

@aemilst

جنونِ وفا

از قلم عیشہ خان



تحریر۔۔۔ جنونِ وفا

از قلم۔۔۔ علیشے خان

یہ منظر شہر اسلام آباد کے ایک رہائشی علاقے کا ہے، یہ علاقہ اور اس میں بنے بالکل قطار در قطار خوبصورت اور عالیشان گھر اس جگہ کی قیمت اور اہمیت کا منہ بولتا ثبوت دیتے تھے۔ صاف ستھرا اور پرسکون ماحول یہاں کے رہائشیوں کی نفاست اور نزاکت طبعیت کا پتہ دے رہا تھا۔۔

ہماری کہانی کا حصہ ایک حویلی نما گھر ہے۔ جس کے مین گیٹ پہ "اسد اللہ خان آفریدی" کے نام کی تختی درج تھی۔ مین گیٹ سے داخل ہوتے ہی سیدھا پاتھ وے پہ چلتے دائیں طرف مڑیں اور چند قدم مزید لیں تو حویلی کے اندر جانے کا داخلی دروازہ آئے گا۔

داخلی دروازے کے بالکل سامنے باہر کی طرف کھلا وسیع سبز گھاس سے بھرا لان تھا۔ اور اس میں کھلتے جا بجا مختلف اقسام کے پھول دیکھنے والی آنکھ کو ٹھنڈک اور راحت بخشتے تھے۔ حویلی کے داخلی دروازے سے اندر آؤ اور پہلا قدم رکھتے ہی نیچے دیکھو تو سفید چمچماتی ٹائلز کے فرش پہ اپنا عکس صاف چھلکتا پاؤ گے۔

اب نظریں فرش سے اوپر اٹھا کے دیکھیں تو سامنے بڑا سا لاؤنج جو بیش قیمتی فرنیچر، ڈیکوریشن پیسز اور فن پاروں سے سجا تھا۔ داخلی دروازے کے ساتھ بائیں طرف بڑا اور کھلا سا ڈرائنگ روم تھا۔ جس کا ایک دروازہ لاؤنج میں جبکہ دوسرا دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ لاؤنج میں سامنے دیوار پہ نصب بڑی سکرین پہ

کسی پرانے اور کلاسک گیت کی مدہم دھن پورے لاونج میں
بکھری ہوئی تھی۔۔

ایک ادھیڑ عمر شخص آنکھیں موندے گیت کے سروں مگن تھا۔
انکے سفید عمر رسیدہ پاؤں جوتے کی قید سے آزاد نرم کاریٹ پہ
پڑے اسکے دھاگوں کی زماہٹ محسوس کر رہے تھے۔ وہ گانے
کی دھن پہ ہلکا سا اپنا ہاتھ موو کرتے ہوئے اپنی ران پہ چلا رہا
تھے، جو اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ ان دھنوں کو انجوائے کر
رہے ہیں، خیر ان کو میوزک انجوائے کرنے دیتے ہیں انہیں
نہیں چھیڑتے ہم آگئے بڑھتے ہیں۔

چند قدم مزید لو تو باتیں طرف تین کمرے تھے جن کے دروازے
فی الوقت بند تھے۔ تینوں کمروں کی سیدھ میں چلتے ہوئے اینڈ پہ

جائیں تو ایک دیوار گیر کھڑکی نظر آئے گئی، جس سے جھانک کر
حویلی کی پچھلی سائیڈ کا سارا منظر با آسانی دیکھا جاسکتا ہے۔
اب واپس مڑیں اور لاونج سے گزر کر دائیں جانب بڑھیں تو
خوبصورت کچن اور اس کے دروازے سے نکلے تو سیدھا
سیڑھیاں چڑھوں، سیڑھیاں چڑھتے ہی عقبی دیوار پوری اوپر
تک فریمز میں مقید تصاویر سے بھری ہوئی تھی جن میں ہر جگہ بس
دو لڑکے ہی دیکھائی دے رہے تھے۔ کچھ بچپن کی یادیں تھی،
کچھ جوانی کی کامیابیاں اور کچھ تقریبات کے قصے، کیمروں میں قید
کر کے دیواروں پہ چسپاں کر دیئے تھے۔

اب تصاویر دیکھ لی ہیں تو اوپر کے پورشن میں پہنچ جاؤ۔ اوپر
کے پورشن کا نقشہ بھی سیم نیچے جیسا تھا۔ اوپر کے پورشن کی

باقی معلومات بعد میں دیکھتے ہیں، پہلے چلتے ہیں اس نوجوان کے
کمرے میں جو ہماری کہانی کا ایک اہم کردار کا ہے۔۔۔

کمرے میں داخل ہو تو ہال نما کمرہ پورا اندھیرے میں ڈوبا ہوا
تھا۔ ایک لمبا چوڑا وجود اوندھے منہ بیڈ پہ آڑا ترچھا پڑا منہ تکیے
میں گھسیڑے سو رہا تھا۔

داعیر!! داعیر بیٹا اٹھ جاؤ بارہ ہو رہے ہیں۔۔۔۔۔ انیسہ خان
کمرے میں داخل ہوتے ہی ساری لائٹس آن کرتی بیڈ پہ پڑے
داعیر خان سے مخاطب ہوتی تھی۔ ان کی پرسنلٹی اور چہرے
کی چمک دمک دیکھ کے لگتا نہیں تھا کہ وہ دو جوان بیٹوں کی ماں
ہے۔ وہ خود پرست تھیں۔ انھوں نے ساری زندگی تمام
رشتوں کو خود سے بعد میں رکھا تھا۔ پہلے ان کی اپنی ذات آتی
تھی، باقی رشتے ناٹے بعد میں آتے تھے۔ مصنوعی بھورے

رنگ سے رنگے بال جو کندھوں پہ بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے
پہ سنجیدگی اور عمر کا تجربہ صاف چھلک رہا تھا۔

وہ اس وقت میرون سیمپل سی ساڑھی میں ملبوس، ہلکے سے
میک اپ کے ساتھ کہیں جانے کیلئے تیار کھڑی تھی لیکن جانے
سے پہلے داعیر خان کو جگانا ضروری سمجھا۔

مورے! تھوڑی دیر تک اٹھ جاتا ہوں۔۔۔ داعیر خان نیند سے
بھاری ہوتی آوازیں جواب دیتا کمفرٹر اپنے گرد مزید لپٹا گیا تھا۔
نہیں ابھی اٹھو!! پھر تم بھول جاؤ گے۔ تمہیں یاد ہے نہ! آج
تم نے مہرو کے ساتھ شادی کی شاپنگ کیلئے جانا ہے؟۔۔۔
انیسہ خان نے اپنی بات پہ زور دیتے ہوئے داعیر کو یاد دہانی
کروائی۔

اوشٹ!! اتنی اہم بات میں کیسے بھول سکتا ہوں؟ میری جان نکال دے گی وہ لڑکی اگر میں پانچ منٹ بھی لیٹ ہوا تو۔۔۔
داعیر خان ماں کی بات سنتے ہی یکدم بیڈ سے اچھل کے نیچے اترا تھا۔ مہرو کے زکر پہ ساری نیند اڑن چھو ہوئی تھی۔ چہرے پہ فکر در آتی۔۔۔ بیڈ سے اترتے ہی لمبی چوڑی قد و قامت واضح ہوئی تھی۔

چھ فٹ دو انچ کا قد، سرخ و سفید رنگت، گھنی براؤن بٹیرڈ، مغرور ناک، اور شہد رنگ آنکھیں، وہ اپنے پٹھانی نقوش کے ساتھ بے حد خوبصورت ستائیس سال کا نوجوان تھا۔

مورے! میرے لئے ناشتہ بنوادیں، میں فریش ہو کر نیچے آرہا ہوں، پھر مجھے مہر کو لے کر شاپنگ پہ بھی جانا ہے۔ پہلے ہی

لیٹ ہو رہا ہوں۔۔۔ داعیر خان اپنے براؤن بالوں میں ہاتھ
پھیرتے ہوئے عجلت میں ماں کو حکم دیتا واشروم میں بند ہو گیا۔
او کے جلدی نیچے آؤ!! میں ملازمہ کو ناشتے کا بول دیتی ہوں، وہ بنا
دے گی اور میں سیلون جا رہی ہوں۔۔۔۔۔ انیسہ خان اونچی
آوازیں داعیر کو آگاہ کرتی اسکے کمرے سے نکل گئی تھی۔ ان کی
بات پہ اس نے واشروم سے او کے کہہ دیا تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ میں ہی وہ شاور لے کر باہر نکلا، خود کے گرد
سفید ٹاول لپیٹے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ
وارڈروب سے بلیوچیک شرٹ کے ساتھ جینز نکال کے پہنتا
ڈریسنگ روم سے باہر آکر آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اپنے
کیلے گھنے بالوں میں برش کرنے کے بعد وہ خود پہ پرفیوم کا چھڑکاؤ

کرتا بیڈ سے اپنا موبائل اور وولٹ اٹھائے عجلت میں کمرے سے
نکلتا نیچے کی جانب بڑھا تھا۔

اسلام علیکم بابا۔۔ داعیر خان سیڑھیوں کے آخری زینے اترتا
میوزک کی دھن میں مگن اسد اللہ خان کو سلام کرنے لگا۔
و علیکم السلام بیٹا!! کہاں جانے کی تیاری ہے؟۔۔۔۔۔ اسد
اللہ خان ریموٹ سے میوزک کی آواز مدہم کرتے داعیر سے
استفسار کرنے لگے۔

آپ شاید بھول رہے ہیں۔ دو دن بعد میری شادی ہے۔ اسی کی
شاپنگ کیلئے جا رہا ہوں۔۔۔ داعیر خان چھپے صوفے کے ساتھ
پشت ٹکاتا جتانے والے انداز میں بولا۔

تو اس میں اتنی جلدی مچانے والی کیا بات ہے؟ پیسہ پاس ہو تو ایک گھنٹے میں بھی سب کچھ اریج ہو سکتا۔۔۔ اسد اللہ خان کندھے اچکا کر ریلیکس انداز میں گویا ہوئے تھے۔

ہاں بابا ہو تو سکتا ہے لیکن لڑکیوں کے معاملے میں ایسا نہیں ہوتا۔ ان کو چیزیں اتنی جلدی پسند نہیں آتی۔ ان کیلئے تو شادی کی شاپنگ کرنے کیلئے ایک مہینہ بھی کم پڑ جائے۔۔۔ داعیر خان نے تاسف سے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔

بیٹا! جن کاموں کیلئے آپ کو ٹائم زیادہ ملتا، آپ اتنے ٹائم ہی چیزوں اور پریشانیوں میں الجھے رہتے، اسلئے میرا ماننا ہے کہ چیزوں کو کم ٹائم دو اور کم وقت میں سرانجام دو تاکہ آپ زیادہ دیر پریشانی اور ایک ہی مسئلے میں پھنسنے نہ رہو۔۔۔ اسد اللہ خان پر سوچ انداز میں سمجھانے لگے۔

شادی بیاہ کے معاملات میں ویسے بھی وقت جتنا زیادہ ہوتا ہے، اتنی ہی چیزیں ڈیسائیڈ کرنے میں ہمیں مشکل آتی ہے اور ہم فضول الجھنوں کا شکار رہتے ہیں۔ اسلیئے بہتر ہے شادی کیلئے کم ٹائم رکھا جائے۔ تاکہ صرف ضروری چیزیں سرانجام دی جا سکے اور فضول کی رسومات سے پرہیز کیا جائے۔۔۔ وہ مزید بول رہے تھے اور داعیر انہیں غور سے سن رہا تھا جب انیسہ خان یہاں آتی دکھائی دیں۔

مورے!! آپ واپس کیوں آگئی؟۔۔۔ داعیر نے اپنی ماں کو لاؤنج میں واپس داخل ہوتے دیکھ کر تعجب کا اظہار کیا۔ میں نے آج کا پروگرام کینسل کر دیا ہے، مہرو کے والدین تھوڑی دیر تک آرہے ہیں! انھوں نے شادی سے ریلٹڈ کچھ ضروری معاملات طے کرنے ہیں۔۔۔ انیسہ خان اپنا سٹائلش سا

ہینڈیگ ٹیبل پہ رکھتی اسد اللہ خان کے دائیں جانب صوفے پہ
بیٹھ گئی۔

تو پھر مہر بھی ان کے ساتھ آئے گی؟۔۔۔ داعیر خان نے
متجسس ہو کر پوچھا۔

نہیں تم دونوں نے تو شاپنگ پہ جانا ہے۔ اگر وہ یہاں آگئی تو
شاپنگ کون کرے گا؟۔۔۔ انیسہ خان بیٹے کو جواب دیتی اسد
اللہ خان کی طرف خفگی سے دیکھنے لگیں، جنھیں نہ بیٹے کی شادی
کی تیاریوں کی فکر تھی اور نہ شادی کی۔ سارا کچھ انہوں نے خود
دیکھنا تھا۔

یار!! ناشتہ کہاں ہے؟۔۔۔ داعیر خان اونچی آواز میں بیزاری
سے بولا تھا۔ وہ کب سے ناشتے کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

لو آگیا تمہارا ناشتہ۔۔۔ ایسہ خان سامنے ملازمہ کو ناشتے کی
ٹرے کے ساتھ دیکھ کر داعیر کو آگاہ کرنے لگیں۔

اتنی دیر کیوں لگا دی؟۔۔۔۔۔ داعیر خان نے ناشتے کی ٹرے
خود کے قریب کرتے ہوئے سنجیدگی سے ملازمہ سے وجہ جاننا
چاہی۔

جاؤ تم!! انسان ہے، دیر سویر ہو جاتی ہے۔ اب آگیا ہے نہ
ناشتہ! جلدی کرو اور مہر کو ساری شاپنگ آج ہی کروا دینا۔ کل
سے مہندی کا فنکشن سٹارٹ ہے، ہماری مصروفیات مزید بڑھ
جائیں گئی۔۔۔۔۔ ایسہ خان ملازمہ کو جانے کا اشارہ کرتی داعیر کو
جلدی ناشتہ ختم کرنے کا حکم دینے لگی۔

مورے! لالا کب تک آجائیں گئے؟ میں نے کل پوچھا بھی تھا
لیکن وہ بات گول گول مول کر گئے تھے۔ مجھے تو شک ہے وہ

میری شادی پہ بھی آنے کی زحمت نہیں کریں گئے۔۔۔ داعیر
خان نے ناشتہ کرتے ہوئے اپنے لالا کا ذکر چھیڑ دیا۔ لہجہ خاصا
ناراض سا تھا۔

بیٹا اگر تمہارے بابا کہیں گے تو وہ شام سے پہلے پاکستان ہوگا،
لیکن تمہارے بابا کو اپنوں کی خوشیوں سے زیادہ عزیز اپنا بزنس
ہے۔ اگر دمیر ایک دن کیلئے بھی پاکستان آجائے تو تمہارے بابا
کے مطابق ان کا باہر کا بزنس ڈوب جائے گا۔۔۔ انیسہ افسوس
سے اسد اللہ خان کی طرف دیکھتی بیٹے کو جواب دینے لگیں۔
دمیر خان نہایت ہی فرمانبردار اور سلجھا ہوا انسان تھا۔ اس
نے ساری زندگی وہی کیا جو اسکے باپ نے اسے کرنے کو کہا۔
دمیر کی پڑھائی مکمل ہوتے ہی اسد اللہ خان نے اس کو اپنے
بزنس میں لگا دیا اور پھر دمیر خان کی قابلیت دیکھتے ہوئے سارا

بزنس اس کے حوالے کر کے خود کو بس فائل کاموں کیلئے مختص کر دیا۔

اب اسد اللہ خان کا ارادہ داعیر کو بھی اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ بزنس میں لگانے کا تھا، لیکن اس سے پہلے انیسہ خان نے اسکی شادی کر دینا ضروری سمجھا کیونکہ یہ لڑکا بھی اگر بزنس میں پڑ جاتا تو پھر دمیر خان کی طرح مشکل سے ہاتھ آتا اور ویسے بھی داعیر کو خود ہی شادی کی جلدی تھی۔ وہ اپنے لالا جیسا نہیں تھا۔ داعیر اور دمیر خان کی شخصیت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

داعیر خان زندگی سے بھرپور اور خوش رہنے والا جوان تھا جبکہ دمیر سنجیدہ مزاج اور کم گو انسان تھا۔ پہلے پہل تو دمیر خان چند ماہ بعد پاکستان کا چکر لگا لیتا تھا، لیکن اب تو اسے ایک سال

ہونے والا تھا، وہ ایک مرتبہ بھی پاکستان نہیں آیا تھا۔ البتہ یہ تینوں اکثر اس سے ملنے آسٹریلیا جاتے رہتے تھے۔ جب گھر والوں سے ملاقات ہو جاتی تھی تو دمیر خان بھی فضول کے چکر پاکستان نہیں لگاتا تھا۔ اسکی سوچ بھی اپنے باپ جیسی تھی۔ کامیاب آدمی بننے کیلئے اس نے وہی کیا جو اس کے باپ نے اسے بتایا تھا اور اسی کامیابی کے چھپوہ اپنوں کے ساتھ سے محروم ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ کامیاب بزنس مین تو بن چکا تھا لیکن زندگی کے میدان میں ابھی تک ایک قدم بھی ترقی نہیں کی تھی۔

میں نے اسے پاکستان آنے سے کبھی منع نہیں کیا، وہ خود سمجھدار ہے، اپنا نفع و نقصان جانتا ہے اور اپنے وقت کو صحیح جگہ انویسٹ کرتا ہے اسلئے تو وہ کاروباری دنیا میں اس شہر کا جانا

پہچانا نام بن چکا ہے۔۔۔ اسد اللہ خان فخریہ انداز میں اتر کر
بولے۔ انہیں اپنے بیٹے کی قابلیت پہ ناز تھا۔

کامیاب بزنس مین تو بنا دیا لیکن اسکی زندگی کے بارے میں نہ
سوچا۔۔ وہ داعیر سے بڑا ہے مگر اسکی شادی تو کیا ابھی تک
کہیں منگنی بھی نہیں ہوئی۔۔ وہ تو صد شکر ہے میرے پاس جو
بیٹا میسر ہے اسکی شادی کر رہی ہوں ورنہ آپ نے تو اسے بھی
اپنے کاروباری معاملات میں پھنسا کر زندگی جینے سے محروم کر
دینا تھا۔۔۔ انیسہ خان خفت سے بولتی شوہر کو ان کی
لاپرواہیاں گنوانے لگی۔۔

دمیر کی بھی شادی ہو جائے گئی۔ تم فکر مت کرو۔ باخدا! میں
نے اسے شادی کرنے سے نہیں روکا ہوا۔ وہ تو اسے خود ہی
کوئی لڑکی اپنے معیار کے مطابق پسند نہیں آتی، اس لئے وہ

شادی نہیں کر رہا۔۔ جس دن کوئی پسند آجائے گئی اس دن دمیر
نے تمہیں بتائے بغیر شادی کر لینی ہے اور تمہیں انیسہ بیگم خبر
بھی نہیں ہونی کہ تمہارے ساتھ ہوا کیا ہے؟ اس دن وہ من
پسند دلہن کے ساتھ تمہارے سامنے کھڑا ہوگا پھر یقیناً تمہارے
شکوے دور ہو جائیں گے؟۔۔۔ اسد اللہ نارمل لہجے میں
بولتے ہوئے بیوی کو آگ بگولہ ہونے پر مجبور کر گئے۔

وہ میری مرضی اور میری پسند کے خلاف جا کر کبھی شادی نہیں
کرے گا۔ اسکی شادی میری پسند کی لڑکی سے ہوگی۔ وہ میری
اجازت کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھاتا تو پھر میری رائے
جانے بغیر شادی کیسے کر لے گا؟ پہلے ہی داعیر اپنی پسند کی لڑکی
چن کے مرضی کی شادی کر رہا ہے لیکن دمیر کی شادی میری
بھانجی کے ساتھ ہوگی اور یہ رشتہ میری طرف سے طے ہے۔

اب جب دمیر آئے گا تو اس کا نکاح کروا کے ہی بھیجو گی۔۔۔
انیسہ خان تیکھے طنزیں بولتی شوہر کو اپنی پسند باور کرا نے لگیں۔
لیکن مورے!! اگر لا آپ کی بھانجی سے شادی کرنے کیلئے نہ
مانے تو کیا ہوگا؟۔۔۔ داعیر خان نے انہماک سے ناشتہ کرتے
ہوئے مصروف انداز میں پوچھا۔

مانے گا کیوں نہیں؟ وہ میری مرضی کے خلاف نہیں جاسکتا۔
میری بڑی بہو تو میری پسند کی ہی آئے گی! بس بات ختم۔۔۔
انیسہ خان صوفے پہ سیدھی ہو کے بیٹھتی اٹل لہجے میں گویا
ہوتی تھیں۔ ان کے انداز میں ایک بھرم تھا ایک مان تھا، اور
ان کو لگتا تھا کہ دمیر خان ان کا یہ بھرم اور مان کبھی نہیں توڑے
گا۔ وہ ان کی پسند کی لاج رکھے گا۔

مورے!! ویسے آپکی بھانجی میں کچھ خاص نہیں ہے جو لالا اس سے شادی کرنے پہ ہنسی خوشی راضی ہو جائیں گے۔ وہ ایک مغرور اور ضدی لڑکی ہے اور لالا کو ایسی لڑکیاں بالکل بھی پسند نہیں ہیں جو کاروبار میں الجھ کر اپنے تقدس کا بھرم کھودیتی ہیں یا جو لڑکیاں سچ دھج کے پارٹیز اٹینڈ کرتی ہیں اور اپنے حسن و فہانت کی نمائش کرواتی ہیں۔۔۔ داعیر خان چائے کا سپ لیتا ناپسندیدگی سے گویا ہوا۔ وہ اپنے لالا کی پسند اور ناپسند سے کافی حد تک واقف تھا۔

نمائش نہیں کرتی، وہ محنتی لڑکی ہے۔ وہ اپنے باپ کا کاروبار میں ہاتھ بٹاتی ہے اور کاروباری معاملات میں آپ کو پارٹیز اٹینڈ کرنا پڑتی ہیں اور اچھا بھی دکھنا پڑتا ہے، اس میں کوئی مضحکہ خیز

بات نہیں ہے۔۔۔ انیسہ خان نے خفت سے داعیر خان کی
درستگی کی تھی۔

مورے! کاروباری معاملات تو مہر بھی پینڈل کرتی ہے لیکن اس
نے تو کبھی اپنی شخصیت کی نمائش نہیں کرائی؟۔۔۔۔۔ داعیر
خان ماں کی بات سے غیر متفق نظر آرہا تھا۔

کیونکہ وہ گھریٹھ کر سب کچھ کرتی ہے اور باہر کے سارے
معاملات اس کا لالا دیکھتا ہے، اگر اس کو بھی فرنٹ لائن پہ آکے
کاروبار کرنا پڑے تو وہ بھی یہی سب کچھ کرے گی۔۔۔۔۔ انیسہ
خان کرخت لہجے میں بولیں۔ اب داعیر کی باتیں ان کی طبعیت پہ
ناگوار گزر رہی تھی۔

اگر مہر کو فرنٹ لائن پہ بزنس کرنا پڑا تو بھی وہ اپنے حسن کی
نمائش کبھی نہیں کرے گی کیونکہ وہ خان ہے۔۔۔۔۔ داعیر خان

نے بھرم سے کہا۔ ناجانے کیوں وہ ماں سے اس فضول سی
بات پہ بحث کئے جا رہا تھا۔

تو تمہارا کہنے کا مطلب ہے جو خان نہیں ہوتے وہ بے شرم اور
بے مروت ہوتے ہیں؟ شرم و حیا اور اچھا پن صرف خانوں میں
پایا جاتا ہے، باقی کا پورا پاکستان بے شرم اور برا ہے؟۔۔۔۔۔
انیسہ خان نے غصے سے استفسار کیا کیونکہ وہ ”بزدار“ تھیں۔
نہیں مورے! میں نے ایسا کچھ نہیں کہا، میں تو بس ایسے ہی
بول رہا تھا۔۔۔ ماں کا موڈ بگڑتا دیکھ کر داعیر خان گڑبڑا کر فوراً
اپنی بات سے چھپے ہٹ گیا۔

اتنے اچھے خان لوگ ہوتے تو تمہارے باپ کو ہمارے گھر
رشتے کیلئے نہ آنا پڑتا۔۔ اتنے شرم و مروت والے تھے تو کیوں نہ
ان کو اپنے خاندان کی لڑکی ملی؟ کیوں میرے بد لحاظ اور بے

مروت خاندان میں رشتہ کیا؟ میرے خاندان کے علاوہ تو آپ کے والد محترم کو کسی نے منہ بھی نہیں لگایا تھا۔ آئے بڑے خان زادے۔۔۔۔۔ انیسہ خان کی توپوں کا رخ اسد اللہ خان کی طرف ہو گیا کیونکہ وہ ہی ہمیشہ داعیر خان سے ایسی باتیں کرتے تھے۔ ان کا پارہ ہائی ہو چکا تھا۔ وہ اپنی بھانجی یا اپنے خاندان پہ ایک حرف برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔

تم ماں بیٹا اپنی بحث میں مجھے کیوں گھسیٹ رہے ہو؟ میں نے کیا کیا ہے؟۔۔۔۔۔ اسد اللہ خان کا حیرت سے منہ کھلا تھا۔

آپ ہی کا قصور ہے ایسی باتیں آپ ہی داعیر کو سیکھاتے ہیں۔۔۔۔۔ انیسہ خان سخت لہجے میں بولتی منہ موڑ گئیں جبکہ داعیر خان کے چہرے پہ ماحول میں بدلاؤ دیکھ کر پریشانی اور سنجیدگی دوڑ گئی۔

بیگم مجھے خاندان کی لڑکیاں کیسے منہ لگاتیں؟ میں نے تو آپ سے
منہ لگایا ہوا تھا۔۔۔ ماحول میں تناؤ محسوس کرتے ہوئے
اسد اللہ خان نے نرمی سے انیسہ خان کا ہاتھ پکڑ کر دھیمی
مسکراہٹ کے ساتھ گھمبیر آواز میں کہا۔

داعیر خان جو ماں کے خفا ہونے پر پریشان بیٹھا تھا۔ اپنے باپ
کی بات اور انداز دیکھ کر بلند قہقہہ لگاتے ہوئے ہنس پڑا۔ انیسہ
خان نے غصے کی وجہ سے پہلے تو اسد اللہ خان کی بات پہ توجہ
نہیں دی تھی پھر داعیر خان کو ہنستے دیکھ کر وہ تیزی سے ہوش
کرتی اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چھڑوا گئی۔

یہی حرکتیں ہیں آپکی جو آپ نے اس کو بھی سیکھا رکھی
ہیں۔۔۔ انیسہ خان سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ اپنے شرمیلے
پن پہ قابو پاتی غصے کا لبادہ اوڑھنے لگتی۔

تو یہ بری حرکتیں تو نہیں ہیں نہ؟ یہ تو حلال حرکتیں ہیں جو ہر کوئی
اپنی شریک حیات کے ساتھ کرتا ہے۔۔۔ اسد اللہ خان اب
جان بوجھ کر بیوی کو چھیڑ رہے تھے، وہ پھر سے انیسہ خان کا ہاتھ
پکڑے بوجھل آوازیں بولے تھے۔ داعیر دلچسپی سے انہیں
دیکھتا ہوا مسکراتے جا رہا تھا۔

چھوڑیں میرا ہاتھ، کیا ہو گیا ہے آپ کو جو یوں بہکی بہکی باتیں کر
رہے ہیں؟۔۔۔ انیسہ خان نے جھرجھری لیتے ہوئے اپنا ہاتھ
چھڑوایا۔۔

پیار ہو گیا ہے آپ سے۔۔۔ اسد اللہ خان اپنی مسکراہٹ ضبط
کرتے ایک آنکھ دبا کے داعیر خان کو دیکھتے شوخ لہجے میں گویا
ہوئے تھے۔

گائزویٹ!! مجھے یہاں سے نکلنے دیں، پھر اپنا یہ سین کانٹینیو کیجئے
گا، میں پہلے ہی بہت بے شرم ہوا پڑا ہوں۔۔۔ داعیر خان ہنستے
ہوئے صوفے سے اٹھ کر اپنی ماں کے سر پہ لب رکھ گیا۔
ایم سوری مورے!! مجھے آپ سے بحث نہیں کرنی چاہیے
تھی۔۔۔۔۔ داعیر خان نے جاتے جاتے اپنی زبان درازی کی
معزرت کی۔

اٹس اوکے بیٹا!! خیر سے جاؤ۔۔۔ انیسہ خان اس کا ہاتھ پکڑ کر
چومتی دھیمے لہجے میں گویا ہوئیں۔

میں بھی تمہارا باپ ہوں۔ مجھے بھی بوسہ دے دوں۔۔۔۔۔ اسد
اللہ خان اپنے بیٹے کو ماں سے یوں پیار جتاتے دیکھ کر ناروٹھے
پن سے بولے تھے۔

پہلے آپ میری ماں کا ہاتھ تو چھوڑیں پھر آپ کو بھی بوسہ دے
دوں گا۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا آپ ہاتھ کسی اور کا تھام کے
بیٹھیں اور چمیاں شمیاں مجھ سے لیں۔۔۔ داعیر خان ان کے
دائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کرتا شرارت سے بولا تھا۔ ہنس مزاح کی
عادت دونوں باپ بیٹے میں ملتی تھی۔

شرم کرو!! وہ کوئی اور نہیں، تمہاری ماں ہے۔ تم نے بوسہ دینا
ہے تو دو ورنہ وہ بھی میں تمہاری ماں سے لے۔۔۔ اسد اللہ
خان کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے کیونکہ انیسہ خان نے سخت
گھوریوں سے نوازتے ہوئے زبان کو بریک لگانے کا اشارہ جو
کر دیا تھا۔

آئی تھنک! میرا یہاں سے نکل جانا ہی بہتر ہے کیونکہ کسی کے
جذبات آؤٹ آف کنٹرول ہو رہے ہیں۔۔۔۔۔ داعیر خان اپنے

باپ کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر زور سے انکے گال
پر بوسہ دیتا ہنستے ہوئے باہر کی جانب بڑھا تھا۔

ہاہاہا!! میرا پیارا بیٹا۔۔۔ اسد اللہ خان قہقہہ لگاتے ہوئے
اونچی آواز میں بولے۔

عمر کا تو لحاظ رکھا کریں! بیٹے کے سامنے کیسی باتیں کر رہے تھے
۔۔۔ انیسہ خان نے سنجیدگی سے انہیں ہوش دلائی چاہی۔
اچھا!! چلیں نہیں کرتا ایسی ویسی باتیں، آپ بتائیں شادی کی
تیاری کہاں تک پہنچی؟ کتنے لوگوں کو انوائٹ کرنا ہے؟۔۔۔
اسد اللہ خان ایک ٹانگ فولڈ کر کے صوفے پہ رکھتے رخ انیسہ
خان کی طرف موڑتے سنجیدگی سے متوجہ ہو گئے۔

شادی کی ساری تیاری ہو گئی ہیں اور میں نے سب کو انویٹیشن
کارڈز بھیجوادیئے تھے۔۔۔ انیسہ خان نے عام لہجے میں جواب
دیا۔

اچھا نزہت کا کارڈ مجھے دے دینا میں خود جا کر دے آؤں گا، اسی
بہانے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ کافی عرصہ ہو گیا ہے اس سے
ملے ہوئے۔۔۔ اسد اللہ خان محتاط انداز میں بولتے بیوی کے
چہرے کے بدلتے تاثرات نوٹ کرنے لگے۔

اس کو بھی شادی پہ انوائٹ کرنا ہے؟ ان کا اور ہمارا سٹینڈرڈ
میچ نہیں کرتا۔ وہ دونوں خواہ مخواہ اپنے سے اونچے لوگوں میں
بیٹھ کر احساس کمتری کا شکار ہوں گی۔۔۔ نزہت کا نام سنتے ہی
انیسہ خان کے لہجے میں سختی در آتی تھی۔

کیا مطلب ان کو بھی انوائیٹ کرنا ہے؟ وہ میری چھوٹی بہن ہے۔ میں اس کا لالہ ہوں! میں بھی وہی تھا، جو وہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور مجھے اپنی نعمتوں سے نوازا اور میں آج یہاں بیٹھا ہوں۔ اس کا ہر گز مطلب نہیں ہے میں اپنا اصل بھول یا اپنے سے جڑے رشتے بھول جاؤں۔۔۔ اسد اللہ خان بے یقینی اور افسردگی سے بولے تھے۔ وہ ساری زندگی اپنی بہن سے متعلق انیسہ خان کی سوچ نہ بدل پائے۔۔۔ ان کی وجہ سے ہی انہوں نے اپنی سگی بہن سے زیادہ ملنا ملنا بند کر رکھا تھا۔ سال میں بس دو بار عید پہ جاتے تھے، ورنہ تو وہ بھول کے بھی نزہت خان کے گھر قدم نہیں رکھتے تھے۔

پہلے وہ اپنے کاروبار میں پھنسے رہتے تھے اور اب ویسے بھی انہوں نے کہیں آنا جانا کم کر رکھا تھا۔

او کے کر لیں انوائیٹ!! مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن پلیر
شادی میں آنے سے پہلے ان کو کوئی ڈھنگ کے کپڑے دلو دیجیے
گا۔ میں نہیں چاہتی ہماری کہیں یہ بھی انسلٹ ہو۔ لوگوں کو تو
وہ آپ کی بہن ہونے کا حوالہ ہی دیں گی نہ۔۔۔۔۔ ایسہ خان
کرخنگی سے بولتی صوفے سے اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔

وہ مزید اس ٹاپک پہ کوئی بحث نہیں کرنا چاہتی تھی، اسلئے جگہ
چھوڑ کے چلی گئیں جبکہ اسد اللہ خان کے چہرے کے نقوش
سخت ہوئے تھے۔

انہوں نے تاسف سے سر جھٹک کر دوبارہ میوزک کا والیوم
اپ کیا اور صوفے کی پشت پہ سر ٹکائے آنکھیں موندھ گئے۔ یہ
مسئلے انہوں نے ساری زندگی سنے تھے۔۔۔ اب تو وہ ایسہ
خان کی باتوں پہ کوئی خاص ری ایکشن نہیں دیتے تھے۔۔۔ ری

ایکشن دینے کا مطلب لڑائی اور بدمزگی پیدا کرنا تھا۔ اور وہ اپنے بیٹے کی خوشی پہ ہرگز کوئی لڑائی یا آپس کی رنجش مول نہیں لے سکتے تھے۔

یہ منظر اسد اللہ خان کے گھر سے بیس منٹ کی دوری پہ واقع بزدار مینشن کا ہے۔ یہ مینشن بھی عالیشان اور اپنی طرز تعمیر میں منفرد اور دلکش تھا۔ جتنا باہر سے یہ مینشن پرکشش دکھتا تھا۔ اندر سے اس سے اتنا ہی زیادہ حسین تھا۔ مینشن کی ایک ایک اینٹ کو نہایت ہی محبت اور نفاست سے لگایا گیا تھا۔ اس کا منفرد انٹیریئر اس میں بسنے والے لوگوں کے ذوق کا پتہ دیتا تھا۔

باہر میں گیٹ پہ گاڑی کے ہارن کی آواز پہ چوکیدار نے بھاگ کر
اسے اوپن کیا تھا۔ گیٹ اوپن ہوتے ہی ایک سیاہ لمبی گاڑی
اندر داخل ہوئی۔

پورچ میں پہنچ کر سست رفتار چلتی گاڑی کو بریک لگی تھی اور
کچھ ہی لمحوں میں ایک صنف نازک نے دودھیا سفید پیر جو کہ
اس وقت سیاہ ہیل میں مقید تھا، گاڑی سے باہر سنگ مرمر کے
فرش پہ رکھا تھا۔ وہ ایک ہاتھ گاڑی کے دروازے پہ رکھتی اپنے
دوسرے ہاتھ میں ایک ڈیسنٹ بیگ تھا مے گاڑی سے باہر نکلتی
سیدھا اندر کی جانب بڑھنے لگی۔ وہ اس وقت سفید لیڈیز ڈریس
شرٹ کے ساتھ سیاہ ہائی ویسٹ لگ پینٹ پہنے دوپٹے سے بے
نیاز تھی۔ بھورے گھنے بال تھوڑے سے کرلرز کے ساتھ
پشت پہ بکھرے ہوئے تھے۔ کانوں میں ڈائمنڈ کے ٹاپس، گلے

میں لٹکتی سٹائش سی گولڈ کی ڈبل لٹیر چین، لمبی مخروطی
انگلیاں، سیاہ اور بھورے امتزاج کی آنکھیں، سر سے لیکر پاؤں
تک وہ اپنی مغرور پر سنیلیٹی کے ساتھ بے حد حسین اور نازک
لڑکی تھی۔

بلی جیسی خوبصورت چال چلتی مٹک مٹک کر وہ آگے کی طرف
قدم بڑھاتے جارہی تھی۔ اس کی ہیل کی آواز اور اس کے
وجود سے اٹھتی مخصوص خوشبو محسوس کر کے لاؤنج میں
بیٹھے ہوئے عام بزدار کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھری تھی۔ وہ
صنف نازک لاؤنج میں داخل ہوتے ہی تھکے ہوئے انداز میں
ملازمہ کو جوس کا آرڈر کرنے لگی۔

اسلام علیکم بابا۔۔۔ انرش بزدار نے صوفے پہ بیٹھتی ہی اپنے
باپ کو سلام جھڑا۔

وعلیکم السلام! آج میرا بیٹا جلدی آگیا آفس سے۔۔۔ سب
خیریت ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟۔۔۔۔۔ عام بزدار
اس کے چہرہ پہ تھکان دیکھتے فکر مند ہوئے تھے۔

نہیں بابا!! میری طبیعت کو کچھ نہیں ہوا۔ میں بالکل ٹھیک
ہوں۔ بس آج کوئی امپورٹنٹ میٹنگ نہیں تھی تو اس لئے میں
گھر آگئی اور ہاں بابا اب میں نے اگلا پورا ایک ہفتہ آفس نہیں
جانا۔۔۔۔۔ انرش بزدار ایک ادا سے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیر
کے چھب کرتی اپنے باپ کو جواب دے رہی تھی۔

ٹھیک ہے نہ جانا آفس!! لیکن پورا ایک ہفتہ!! کوئی خاص وجہ
ہے؟۔۔۔ داعیر کی شادی تو تین دن میں ختم ہو جائے گئی۔۔۔۔۔
عام بزدار پر سوچ انداز میں بولے تھے۔

بابا!! شادی تو تین دن میں ختم ہو جائے گی لیکن آپ کو پتہ ہے
نہ دمر پورے ایک سال بعد پاکستان واپس آ رہا ہے۔ تو میں
چاہتی ہوں ہم دونوں کچھ ٹائم ساتھ سپینڈ کریں۔ کتنا عرصہ ہو
گیا ہے دمر سے ملے، اب تو میں اسکی پسندنا پسند بھی بھول گئی
ہے۔۔۔ انزب بزدار نے شرمیلے سے لہجے میں باپ کو جواب
دیا۔ دمر صرف اس کا کزن ہی نہیں بلکہ بہت اچھا دوست بھی
تھا۔ وہ تو جب سے دمر خان بزنس میں پڑا تھا، اس نے انزب
سے تقریباً رابطہ ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ اب تو دمر خان سے
انزب بزدار کا مہینوں بعد بھی رابطہ نہیں ہوتا تھا۔ وجہ دونوں کی
بڑی روٹین تھی۔

پھر تو تم بے شک دو ہفتے آفس سے چھٹی لے لو۔ دمر کے ساتھ
ٹائم سپینڈ کرو۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ تم دونوں میں کوئی بھی

رشتہ قائم ہونے سے پہلے ایک دوسرے کے ساتھ اچھی
انڈرسٹینڈنگ ہو سکے۔ آفس کی تم ٹینشن نہ لو، میں آفس کا سارا
کام خود دیکھ لوں گا۔۔۔ عام بزدار نرمی سے انزس کو ساری
زمہ داریوں سے آزاد کر رہے تھے۔

اوکے! پھر میں تو آج سے ہی خالہ جان کے گھر شفٹ ہو رہی
ہوں۔۔۔ انزس بزدار خوشی سے بولی۔

نہیں تم کہیں نہیں جا رہی، ہم رات کو مل کے جائیں گے! میں
آپ کے بغیر اس اتنے بڑے گھر میں اداس ہو جاتا ہوں میرا
بیٹا۔۔۔ عام بزدار لاڈ سے بولتے انزس کو اپنے پاس آنے کا
اشارہ کرنے لگے۔

بابا آپ بھی نہ! جب میں آپ کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ کے چلی جاؤ گی
پھر آپ کیا کریں گئے؟۔۔۔ انزش نے صوفے سے اٹھ کے
اپنے باپ کے پاس بیٹھتے ہوئے انکے سینے پہ سر ٹکایا۔

تم کبھی مجھے چھوڑ کے نہیں جاؤ گی۔۔۔ میں ہمیشہ تمہیں اپنی
آنکھوں کے سامنے رکھوں گا۔۔۔ عامر بزدل بیٹی کے سر پہ لب
رکتے محبت سے بولے تھے۔

تو پھر آپ کیا گھر داماد ڈھونڈنے کی پلاننگ کر رہے ہیں؟۔۔۔
انزش ان کے سینے سے سر اٹھاتی شریر لہجے میں بولی تھی۔
دمیر کبھی گھر داماد نہیں بنے گا لیکن میں اپنی بیٹی کے پاس رہنے
کیلئے ”گھر سر“ ضرور بن سکتا ہوں۔۔۔۔۔ عامر بزدل ہنس کر
بولتے ہوئے اپنے ساتھ انزش کو بھی قہقہہ لگانے پر مجبور کر
گئے۔

بابا! گھر داماد تو میں نے سن رکھا تھا لیکن گھر سسر پہلی بار سن رہی ہوں۔۔۔ انزش نے ہنستے ہوئے استفسار کیا۔

جب میں بنوں گا پھر دیکھ بھی لینا۔۔۔ عامر بزدار بھی اسی کے انداز میں بولے۔ دونوں باپ بیٹی کے قہقہے کافی دیر تک لاؤنج میں گونجتے رہے تھے۔۔۔ انزش کی ماں کو گزرے ہوئے دس سال ہو گئے تھے۔ انزش کی ماں کے گزر جانے کے بعد عامر

بزدار نے ہی اس کو ماں اور باپ دونوں بن کر پالا ہے اور صرف انزش کیلئے ہی انھوں نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ وہ اب چوبیس سال کی خوبصورت جوان لڑکی تھی، اس میں حسن اور ذہانت دونوں کوٹ کوٹ کے بھرے ہوئے تھے۔ بہت تھوڑے ہی عرصے میں دمیر خان کی طرح اس نے بھی اپنے باپ کے بزنس کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا تھا۔

داعیر کہاں رہ گئے تھے آپ؟ میں کب سے ویٹ کر رہی
تھی۔۔۔۔۔ مہرو النساء خان پاسبخ سیٹ کا دروازہ کھول کر
بیٹھتے ہوئے خفگی سے بولتی سیٹ بیلٹ باندھنے لگی۔
غصہ مت کرو میری جان! آتو گیا ہوں تمہارے پاس۔۔۔
داعیر خان اس پہ محبت بھری نگاہ ڈالتا گاڑی سٹارٹ کرنے
لگا۔

پورا ایک گھنٹہ لیٹ آئے ہیں آپ!! ابھی اس وقت تک تو ہم
نے آدھی شاپنگ کر بھی لینی تھی۔۔۔۔۔ مہرو اپنے بیگ سے
فون نکالتی مصروف انداز میں بولی۔

تو ہم نے کونسا گھر جا کے کام کرنے ہیں؟ بس شاپنگ ہی تو کرنی
ہیں جب مرضی فری ہو جائیں۔ بہت ٹائم ہے ہمارے پاس

شاپنگ کرنے کیلئے۔۔۔ داعیر خان نرمی سے اس کا نازک ہاتھ
اپنے مضبوط ہاتھ میں لیتا ریلیکس انداز میں بولا تھا۔۔
ہاں آپ کو تو کوئی کام نہیں کرنے لیکن میرے بہت سے کام
ہیں۔ میں تو دلہن ہوں۔ اتنی ساری تیاریاں کرنی ہیں۔ ابھی
مجھے مہندی لگوانی ہے، جیولری ڈیسائٹڈ کرنی ہے، پارلر جانا
ہے، مینی کیوریٹیڈ کیور۔۔۔ اف ف کتنے کام ہیں داعیر۔ میں اپنی
شادی پہ اپنے سارے ارمان پورے کرنا چاہتی ہوں۔۔۔۔
مہرو النساء خان ایکسائٹڈ ہو کر بولی تھی۔ چہرے کا ہر پٹھانی
نقش معصومیت سے بھرپور تھا۔

تمہاری ہر چھوٹی سے چھوٹی خواہش داعیر خان بذاتِ خود پوری
کروائے گا میری مہر۔۔۔ وہ اسکے نرم ہاتھ کو اپنے لبوں سے
لگاتا مان بھرے لہجے میں گویا تھا۔

میں جانتی ہوں داعیر!! آپ میری ہر خواہش پوری کریں گے۔
میں اللہ تعالیٰ کی شکر گزار ہوں جس نے میری قسمت میں آپ
جیسا ہمسفر لکھ دیا ہے، جو میری ہر خواہش پوری کرنے کی
استطاعت رکھتا ہے۔۔۔۔۔ مہر واسکے لبوں کی جسارت پہ شرم
سے اپنا ہاتھ چھڑواتی تشکر بھرے انداز میں بولی۔ وہ داعیر کے
ساتھ بہت ایٹچ تھی، اپنی ہر بات وہ اس سے شئیر کرتی تھی۔
میں تو آپ کی ہر خواہش پوری کر سکتا ہوں لیکن آپ مجھے تڑپانے
کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔ آپ کی ابھی سے مجھ
سے دور رہنے کی کوششیں میری حق تلفی کرتی ہیں۔۔۔۔۔ داعیر
خان مصنوعی غصے سے بولا تھا۔ اس کو مہر والنساء کا یوں
اپنی گرفت سے ہاتھ چھڑوانا اچھا نہیں لگا تھا، اس لئے ایمو شنل
بلیک میل کیا۔

پہلے تو داعیر پلینز، مجھے آپ کہنا بند کریں۔ اور دوسری بات میں
بھلا آپ کو آپکے جائز حق سے کیسے محروم رکھ سکتی ہوں؟ میں
صرف آپ کی ہوں۔ مجھ پہ صرف آپ کا حق ہے۔ آپ جب
چاہیں اپنے حق کا استعمال کر سکتے ہیں۔۔۔ مہرو النساء اپنی
کر سٹل گرے آنکھوں میں معصومیت لئے صفائی دینے والے
انداز میں گویا ہوئی۔

البتہ یہ باتیں کہتے ہوئے اس کے گلابی گال شرماتے سے سرخ
ہوئے تھے۔ وہ اپنی بات کہتے ساتھ ہی نظریں چراگئی تھی
۔ مہرو النساء خان معصوم اور پٹھانی نقوش کے ساتھ سحر انگیز
حسن کی مالک تھی۔

تو پھر یہاں میرے پاس میری گود میں آکر بیٹھو اور مجھے میرے
حق سے نوازو! میرے ان تشنہ لبوں کو اپنے رسیلے لبوں سے

سیرابی بخشو میری مہر۔۔۔ داعیر خان اسکے الفاظ سے اندر تک
سرشار ہوتا پھر سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے خود کی جانب کھینچتا
ہوا مخمور لہجے میں بولا۔

داعیر!! کیا کر رہیں آپ؟ دیکھ کے گاڑی چلائیں۔۔۔ ہم روڈ پہ
ہیں، بیڈ روم میں نہیں، جو آپ ایسی الٹی سیدھی فرمائشیں کر
رہے ہیں۔۔۔ مہر و خفگی سے بولتی اسے ہوش دلاتے ہوئے
فاصلہ قائم کرنے لگی۔

جتنا مجھ سے دور بھاگنا ہے، بھاگ لو! صرف یہ دو دن گزر
جائیں، پھر میں بھی دیکھتا ہوں کہ آپ میری جنونی قربت سے
کیسے رہائی پاتی ہیں۔۔۔ اسکے دور ہونے پہ داعیر خان نے
جبرے بھینچے اپنا ہاتھ اسٹیرنگ پہ مضبوطی سے جما لیا۔

بھاگ نہیں رہی ہوں داعیر!! ہم چلتی گاڑی میں ہیں۔ آپ کا
دھیان بھٹکنے سے خدا نخواستہ کوئی حادثہ نہ ہو جائے میں تو بس
اس لئے بول رہی تھی۔۔۔ مہرو نے معصومیت سے وجہ
بتائی۔ وہ داعیر خان کو کبھی ناراض نہیں کر سکتی تھی۔
اس کا مطلب اگر ہم گاڑی میں نہ ہوتے تو آپ مجھے کس کر
لیتی؟ رائٹ؟ ویسے اگر آپ کا ابھی دل کر رہا ہے مجھے کس
کرنے کو تو میں گاڑی سائیڈ پہ لگا لیتا ہوں۔ آپ جب چاہیں مجھے
آرام سے کس کر سکتی ہیں۔۔۔ داعیر خان کی آنکھیں شرارت
سے چمکی تھی لیکن چہرہ سنجیدہ سپاٹ تھا۔

نہیں میرا دل نہیں کر رہا۔ مجھے اپنے جذبات کو قابو کرنا اچھے
سے آتے ہیں۔ آپ ڈرائیونگ پہ دھیان دیں۔۔۔ مہرو النساء

اپنے ہاتھ سے اسکا چہرہ پکڑ کر سامنے روڈ کی سیدھ میں کرتی خفگی سے بولی۔

ہائے میری جان! کون کہہ رہا ہے جذبات قابو کرو؟ جب حق حلال کا شوہر میسر ہے تو پھر اپنے جذبات کو بہنے دو۔۔۔۔۔ داعیر خان پھر سے رخ اسکی طرف موڑتا پیار سے چھیڑنے لگا۔
داعیر آپ بہت بے شرم ہیں۔ میں آئندہ آپکے ساتھ سفر نہیں کروں گی۔۔۔ مہر و النساء سے اب اسکی باتیں برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس لئے منہ پھولائے ناراضگی کا اظہار کرنے لگی۔

اب تو بقیاء ساری زندگی کے سفر آپ کو میرے ساتھ کرنے ہیں اور اس سفر کو میں بے حد رومینٹک بنانے والا ہوں۔ پرسوں میرے پاس ذہنی و جسمانی طور پر تیار ہو کے آنا کیونکہ میرے

وجود کو اچانک آپ کیلئے برداشت کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ داعیر خان بے باکی سے بولتا آگے کو جھک کر اس کے گال کو زور سے دانتوں میں دبا کے چھوڑتا پیچھے ہوا تھا۔ آپ کیا چاہتے ہیں میں چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دوں؟۔۔۔ مہر و سرخ گالوں سے اسے سخت گھوریوں سے نوازتی دے دے غصے سے غرائی تھی۔

داعیر خان کی بے باکی اب حد سے بڑھ رہی تھی جو اس سے ہضم کرنا تھوڑا مشکل تھا۔ ہاں ٹھیک ہے مہر و النساء اوپن مائنڈڈ لڑکی تھی لیکن اتنی بولڈ بھی نہیں تھی کہ شادی سے پہلے ایسی باتیں سن کے ہضم کر سکے۔

نہ! زما دازرا ٹکورا! (نہیں میری جان کے ٹکڑے) چھلانگ والی سین کرئیٹ نہیں کرنا ورنہ میری گولڈن نائٹ کا پروگرام وڑ

جائے گا۔۔۔ وہ ہنستے ہوئے مہرو النساء کا گلابی گال پکڑ کے
پچکارتا شوخ لہجے میں بولا تھا جبکہ وہ سرخ چہرہ لئے اسکی طرف
سے نظریں ہٹاتی ونڈو سے باہر دیکھنے لگی۔ داعیر خان سے بات
کرنا مطلب مزید اسکی بے باک خیالات سے آگاہ ہونا تھا۔ اسلئے
شرم سارسی مہرو النساء نے چپ رہنے میں ہی بہتری سمجھی
تھی۔ اسکا اور داعیر کا نکاح تین ماہ پہلے ہو گیا تھا۔ اس وقت
کچھ فیملی پر اہلنزی وجہ سے مہرو کے والدین اسے رخصت نہ کر
سکے لیکن اب سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ اسلئے تو مہرو النساء
کی شادی دھوم دھام سے کر کے اسے اپنے گھر کا کر رہے تھے۔
تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں شہر کے سب سے بڑے شاپنگ
مال کے پارکنگ ایریا میں گاڑی پارک کر کے اندر مال کی جانب
بڑھے تھے۔ مہرو نے دو گھنٹے لگا کے سب سے پہلے جیولری،

جوتے، اور کچھ ضروری چیزیں لی تھیں۔ اب تینوں فنکشنز کیلئے ان دونوں کے ڈریسز لینا باقی تھے۔ ان کیلئے داعیر خان اسے مال کے ایک مخصوص حصے میں لایا تھا، تاکہ مہرو کو ڈریس چوز کرنے میں آسانی ہو۔ یہاں پہ صرف برائیدل اور گروم کو لیکشن تھی، ہر ڈیزائن اور ہر کلر کا ڈریس یہاں موجود تھا۔

وہ اس وقت مکمل پردے میں تھی، صرف اسکی کرسٹل گرے آنکھیں اپنی چمک دیکھا رہی تھی۔ داعیر خان ڈھیروں شاپنگ بیگز ہاتھ میں پکڑے اسکے ساتھ ساتھ تھا۔ مہرو نے جس چیز پہ ہاتھ رکھا تھا، داعیر نے ہر وہ چیز اس کو دلوائی تھی۔

داعیر!! یہ دیکھیں یہ کیسا ہے؟۔۔۔۔۔ مہرو ایک عروسی جوڑے پکڑ کر دیکھتی داعیر خان کو اپنی طرف متوجہ کروانے لگی جو کہیں دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کا کلر اچھا نہیں ہے۔۔۔ عروسی جوڑا ایک نظر دیکھتے ہی
داعیر خان نے انکار کر دیا۔۔

اچھا میں کچھ اور دیکھتی ہوں۔۔۔ مہرو اس جوڑے کو چھوڑ کر
آگے بڑھ گئی۔ ایک دو ڈیزائن مزید دیکھنے کے بعد اس نے
تیسرے جوڑے پہ آکر پھر سے داعیر خان کو پکارا جو مسلسل
ابھی بھی کہیں اور دیکھنے میں مصروف تھا۔۔

نہیں یہ بہت زیادہ بھاری ہے، تم کیری نہیں کر سکو گی۔ اتنا تو
تمہارا وزن نہیں ہے جتنا اس ڈریس پہ ورک ہے۔۔۔ داعیر
خان اس جوڑے کو بھی انکار کر گیا۔

آپ کی نظریں یہاں ہو تو آپ کو کوئی ڈریس پسند آئے نہ !
سارے ہی بنا دیکھے ری جیکٹ کئے جا رہے ہیں۔۔ مہرو ناک

سکوڑتے ہوئے بولی۔ اس نے داعیر خان کی غفلت بخوبی نوٹ کی تھی۔

نظریں یہی پر ہیں، بس تمہارے خوبصورت جمال کے مطابق کوئی ڈریس تلاش کر رہا تھا اور ڈریس مل گیا آجاؤ، وہ رہا۔۔۔ داعیر خان اس کو جواب دے کر اسکا ہاتھ پکڑتے ہوئے آگے کی طرف بڑھ گیا اور سامنے بلڈ ریڈ لہنگے کی طرف اشارہ کرتا مہرو النساء کو ڈیسائیڈ کرنے کا آپشن دینے لگا۔

لہنگے پہ بھاری کڑھائی کا کام کیا گیا تھا لیکن یٹلک ورک لائٹ ویٹ تھا جو مہرو آسانی سے کیری کر سکتی تھی، اس لئے تو داعیر خان نے اس لہنگے کو چوز کیا تھا۔

یہ بہت پیارا ہے داعیر لیکن اس کا بلاؤز بہت چھوٹا ہے۔۔۔
مہرو النساء کو لہنگا بہت پسند آیا تھا لیکن اس کا بلاؤز دیکھ کر وہ
معصومیت سے انگلیاں مروڑتی داعیر خان کی طرف دیکھنے لگی۔
لیکن مجھے تو یہ پسند ہے میں چاہتا ہوں، تم جب میرے نام کی
دلہن بنو تو میرے لئے یہی پہنو!۔۔۔ داعیر خان فرمائشی ہوا
تھا۔

اوکے! آپ کی پسند سر آنکھوں پر۔۔۔ مہرو النساء خان اسکی
فرمائش سنتے ہی فوراً مان گئی تھی۔
چلو جاؤ ٹرائی کر کے آؤ، پھر میں پیک کرواتا ہوں۔۔۔ اسکے مان
جانے پہ داعیر خان اسے خوشی سے دیکھتا حکمیہ لہجے میں بولا۔
آپ بھی میرے ساتھ آئیں۔۔۔ مہرو لہنگا پکڑتی داعیر خان کا
ہاتھ تھامے چینجنگ روم کی طرف بڑھنے لگی۔

ٹھہرو مہر!! پہلے مجھے اندر کی ساری لائٹس آف کرنے دو پھر ٹرائی کرنا۔۔۔ مجھے کسی پہ کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ کیا پتہ اندر کہیں کیمرو نصب ہو؟۔۔۔ داعیر خان سارے شاپنگ بیگز نیچے زمین پہ رکھتا اندر کی ساری لائٹس آف کرتے ہوئے اس کو اندر جانے کا اشارہ کرتا خود باہر اسکے نکلنے کا انتظار کرنے لگا، چونکہ یہ ایریا صرف برائیدل اینڈ گروم کی کو لیکشن کا تھا اس لئے یہاں پہ رش کم تھا۔

تقریباً دس منٹ گزر چکے تھے، مہر و لہنگا ٹرائی کر چکی تھی لیکن ابھی تک باہر نہیں آئی تھی۔ داعیر خان باہر کھڑا موبائل پہ انگلیاں چلانے میں مصروف تھا۔

داعیر۔۔۔ اندر سے مہر و نے اسے آہستگی سے پکارا۔

کیا ہوا میری جان؟۔۔۔ داعیر خان اسکی آواز سنتا موبائل
جیب میں ڈالتے ہوئے مہرو کی طرف متوجہ ہوا تھا۔
داعیر!! یہ اس کی ہک مجھ سے نہیں کھل رہی ہے۔ لگتا ہے
پھنس گئی ہے۔ مجھے کچھ سمجھ بھی نہیں آرہی، اندر اندھیرا
ہے۔ کیا میں لائٹ آن کر لوں؟۔۔۔ مہرو النساء جھنجھلاتے
ہوئے بولتی داعیر خان کو پریشانی سے آگاہ کرنے لگی۔
نہیں لائٹ آن نہیں کرنی! میں آجاؤں اندر؟ آئی مین تمہاری
ہیلپ کرنے؟۔۔۔ داعیر خان دروازے پہ ہاتھ رکھتا سوالیہ
انداز میں اندر جانے کی اجازت طلب کرنے لگا۔
نہیں آپ اندر نہیں آئیں، داعیر یہاں کوئی کمیرے نہیں لگے
ہوئے، آپ ایسے ہی وہم کر رہے ہیں! میں لائٹ آن کرنے لگی
ہوں، مجھے نہیں پتہ۔۔۔۔۔ اپنی حالت کا سوچتے ہی مہرو شرم

سے فوراً انکار کرتے ہوئے لائٹ آن کرنے کی تیاری پکڑ رہی تھی۔

نہیں لائٹ آن مت کرنا، ورنہ میں سچ میں اندر آجاؤں گا۔۔۔
داعیر خان نے سنجیدہ اور مضبوط لہجے میں دھمکی دی۔
تو پھر میں کیسے کروں؟ مجھے کچھ بھی دیکھائی نہیں دے
رہا۔۔۔۔۔ وہ روہانسی ہوئی۔ ایک بلاؤز ہک نہیں کھل رہی تھی،
ہاتھ چھپ کر کر کے وہ تھک گئی تھی اور دوسری داعیر خان کی
لائٹ آن نہ کرنے کی عجیب منطق اسے اب غصہ دلا رہی تھی۔
جان من! کہہ تو رہا ہوں کہ میں ہیلپ کر دیتا ہوں؟ ویسے بھی
مجھے کچھ نہیں دکھے گا اندر تو اندھیرا ہے نہ۔۔۔۔۔ داعیر خان
اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبائے مصنوعی معصومیت سے آنکھیں
ٹپٹپا کر بولا۔

جو کام آپ کی آنکھیں نہیں کر سکتیں، وہ آپ کے گستاخ ہاتھ
سرا انجام دیں گئے۔ آپ باہر ہی ٹھیک ہیں۔۔۔ مہرو النساء
نے اسکی بات رد کی کیونکہ وہ جانتی تھی داعیر خان جب بھی اس
کے قریب آتا تھا، وہ آپ سے باہر ہو جاتا تھا اور اسکی نازک
سی جان مشکل میں پڑ جاتی تھی۔ اسکی روہانسی آواز پہ داعیر نے
لبوں پہ مچلتی کمینی سی مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے خاموشی
اختیار کی۔ وہ کچھ بے باک بول دیتا، تو اندر جانے کا چانس کھو
دیتا۔

داعیر!! آپ یہی پہ ہیں؟۔۔۔ اسکی خاموشی پہ مہرو النساء نے
ایک ٹھنڈی سانس ہوا میں منتشر کرتے ہوئے استفسار کیا۔
جی میری جان میں یہی پہ ہوں۔ ہک کھل گئی؟۔۔۔ داعیر خان
فکر مندی سے بولا۔

نہیں کھل رہی داعیر، آپ اندر آکر کھول دیں۔۔۔۔ دو منٹ
مزید گزرنے کے بعد جب مہرو کچھ نہ کر پائی تو روہانسی آوازیں
داعیر خان کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ وہ احتیاط سے
تھوڑا سا دروازہ کھولتا مشکل سے خود کے گزرنے کی جگہ بناتا
اندر داخل ہوتے ہی دروازہ لاک کرنے لگا۔ اندر گھپ اندھیرا
تھا۔

کہاں ہو ادھر میرے پاس آؤ؟۔۔۔ داعیر خان اندھیرے میں
ہاتھ پھیلاتا مہرو کو اپنی طرف آنے کا حکم دینے لگا۔
ادھر ہی تو ہوں داعیر! اتنا بڑا بھی روم نہیں ہے کہ گم ہو جاؤ
اس میں۔۔۔ مہرو نے ہچکچا کر اس کی طرف آتے ہوئے داعیر
کا ہاتھ تھاما۔

اچھا چھپو! مجھے چیک کرنے دو کیوں نہیں کھل رہی
ہک؟۔۔۔ داعیر خان اسے کندھوں سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی
طرف موڑتے ہوئے بلاؤز کی ہک ٹٹولنے لگا۔ داعیر خان کی
انگلیوں کا لمس اپنی کمر پہ محسوس کرتے ہوئے مہرو نے زور سے
آنکھیں میچ لیں۔

داعیر! جلدی کریں۔۔۔ وہ سرخ ہوتے چہرے اور لڑکھڑاتی
زبان کے ساتھ بولی تھی۔

اندر بال پھنسا لئے ہیں، ہک کیسے کھلے پھر؟۔۔۔ داعیر خان
اسکے مخملی جسم کی خوشبو اپنے اتنے قریب سے محسوس کرتا خود
کو مشکل سے کنٹرول کئے اس کے پھنسنے بال ہک سے نکالنے
لگا۔ ہک کھلتے ہی داعیر خان اپنے ہاتھوں سے بلاؤز اس کے تن
سے جدا کرتا اسکے سر پہ لب رکھ گیا۔

کس کر لوں آپ کو؟۔۔۔۔ وہ اس کے برہنہ کندھے پکڑ کر رخ
اپنی طرف موڑتے ہوئے مخمور لہجے میں بولا۔ شرم سے پاگل
ہوتی مہرو نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے کھڑی رہی۔
البتہ اپنے برہنہ کندھوں پہ اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کر کے
اسکی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑنے لگی تھی لیکن وہ داعیر خان
کے اتنے پیار سے اجازت طلب انداز کو انکار نہیں کر سکتی
تھی۔

آپ کی خاموشی بتا رہی ہے کہ میری محبت کے رنگ آپ کے
چہرے کو رنگین کر رہے ہیں؟ کیا یہ سچ ہے؟۔۔۔۔ داعیر خان
اس کی کنپٹی پہ لب رکھتا سرشاری سے بولا۔ لہجہ معصوم بنایا
ہوا تھا۔

کر لیں! لیکن پہلے مجھے آپ کہنا بند کریں اور دوسرا کس کی ٹائمنگ
بس ایک منٹ کی ہو۔۔۔ مہرو خان بعمہ شرط شرماتے ہوئے
کس کرنے کی اجازت دے گئی۔ اس کو اچھا لگا اس کا یوں
اجازت سے کس کرنا۔

اوکے۔۔۔ داعیر خان مسکراہٹ دبا کر جواب دیتا اندھیرے
میں ہی ہاتھ چلاتے ہوئے اس کو جبرے سے پکڑے شدت سے
اس کے گلابی لبوں کو اپنے عنابی لبوں کی گرفت میں لیتا ان کی
نمی سک کرنے لگا۔ مہرو النساء بھی شرم سے آنکھیں موندے
اسکی بیڑپہ ہاتھ جماتی اس کا ساتھ دینے کی تھوڑی سی کوشش
کرنے لگی۔ وہ بے حد پیار سے اس کے نچلے لب کو چوم رہی
تھی۔ اس کی اتنی سی جسارت پہ داعیر خان کے جذبات میں
طغیانی مچ گئی۔ وہ اس کا پورا جبرے وا کئے جنونی انداز میں

اسے ڈیپ کس کرنے لگا جبکہ مہرو اسے بے قابو ہوتا دیکھ کے
اس کی گرفت سے اپنے لب چھڑوانے کی کوشش کرتی اسکے
سینے پہ ہاتھ جمائے چھپھٹنے کی تگ و دو کر رہی تھی لیکن داعیر
خان اسکی کسی بھی مزاحمت کو خاطر خواہ لائے بغیر اس کی زبان
کو اپنے دانتوں کی گرفت میں لیتا سک کرنے لگا۔ مہرو النساء کی
اب بس ہو گئی تھی، وہ مسلسل چھپھٹنے کی کوشش کر رہی
تھی۔ شرم سے اس کے چہرے کے ساتھ ساتھ جسم بھی
بھانپ چھوڑ رہا تھا۔ داعیر خان جنونی ہوتا اسکی برہنہ کمر میں اپنی
انگلیاں پیوست کرتے ہوئے اوپر کی طرف اٹھاتا اسکی دونوں
ٹانگیں اپنی پشت پہ ریپ کئے اس کو دیوار کے ساتھ لگائے
شدت سے کس کرنے لگا۔ وہ مسلسل مہرو کے نازک لبوں
سے لپٹا اسے سانس لینے کا موقع بھی نہیں دے رہا تھا۔ مہرو

النساء نے اس کی گردن کے گرد بازو حمائل کر رکھے
تھے۔ اسکی سانسیں اب گھٹ رہی تھی۔ داعیر خان بے چینی
سے اسے ایک بازو میں ہولڈ کرتا دوسرے ہاتھ سے اسکی
دھڑکنوں کو سہلاتے ہوئے اپنی مٹھی میں دبائے لگا۔ اس کی
اتنی جان لیوا جسارت پہ مہر و اسکی گود میں اوپر کی طرف
اچھلی۔۔ وہ زور سے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے
ہوئے ہوش دلانے لگی۔ کافی دیر بعد داعیر خان اس کی مدہم
ہوتی سانسیں محسوس کرتا اسکے نچلے لب کو چومتے ہوئے مہر و
النساء کی نازک پنکھڑیوں کو آزادی بخش گیا۔۔ لب آزاد ہوتے
ہی اس نے پھولی سانسوں کے درمیان ایک زوردار مکا غصے
سے اسکے سینے پہ جھڑ دیا جبکہ داعیر خان تیز تیز سانسیں لیتا اس کی
گردن کو چومنے لگا۔ پھولتی سانسوں کی وجہ سے مہر و کا نازک

سراپہ اسے صاف اپنے سینے سے مس ہوتا محسوس ہو رہا تھا،
اسکی تیز دھڑکنوں کا شور اپنے سینے پہ بجتا داعیر خان کو مزید بے
خود کر رہا تھا۔ وہ تھوڑا سا دیوار سے ہٹتا ایک ہاتھ اسکی گردن پہ
رکھ کر اس کا سر پیچھے کی طرف جھکانے لگا، وہ اسے تھوڑا سا پیچھے
دکھیل کر اوپر کی طرف مزید اٹھاتے ہوئے اسکی دھڑکنوں پہ
جھک گیا۔ پردے کے اوپر سے ہی وہ انہیں اپنے لبوں اور
دانتوں سے چھونے لگا۔

دا۔۔۔۔۔ داعیر۔۔۔۔۔ مہرونے اسکے پاگل لمس پہ سسکتے ہوئے
پکارا۔ ابھی تو اس نے سانسیں ہموار ہی نہیں کی تھی اور داعیر
خان پھر سے اس کی جان حلق میں اٹکا گیا تھا۔ وہ اسکے کندھوں
میں ناخن پیوست کرتی اس روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ شرم

وحیاء وہ بھول گئی تھی، ابھی صرف اسے اپنی جان کی پڑی تھی
جو داعیر خان آج اپنے لمس کی تپش سے لینے کے درپے تھا۔
وہ اس کی ساری مزاحمتیں ردی کرتا اسکی دھڑکنوں کو بے دردی
سے اپنے ہاتھ میں بھرتے ہوئے ہونٹوں سے چھونے لگا۔ وہ
اسکی دھڑکنوں سے ہوتا پھر سے اسکے چہرہ اپنے قریب کئے مہرو
النساء کو سنہلنے کا موقع دئے بغیر پھر سے اسکے لبوں سے لپٹ
گیا۔ مہرو نے اب ساری مزاحمتیں ترک کی تھی کیونکہ وہ ہاتھ
پاؤں چلا کر تھک چکی تھی۔ اس بے ایمان شخص نے صرف
ایک منٹ کی کس کی اجازت مانگی تھی۔ وہ کلس کر سوچنے لگی۔
اسے پرسکون ہوتا دیکھ کر داعیر خان نے مزید کچھ دیر نرمی سے
مہرو کے لبوں کو چومنے کے بعد انہیں آزادی دیتے ہوئے اسکے
ماتھے پہ لب رکھ کے اسکو خود کے ساتھ لپیٹ لیا۔ وہ نرمی

سے اسکی برہنہ پشت سہلاتے ہوئے اسے نارمل کرنے لگا جبکہ
مہر و تھکے ہوئے انداز میں بنا کچھ بولے اس کی گردن میں منہ
گھسیڑے سانسیں بحال کرنے لگی۔

تم ٹھیک ہو؟۔۔۔ داعیر خان اسکے بالوں میں ہاتھ پھیرتا وقفے
وقفے سے اس کا چہرہ اپنی گردن سے نکال کے چومتا استفسار
کرنے لگا۔

آپ بہت برے ہیں! میں اب کبھی بھی آپ پہ بھروسہ نہیں
کروں گئی۔۔۔ مہر و نے زور سے اسکی گردن پہ دانت گاڑتے
ہوئے شکوہ کیا۔

ہاہاہا!! میری جان یہ تو ابھی میرے رومینس کا پروموتھا، جب
پکچر پوری دیکھو گی تو مجھے لگتا ہے تم میری جان لے لوں گی، کیونکہ
میرا رومینس اور پیار کرنے کا انداز بلاک بسٹر ہوگا۔ اسلئے تو

تمہیں کہہ رہا ہوں تیار ہو کے آنا۔۔۔ داعیر خان قہقہہ لگا کے
ہنستا ہوا اس کے لبوں کو پیار سے چوم گیا۔

نیچے اتاریں مجھے شرٹ پہننی ہے۔۔۔ چونکہ اندر اندھیرا تھا
اس لئے وہ بلا جھجھک اس کی گود سے اترنے کی کوشش کرنے
لگی اگر روشنی ہوتی تو مہر و کبھی بھی اس کے سینے سے چہرہ ہی نہ
باہر نکالتی، بلکہ شرم سے وہی وفات پا جاتی۔۔۔

ٹھہرو میں پہنا دیتا ہوں۔۔۔ داعیر خان اندھیرے میں ہاتھ
چلاتے ہوئے اسکی قمیض ڈھونڈنے لگا۔ قمیض ہاتھ لگتے ہی وہ
اسے نیچے کھڑا کر گیا۔ وہ ابھی تک ہلکا سا کانپ رہی تھی۔
داعیر خان اسے شرٹ پہناتے ہوئے اس کے دل کے مقام پہ آ
کر رکا اور وہاں اپنا دائیاں ہاتھ رکھ گیا۔

مجھے تمہارا دل بہت اچھا لگتا ہے نورِ چشم!! اور اس وقت تو
اور بھی جان لیوا احساس ہو جاتا ہے جب یہ میرے ہاتھ کے
نیچے زوروں سے دھڑکتا ہے۔۔۔ داعیر خان گھمبیر آواز میں
بولتا نیچے جھک کر اسکے دل کے مقام کو شدت سے چومتا اسکی
قمیض نیچے کرنے لگا جبکہ مہر و آج اسکی باتوں اور حرکتوں سے
آدھی مر چکی تھی۔

وہ بنا کوئی جواب دئے دھڑکتے دل سے خاموش کھڑی رہی۔
داعیر خان اب اسکے بال شِٹ سے باہر نکال کر چھپے پشت پہ
ڈالتا اسکی حالت درست کرنے لگا۔ اسے مکمل باپردہ کر کے
اپنے بے ترتیب بالوں میں ہاتھ پھیر کے درست کرتا روم کا لاک
کھولنے لگا۔ یہ لہنگا ٹرائی کرنا تو مہر و النساء خان ساری زندگی
نہیں بھولے گئی۔

آئندہ ہک توڑ دوں گی لیکن آپ سے مدد نہیں لوں گئی۔۔۔ باہر
نکلے ہی مہرو اس سے فاصلہ پہ ہوتی خفگی سے بولی، جبکہ داعیر
خان سارے شاپنگ بیگز اور لہنگا پکڑتا ایک فتح مندی کی
مسکراہٹ کے ساتھ کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا کیونکہ لہنگا بالکل مہرو
کو فٹ آیا تھا۔

کچھ کھانا ہے؟ میرے خیال سے پہلے کچھ کھا لیتے ہیں باقی کی
شاپنگ بعد میں کر لیں گئے۔۔۔ داعیر خان واپس اسکے پاس آتا
مفاہمتی انداز میں بولا۔۔

نہیں مجھے بھوک نہیں ہے، جلدی شاپنگ ختم کر کے گھر جانا
ہے۔۔۔۔ مہرو خان رخ موڑے نروٹھے پن سے بولی تھی۔
یوں نہ کرو نور چشم!! کھانے سے انکار کروں گی تو پھر میں آپ کو
اپنے طریقے سے کھلاؤں گا۔ اور میرا طریقہ کتنا میٹھا ہوتا ہے۔

اسکا زائقہ آپ بہت اچھے سے چکھ چکی ہیں۔۔۔ داعیر خان
شوخی ہو کر بولتا اسے اپنے ساتھ لئے نیچے کی طرف بڑھ گیا تاکہ
کچھ کھا لیں اور مہر کا غصہ بھی تھوڑا کم ہو سکے۔۔

رات کے تقریباً سات بج رہے تھے۔ جب وہ دونوں ساری
شاپنگ کمپلیٹ کر کے گاڑی میں سوار ہوتے گھر کی طرف بڑھے
تھے۔

ناراض ہو؟۔۔۔۔۔ اسے مال میں اور اب گاڑی میں بھی مکمل
خاموشی سا دھے دیکھ کر داعیر خان فکر مندی سے بولا۔
نہیں میں نے کیوں ناراض ہونا ہے؟ میں بس تھک گئی ہوں
بہت زیادہ۔۔۔۔۔ مہر و خان نے اس کے چہرے پہ فکر مندی
دیکھ کے نرمی سے جواب دیا۔

آئی ایم سوری!! میں تھوڑا ہارش ہو گیا تھا۔ تم ہو ہی اتنی
خوبصورت! تمہیں چھوتے ہی میں اپنا آپ کھو دیتا ہوں لیکن
آئندہ احتیاط کروں گا۔۔۔ داعیر خان معصومیت سے گویا
ہوا۔

داعیر!! سوری کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے کچھ بھی نہیں ہوا،
میں بالکل ٹھیک ہوں بس چل چل کے پاؤں میں درد ہو رہا اور
جسم میں تھکاوٹ دیٹس اٹ!! اور کچھ بھی نہیں ہے، اچکے
چھونے یا مجھ پہ حق جتانے پر میں بالکل بھی ناراض نہیں
ہوں۔ آپ میرے محرم ہیں۔ مجھ پہ سارے اختیارات رکھتے
ہیں تو پھر محرم سے ناراضگی کیسی؟۔۔۔ مہرو خان نے
سمجھداری سے جواب دیتے ہوئے پیاری سی مسکراہٹ داعیر
خان کی طرف اچھالی۔

میں دبا دیتا ہوں تمہارے پیر، ادھر کرو۔۔۔ داعیر خان اس کے
چہرے پہ تھکاوٹ دیکھ کے محبت سے لبریز لہجے میں بولا تھا۔
نہیں داعیر!! میں گھر جا کے ریسٹ کروں گی تو بالکل ٹھیک ہو
جاؤ گی، آپ فکر نہ کریں۔ مہرو خان اس کا مضبوط ہاتھ اپنے
پیروں کی طرف بڑھتا دیکھ کے اپنے نازک ہاتھوں میں تھام
گئی۔

داعیر کی زندگی! آئی لویو سو مچ۔۔۔ وہ اسکے دونوں ہاتھوں کو پکڑ
کر باری باری چومتا اپنی محبت کا اظہار کرنے لگا۔

لویو ٹو۔۔۔ مہرو خان بھی اسی کے انداز میں جواب دیتی اسکے
کندھے پہ سر ٹکا گئی۔ داعیر خان مسکراتے ہوئے اس کے ماتھے
پہ لب رکھتا روح سے پرسکون ہوتا ناک کی سیدھ میں دیکھتے
ہوئے احتیاط سے ڈرائیونگ کرنے لگا۔۔۔ داعیر خان کی

محبت رخصتی سے پہلے اتنی تھی تو پھر رخصتی کے بعد تو اس کی
محبت نازک سی مہرو النساء سے سنبھالی بھی نہیں جانی تھی۔

مہرو النساء خان کو گھر چھوڑنے کے بعد داعیر خان حویلی واپس
آیا تھا۔ پوری حویلی روشنیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مقیموں کی
چمک دمک پوری حویلی کو چار چاند لگا رہی تھی۔ آج قوالی ناٹ
تھی تو اس حساب سے لان کی ڈیکوریشن کئی گئی تھی۔ مہمانوں
کی آمد جاری تھی۔ مردوں اور عورتوں کا انتظام علیحدہ تھا۔ عام
بزدار اور انزش بزدار بھی ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔

کہاں رہ گئے تھے بیٹا!! ہو گئی ساری شاپنگ کمپلیٹ؟۔۔۔۔۔
لاؤنج میں داخل ہوتے ہی انیسہ خان بیٹے سے مخاطب ہوئیں جو
تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا تاکہ جلدی تیار ہو کر

نیچے لان میں جا سکے کیونکہ اس کے سارے دوست اس کے
انتظار میں بیٹھے تھے۔۔

جی مورے سب ہو گیا ہے۔ ساری شاپنگ کمپلیٹ کر لی
تھی۔ لالہ نہیں پہنچے؟۔۔۔ داعیر خان ریلنگ پہ ہاتھ جھماتا
سنجیدگی سے استفسار کرنے لگا۔

نہیں بیٹا ابھی تک تو نہیں پہنچا! کال بھی نہیں اٹھا رہا۔۔ آج
اس کی ایک امپورٹنٹ میٹنگ تھی، شاید صبح تک آ
جائے؟۔۔۔ انیسہ خان افسردگی سے گویا ہوئیں۔

آپ مجھ سے لکھوا کے رکھ لیں وہ میری شادی پہ نہیں آئیں
گئے۔ ان کو رشتوں سے زیادہ اپنا بزنس پیارا ہے۔۔۔ داعیر
خان خفگی سے شکوہ کرتا تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے کی
جانب بڑھ گیا۔ شادی کے اس خاص موقع پہ اپنے لالا کی غیر

موجودگی اس کے دل کو کچوکے لگا رہی تھی جبکہ انیسہ خان کی
طبعیت بھی یکدم افسردہ ہوئی تھی۔

السلام علیکم خالہ جان۔۔۔ انزش بزدار چہکتی ہوئی پر جوشی
سے انیسہ خان کو پکار کر انکی طرف بڑھی۔ وہ دونوں باپ بیٹی
ابھی آئے تھے۔ عامر بزدار باہر لان میں ہی اسد اللہ خان کے
پاس رک گئے تھے جبکہ انزش اپنی خالہ کو وہاں نہ پا کر سیدھی
اندر چلی آئی تھی۔

وعلیکم السلام میری پیاری گڑیا! اتنی لیٹ کیوں آئی ہو؟ پتہ بھی
ہے کہ خالہ کی کوئی بیٹی نہیں ہے ہاتھ بٹانے کیلئے۔۔۔ پہلے آ کے
چیزوں کو ڈیسائیڈ کرنے میں میری مدد ہی کر دیتی۔۔۔ انیسہ
خان پیار سے انزش کو اپنے سینے میں بھینچتی اس کے لیٹ آنے
پر شکوہ کرنے لگیں۔

خالہ جان!! میں تو آرہی تھی لیکن بابا میرے بغیر ایک منٹ
نہیں رہ سکتے۔ انھوں نے کہا کہ مل کے جائیں گئے۔۔ اچھا
چھوڑیں سارے شکوے مجھے بتائیں دمیر کہاں ہے؟ اپنے
کمرے میں ہے؟ میں اس سے مل کر آتی ہوں۔ بہت عرصے بعد
اس کو دیکھنا ہے۔ پتہ نہیں کتنا بدل گیا ہوگا؟ تصاویر دیکھنے سے
کیا پتہ چلتا ہے کہ کون کتنا بدلا ہے؟ اصل میں آنکھوں کے سامنے
دیکھنے سے پتہ چلتا کہ انسان کی شخصیت میں کتنا بدلاؤ آیا
ہے۔۔۔۔۔ انرش خوشی سے بولتی انیسہ خان کے حصار سے
نکل کر دمیر خان کے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔
رک جاؤ بیٹا!! وہ نہیں آیا ہے۔۔ انیسہ خان نے اس کا ہاتھ
پکڑ کر اداسی سے روک دیا۔

واٹ؟ کیا کہا آپ نے خالہ جان؟۔۔۔ انزس بزدار نے چھپڑ
کر دیکھتے ہوئے حیرانگی سے دوبارہ انیسہ خان سے جاننا چاہا۔
ہاں وہ نہیں آیا، شاید صبح تک آجائے۔۔۔ انیسہ خان
زبردستی چہرے پہ مسکراہٹ سجا کے بولتی انزس کو لیکر باہر لان
کی طرف بڑھی تھی۔

کیا مطلب خالہ وہ صبح آئے گا؟ اس کو اپنی چھوٹے بھائی کی
خوشی سے زیادہ عزیز ہے بزنس؟۔۔۔ انزس ساتھ چلتے
ہوئے بے یقینی سے بولی۔ وہ تو اتنی چاہ سے تیار ہو کے آئی
تھی کہ آج اس نے دمیر خان سے ملنا ہے۔ پورا راستہ دمیر خان
کے بارے میں سوچ سوچ کے اس کے چہرے سے مسکراہٹ
جدا نہیں ہو رہی تھی لیکن یہاں آکر پتہ چلنے پر اسکی ساری خوشی
ہوا ہوئی تھی۔۔۔

خالہ دمیر ایسا تو نہیں تھا کہ وہ اپنے رشتوں کو ہی بھول جائے؟
رشتے اسکی سکینڈ پرائیٹی تو کبھی نہیں تھے۔ وہ تو بہت لونگ
اینڈ کئیرنگ انسان تھا۔ پھر وہاں جا کے اسکی شخصیت میں اتنے
بدلاؤ کیسے آسکتے ہیں؟۔۔۔۔۔ انرش بزدار دکھی انداز میں بولتی
باہر لان کی تازہ ہوا سانس کے ذریعے اندر اتارنے لگی کیونکہ دمیر
خان کی غیر موجودگی اسے تکلیف دے رہی تھی۔

"جن کے چہرے دیکھنے کو آنکھیں منتظر ہو، وہ نہ دکھیں تو سارے
وجود کی شوخی غارت ہو جاتی ہے۔" بلکل ایسے ہی انرش بزدار
کی ساری تیاری ساری روح کی خوشی بجھ گئی تھی۔

وہ اس وقت خوبصورت سی ایمبرائیڈڈ بلیک نیٹ کی ساڑھی
میں ملبوس تھی، جس پر ستارے اور موتی کا کام باہر کی لائٹس اور
مقنموں کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ بالوں کا بن بنا کے ان پر سرخ

گلاب کے پھولوں کا گجرا لگایا ہوا تھا۔ سفید شفاف کلاٹیاں
گجرے اور چوڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ پیروں میں سیاہ ہی
میچنگ ہیل کے ساتھ وہ پوری تقریب میں موجود خواتین سے
الگ تھلگ، پروقار اور پرکشش لگ رہی تھی۔

انزس بزدار نے جب سے لان میں پیر رکھا تھا۔ تمام خواتین اور
لڑکیوں نے ایک بار مڑ کے اس کے حسن کو ضرور داد دی تھی
جبکہ اس کے ساتھ کھڑی انیسہ خان بھی بلیک ساڑھی میں کچھ
کم نہیں لگ رہی تھی چونکہ قوالی نائٹ کا تھیم بلیک رکھا گیا تھا
اس لئے سب کے ملبوسات بلیک کلر میں ہی تھے۔

نہیں بیٹا! وہ ابھی بھی بہت لونگ اینڈ کئیرنگ ہے، بس وہ کام
میں پھنسا ہوا ہوگا اس لئے ابھی تک نہیں پہنچ سکا لیکن صبح تک
وہ ضرور پہنچ جائے گا۔ تم اداس نہیں ہو۔۔۔۔۔ انیسہ خان

اپنی بھانجی کے دل کے حالات جانتی تھیں۔۔۔ وہ اس کا پھیکا
پڑتا چہرہ بخوبی نوٹ کر گئی تھی۔

دمیر اپنے چھوٹے بھائی کی خوشیوں میں ضرور شرکت کرے
گا۔۔۔ انیسہ خان پیار سے اسے سمجھاتی اسد اللہ خان کی طرف
گئی تھیں تاکہ ان کی کلاس لے سکیں اور ان سے پوچھیں کہ دمیر
خان ابھی تک کیوں نہیں پہنچا؟

دمیر سے بات ہوئی آپ کی؟۔۔۔ انیسہ خان ان کے پاس پہنچ
کر قریب بیٹھتے ہوئے آہستگی سے استفسار کرنے لگیں۔
چہرے کے تاثرات سخت سپاٹ تھے۔

ابھی تو اس کا نمبر بند جا رہا ہے لیکن شام میں میری بات ہوئی
تھی، وہ بول رہا تھا آج رات تک وہ پہنچ جائے گا۔۔۔ اسد اللہ
خان نے بھی انہی کے انداز میں آہستگی سے جواب دیا کیونکہ ان

کے قریب کچھ ضروری مہمان بیٹھے تھے۔ سب مہمان آچکے تھے۔ ساری تیاریاں مکمل تھی۔ قوالی خواں اور ویڈیو میکرز بھی آچکے تھے۔ ویڈیو صرف مردوں والی سائیڈ ریکارڈ ہونی تھی۔

میں آپ کو بتا رہی ہوں اگر وہ صبح تک نہیں آیا تو اس کو بول دیجئے گا کہ اب پاکستان آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہی رہے اور اپنا بزنس سنبھالے، ہم تو اسکی زندگی میں صرف فالتو سامان کے جیسے ہیں، جس کو ضرورت پڑنے پر استعمال کر لیا جائے اور ضرورت ختم ہونے پر پھر سے کسی کو نے میں واپس پھینک دیا جائے۔۔۔ ایسہ خان دبے دبے غصے میں پھنکاری تھی۔ ہر طرف خوشیوں کا سماں تھا اور ان خوشیوں میں ان کا بڑا اور لاڈلا بیٹا ہی موجود نہیں تھا۔ یہ سوچ کر ہی انہیں تکلیف ہو رہی

تھی۔ دمیر خان کی غیر موجودگی انیسہ خان کے چہرے کی
مسکراہٹ پھیل چکی کر رہی تھی جبکہ انزس بزدار بھی خاموشی سے
ایک صوفے پہ بیٹھی غیر ضروری سوچوں میں گم تھی۔۔

داعیر خان روف شاور آن کئے کچھلے پندرہ منٹوں سے سامنے کی
دیوار پہ دونوں ہاتھ جمائے سر نیچے جھکا کے آنکھیں موندے کھڑا
دل و دماغ میں مسلسل دمیر خان کو یاد کر رہا تھا۔
لالہ پتہ نہیں آئیں گے بھی یا نہیں؟۔۔۔ ایک ہی سوال اس کے
ذہن کو جکڑے ہوئے تھا۔ ٹھنڈا پانی اسکے چٹائی وجود سے
ہوتے ہوئے نیچے فرش پر گر رہا تھا۔ بالآخر کافی دیر بعد وقت کا
احساس کرتے ہوئے وہ روف شاور بند کئے خود کے گرد ٹاول
لپیٹتا واشروم سے باہر نکلا تھا۔ طبعیت اداس تھی۔ انداز تھکا

ہوا۔ وہ ڈریسنگ روم میں جانے کی بجائے بیڈ کی طرف بڑھا اور
بیڈ سے اپنا فون اٹھا کر ایک دفعہ پھر سے دمیر خان کو کال ملا دی
لیکن نمبر ہنوز بند تھا۔

میں آپ سے کبھی بات نہیں کروں گا لالا۔۔۔ داعیر خان
غصے میں زور سے اپنا فون بیڈ پہ پٹکتا ڈریسنگ روم میں بند ہو گیا۔
دو منٹ میں ہی وہ سیاہ شلوار قمیض زیب تن کئے باہر آیا اور بیڈ
پہ پڑی اپنی سیاہ ویسکوٹ اٹھا کے پہنتے ہوئے سنگھار میز کے
سامنے آکر برش اور ہئیر جیل اٹھا کے اپنے بھورے بال
سنوارنے لگے۔

بال سیٹ کرنے کے بعد اس نے خود کو خوشبو سے تر کیا اور
پھر ڈراکھول کے ڈھیروں برانڈڈ واچز میں سے ایک واچ اٹھا کے
اپنی چوڑی کلائی کی زینت بنا گیا۔ سرخ و سفید رنگت سیاہ لباس

میں مزید نکھر گئی تھی۔ مررورک کے ساتھ زیب تن کی گئی
ویسکوٹ اسکے لباس اور لک کو مزید ڈیشنگ اور سٹیننگ بنا رہی
تھی۔ داعیر خان آئینے کے سامنے سے ہٹا صوفے کی طرف آیا
اور اس پہ بیٹھتے ہوئے وہ اپنے دودھیا سفید پیر چھماتے جوتے
میں قید کرتا پھر سے بیڈ پہ پڑا اپنا فون اٹھا کر باہر کی طرف بڑھ گیا۔
پوری حویلی جلتی بجھتی لائٹس اور قوالی کی دھن سے گونج رہی
تھی۔ وہ بالوں میں آہستگی سے انگلیاں پھیرتے ہوئے تیزی سے
سیرھیاں اتر رہا تھا۔ اسکا رخ باہر لان کی طرف تھا۔ داعیر خان
جہاں جہاں سے گزر رہا تھا، وہ جگہ اسکی خوشبو سے مہکتی جا
رہی تھی۔ اسکے لان میں قدم رکھنے کی دیر تھی کہ سب کی نگاہیں
اس کے چہرے پر سے ہٹنے سے انکاری ہو گئیں۔

ماشاء اللہ۔۔۔۔۔ انیسہ خان اپنے بیٹے کو دیکھتے ہی اسے اپنی
طرف آنے کا اشارہ کرتی اونچی آواز میں بولیں۔ داعیر خان
چہرے پر رسمی مسکراہٹ سجائے خاندان کی سب خواتین سے
ملنے کے بعد اپنی ماں کی طرف قدم بڑھانے لگا۔

بہت پیارا لگ رہا ہے میرا بیٹا!! اللہ تعالیٰ تمہیں بری نظروں
سے محفوظ رکھے۔ تمہیں خوشیاں مبارک کرے آمین۔۔۔۔۔
انیسہ خان محبت سے اس کے ماتھے پہ لب رکھتی اسے ڈھیروں
دعاؤں سے نوازنے لگیں۔

لالا کے بغیر میری خوشیاں ادھوری ہیں مورے۔۔۔۔۔ داعیر خان
ماں کا ہاتھ پکڑ کر اداسی سے بولا۔

لالہ آجائیں گے۔۔۔ تم جاؤ تمہارے دوست ویٹ کر رہے ہوں
گے۔۔۔۔۔ انیسہ خان مسکرا کر پر اعتماد لہجے میں بولی تھیں۔ وہ

داعیر خان کو کبھی بھی اداس نہیں دیکھ سکتی تھی، اس لئے اس مسکرا کے اسکے دوستوں کی طرف بھیج دیا تاکہ اسکی طبیعت بہتر ہو سکے جبکہ اسد اللہ خان دونوں ماں بیٹے کی طرف دیکھ کے ایک پیاری سی مسکراہٹ اچھال گئے۔

اوئے ہوئے!! دلہا میاں آئے ہیں۔۔۔۔۔ داعیر خان جو نہی
مردوں والی سائیڈ پہ آیا، اس کے سارے دوست ایک دم اسکی
طرف بڑھتے اسے چاروں طرف سے گھیر کے اپنے حصار میں قید
کرنے لگے۔

تم لوگوں میں سے کوئی بھی بے غیرتی نہیں کرے گا ورنہ میں
بہت بری طرح سے پیش آؤں گا۔۔۔ داعیر خان نے ان کی
آنکھوں میں چمکتی شرارت دیکھ کر پہلے ہی انگلی اٹھا کے تنبیہ
کی۔

تیرے سے برا ہے ہی کوئی نہیں لیکن ہم آج تیرے ساتھ وہ
کریں گئے کہ تو پرسوں کہیں پیش ہونے کے قابل نہیں رہے
گا۔۔۔ داعیر خان کا دوست فہد زو معنی انداز میں بولتا داعیر
خان کو ٹانگوں سے پکڑ کر اوپر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا لیکن
اس سے پہلے ہی داعیر خان جھلانگ لگاتے ہوئے چھپے ہو گیا۔
اس کے یوں ایک دم سے چھپے ہوئے پر اس کے سب دوستوں کا قہقہہ
بے ساختہ تھا۔

تم کمینوں کو اٹھا کے باہر کو پھینک دوں گا اگر میرے ساتھ کچھ
بھی الٹا سیدھا کیا تو۔۔۔ اس دفعہ داعیر خان نے انہیں سختی
سے وارن کیا۔ اس کا موڈ پہلے ہی دمیر کے نہ آنے کی وجہ سے
آف تھا۔

اچھا رو نہیں، آج تیرے ساتھ کچھ بھی نہیں کرتے، کل کریں
گئے، آجا قوالی انجوائے کرتے ہیں۔۔۔ فہد اس کی بچا رگی سی
شکل دیکھتا اپنے سارے ارادے کینسل کرتا داعیر خان کا بازو
پکڑے آگے سٹیج کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں قوالی خواں اپنی
خوبصورت آواز اور دھن کے ساتھ سننے والے کانوں پہ سحر
طاری کر رہا تھا۔

رفتہ رفتہ وہ میرے ہستی کا ساماں ہو گئے (2)

پہلے جان پھر جانِ جاں
پھر جانِ جاناں ہو گئے

رفتہ رفتہ وہ میرے ہستی کا ساماں ہو گئے

داعیر خان کے دوست آہستہ سے ہاتھ اوپر اٹھائے قوالی کی
دھن پہ جھومنے لگے جبکہ فہد جان بوجھ کے داعیر خان کے چہرہ

پہ اپنی انگلیوں کو بجاتا اسے جانِ جاناں کہتے ہوئے پھر سے
چھیڑنے لگا۔

ہٹ پرے!! اپنے لئے کوئی زنانہ جانِ جاناں ڈھونڈ تر سے
ہوئے سنگل آدمی۔۔۔ داعیر خان فوراً اسکی انگلیاں اپنے
چہرے سے جھٹکتا دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔
ہا ہا ہا!! کیا کروں یا ر زنانہ ٹائپ جانِ جاناں بہت مہنگی پڑتی ہے۔
جب توں مجھے فری کا میسر ہے تو کیوں نہ تجھ سے ہی فائدہ اٹھایا
جائے؟۔۔۔ فہد قمقے لگا کر ہنستا آواز کو جان بوجھ کر گھمبیر
بناتے ہوئے اسے مزید تنگ کرنے لگا۔

سوری لیکن میں تو بہت خطرناک ہوں! تجھے تیری حساس جگہوں
سمیت مروڑ کے رکھ دوں گا، میرے ساتھ پنکا تجھے زنانہ پنکے سے
زیادہ مہنگا پڑ جائے گا۔ نہ رہے گا بانس نہ بچے گئی بانسری۔۔۔

داعیر خان اسے اوپر سے لے کر نیچے تک دیکھتا بے باکی کی ہر حد پار کرتا زو معنی انداز میں بولا۔ اسکی بات کا مطلب سمجھ کر فہد کا چہرہ شرم اور غصے سے سرخ ہوا۔ وہ اس کے بے شرم ارادے جان کر فوراً اس سے فاصلہ قائم کر گیا تھا۔ اب کی دفعہ ہنسنے کی باری داعیر کی تھی۔

داعیر خان آفریدی ہوں، اپنے نام کا ایک!! آئندہ ایسی دو روپے کی حرکتیں میرے ساتھ نہ کرنا ورنہ۔۔۔۔۔ وہ کمینگی سے مسکراتے ہوئے فہد کا شرم سے سرخ انگارہ چہرے دیکھ کے جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے وارن کرنے لگا۔

ہاں تو اپنے نام کا ایک ہی بے غیرت ہے! مجھے پتہ ہے۔۔۔۔۔ فہد کلس کے بولتا قوالی کی طرف متوجہ ہو گیا کیونکہ داعیر خان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اسے مہنگی پڑ رہی تھی۔

جب پتہ ہے!! تو کیوں اپنی جان مشکل میں ڈالتا ہے؟۔۔۔
داعیر خان اس کے قریب ہوتا فہد کے کندھے پہ ہاتھ رکھتا ہلکے
بھلکے انداز میں اتر کر گویا ہوا۔ اسے اپنے دوست بہت عزیز
تھے، بلکہ اپنے سے جڑا ہر رشتہ عزیز تھا۔

دن بادن بڑھتی گئیں

اس حسن کی رعنائیاں

پہلے گل پھر گل بدن

پھر گلِ بد اماں ہو گئے

رفتہ رفتہ وہ میرے ہستی کا سا ماں ہو گئے۔۔۔

داعیر خان کی آنکھوں کے پردوں میں بے ساختہ اپنی کرسٹل
گرے آنکھوں والی نورِ چشم کی معصوم صورت لہرائی تھی۔۔۔

لبوں پہ ایک دلکش مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ مہر کو سوچتے ہوئے
لیر کس بے حد آہستگی سے دہرانے لگا۔

پہلے جان پھر جانِ جاں
پھر جانِ جاناں ہو گئے

رفتہ رفتہ وہ میرے ہستی کا سماں ہو گئے۔

سب لڑکے اور اسد اللہ خان کے ساتھ عامر بزدار نے بھی
ڈھیروں ہزرواں کے نوٹ فضا میں اچھالے تھے۔ کچھ فاصلے پہ
داعیر خان کے دوست فائرنگ کرنے میں مصروف تھے۔۔
قوالی کا پورا سماں بندھا ہوا تھا اور یہاں پہ موجود ہر شخص اس
میٹھی سی دھن کو انجوائے کر رہا تھا۔۔

آپ تو نزدیک سے
نزدیک تر آتے گئے (2)

پہلے دل پھر دل ربا
پھر دل کے مہماں ہو گئے (2)
رفتہ رفتہ وہ میرے ہستی کا ساماں ہو گئے

پہلے جان پھر جان جاں
پھر جانِ جاناں ہو گئے۔۔

لیر کس ختم ہوتے ہی سب حاضرین نے کھلے دل سے تالیاں
بجاتے ہوئے دادپیش کی تھی۔۔ عورتوں والی سائیڈ بھی آواز
کلئیر جا رہی تھی۔ انھوں نے بھی پوری توجہ سے ہر دھن سنی
تھی۔

داعیر!! اگلی قوالی "میرا پیا گھر آیا"۔۔۔ داعیر خان کے ایک
دوست نے بلند آواز میں فرمائش کی۔

(میراپیا تو پر سو گھر آئے گا!! ہائے یہ فاصلے، یہ دوریاں کب ختم
ہوگی واللہ۔۔۔ داعیر خان اپنی مہر کو عکس دماغ میں لاتے
ہوئے دل میں خود سے مخاطب ہوا)

جن کے پاس کوئی پیا نہ ہو، وہ ایسی قوالیاں سننے ہوئے اچھے نہیں
لگتے۔۔۔ داعیر خان نے اپنے عنابی ہونٹوں کے گرد ہاتھ جما کر
شرارت سے تابش کا سلگایا، جس جس نے اسکا جملہ سنا، وہ
سب ایک ساتھ ہنس دیے۔

قوالیاں سننے کے لئے محبوب کا ہونا لازم و ملزوم نہیں ہے۔۔
ہونہ۔۔۔ سب کو خود پہ ہنستے دیکھ کر وہ منہ بناتے ہوئے تلملا
کر بولا۔

مان لیا کہ قوالیاں سننے کے لیے محبوب ہونا شرط نہیں لیکن بندہ کم
از کم کسی کے نصیب میں تو ہو؟۔۔۔ داعیر اسے چڑانے کے

لئے آنکھ ونک کرتا گردن اکڑاتے ہوئے ایک ادا سے بولا تو
سب پھر سے ہنس دئے۔ وہ کسی کو تنگ کئے بغیر کہاں رہتا
تھا۔

اگر مرا کے تیری شادی ہو رہی ہے تو زیادہ شوخیاں مارنے
کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہمارے بھی نصیب کھل جائیں گے
کسی دن۔۔۔ ہونہ۔۔۔ تابش اپنا سامنہ لئے ناک سکوڑ کر
جتانے والے انداز میں بولا۔

اللہ کرے تیرے نصیب ایسے بدلیں کہ رومانس فرمانے کی
 بجائے تو ہمیں راتوں کو بچے چپ کراتے اور پیمپر بدلتے ہوئے
نظر آئے۔۔۔ سارے بولو آئیں۔۔۔ اسکا پھولتا منہ دیکھ کر
داعیر خان نے اپنی شرارت میں سب دوستوں کو شامل کیا۔ پہلے
فہد اور اب تابش کا ریکارڈ لگا کر اسکا موڈ اچھا ہو گیا تھا۔ داعیر

کے سب دوست ہنستے ہوئے اجتماعی آہن دہرانے لگے جبکہ وہ
خوبصورتی سے مسکرا کر اسٹیج کی طرف بڑھ گیا تاکہ قوال سے
اپنے دوست کی فرمائش پوری کروا سکے۔

اپنے باپ کی طرح داعیر اور دمیر خان دونوں کو قوالیز اور کلاسک
سونگ بہت پسند تھے۔ میوزک کے معاملے میں وہ تینوں باپ
بیٹے کافی اچھا ذوق رکھتے تھے۔۔

آؤنی سیوں رل دیونی ودھائی (2)

میں ول پایا سوہنڑاں نی ماہی

گھریال دیونکالنی

میراپیا گھر آیا اولال نی (2)

سب مہمان اور حاضرین پوری دلجمعی سے قوالی خواں کی طرف
متوجہ تھے۔ یہاں موجود ہر ذی روح پورے دل سے ان لیرکس

کو سن رہا تھا۔ ہر لفظ پہ آکے دل پہ ٹھنڈی پھوار پڑ رہی تھی۔
داعیر خان اور اسد اللہ خان آنکھیں موندے ہلکا سرور اٹھا رہے
تھے۔ ایسے میں مین گیٹ پہ گاڑی کے ہارن کی آواز آئی تھی۔
چوکیدار بھی قوالی کی طرف متوجہ تھا۔ پہلی بار اس نے غور
نہیں کیا لیکن تیسری بار ہارن کی آواز سنتے ہی بھاگ کے گیٹ کی
طرف بڑھتا مین گیٹ سارا کھول گیا۔

گاڑی دھیمی رفتار سے حویلی میں داخل ہوئی تھی۔ مین گیٹ کا
منظر ایسا تھا کہ مرد اور خواتین دونوں طرف سے گیٹ سے آتی
گاڑی کو دیکھا جاسکتا تھا۔ انیسہ خان اور انزش بزدار کی نگاہیں
بے ساختہ حویلی میں داخل ہونے والی سفید گاڑی پہ اٹھیں
تھی۔ انہیں لگا شاید کوئی مہمان آیا ہے لیکن گاڑی تھوڑی قریب
آتے ہی ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے ہوئے جوان کو دیکھ کے دونوں

کی خوشی سے چیخ بے ساختہ تھی۔ دل زوروں سے دھڑکے
تھے۔ مرجھائے چہرے کھل اٹھے تھے۔ غزاں میں وہ بہار بن
کے آیا تھا۔ وہ دونوں حیرانگی سے اپنے منہ پہ ہاتھ رکھتی گاڑی
سے اترتی ہستی کو دیکھنے لگی۔

میراپیا گھر آیا اولال نی

میراپیا گھر آیا اولال نی

وہ خوبرونوجوان اپنی سیٹ بیلٹ کھولے گاڑی کا دروازہ اوپن
کئے باہر نکلا تھا۔ اونچا دراز قد، شفاف سفید رنگت، تیکھے نقوش
، شہد رنگ آنکھیں، پر نور چہرے پہ سچی گھنی براؤن بئیرڈ، اپنی
بھرپور مردانہ وجاہت اور شخصیت کے رعب کے ساتھ وہ
تیس سالہ نوجوان دمیر خان آفریدی تھا۔ وہ اس وقت بالکل
سیمم داعیر خان جیسے لباس میں ملبوس تھا۔ سیاہ لباس میں وہ

اپنی پرکشش شخصیت کے ساتھ چودھویں کا چاند لگ رہا تھا
جیسے سیاہ رات میں چاند آسمان پہ نمایاں نظر آتا ہے، بالکل
ایسے ہی وہ سیاہ شلوار قمیض میں سب سے نمایاں سب سے
الگ اور منفرد لگ رہا تھا۔

ماں کو دیکھتے ہی اسکا سنجیدہ چہرہ مسکراہٹ میں ڈھلا۔ انیسہ خان
خوشی سے دوڑتی ہوئی اس کے سینے سے لپٹی تھی۔ وہ اس کے
چہرے پہ جابجا لب رکھتی اپنی ممتا کو سکون پہنچانے لگی۔
ماتا سونہ دیر یاد کرہ مورے (میں نے آپ کو بہت یاد کیا
مورے)۔۔۔ وہ انہیں زور سے سینے میں بھینچ کر بھاری آواز
میں سرگوشی کرتا جیسے اپنے ہونے کا احساس دلا رہا تھا۔
مسڈیو ٹو میری جان۔۔۔ وہ نم آنکھوں سے جواب دینے لگیں،
وہ پٹھان نہیں تھیں، اسد اللہ خان کے ساتھ شادی کروا کر بھی

انہیں پشتو بولنی نہیں آئی تھی کیونکہ وہ ان سے زیادہ تر اردو میں ہی بات کرتے تھے، البتہ بچوں کو وہ بچپن میں ہی پشتو سکھاتے آئے تھے۔ انیسہ خان اتنا سمجھ جاتی تھیں کہ پشتو میں بات کیا ہو رہی ہے لیکن خود سے بولنی نہیں آتی تھی۔ کافی دیر بعد دمیر خان اپنی ماں کے ماتھے پہ لب رکھتے ہوئے چپھے ہٹا تھا۔

کیسے ہو دمیر؟۔۔۔۔۔ انرش بزدار اپنے پاگل جذبات کو قابو کرتی ایک خوبصورت سی مسکراہٹ کے ساتھ دمیر خان کی طرف بڑھتی اسکا حال پوچھنے لگی۔ دل نے تو کہا تھا پردیس سے آئے اپنے کو سینے سے لگا لو اور پورے سال کی تڑپ چند لمحوں میں سمیٹ لو لیکن نہیں وہ حدود کی پابند لڑکی تھی اس نے ناجائز طریقے سے جدائیاں نہیں مٹانی تھی۔ وہ اسے پورے حق اور

حلال طریقے سے اپنے سینے سے لگا کے بتائے گئی کہ وہ اسے کتنا
یاد کرتی تھی۔

میں بالکل ٹھیک ہوں انزہ !! تم کیسی ہو؟۔۔۔ اس نے
سنجیدگی سے جواب دیا۔ اس کے چہرے کے ہر نقش سے رعب
چھلک رہا تھا۔

میں حسین ہوں، تمہارے سامنے ہوں۔۔۔ انزہ بزوار کھل
کے مسکرا کر بولتی دمیر خان کو بھی مبہم سا مسکرا نے پر مجبور
کر گئی۔

اے پیا گھر آیا سانوں اللہ ملایا (2)

ہن ہو یا فضل کمال نی

میر اپیا گھر آیا او لال نی (2)

اج دا دوز مبارک چڑھیا

ماہی میرے ویہڑے وڑیا

میرا پیا گھر آیا او لال نی (2)

انزس بزدار دیوانوں کی طرح قوالی کی دھن اور دمیر کی چہرے کو
دیکھتی روح تک پر سکون ہو رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی
دمیر خان سے نظریں ہٹانے کی گستاخی نہیں کی تھی۔۔۔ اسکی پر
وقار شخصیت آج نئے انداز سے اسکو گھائل کر رہی تھی۔

اور سنائیں مورے!! میں نے سنا ہے کہ آپ مجھ سے شدید
ناراض ہیں؟۔۔۔ سب کو سلام دعا کرنے کے بعد وہ پھر سے
ماں کو اپنے حصار میں لئے آبرو اچکا کر نرمی سے پوچھنے لگا۔
ہاں بالکل! میں تو پھر بھی کم ناراض ہوں لیکن داعیر بہت زیادہ
ناراض ہے۔۔۔۔۔ ایسہ خان مصنوعی غصے سے بولتی اپنے
بیٹے کے چٹانی سینے پہ سر رکھتی سکون محسوس کر رہی تھیں۔

اب آگیا ہوں تو سب کو منالوں گا۔۔۔ وہ گہری سانس خارج کرتا پر اعتمادی سے بولا۔ لان میں موجود تمام خواتین اور لڑکیوں کی نگاہیں دمیر خان سے ہٹنے کو تیار ہی نہیں تھیں۔ وہ بنا پلکیں جھپکائے اسے پھلے کئی منٹوں سے دیکھ رہی تھیں بلکہ لڑکیاں تو پورے حق سے اپنا سمجھ کر دیکھ رہی تھیں۔ ابھی پوری تقریب میں دمیر خان کی غیر موجودگی سب کو نارمل لگ رہی تھی لیکن اب اس کو دیکھ کے سب کی رائے بدل گئی تھی کیونکہ پوری تقریب کو آکر چار چاند دمیر خان نے لگائے تھے۔ ایک بات تو طے تھی جتنی آنٹیوں کی نظروں نے دمیر خان کو دیکھا تھا ان سب نے ایک بار تو اپنی بیٹی کا رشتہ اس کے ساتھ کروانے کی کوشش ضرور کرنی تھی۔ یہاں پہ موجود سبھی لوگ ایلٹ کلاس کے تھے، تو کوئی بھی دمیر خان کو اپنا داماد بنانے کی خواہش کر

سکتا تھا لیکن سب اس بات سے انجان کہ وہ جس کا ہے اس کے عکس کو اپنے وولٹ میں لئے پھیرتا ہے حتیٰ کہ اسکے والدین بھی اس بات سے انجان تھے۔ سب لڑکیوں کی نظریں دمیر خان پہ جمے دیکھ کر انزس بزدار کی مسکراہٹ سمٹی تھی۔ وہ سب کو سخت نگاہوں سے دیکھتی انہیں نظریں بدلنے پر مجبور کر گئی۔

اتنی لیٹ کیوں آئے ہو؟ دل نہیں کر رہا تھا۔ چھوٹے بھائی کی خوشی میں شریک ہونے کا؟ شام سے ہم تمہاری راہ دیکھ رہے تھے۔ داعیر تو کوئی ہزار بار تمہارا پوچھ چکا ہے۔۔۔۔۔ انیسہ خان بیٹے کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھتی اس کے لیٹ آنے پر شکوہ کرنے لگیں۔

میں تم کل ہی آنا چاہ رہا تھا مورے لیکن لندن سے میرے کچھ
ضروری کلائنڈز آگئے تھے تو ان کے ساتھ ایک دوپرو جیکٹس پہ
میری ڈیل فائل ہونی تھی اور وہ کل ہی ہر صورت فائل کرنی
تھی۔ اس لئے کل نہیں آسکا اور باقی داعیر کی خوشی سے بڑھ کر
مجھے کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔ دمیر خان محبت سے ماں کا ہاتھ
پکڑ کر لبوں سے لگاتا تفصیلی وجہ بیان کرنے لگا۔

ویسے دمیر!! اگر تم آج بھی نہ آتے تو خالہ نے پکا پکا ناراض ہو
کر تمہارا اس حویلی میں داخلہ ممنوع کر دینا تھا۔۔۔ انزس بزدار
مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے تنگ کرنے کی غرض سے
بولی۔

مورے مجھ سے کبھی بھی ناراض نہیں ہو سکتی۔۔۔ دمیر
خان نے اپنی ماں کے سر پہ لب رکھتے ہوئے مان بھرے لہجے
میں جواب دیا۔

ہاں ماں جو ہوں، کیسے اپنے بچے سے ناراض ہو سکتی ہوں؟ اور
اسی بات کا تم فائدہ اٹھاتے ہو۔۔۔۔۔ ایسہ خان مصنوعی خفگی
سے بولیں۔

ہا ہا ہا مورے!! میں داعیر اور بابا سے مل کے آتا ہوں۔۔۔۔۔ وہ
ہلکا سا مسکا کر بولتا ان کے سر کو خم دینے پہ پردے کی دوسری
سائیڈ بڑھ گیا۔

اسد اللہ خان دور سے ہی دمیر خان کو دیکھ چکے تھے، وہ آنکھوں
میں چمک لئے مسکراتے ہوئے اسکی طرف آتے ہی اسکو اپنے
سینے میں بھینچ گئے۔

سنگہ پی زما زمری زویہ؟ (کیسا ہے میرا شیر بیٹا؟)۔۔۔۔ وہ
شفقت سے اس کا ماتھا چومتے ہوئے حال احوال دریافت
کرنے لگے۔

زا بالکل خایم بابا (میں بالکل ٹھیک ہوں بابا)۔۔۔ وہ ان کے
گرد گھیراتنگ کرتا زمری سے اپنا حال بتانے لگا۔
آپ بتائیں کیسی گزر رہی تھی زندگی میرے بغیر اور آپ نے
میرے سر پر انز کے بارے میں کسی کو بتایا تو نہیں تھا؟ داعیر کو تو
نہیں بتایا؟۔۔۔۔ وہ ان سے الگ ہو کر سوالیہ نظروں سے
باپ کو دیکھتا کنفرم کرنے لگا۔

تمہارے بغیر تو ہماری زندگی ادھوری ہے میرے بیٹے! اور
تمہاری ماں سے سارا دن باتیں سنی ہیں لیکن ان کو بتایا نہیں کہ
تمہارا بیٹا آج رات ہی آرہا ہے۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔

داعیر تمہیں دیکھ کے بہت خوش ہو گا۔۔ جاؤ اس سے مل
لو۔۔۔ اسد اللہ خان کو اس کی آمد کی خبر تھی لیکن انھوں نے
اسکے کہنے پہ ہی داعیر اور انیسہ خان سے یہ بات چھپائی تھی کیونکہ

دمیر خان انہیں سر پر انڈو دینا چاہتا تھا۔

گھڑی گھڑی گھڑیاں و جاوے

راہن و سل دی پیا گھٹاوے

اے میرے من دی بات نہ پاوے (2)

ہتھوں جا سٹو گھڑیاں نی

انہت باجے، بجے شہانا

مطرب صغرا، تال ترانہ

بھل گیا اے نماز دو، گانہ

بھر پیا لادیون کلال نی

میرا پیا گھر آیا اولال نی (2)

داعیر خان ابھی تک آنکھیں موندے دھنوں میں مسرور تھا۔ دمیر
خان اس کے سب دوستوں سے بغلگیر ہو کر انہیں خاموش
رہنے کا اشارہ کرتا دے پاؤں ہو کے یک دم چھپے سے جا کر داعیر
خان کی بند آنکھوں پہ ہاتھ رکھ گیا۔ وہ جو اپنی دھن میں کھڑا قوالی کا
ہر بول غور سے سن رہا تھا، کسی کو اپنے چھپے محسوس کرتا
بوکھلاتے ہوئے اپنی آنکھوں سے اسکے ہاتھ ہٹانے لگا تاکہ دیکھ
سکے کون ہے جو اس کے ساتھ مزاق کرنے کی کوشش کر رہا
ہے؟ اور پھر اگلے ہی پل اپنے چھپے موجود شخص کی مخصوص
خوشبو محسوس کرتا وہ حیرت زدہ ہوا تھا۔

لالہ۔۔۔۔۔ اسکے ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہوئے داعیر خان
خوشگوار حیرت سے چیخا تھا۔ وہ جھٹ سے اس کے ہاتھ اپنی

آنکھوں سے ہٹاتا چھلانگ لگاتے ہوئے اسکی گردن میں بازو
ڈالے بچوں کی طرح اسکے سینے سے چپک گیا تھا۔ اسے اپنے
سامنے دیکھتے ہی ساری ناراضگی جیسے ہوا میں اڑ گئی تھی۔
میرادل کہہ رہا تھا کہ آپ ضرور آئیں گئے۔۔۔۔۔ داعیر خان زور
سے اپنے بازو اسکی گردن کے گرد لپیٹتا بھاری آواز میں بولا تھا۔
وہ رو نہیں رہا تھا، بس جزباتی طور پر اسکی آواز بھاری ہو رہی
تھی۔۔۔

تو پھر دل کی سننے کی بجائے منہ لٹکائے کیوں کھڑے تھے؟۔۔۔۔۔
دمیر خان نے پیار سے اسکے گال پہ لب رکھتے ہوئے سوال کیا۔
مجھ سے بات نہیں کریں لالا! میں بہت ناراض ہوں آپ
سے۔۔۔۔۔ جیسے ہی یاد آیا کہ وہ اس سے ناراض ہے، داعیر

سیدھے منہ جواب دینے کی بجائے شدید خفگی سے بولا لیکن دور
اب بھی اس سے نہیں ہوا تھا۔

خوشی کے موقعوں پر ناراضگیاں نہیں پالی جاتیں میری جان،
ورنہ لمحے بدشگونی میں ڈھل جاتے ہیں۔۔۔ دمیر خان نے گہری
آواز میں جواب دیا، وہ اسکی ناراضی ختم کرنے کی کوشش کر رہا
تھا۔

خوشی کے موقعوں پہ بہن بھائی بھی اس طرح آخری ٹائم پہ
حاضری نہیں لگاتے جیسے آپ مہمانوں کی طرح آئے ہیں۔۔۔
داعیر نرمی سے اس سے الگ ہو کر ناراضی سے بولا۔
تو تم نے کون سا میرے لیٹ آنے پہ شادی رکوا دی تھی؟ اگر
میں نہ آتا تو بھی تمہاری شادی ہو جانی تھی۔ تم نے یہ نہیں کہنا
تھا کہ جب تک میرے لالا نہیں آتے، میں شادی کی ڈیٹ فکس

نہیں کروں گا لیکن تم نے تو شادی کی ڈیٹ بھی فکس کر لی اور
آج قوالی نائٹ بھی جمالی۔ پرسوں تمہاری شادی بھی ہو جاتی
میرے بغیر اور تم اداس شکل کے ساتھ ہی صحیح، لیکن شادی
ضرور کرتے۔۔۔ دمیر خان مدہم آوازیں مصنوعی شکوہ کناں
لہجے میں بولا۔

اگر میں اپنی شادی کی ڈیٹ آگے بڑھا دیتا یا کینسل کروا دیتا تو پھر
آپ نے آنا ہی نہیں تھا۔ کم از کم اب پریشر میں آپ آتو گئے ہیں
اور دوسری بات میں کسی صورت اپنی شادی ایک دن بھی لیٹ
نہیں کرنا چاہتا، پہلے بھی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی، اب میں کوئی
رسک نہیں لے سکتا تھا۔۔۔۔۔ داعیر خان نے آنکھیں گھما کر پر
سوچ انداز میں پتے کی بات بتائی۔ اصل میں وہ خود شادی کیلئے

مرے جا رہا تھا۔ اب اپنی شادی میں وہ کسی قسم کی رکاوٹ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔۔

شرم نہیں آرہی تجھے؟ مجھ سے چھوٹا ہو کر پہلے شادی کر رہا ہے! اتنا ہی تڑپ رہا تھا شادی کے لیے؟ یہ بھی نہ سوچا کہ پہلے میرے لالا کی ہوگی، پھر میری باری آئے گی! میری غیرت یہ گوارہ نہیں کرتی کہ میں چھوٹا ہو کر اپنے لالا سے پہلے گھوڑی چڑھوں۔۔۔۔۔ دمیر خان سنجیدہ تاثرات کے ساتھ طنزاً بڑبڑایا تھا۔۔۔

تو لالہ آپ پیسہ کمانے پہ کم توجہ دیں، یہی تھوڑی سی توجہ اپنا گھر
بسانے پہ دے لیتے تو آج میں آپ کے تین چار بچوں کا چاچو ہوتا
اور میرے بھتیجے آج یہاں میری شادی انجوائے کر رہے
ہوتے، بھنگڑے ڈال رہے ہوتے۔ ایسے فضول میں میرے

نہے منے بھتیجوں کو ویٹنگ لسٹ میں لگایا ہوا آپ نے۔۔۔۔۔
داعیر خان مصنوعی خفگی سے بولتا دمیر خان کو آنکھیں پھیلانے پر
مجبور کر گیا۔

فی الحال تو مجھے تیرے بھتیجوں کی ماں چاہیے وہ بھی شدت
سے۔۔۔ ان کی ماں کا ذکر ہی نہیں کیا تو نے؟ اور ڈائریکٹ
بھتیجوں پہ چھلانگ لگا دی۔ بے وقوف پہلے بھا بھی آئے گی تو
تیرے بھتیجوں کا کوئی سین آن کو گانہ؟۔۔۔۔۔ دمیر خان نے
اس کے سر پہ آہستہ سے چت لگاتے ہوئے داعیر خان کی
درستگی کی تو وہ قہقہہ لگا اٹھا۔ ویسے تو دمیر کی طبیعت سنجیدہ
تھی، مگر فیملی اور قریبی دوستوں کے ساتھ وہ یہ سنجیدگی ایک
طرف رکھ دیتا، تاکہ سب اس کے ساتھ بے تکلف محسوس
کریں۔

اگر آپ کی شدت کا یہی لیول رہا نہ تو مجھے ڈر ہے کہ بھا بھی
ویڈنگ نائٹ پہ نکاح نامہ پھاڑ کر ہی نہ بھاگ جائیں، پھر بھتیجیوں
کی فکر چھوڑ کر مجھے آپ کے لیے دوسری دلہن ڈھونڈنی پڑے
گی!۔۔۔۔۔ دمیر کے لہجے میں شدت پسندی اور آنکھوں میں ہلکی
سی سرخی دیکھ کر داعیر خان شرارت سے اسے تنگ کرنے لگا۔
نکاح نامہ پھاڑنے کے لئے فرصت چاہیے ہوتی ہے اور دمیر
خان کی موجودگی میں اسے فرصت تو دور سانس لینے کی مہلت
بھی نہیں ملے گی۔۔۔۔۔ وہ ٹھہرے ہوئے جنون سے مسکرا کر
بولا، نظریں اس معصوم چہرے پر جمی تھیں جو اس کی آنکھوں
کے پردوں میں لہرا رہا تھا۔

اللہ خیر کرے لالا! آج تو آپ کے ہر انداز سے خطرہ ٹپک رہا
ہے۔۔۔۔۔ داعیر معنی خیزی سے ہنس کر بولا۔ آج پہلی دفعہ وہ

اپنی شادی کو لے کر کچھ زیادہ ہی انٹرسٹڈ نظر آ رہا تھا۔ دمیر کو
اپنے لہجے میں انتہا پسندی کا عنصر محسوس ہوا تو زبان کو یہی پہ
بریک لگا کر داعیر کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں لے کر مدھم
سی مسکراہٹ کے ساتھ قوالوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس
دوران داعیر اسے مسلسل تنگ کرتا رہا تھا اور وہ کبھی اسے گھور
کر دیکھتا تو کبھی لبوں پہ خوبصورت سی مسکان سجا کر سر جھٹک

دیتا۔

او بلھے شاہ دی سچ پیاری
نی میں تارن ہاریں تاری
او اللہ ملایا، ہن آئی واری
ہن وچھڑن ہو یا محال نی
میر اپیا گھر آیا او لال نی (2)

قوالی ختم ہوتے ہی ایک دفعہ پھر ہر طرف تالیوں کا شور اٹھا
تھا۔ دمیر خان باقی سب مرد حضرات سے ملنے جلنے میں مصروف
ہو گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد تمام مہمانوں کو بارہ قسم کا لذیذ
کھانا سرو کیا گیا تھا۔ رات کافی دیر تک قوالی کی محفل جمی رہی
تھی۔ اور ساتھ داعیر خان کے دوستوں نے بھی شغل لگایا ہوا
تھا۔

بابا!! مجھے پورے ایونٹ میں پھوپھو کیوں نہیں دکھائی دیں؟ وہ
کہاں ہیں؟۔۔۔۔۔ دمیر خان نے ہر طرف متلاشی نگاہیں دوڑا
کے دیکھ لی تھیں لیکن نزہت خان کو نہ پا کر وہ سنجیدگی سے اپنے
باپ سے مخاطب ہوا تھا۔ اسکی نظریں کسی کاشدیت سے دیدار
کرنا چاہ رہی تھیں۔

بیٹا ہم نے ان کو کارڈ بھیجا تھا لیکن وہ آج نہیں آئیں! شاید کل
مہندی کے فنکشن پہ آئیں؟۔۔۔ اسد اللہ خان نظریں چرا کے
بولے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے دمیر خان کو یوں صرف نزہت
خان کو کارڈ بھیجنا اچھا نہیں لگے گا۔

واٹ بابا!! آپ نے صرف کارڈ کیوں بھیجا؟ آپ کو خود چل کے
ان کو انوائٹ کرنا چاہیے تھا۔ وہ آپ کی بہن ہیں۔ انکے
چھوٹے بھتیجے کی شادی ہے۔ ان کا ہم پہ اور اس گھر پہ حق
ہے۔ آپ لوگوں نے غیروں کو تو خود جا کے محبت سے دعوت
نامے باٹے ہیں لیکن اپنی سگی بہن کو یوں غیروں کی طرح صرف
بے مروت طریقے سے کارڈ بھیج دیا۔۔۔۔۔ دمیر خان کو ایک دم
سے غصہ آیا تھا، لیکن باپ کے سامنے آواز بلند کرنے کی بجائے
وہ دبی دبی آواز میں بولتا چلا گیا۔ اس کو اپنے باپ سے اتنی

لا پرواہی کی امید نہیں تھی کہ وہ اپنی سگی بہن پہ غیروں کو فوقیت
دیں گئے۔

تم پریشان نہیں ہو میں صبح جا کے ان کو لے آؤں گا۔۔۔ اسد
اللہ خان شرمندگی سے بولتے نظروں کا زاویہ بدل گئے کیونکہ انیسہ
خان کی وجہ سے وہ اپنے بیٹے سے نظریں چرانے پہ مجبور تھے۔
نہیں میں خود دیکھ لوں گا۔ آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت
نہیں بلکہ میں ان کو ساتھ لے کر آؤں گا۔۔۔۔۔ دمیر خان نے
سنجیدگی سے کرخت لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا۔

او کے بیٹا!! جیسے تمہاری مرضی۔۔۔ اسد اللہ خان اس کے
کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی بات پہ متفق نظر آنے لگے۔
بابا آپ نے بہت غلط کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ میرے
باپ ہیں۔ مجھ سے زیادہ سمجھدار ہیں لیکن رشتوں کے معاملوں

میں آپ کوتاہیاں کر جاتے ہیں۔ بہنیں تو خوش قسمت بھائیوں کو ملتی ہیں۔ بہنوں کا رشتہ تو اتنا پیارا ہوتا ہے بابا لیکن میں نے ساری زندگی آپ کو پھوپھو سے پیار جتاتے نہیں دیکھا۔ آپ نے کبھی بھی ان کو بڑے بھائی کی طرح پیار نہیں کیا۔ پھوپھو کی معاشی حالت بہتر نہیں ہے۔ میں نے کئی بار ان کی مدد کرنی چاہی لیکن انھوں نے ہمیشہ خوداری سے اپنا بھرم قائم رکھتے ہوئے میرے خلوص کو ٹھکرا دیا۔ وہ مجھ سے بھلا کیوں کوئی مدد یا تحائف لیتی جب ان کے سگے لالہ نے ان کی کبھی خبر نہیں لی۔۔۔ پھر ان کے بیٹے سے کوئی مراسم کیسے قائم کرتی؟۔۔۔ باپ کو شرمندہ ہوتے دیکھ کر دمیر خان لہجے کو مؤدب بناتا انہیں ان کی لاپرواہیاں گنوانے گیا۔۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا وہ ایک دن بھی اپنی پھوپھو سے غافل نہیں رہا تھا۔

وہ جب پاکستان تھا ہر ہفتے ان کے گھر کا چکر لگاتا تھا لیکن جب وہ آسٹریلیا گیا تھا۔ اسد اللہ خان کو باور کروا کے گیا تھا کہ وہ بھی ہفتے میں ایک بار انکی خبر ضرور لیں مگر وہ ہفتے میں تو کیا سال میں ایک بار بھی نہیں گئے تھے۔

بیٹا میں مانتا ہوں، میری کوتاہی ہے مگر تمہاری ماں کو نزہت سے تعلقات بڑھانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم جانتے ہو نہ جب وہ ایک دفعہ ہمارے گھر آئی تھی تو تمہاری ماں نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا؟ اس دن کے بعد میں اس کا سامنا کرنے سے ڈرتا ہوں۔ مجھے اس سے ملتے ہوئے شرمندگی ہوتی ہے مگر اب میں اسکی ذات کو نظر انداز نہیں کروں گا، اسے مناؤں گا!! اس کے گھر جا کے ساری ناراضگی دور کروں گا۔۔۔ اسد اللہ خان کرب سے آنکھیں میچ کے کھولتے پر امید سے بولے تھے۔۔

مجھے آپ سے اسی کی امید تھی بابا۔۔۔ انہیں اپنی غلطی تسلیم کرتے دیکھ کر دمیر خان داد دینے والے انداز میں اپنے باپ کو سینے سے لگا گیا۔

آج کے بے مروت وقت میں ہمارے پاس چار پیسے آجائیں تو ہم خود کو اعلیٰ مخلوق سمجھنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کو بھی پیسے کیلئے چھوڑ دیتے ہیں۔ آج کل زمانے میں سب سے بڑا رشتہ دار اور قریبی عزیز پیسہ ہے۔۔۔ چند کاغذ کے نوٹ اصل رشتوں کی جگہ لیتے ہیں۔ اور یہی چند نوٹ جب کسی کی شخصیت کو ظاہری طور پہ سنوار دے تو وہ انسان اپنے ہی اصل سے دور بھاگنے لگتا ہے۔۔۔ اس کو بنا پیسے کے ماں باپ اور بہن بھائی دوسرے کے سامنے متعارف کروانے میں شرمندگی محسوس ہونے لگتی ہے۔ انا اور بڑائی کا

ایک خول خوف پہ چڑھا لیتا ہے۔ اور ایک سوچ اپنے دماغ میں
پال لیتا ہے کہ وہ اپنوں کو کسی کے سامنے نہیں لائے گا کیونکہ وہ
غریب ہیں۔ ان کی وجہ سے اسے بھی مختلف تقریبات یا
محفلوں میں شرمندگی سے دور چار ہونا پڑے گا، پھر وہ شخص یا تو
خود کو اپنی امیری سمیت علیحدہ کر لیتا ہے یا پھر عمر بھر کیلئے
اپنے ہی پیارے رشتوں سے ناٹھ توڑ لیتا ہے تاکہ ہمیشہ کیلئے
بوسیدہ رشتوں اور ناٹوں سے جان چھڑاوائی جاسکے جو اسکی
امراء دنیا میں اسکی ذات کیلئے ذلت کا سبب بنتے ہیں۔ بالکل
ایسے ہی اسد اللہ خان نے کیا تھا، جب سے ان کے حالات
بدلے تھے۔ انہوں نے اپنی سگی غریب بہن سے رشتہ ہی
تقریباً ختم کر کے رکھ دیا تھا کیونکہ اس کی غریبی اسد اللہ خان
اور انکی بیگم کو شرمندہ کرواتی تھی۔۔۔ کھویا ہوا پیسہ واپس مل

جاتا ہے لیکن چھپ چھوڑے ہوئے یا کھوئے ہوئے رشتے نہیں ملتے۔۔۔ محبتوں کا محور خوبصورت رشتے ہیں۔ رشتے ہی انسان کو ساری زندگی پروان چڑھاتے ہیں، دنیا میں آنے سے پہلے ماں نے پیٹ میں رکھا، پیدائش کے بعد ماں نے پرورش کی، جب دنیاوی غزائیں کھانے کے قابل ہوا تو باپ نے حلال محنت کا نوالہ منہ میں ڈال کے پروان چڑھایا، بہن نے محبت سے اس کے ہر کام کو سینچا، بھائی نے ہر مشکل میں ساتھ کھڑے ہو کر حالات کا مقابلہ کرنا سکھایا۔ گویا زندگی کے ہر موڑ پہ انسان رشتوں کا محتاج رہتا ہے۔ رشتوں میں انسان کو اپنا عکس دکھتا ہے۔۔۔ خدا را بناوٹی محلوں سے نکل کر اپنے رشتے کے دھاگوں کو سمیٹیں، ان دھاگے کے سروں کو مضبوطی سے پکڑیں رکھیں۔ جرّے رہو گے تو ہر مشکل میں اپنوں کو ساتھ پا کے نکل

آؤ گے۔ اپنوں سے الگ ہو گے تو زندگی کی آزمائشوں کی لپیٹ
میں آکر فنا ہو جاؤ گے۔

زندگی کا حسن رشتوں میں ہے۔ اپنوں سے تعلقات مضبوط
کریں تاکہ آپ کا اصل باقی رہے کیونکہ پیسہ آپ کو سب کچھ
دے سکتا لیکن ذہنی سکون اور جسمانی خوشی نہیں۔۔ اور
خوشی اور سکون دو ایسی چیزیں ہیں جو صرف خوبصورت رشتے
ہی دے سکتے ہیں۔ اپنی خوشی اور سکون کو سمیٹ کے رکھیں،
اپنے ساتھ بالکل کسی قیمتی اثاثے کی طرح!! یعنی کہ رشتوں کو!!
لالہ!! آپ نے میرے جیسی سیم ڈریسنگ کیسے کی؟ مطلب
آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں آج کیا پہننے والا ہوں؟۔۔۔۔۔ داعیر
خان دونوں باپ بیٹے کو باتوں میں مصروف دیکھ کر انکی طرف

بڑھتا مشکوک انداز میں دمیر خان کے کپڑوں کے متعلق استفسار
کرنے لگا جو کہ بالکل اسکے جیسے تھے۔

اہم!۔۔۔۔۔ اسد اللہ خان نے گلے کھنکھارتے ہوئے دمیر
خان کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ اس وقت ان دونوں کے
چہروں پہ ایک شرارتی مسکراہٹ تھی۔

بتائیں نہ لالا!! آپ کو کیسے پتہ چلا؟ کہیں مورے نے تو آپ کو
میرا ڈریس نہیں دیکھایا تھا؟۔۔۔۔۔ داعیر خان متجسس سا ہوا
تھا۔ وہ ان کے چہروں پہ شرارتی مسکراہٹ دیکھ کے سچ جاننے
کیلئے بے چین ہونے لگا۔۔۔

بابا!! بتا دوں؟۔۔۔۔۔ دمیر خان نے سوالیہ انداز میں باپ کی
طرف دیکھا تھا۔

بتا دو میں کو نسا ڈرتا ہوں کسی سے۔۔۔۔۔ وہ اترا کر بولے تھے۔

مورے سے تو ڈرتے ہیں نہ!! اچھا لالہ بتائیں نہ!! آپ نے کہاں
سے لیا یہ ڈریس اور آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں آج کیا پہن رہا
ہوں؟۔۔۔۔۔ داعیر خان باپ کو جواب دینے کے بعد پھر سے
دمیر خان سے مخاطب ہوا تھا۔

ایکچو بیلی مجھے بابا نے بتایا تھا اور پھر تمہارا ڈریس دیکھ کے میں
نے بھی سیم منگوا لیا۔۔۔ اس میں اتنی متجسس ہونے والی کیا
بات ہے؟۔۔۔۔۔ دمیر خان نارمل لہجے میں گویا تھا۔

یہ ڈریس صرف پاکستان میں ہی مل سکتا ہے تو پھر کیا آپ ائر
پورٹ سے سیدھا مال گئے تھے؟۔۔۔۔۔ داعیر خان نے جانچتی
نظروں سے سوال کیا۔ یوں لگا جیسے وہ دونوں اس سے کچھ چھپا
رہے ہوں۔

بالکل بھی نہیں! میں نے کیوں مال سے جا کے لینا تھا؟ یہ ڈریس
بابا نے لے کر دیا تھا۔ دراصل میں دوپہر کے وقت ہی اسلام
آباد پہنچ چکا تھا لیکن میں نے بابا کو منع کیا تھا کہ وہ تمہیں اور
مورے کو میرے بارے میں نہ بتائیں کیونکہ میں تم دونوں کو
سرپراندہ دینا چاہتا تھا۔ اس لئے بابا نے سیم تمہارے
جیسا ڈریس مجھے فارم ہاؤس ہی بھیجوا دیا تھا تاکہ میں تقریب میں
تیار ہو کے آؤں۔۔۔ دمیر خان شانے آچکا کر ریلیکس انداز میں
بولتا داعیر خان کو آنکھیں پھیلانے پر مجبور کر گیا۔
واٹ!!! بابا آپ نے ہم سے کیوں چھپایا۔۔۔ مورے اور میں
شام سے پوچھ پوچھ کر ہلکان ہو رہے تھے اور آپ کو سب
معلوم تھا لیکن آپ نے ہمیں نہیں بتایا؟ کیوں بابا!! کیا آپ کو
ہماری افسردہ حالت مزہ دے رہی تھی؟۔۔۔۔۔ داعیر خان بے

یقینی سے اسد اللہ خان سے سوالات کی بوچھاڑ کرنے لگا جنہوں

نے دمیر خان کی آمد ان سے چھپائی تھی۔

مجھے اس نے خود کہا تھا کہ میرے آنے کا کسی کو نہیں بتانا پھر

میں کیا کرتا؟ میں مجبور تھا بیٹا۔۔۔ وہ مصنوعی بے بسی سے

بولتے آخر میں ہنس دئے۔۔

تو اچھا کیا بابا نے اگر میں پہلے آجاتا یا تم لوگوں کو میری آمد کا پتہ

چل جاتا تو اتنے خوش تب ہوتے جتنے اب ہوئے ہو؟۔۔۔

دمیر خان پیار سے داعیر خان کے سیاہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا سوالیہ

انداز میں گویا ہوا۔

جو بھی ہے کسی کو تڑپانا یا بے وجہ انتظار کی کیفیت سے دوچار

کروانا غلط ہے اور باقی بابا میں آپ کی شکایت تو مورے سے

ضرور لگاؤں گا۔۔۔ داعیر خان نے سنجیدگی سے بولتے ہوئے
باپ کو دھمکی لگائی۔۔

نہیں بیٹا! یہ ظلم مت کرنا، ورنہ تمہاری ماں میری باتوں پہ یقین
کرنا چھوڑ دے گئی۔۔۔ وہ ملتجی ہوئے۔ باپ کو یوں بیچارگی
سے داعیر خان کی منت کرتے دیکھ کر دمیر خان کا دلکش قہقہہ
بلند ہوا تھا۔ دونوں باپ بیٹے کی بحث و تکرار کافی دیر تک جاری
تھی جبکہ دمیر خان مسکراتے ہوئے ان دونوں کو چھوڑ کے اوپر
اپنے کمرے میں اگیا تھا۔

وہ کافی تھک چکا تھا، اب آرام کرنا چاہتا تھا۔ کمرے میں آتے
ہی دمیر خان نے سب سے پہلے شاور لیا تھا۔ وہ گرے ٹروازر
شرٹ پہنے واشروم سے باہر نکلا تھا، اپنے گیلے بالوں کو ٹاول سے
خشک کرنے کے بعد بیڈ کی جانب بڑھا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پہ پڑا اپنا

وولٹ اٹھا کر اس میں سے ایک چھوٹے سائز کی تصویر نکالے
چھپے بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹیک لگائی اور ہاتھ میں پکڑی تصویر پہ
مسکراتے ہوئے نگاہیں جمائے لیں۔۔۔ وہ بڑی فرصت سے
چھوٹی سی تصویر کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھ کے اس پہ نظر
آتے عکس کو حفظ کر رہا تھا۔۔۔ عکس کسی صنف نازک کا تھا
جس کی آنکھیں نیلی تھیں۔۔۔ وہ جتنی دلجمعی سے اس عکس کو دیکھ
رہا تھا، اس سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یہ کام روز فرصت سے
کرتا ہے اور جیسے سونے سے پہلے اس عکس کو ایک بار حفظ کرنا
دمیر خان کیلئے ضروری ہو۔۔۔

تم اب کیسی دکھتی ہو گی؟ کتنی بدل گئی ہو گی تم؟ یا ویسی ہی ہو
جیسے پہلے تھی؟ معصوم سی پیاری سی خیر جیسی بھی ہو صبح تم
سے مل کے پتہ چل جائے گا۔۔۔ دمیر خان تصویر میں نظر آتے

عکس سے سوال کرتا سوچوں میں اسکی صورت بنانے لگا۔۔
آنکھیں، دل اور دماغ سب اس نیلی آنکھوں والی پری کو سوچنے
لگ گئے۔۔۔ ناجانے کب اس عکس میں کھوئے دمیر خان کو
نیند آگئی، اسے معلوم ہی نہ ہو سکا۔ تصویر اب اسکے سینے پہ
پڑی تھی اور دمیر خان گہری سانسیں بھرتا اب نیند میں اس عکس
کے سینے دیکھنے لگا۔ اور اس بات کا ثبوت دمیر خان کا نیند میں
مسکراتا چہرہ دے رہا تھا۔۔

افف!! کیا مسئلہ ہو گیا ہے بھئی؟ جلدی کرو! میں لیٹ ہو رہی
ہوں۔۔۔۔۔ انزس بزدار اپنی سفید کلائی پہ بندھی گھڑی پہ ایک
نظر ڈالتی جھنجھلاتے ہوئے ڈرائیور سے مخاطب ہوئی جو گاڑی

سے باہر نکل کے اس کا ہڈ اوپن کئے انجن چیک کرتے ہوئے
بیٹری کی تاروں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔

میم! مجھے لگتا ہے بیٹری میں کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔۔۔ ڈرائیور
ہڈ نیچے کرتے ہوئے جواب دیتا واپس ڈرائیونگ سیٹ پہ آتا
گاڑی سٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ سٹارٹ
ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

اچھا! تم اسکو چھوڑو اور باہر کوئی ٹیکسی دیکھو۔ میں ابھی ٹیکسی پہ
چلی جاتی ہوں، تم بعد میں اس کو ٹھیک کروا کے مجھے پک کر
لینا۔۔۔ انزس بزدار ڈرائیور کو حکم دیتی بیگ سے اپنا فون نکال
کے کسی کو چند میسجز سینڈ کرتی گاڑی سے باہر نکلی تھی۔۔۔ ابھی
وہ آگے بڑھتی کہ سامنے سے آتی ایک سیاہ کار اس کی گاڑی کے
قریب آ کے رکی تھی۔۔۔ آگے بڑھتی انزس بزدار کے پاؤں رکے

تھے۔۔ اس نے جانچتی نظروں سے ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے
شخص کو دیکھا اور پھر نگاہ بدل کر چہرے کے تاثرات سنجیدہ کر
لئے۔

سامنے کھڑی گاڑی سے ایک وجہیہ نوجوان باہر نکلا تھا۔ وہ اس
وقت پاسٹل بلیو تھری پیس سوٹ میں ملبوس اپنی کرسٹل
گرے آنکھوں کے ساتھ انتہائی جاذب نظر اور جسمانی مضبوط
خدوخال سے بارعب شخصیت کا مالک لگ رہا تھا۔

Hi Miss Anzish ! What happened? Is everything all right?

اس نوجوان نے اپنی ٹائی ڈھیلی کرتے آگے بڑھ کر نہایت
احترام سے انزیش بزدار کو مخاطب کیا جو اس وقت کنفیوز سی
کھڑی ٹیکسی کا ویٹ کر رہی تھی۔

Yeah, everything is all right !

انزس ایک ترچھی نگاہ رائم خان پہ ڈالتی مختصر انداز میں بولی۔
اگر آپ برانہ مانیں تو میں ایک بار آپ کی گاڑی چیک کر سکتا
ہوں؟۔۔۔۔۔ رائم خان نے سنجیدگی سے سوالیہ نظروں سے
اس کو دیکھتے ہوئے استفسار کیا کیونکہ وہ ڈرائیور کو گاڑی کا ہڈ
کھولے دیکھ کر اتنا تو سمجھ چکا تھا کہ گاڑی کے ساتھ کوئی مسئلہ
ہو گیا ہے اور یہ مغروری شہزادی اب کسی دوسرے ذریعے سے
آفس تک پہنچنا چاہتی ہے لیکن سیدھے منہ بتائے گی نہیں کہ ہوا
کیا ہے کیونکہ اس کو راہگیروں سے مدد لینا یا مخاطب کرنا اچھا نہیں
لگتا تھا۔

ڈرائیور سے ٹھیک ہو نہیں رہی تو آپ سے کیا خاک ہو گئی؟ لیکن
پھر بھی آپ کو گاڑی کا انجن چیک کرنے کا شوق ہو رہا ہے تو

اپنی مکینکی کے جوہر دیکھا لیں۔۔۔ انزش بزدار اپنے سینے پہ

دونوں بازو باندھتی طنزاً بولی تھی۔

نہیں!! اگر آپ کو میری مکینکی پہ شک ہے تو میں نہیں دیکھتا! آپ

ٹیکسی کا انتظار کریں اور میں آفس جا کے اپنی پریزنٹیشن دیتا

ہوں۔ نہ آپ کی گاڑی ٹھیک ہوگی اور نہ ہی اس ایریا میں آپ کو

کوئی ٹیکسی ملے گی تو نتیجتاً آپ میٹنگ میں نہیں پہنچ پائیں گی اور

اس کا فائدہ مجھے ہوگا کیونکہ میں بلا مقابلہ شاہ کمپنی کا نیا پروجیکٹ

لے اڑوں گا۔۔۔ رائم خان اپنی کرسٹل گرے آنکھیں گھوما کے

پر اعتمادی سے بولتا ہمیشہ کی طرح انزش بزدار کو اندر تک تپا گیا

تھا۔

آپ کی اطلاعات کیلئے عرض ہے، میں پہلے ہی اپنے لیٹ پہنچنے کا

ان کو انفارم کر چکی ہوں۔ اور اگر میں آج وقت پہ پہنچ نہ سکی تو

میٹنگ کینسل ہو جائے گی لیکن آپ کو یکطرفہ طور پر پروجیکٹ
کبھی نہیں ملے گا اور دوسری بات آپ نے پہلے کبھی وہ کیا ہے
جو آپ کہتے ہیں؟ آپ صرف ہوائی باتیں کر کے اپنا اور دوسروں
کا ٹائم ویسٹ کرتے ہیں۔۔۔ انرش کے ماتھے پہ بل پڑے، وہ
انتہائی سنجیدگی سے بولتی رائم خان کو اسکی عادت سے آگاہ
کرنے لگی۔ یہ آدمی کیوں ہمیشہ اسے پتاتا تھا؟ انرش بزدار نے
کلس کر سوچا۔ رائم خان ہمیشہ اس کو تنگ کرنے کیلئے الٹی
سیدھی باتیں کرتا تھا لیکن عملی طور پر اس نے وہ سب کچھ
کبھی سرانجام نہیں دیا تھا جو وہ کہتا تھا۔

وہ دونوں کئی بار کاروباری معاملات کی وجہ سے مختلف میٹنگز اور
بزنس پارٹیز میں ملتے رہتے تھے۔ انرش کسی بھی جگہ پر اس کی
موجودگی کو اتنا سیریس نہیں لیتی تھی کیونکہ وہ بھی تو ایک

کاروباری آدمی تھا اور ہر جگہ پہ اس کا انزس بزدار سے پہلے ہونا عام سی بات تھی البتہ رائم خان آفریدی کیلئے انزس کی موجودگی بہت اہمیت رکھتی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ بزنس پارٹیز صرف انزس بزدار کی وجہ سے ہی اٹینڈ کرتا تھا تو یہ غلط نہیں ہوگا۔

”رائم خان بارکزی کے دل کو اچھی لگتی تھی یہ انا پرست اور مغروری شہزادی“ ورنہ وہ سنجیدہ شخصیت کا مالک کسی صنف نازک سے بغیر ضرورت کے مخاطب نہیں ہوتا تھا۔ صرف انزس بزدار ہی ایسی لڑکی تھی جس سے بات کرنے کیلئے وہ فضول بول جایا کرتا تھا، اور اپنی شخصیت کے برعکس حرکتیں بھی کر جاتا تھا۔

ہارڈ پلے!!۔۔۔۔۔ رائم خان اسکی چالاکیاں سنتا مدہم آوازیں
بولتا گاڑی کی طرف بڑھ گیا تاکہ دیکھ سکے کہ کیا مسئلہ ہوا ہے؟
اٹس ناٹ آہارڈ پلے۔ اٹس آسمارٹ پلے۔۔۔۔۔ انزش بزدار
اسکی بڑبڑاہٹ سنتی ایبرو آچکا کے بولی تھی۔۔۔

یہ تو ٹھیک نہیں ہونے والی۔۔۔۔۔ رائم خان بیٹری کی تاروں کے
ساتھ چھیڑچھاڑ کر کے مزید اس کی دو تاروں کو پکڑ کر انجن کے
ساتھ ان کا کنکشن کاٹ گیا۔ پہلے صرف نیچے کی طرف ایک تار
ڈبل کر اس ہونے کی وجہ جل گئی تھی۔ اور اس کا انجن سے
کنکشن کٹ گیا جس کے باعث گاڑی سٹارٹ نہیں ہو رہی
تھی۔ ڈرائیور کو وہ تار شاید دکھی نہیں تھی۔ اسلئے وہ جوڑ نہیں
پایا لیکن رائم خان نے دیکھ لی تھی اور اس نے جوڑنے کی
 بجائے ایک کمینی سی مسکراہٹ چہرے پہ لئے الٹا دو اور تاروں

کا مزید کنکشن کاٹ دیا تاکہ انزش بزدار کو آج ہر صورت اپنے
ساتھ گاڑی میں سوار ہونے پر آمادہ کر سکے۔۔

کیوں نہیں ہوگی سٹارٹ؟ زیادہ مسئلہ ہو گیا ہے؟۔۔۔ انزش
بزدار پریشانی سے بولی تھی۔ اب تو واقعی میں ہی دور دور تک
کوئی ٹیکسی نظر نہیں آرہی تھی اور گھر میں بھی دوسری گاڑی اس
وقت موجود نہیں تھی کیونکہ وہ عام بزدار اپنے کسی دوست سے
ملنے کیلئے لے کے نکل گئے تھے ورنہ وہ گھر سے دوسری گاڑی
منگوا لیتی اور ٹائم سے میٹنگ اٹینڈ کر لیتی۔

اس کے انجن میں کوئی خرابی بن گئی ہے لیکن آپ فکر نہ کریں۔
میں مکینک کو کال کر دیتا ہوں۔ ڈرائیور ٹھیک کروا کے اس کو
واپس لے جائے گا، آپ میرے ساتھ آجائیں! میں بھی وہی جا

رہا ہوں، جہاں آپ نے جانا ہے۔۔۔ رائم خان گاڑی کا ہڈ نیچے
کرتا معصوم شکل بنا کر مصنوعی سنجیدگی سے بولا تھا۔
اور میں آپ کی گاڑی میں کیوں بیٹھوں گی؟۔۔۔ انزس بزدار کو
اس کی آفر ٹھٹکی تھی۔

کیونکہ آپ کی گاڑی کا انجن بیٹھ گیا ہے، آپ کو ایک امپورٹنٹ
میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے اور یہاں پہ آپ کو میری گاڑی کے سوا
آفس پہنچنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ملے گا تو اس لئے انزس بزدار،
تہ پورہ حسن، ذہانت اور غرور سرہ زما سرہ زما پہ گاڑی کی کبسنہ۔
(آپ پورے حسن، ذہانت اور غرور کے ساتھ میرے ساتھ
میری گاڑی میں بیٹھ رہی ہے)۔۔۔۔۔ انزس کو اس کی گاڑی کی
حالیہ صورت سے آگاہ کرنے کے بعد رائم نے آخری الفاظ پشتو
میں دہرائے تو وہ الجھ کر اسکی طرف دیکھنے لگی۔ وہ پشتو زبان

بولنا یا سمجھنا بالکل نہیں جانتی تھی، دمیر اور داعیر بھی اگر اکثر کبھی پشتو بولتے تو وہ نا سمجھی اور خفگی سے انہیں دیکھ کر ہنسنے پہ مجبور کر دیتی تھی اور پھر وہ جان بوجھ کر آپس میں پشتو زبان میں بات کرتے رہتے تاکہ انزش تنگ ہو اور وہ ہوتی تھی۔
یہ آخر میں کیا کہا آپ نے؟۔۔۔ انزش نے متجسس ہو کر اس کے آخری الفاظ کا مطلب جاننا چاہا جو اس نے اپنی زبان میں بولت تھے۔

کچھ نہیں! آپ بیٹھیں۔۔۔ رائم گڑبڑا کر اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے سادگی سے بولا، وہ جانتا تھا کہ مقابل اسکی زبان سے ناواقف ہے، جبکہ وہ اسے مشکوک نگاہوں سے گھور کر اپنے ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو گئی۔

اس کو ٹھیک کروا کے مجھے ایک گھنٹے بعد پک لینا۔۔۔ انزش
اپنے ڈرائیور کو حکم دے کر احسان کرنے والے انداز میں رائم
خان کی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ اسے آفس ہر حال میں پہنچنا
تھا۔ اور اس وقت اس کے پاس رائم خان کے ساتھ جانے
کے علاوہ کوئی دوسرا آپشن نہیں تھا۔ اس لئے بنا کچھ بولے اس
کی آفر قبول کر لی تھی۔ مس انزش! کیا آپ کے پاس ٹیشو ہے؟
وہ ایکچولی میرے ہاتھ گندے ہو گئے ہیں۔۔۔ رائم خان پیاری
سی مسکراہٹ چہرے پہ سجائے گاڑی کا دروازہ کھولتی انزش کو
روک کر پوچھنے لگا۔ انزش نے اس کے دونوں ہاتھوں پہ گریس
لگی دیکھ کے بلا جھجھک اپنے بیگ سے ایک ٹیشو نکال کے دیا تھا
کیونکہ اس کے ہاتھ اسکی گاڑی کا انجن دیکھنے کی وجہ سے گندے
ہوئے تھے۔ رائم خان ایک انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے ٹیشو

پکڑتا اس کا شکریہ ادا کرنے لگا جبکہ انزش بزدار نے سر کو خم دے کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ سوار ہوتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ وہ اس کا دیا ہوا ٹیشو اپنی پینٹ کی جیب میں ڈالتا دوسری جیب سے اپنا ٹیشو نکال کے ہاتھوں سے گریس صاف کر گیا۔ رائم کی یہ حرکت ڈرائیور نوٹ کر چکا تھا، وہ چہرے پہ الجھن لئے اس انسان کی حرکتیں دیکھ رہا تھا جو اب وہی ٹیشو واپس نکال کے اپنے کوٹ کی انر جیب میں ڈال گیا۔ چہرے پہ ایک فتح مندی کی مسکراہٹ تھی۔ کرسٹل گرے آنکھیں خوشی سے سات رنگوں میں ڈھل کے قوس قزح کا منظر پیش کر رہی تھی۔ پہلی چیز اس کی پاس انزش بزدار کی آئی تھی۔ اس ٹیشو پہ انزش کے ہاتھوں کا لمس تھا، اس کی مخصوص خوشبو تھی۔ یہ صرف ٹیشو نہیں بلکہ ایک قیمتی خزانہ تھا جو رائم خان کے ہاتھ لگا تھا۔

اور یہ ٹیشو رائٹم خان کبھی استعمال نہیں کرنے والا تھا۔ یہ تو سنا تھا من پسند شخص کی ذات کی ہر چیز اچھی لگتی ہے لیکن من پسند شخص کی دی گئی بے جان چیزیں بھی اچھی لگتی ہیں، یہ آج دیکھ لیا۔

محبت کی ہے کبھی؟۔۔۔ رائٹم نے تحیر زدہ ڈرائیور سے استفسار کیا جو ہونق بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ ڈرائیور کو یہ پٹھان خاصہ سر پھر الگ رہا تھا۔

نہیں۔۔۔ ڈرائیور نے نا سمجھی سے جواب دیا۔
پھر کھڑے رہو حیران۔۔۔ اس نے ڈرائیور کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے اپنے دل کے مقام پر ہاتھ رکھا۔

مسٹر خان!! اگر آج کی تاریخ میں آپ کے ہاتھ صاف ہو جائیں تو گاڑی میں آنے کی زحمت بھی کر لیجئے گا۔ آپ شاید بھول رہے

ہیں، ہمیں دیری ہو رہی ہے۔۔۔ انزش بزدار گاڑی سے سر
نکالے جبرے بھیج کر غصے سے بولی تھی۔ وہ گاڑی میں کب سے
انتظار کر رہی تھی اور رائم خان کے ہاتھ صاف ہو کر نہیں دے
رہے تھے۔

جی بس ہو گئے!! وہ اس کی آواز پہ چونکتے ہوئے اسے جواب
دیتا ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولنے لگا۔

خان صاحب!! میں حیران ہی ٹھیک ہوں۔۔۔ ڈرائیور نے
رائم خان کی بوکھلائی حالت دیکھ کر ہانک لگائی اور اسکی سابقہ
کہی گئی بات کا جواب دیا کیونکہ اتنا تو وہ بھی جان گیا تھا محبت
اتنی بھی اچھی چیز نہیں ہے جتنی سننے میں لگتی ہے۔

سمجھدار ہو پھر تو تم۔۔۔ رائم خان جواب دیتا دلکشی سے
مسکراتے گاڑی میں سوار ہوتا اسے سٹارٹ کرنے لگا۔

کیا باتیں ہو رہی تھی باہر؟۔۔۔ انزش بزدار نے فون سے نگاہیں
ہٹاتے ہوئے سرسری انداز میں رائم خان سے سوال کیا۔
محبت کی۔۔۔ رائم خان نے صاف گوئی سے جواب دیتے
ہوئے ریویو مریں اسکے چہرے کے بدلتے تاثرات بغور
ملاحظہ کئے تھے جو محبت کا نام سن کر بدلے تھے۔ انزش بزدار
کے سنجیدہ چہرے پہ یکدم مدہم سی مسکراہٹ بکھری تھی۔ وہ
فون پہ نظریں جماتی اپنے آگے کے جھولتے بالوں کو ایک انگلی کی
مدد سے کان کے چھپ کر گئی، البتہ چہرے پہ مسکراہٹ ابھی بھی
قائم تھی۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کر رائم خان کی مسکراہٹ
مزید گہری ہوئی تھی۔

چلو ایک بات تو اچھی ہو گئی یہ لڑکی محبت لفظ کو جانتی ہے۔۔۔
رائم خان اس سے نظریں ہٹاتا خوشی سے دماغ میں سوچنے لگا،

اس بات سے انجان کہ وہ نہ صرف محبت کے لفظ سے واقف ہے بلکہ اس کا مطلب اور تلفظ بھی یاد کئے بیٹھی ہے۔ آپ کو کبھی کسی سے محبت ہوئی ہے؟۔۔۔ انرش نے دماغ میں دمیر خان کو سوچتے ہوئے اچانک اس سے سوال کیا۔ وہ بے دھیانی میں سوال کر گئی تھی ورنہ وہ کسی سے بنا کام کے زیادہ مخاطب نہیں ہوتی تھی۔

جی ہوئی ہے!! پہلی نظر میں ہوئی تھی اور اب تو بے انتہا ہو گئی ہے۔ یوں سمجھ لیں، جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے ہیں مرض بڑھتا جا رہا ہے۔۔۔ رائم خان بوجھل لہجے بولا تھا۔ نجانے انداز بتانے والا تھا اظہار کا تھا یا اقرار کا؟

پھر تو مرض کا علاج کریں ورنہ یہ جان لیوا ثابت ہوگا۔۔۔ انزس
بزدار اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتی مفید
مشورے سے نوازنے لگی۔

واہی اللہ! یہ مارحم وئی (اوہ میرے اللہ! مجھ پر رحم کر)۔۔۔
اس کا فکر مندانہ جواب سن کر وہ گہری سانس خارج کرتے
ہوئے آہستگی سے اللہ سے مخاطب ہوا کیونکہ مرض تو واقعی جان
لیوا تھا۔

ڈھنگ سے اردو میں جواب نہیں دے سکتے آپ؟۔۔۔ اسے پھر
سے پشتو بولتے دیکھ کر انزس بگڑتے موڈ کے ساتھ بیزارى سے
بولی۔

اولس! آئی مین علاج بہت مہنگا ہے۔ میرے دل کا طبیب
میری اوقات سے باہر ہے۔۔۔ اس کے کوفت بھرے لہجے پہ

رائم خان بارکزی نے ہوش میں آکر مصنوعی افسردگی سے ناک
سکوڑ کر اس کی سابقہ بات کا جواب دیا۔ انزش کو اس کے
جواب اور انداز پہ ناچاہ کر بھی ہنسی آئی مگر وہ کمال مہارت سے
ضبط کر گئی۔

شاید میں اس کے قابل نہیں ہوں۔۔۔ آپ دعا کریں نہ کہ میں اس
کے قابل ہو جاؤں۔۔ وہ اب رنجیدگی سے مزید بولتے ہوئے
انزش سے دعا کی گزارش کرنے لگا۔

طیب مطلب محبوب۔۔۔ انزش بزدار نے تشویشی اور سوالیہ
نگاہوں سے اس کو دیکھا۔

جی دل کا طیب محبوب ہوتا ہے۔ اور میرا طیب ابھی میری
پہنچ سے دور ہے۔ کوئی معجزہ ہی ہو، وہ مجھے یسر آجائے۔ اگر
معجزے کی صورت میں وہ مجھے یسر آگئی تو میں تو اسے قدرت کا

عجوبہ سمجھ کے اس پہ ہر پل اپنی محبت نچھاور کروں گا۔۔ میں
اس معجزے کی تکمیل کو محبت کے پھولوں سے سینچوں گا۔۔
اتنی محبت دوں گا کہ اسے میری محبت کی مٹھاس اور رنگینی کے
آگے ساری دنیا کی لذتیں اور رونقیں پھیکی لگے گی۔ میں ہر پل
اس وقت کا انتظار کرتا ہوں جب میرا خدا مجھ پہ مہربان ہوگا
اور مجھے معجزے کی صورت میں اس کا ساتھ نصیب کرے گا
محرم بنا کر۔۔۔ رائم خان غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے
بولا۔ گاڑی کی سپیڈ حد درجے تک آہستہ ہو گئی تھی۔ کارواں تھم
گئے تھے، ہوائیں رک گئی تھی، سڑک کے کنارے جھولتے
درخت کے پتوں نے احتراماً جھک کر محبت کو بیان کرنے والے
رائم خان کے سچے جذبوں کو سراہا تھا۔

ان شاء اللہ!! وہ آپ کو محرم بن کر مل جائیں گئی! اگر محبتیں
سچی ہوں تو قدرت کو معجزے کرنے پڑتے ہیں۔ سچی محبتیں
اکثر اپنے خلاف فیصلوں اور تقدیروں سے لڑ جاتی ہیں۔۔۔ انزس
بزدار جو اس سے سوال پوچھ کے فون پہ مصروف ہو گئی تھی،
رائم کا جواب سنتے ہی اسکی فون پہ چلتی انگلیاں رکی تھی اور وہ
بے اختیار اسے کی محبت کی تکمیل کیلئے دعا کر گئی کیونکہ وہ خود
بھی تو اسی جذبے سے دوچار تھی۔

پھر سے بولیں۔۔۔ رائم خان نے اسے اپنے الفاظ دہرانے کی
فرمائش کی۔

کیا بولوں؟۔۔۔ انزس بزدار نے نا فہمی سے پوچھا۔
جو ابھی بولا۔۔۔ رائم خان نے حوالہ دیا۔

ان شاء اللہ! وہ آپ کو مل جائے گی محرم بن کر۔۔۔
انزش نے عام سے لہجے میں دہرایا۔
پھر سے بولیں۔۔۔ رائم خان کا لہجہ اب کی بار التجائیہ ہوا۔
انزش بزوار نے اسکی گزارش سنتے ہی کڑی نظروں سے
دیکھا۔۔۔

پلیز!!۔۔۔۔۔ رائم خان نے مزید ملتیجی ہوا۔
اوکے فائن!! ان شاء اللہ وہ آپ کو محرم بن کر مل جائے
گی۔۔۔ انزش نے ٹھنڈی سانس ہوا میں منتشر کرتے ہوئے
اگتائے ہوئے انداز میں دہرایا۔
آمین۔۔۔ رائم خان ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اونچی
آواز میں پر امید سے گویا تھا۔

آپ فضول باتوں کے علاوہ گہری باتیں بھی کرتے ہیں یہ مجھے آج معلوم ہوا ہے لیکن ابھی تھوڑی دیر بعد پروجیکٹ کی ڈیل اپنی کمپنی کے ساتھ فائنل کر کے میں آپکی چلتی زبان کو تالو سے چپکانے والی ہوں۔۔۔ انرش بزدار اپنی گردن اونچی کئے ٹانگ پہ ٹانگ جماتی ایک ادا سے بولی تھی۔ وہ پچھلی سیٹ پہ بیٹھ کر بولی تھی لیکن بے عزتی رائم خان کو قریب سے محسوس ہوئی تھی۔۔۔

کیا یہ طنز تھا؟ تعریف تھی؟ یا پھر بے عزتی؟ وہ سمجھ نہیں پایا۔ اور اس کی یہ بات سننے کے بعد رائم خان مزید کوئی سوال کرنے سے خود کو پرہیز رکھتا گاڑی کی سپیڈ بڑھا گیا۔ مشکل سے اس نے پہلی دفعہ اتنی بات کی تھی، وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا کوئی جواب اسے آئندہ اتنی گفتگو سے بھی محروم کر دے۔۔۔ خیر آج کا دن

رائم خان کیلئے اچھا ثابت ہوا تھا، نہ صرف اس سے ملاقات ہوئی تھی بلکہ اس مغرور شہزادی نے اسکی گاڑی اور اسے مخاطب کرنے کا شرف بھی بخشا تھا اور اتنی سی بات اس کا دن بنا گئی تھی۔۔۔ رائم خان چور نظروں سے سارا راستہ انزش کو دیکھتا آیا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کا ساتھ پانا چاہتا تھا محرم بنا کر، شریک حیات بنا کر۔۔۔

میٹنگ روم میں تمام افراد جمع تھے۔ کانفرنس ٹیبل پہ ہر نشست کے آگے کوئی اور پانی کی باٹلز موجود تھیں۔ انزش اور رائم نے بھی روم میں انٹر ہوتے ہی سب کو سلام کرتے ہوئے اپنی اپنی نشست سنبھال لی تھیں۔ وہ انزش کے ساتھ بیٹھنے کی بجائے دوسری سائیڈ بالکل اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ سب کے آنے

کے بعد سیکرٹری نے کاظم شاہ کو آنے کی اطلاع دی تھی۔
اطلاع ملتے ہی کاظم شاہ اپنے آفس روم سے نکلتا ٹائی درست
کرتے ہوئے میٹنگ روم کی طرف بڑھنے لگا۔ چال میں ازلی
رعب اور بے نیازی تھی۔ وہ اس وقت روئیل بلیو سوٹ میں
ملبوس بالوں کو جل سے سیٹ کئے ہمیشہ کی طرح اپنت سنجیدہ
اور خوبصورت نقوش سے نظر لگ جانے کی حد تک پیارا لگ رہا
تھا۔ وہ میٹنگ روم میں داخل ہوتے ہی سر کو خم دے کر
اشارے سے سب کو سلام کرتا سربراہی سیٹ سنبھالنے لگا اور
تھوڑی دیر بعد تمام کلائنڈز کے باری باری پروجیکٹر سکرین پہ ان
کی پریزنٹیشن دیکھنے لگا۔

وہ جھولتی چٹیر پہ بیٹھا کبھی سکرین کی طرف دیکھتا تو کبھی کلائنڈز
کے دلائل سنتا جو وہ پروجیکٹ پانے کیلئے اسے قائل کرنے کے

لئے دے رہے تھے۔ انزش اور رائم اسکے ساتھ پہلی نشست
کی لائن میں تھے۔ اب باری رائم خان کی تھی۔ اس نے اپنی
پریزنٹیشن دینے کے بعد انزش کی طرف اشارہ کیا تھا۔

وہ اپنے لیپ ٹاپ پہ انگلیاں چلاتے ہوئے بیٹھے بیٹھے اپنی ساری
پریزنٹیشن اور اس کے اہم پوائنٹس کاظم شاہ کے سامنے رکھ گئی
۔ اس نے اس پروجیکٹ کو پانے کیلئے کوئی چکنی چٹری باتوں کا
سہارا نہیں لیا تھا۔ کوئی ایسا پوائنٹ اندر شامل نہیں کیا تھا جو
ان کی کمپنی پورا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بے حد صاف
گویائی سے اپنی قابلیت پہ ایمانداری کے ساتھ اس پروجیکٹ کو
لینے کیلئے چند اہم پوائنٹس سامنے رکھے تھے جس پہ پورا اترنے
اور انہیں مکمل کرنے کی ذمہ داری انزش بزدار نے اپنے زبان
اور کام دونوں سے دی تھی۔ کاظم شاہ اسکی پر اعتمادی اور

پروفیشنل انداز سے کافی متاثر ہوا تھا۔ اس نے انزس بزدار کی
قابلیت کا سن رکھا تھا، آج آنکھوں سے دیکھ بھی لیا تھا۔۔
سب کی پریزنٹیشنز ہونے کے بعد کاظم شاہ پانچ منٹ کا وقفہ کرتا
میٹنگ روم سے باہر نکل گیا تھا۔ سب کلائینڈز نے دھڑکتے دل
سے سید کاظم شاہ کے فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔ سوائے رائم
خان اور انزس بزدار کے۔۔

رائم خان کو یہ پروجیکٹ چاہیے ہی نہیں تھا، وہ تو بس انزس
بزدار کی وجہ سے میٹنگ میں شامل ہوا تھا۔ رائم خان کا شاہ
کمپنی کے ساتھ الریڈی دو پروجیکٹس پہ کام چل رہا تھا۔ انزس پر
سکون ہوتی چھپچھیر کے ساتھ پشت ٹکائے فون کی سکرین پہ
ٹائم دیکھنے لگی۔

آج داعیر خان کی مہندی تھی اور اسے جلدی یہاں سے نکلنا تھا
تاکہ وقت پہ پہنچ کر دمیر خان کے ساتھ کچھ ٹائم سپینڈ کر
سکے۔۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد کاظم شاہ پھر سے میٹنگ روم میں
داخل ہوا۔ سب کلائینڈز متجسس ہو کر آگے ہوئے تھے۔ کاظم
شاہ گلہ کنکھارتے ہوئے سب کو اپنی طرف متوجہ کروا گیا۔
ہماری کمپنی یہ پروجیکٹ بزدار کمپنی کو دیتی ہے کیونکہ مس انرش
بزدار کے پوائنٹس ویلڈ تھے اور ہماری کمپنی کیلئے ان سے اچھا
کوئی پارٹنر نہیں ہو سکتا۔۔۔ کاظم شاہ سنجیدگی سے بولتے
ہوئے تمام کلائینڈز کی زبان تالو سے چپکا گیا سوائے رائم خان
اور انرش کے۔

کاظم شاہ کی بات سنتے ہی انرش بزدار کے ہونٹوں پہ ایک فاتحانہ
مسکراہٹ دوڑی تھی۔ وہ ایک ادا سے رائم خان کو دیکھتی اپنی

چیزیں سمیٹنے لگی جبکہ باقی کے تمام کلائینڈز مایوسی سے میٹنگ روم سے نکلتے بنے تھے البتہ انزش بزدار کو زہریلی نظروں سے ایک بار ضرور دیکھا تھا جو ہر بار ان کی قابلیت کو مات دے جاتی تھی۔

Congratulations Miss Anzish !

رائم خان نے خوشی سے جذبات میں بہتے ہوئے اپنا ہاتھ مصافحے کیلئے انزش بزدار کی طرف بڑھایا۔ اتنی خوشی تو رائم کو اپنے لئے نہ ہوتی، جتنی خوشی انزش بزدار کو یہ پروجیکٹ ملنے پر ہو رہی تھی۔ وہ اب اپنا سیدھا ہاتھ بڑھائے اس کے جواب کیلئے کھڑا تھا جبکہ کاظم شاہ حیرانگی سے منہ کھولے رائم خان کی بے تکلفی دیکھ رہا ہے۔ وہ کبھی ایسا تو نہ تھا۔۔

شکریہ مسٹر خان۔۔۔ انزس بزدار نے اپنی فائل ٹیبل پہ
گھسیٹ کے اٹھاتے ہوئے بنا ہاتھ ملائے ایک کڑی نگاہ رائم
خان پہ ڈال کر جواب دیا۔

آپ کے ساتھ کام کر کے بہت اچھا لگے گا۔ انشاء اللہ ہمارے
ساتھ آپ کا ایکسپیرینس کافی اچھا رہے گا۔ اس پروجیکٹ کا
فائدہ دونوں پارٹیز کو برابر ہو گا۔ میں اس پروجیکٹ کو کامیاب
کرو گی۔۔۔ انزس اب کاظم شاہ کی طرف متوجہ ہو کر رسمی
کلمات کہتی اپنی چیزیں اٹھائے فاتح ہو کر میٹنگ روم سے نکل
گئی تھی۔ رائم خان کا ہاتھ وہی ہوا میں معلق ہو گیا تھا، وہ ایک
دفعہ پھر سے اسکی کر کے چلی گئی تھی اور رائم خان ہکا بکا تماشا
دیکھتا رہ گیا۔

چلی گئی ہے وہ!!۔۔۔ کاظم شاہ نے اس کا ہاتھ جھٹک کر
سنجیدگی سے اسے حقیقی دنیا میں پٹکا جو ہونق بنا میٹنگ روم کا
خارجی دروازہ دیکھ رہا تھا جہاں سے انزس بزدار بے نیازی سے
نکل کے گئی تھی۔

کیا حرکت تھی یہ؟۔۔۔ کاظم شاہ نے آئرو آچکا کے تیکھے لہجے
میں سوال کیا؟

مجھے خود بھی نہیں پتہ، بس بے اختیاری میں ہو گیا۔۔۔ رائم
خان منہ پھولا کر شرمندگی سے گویا ہوا۔

تو پہلے تو ایسا نہیں تھا پھر یہ سب کیا تھا؟ یہ تیری تازہ تازہ
سیکھی ہوئی بے غیرتی لگ رہی ہے، کہاں سے سیکھی
ہے؟۔۔۔ کاظم شاہ کو یوں اس کا ڈائریکٹ انزس کی طرف ہاتھ
بڑھانا بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا اور رائم خان ایسا تھا بھی

نہیں، یہ کام اس نے اپنی شخصیت کے برعکس کیا تھا۔۔ ہاں
کاروباری سلسلے میں انکا واسطہ روز خواتین سے پڑتا تھا لیکن
انہوں نے کبھی اپنے وقار اور شریعت کے خلاف جا کر یوں
کسی نامحرم کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تھا جیسے آج اس نے بے
ساختگی سے بڑھا دیا تھا۔۔

سیکھی کہیں سے نہیں ہیں، یہ دل کی گستاخیاں ہیں۔ اور کم بخت
دل، دماغ کی کہاں سنتا ہے۔۔ صحیح، غلط اس کو کچھ سمجھ نہیں
آتا! بس بے وقوفیاں کرتا جاتا ہے۔۔۔ رائم خان دوبارہ اپنی
نشست پہ بیٹھتا ٹھنڈی آہ بھر کر کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔
خیر اللہ تعالیٰ تمہارے دل کو ہدایت دے۔۔۔ کاظم شاہ نے
گہری نگاہوں سے اسے دیکھ کر سچے دل سے اس کیلئے دعا کی،

اسے کسی کی پرسنل باتوں میں گھسنے کی عادت نہیں تھی، اسلئے کچھ بھی مزید رائم خان سے پوچھنے کی بجائے بات کو ختم کر دیا۔
دل کو ہدایت نہ دے، اللہ تعالیٰ اس دل کو منتخب پسند انسان دے۔۔۔ رائم خان مدہم آواز میں بولا تھا۔

اچھا چھوڑیہ سب!! آج تو گڑیا کی مہندی ہے، توں یہاں کیا کر رہا ہے؟ شادی کی تیاری دیکھنے کی بجائے تجھے آج بھی میسنگ کی پڑی ہوئی تھی؟۔۔۔ کاظم شاہ سنجیدگی سے بولتا اس کی لاپرواہی پہ چوٹ کرنے لگا۔

میسنگ بھی تو خاص تھی اور ویسے بھی مہندی کا فنکشن رات کو ہے اور میں کوئی بہانہ نہیں سن رہا، بھابھی اور بچوں کو لیکر تو نے شام سے پہلے ہمارے گھر پہنچ جانا ہے۔۔۔ رائم خان

اب حکمیہ اور بارعب لہجے میں بولتا اسے گھوری سے نواز رہا
تھا۔

وعدہ نہیں کرتا لیکن کوشش ضرور کروں گا آنے کی، دمیر بھی
بہت اصرار کر چکا ہے لیکن یار بچوں کے ساتھ مصروفیات اتنی
ہوتی ہیں کہ کہیں نکلنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا! بس آفس سے گھر اور
گھر سے آفس کے ہو کر رہ گئے ہیں۔۔۔ کاظم شاہ چھپے چئیرپہ
پشت ٹکاتا اپنی مصروفیات کے بارے میں بتانے لگا۔ آفس سے
گھر جانے کے بعد منت ایک منٹ کیلئے بھی کاظم شاہ سے دور
نہیں ہوتی تھی، مطلب شام کے بعد کاظم شاہ کا منت کے بغیر
گھر سے نکلنا ممنوع تھا۔ کافی دیر تک وہ باتوں میں مصروف رہے
تھے۔

رائم پچھلے دو سالوں سے کاظم شاہ کے دوستوں کی لسٹ میں
ایک کاروباری میٹنگ کے ذریعے شامل ہوا تھا جبکہ دمیر خان
سے دوستی کاظم شاہ کی بہت پرانی ہے، جب وہ آسٹریلیا گیا تھا،
تب اس نے دمیر خان کے ساتھ ہی کاروباری تعلقات بڑھائے
تھے اور دوستی کا بہت خوبصورت رشتہ وہی آسٹریلیا سے پروان
چڑھا تھا۔

السلام علیکم خالہ جان!! کیا چل رہا ہے؟ کہاں تک پہنچی مہندی
کے فنکشن کی تیاریاں؟۔۔۔ انزس بزدار لاؤنج میں داخل ہوتے
ہی اونچی آواز میں چہک کے استفسار کرنے لگی۔ آج وہ معمول
سے ذرا ہٹ کے خوش تھی اور یہ خوشی اس کے چہرے سے
چھلک رہی تھی۔۔۔

وعلیکم السلام!! شکر ہے تم آگئی، ہمیں مہر و لوگوں کی طرف جانا ہے۔۔ مہندی اور شکن وغیرہ کا سامان لیکر۔۔۔ انیسہ خان بھانجی کو دیکھتے ہی تھوڑی ریلیکس ہوئی تھی ورنہ صبح سے وہ ساری رسومات اور انکی تیاری سے متعلق سوچ سوچ کے اکیلی ہلکان ہو رہی تھی۔

اوکے! چلے جاتے ہیں، اس میں تو اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ میں آگئی ہوں نہ، میں سب چیزیں دیکھ لیتی ہوں۔ آپ ٹینشن فری ہو جائیں۔۔۔۔ انرش صوفے پہ بیٹھتے ہی اپنائیت بھرے احساس میں بولی تھی۔۔

خیریت تو ہے؟ آج تم کچھ زیادہ ہی خوش نظر آرہی ہو؟۔۔۔ انرش کے چہرے پہ بکھری گہری مسکراہٹ دیکھ کے انیسہ خان خود کو سوال کرنے سے نہ روک پائی۔۔ وہ عام لڑکیوں جیسی

بالکل بھی نہیں تھی۔ فضول بولنا اور بلاوجہ مسکرانا اسکے مزاج میں شامل نہیں تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ خشک طبعیت کی مالک تھی یا وہ ہنس مکھ نہیں تھی۔ وہ زندہ دل لڑکی تھی۔ وہ صرف اپنے دل کے قریب لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے ہنستی مسکراتی تھی یا جو اس کے دل میں رہتے تھے، انکی موجودگی اسے خوش کر دیتی تھی۔۔۔

بھئی!! خوش کیوں نہیں ہوں گی؟ آخر کو اسکے چھوٹے کزن کی شادی جو ہو رہی ہے۔۔۔ داعیر خان جو کہ غالباً ابھی سو کے اٹھا تھا، اپنے بے ترتیب بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے سیڑھیاں اتر کر انیسہ خان کی طرف بڑھ کر جتانے والے انداز میں بولا۔

ہاں تمہاری شادی کی خوشی تو ہے ہی لیکن ایک اور بات کی بھی خوشی ہے جو شاید تمہاری شادی کی خوشی سے کئی گنا زیادہ ہے۔۔۔۔۔ انزش بزدار ایکسائٹڈ انداز میں بولی تھی۔

کیسی بات؟۔۔۔۔۔ انیسہ اور داعیر خان دونوں نے نا فہمی سے استفسار کیا۔

آج میں نے کروڑوں کی ڈیل طے کی ہے شاہ کمپنی کے ساتھ! آئی مین ایک بڑا پروجیکٹ حاصل کیا ہے۔۔۔۔۔ انزش بزدار فخریہ انداز میں بولی تھی۔

مطلب کاظم لالہ کی کمپنی کے ساتھ؟۔۔۔۔۔ داعیر خان نے شاہ کمپنی کا نام سنتے ہی آبرو اچکا کر وضاحت چاہی۔۔۔۔۔ یس انہی کی کمپنی کے ساتھ۔۔۔۔۔ انزش بزدار نے دھیمے لہجے میں تصدیق کی تھی۔

پھر تو تمہیں بہت بہت مبارک ہو! اللہ تعالیٰ تمہیں مزید
کامیابیوں سے نوازے۔۔۔ انزش کی کامیابی پہ انیسہ خان کی
گردن فخر سے مزید بلند ہوئی تھی۔۔

آین۔۔۔ انزش بزدار نے پر امید سے جواب دیا۔۔
خالہ جان!! ہم نے کس کے ساتھ جانا ہے مہرو کے گھرمایوں کا
سامان دینے؟۔۔۔ انزش بزدار نے الجھتے ہوئے سوال کیا۔
میں لے کر جاؤں گا۔۔۔ داعیر خان جو انیسہ خان کی گود میں سر
رکھے ہوئے تھا، انزش کی بات سنتا فوراً اٹھ کے بیٹھ گیا۔
جی نہیں! آپ کا وہاں جانا اور مہرو سے ملنا ممنوع ہے۔۔۔
انیسہ خان اسکو گردن سے پکڑ کر پھر سے اس کا سر اپنی گود میں
رکھتی مزے سے بولیں۔

یہ زیادتی ہے ویسے مجھ غریب کے ساتھ! تقریباً چوبیس گھنٹوں سے وہ مجھ سے بات نہیں کر رہی۔۔۔ داعیر خان افسردگی سے منہ پھولا کر بولا تھا۔ کل شام سے مہر خان نے اس سے بات کرنا بند کر دیا تھا۔ اسکے میسیجز کا سپلائے کرنا تو دور میڈم نے میسیجز سین ہی نہیں کئے تھے۔

یہ زیادتی نہیں ہے۔ یہ رسم و رواج ہیں۔ رخصتی سے پہلے دولہا دلہن ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ بات کر سکتے ہیں۔۔۔ انیسہ خان ہلکے ہلکے انداز میں اسے تنگ کرتی نرم انگلیاں اس کے بالوں میں پھیرنے لگیں۔

مورے!! یہ ساری پرانی دقیانوسی باتیں ہیں، میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔ آج کے زمانے میں کوئی پابندیاں قبول نہیں کرتا ہے۔ ایون آج کل کے دلہا، دلہن تو رخصتی سے پہلے ملنے سے

ذرا بھی گریز نہیں کرتے۔۔۔ داعیر خان پھر سے سراں کی گود
سے ہٹاتا مایوسی سے بولا۔

افگورس! ہوتے ہوں گے لوگ جو رسم و رواج کے خلاف
ورزی کرتے ہیں، لیکن ہم نہیں کریں گے اور یہ دقیانوسی باتیں
نہیں ہیں، ہماری رسومات ہیں۔۔۔ انیسہ خان سنجیدگی سے
سمجھانے والے انداز میں بولیں۔۔۔

مطلب آپ اپنے بیٹے کو شادی سے پہلے اس کی منکوحہ سے ایک
دفعہ بھی نہیں ملنے دیں گی؟۔۔۔ داعیر خان معصومیت سے
منہ لٹکا کے بولا تھا۔

ہاں بالکل بھی نہیں ملنے دوں گی! جتنا ملنا تھا مل لیا۔۔۔ انیسہ
خان اپنی ہنسی دباتے ہوئے فوراً انکار کر گئی۔ انرش ہلکی سی
مسکراہٹ کے ساتھ انہیں خاموشی سے سن رہی تھی۔

مورے!! ماں بنیں ساس نہ بنیں۔۔۔۔۔ داعیر خان نے ناک
سکوڑتے ہوئے دہائی دی۔۔۔ وہ جان بوجھ کے ماں کو چھیڑ رہا تھا
۔ مہر سے ملنے کا اسکا دل تو بہت تھا لیکن وہ بڑوں کی مرضی اور
ہدایت کے خلاف نہیں جاسکتا تھا۔ پھر مہرو کے گھر والوں نے
بھی اپنی بیٹی کو مایوں بیٹھانے کے بعد کونساداعیر خان سے ملنے
دینے تھا۔۔۔

ہاہاہا! تم بھی سعادت مند بیٹے بنو، ٹھہر کی نہ بنو۔۔۔ انز ش بزدار
نے ایک دلکش ہنسی کے ساتھ بولتے ہوئے داعیر خان کو مزے
سے جواب دیا۔۔۔

ٹھہر کی نہیں ہوں میں، شوہر ہوں اسکا!! اپنی بیوی کے ساتھ کون
ٹھہر کر رہتا ہے؟۔۔۔۔۔ داعیر خان نے آنکھیں پھیلا کر انز ش
بزدار کو ٹوک دیا۔

رخصتی سے پہلے ٹھہر کر ہی ہوتا ہے بیٹا۔۔۔ انرش بزدار بھی
اسی کے انداز میں مزید بولتی اسے چھیڑنے لگی۔

دمیر!! کہاں جا رہے ہو؟۔۔۔ دمیر خان عجلت میں ہونے
کے باعث لاؤنج میں بیٹھے تینوں مکینوں کو انور کرتا بنا سلام کئے
آگئے بڑھ رہا تھا جب اچانک انیسہ خان کی اس پر نظر گئی، تو
انہوں نے اسے ٹوک کر روک لیا۔

مورے!! آپ نے مجھے اٹھایا کیوں نہیں؟ دوپہر کے دو ہو گئے
اور میں سوتا رہ گیا! اتنے ضروری کام کرنے تھے میں نے
۔۔۔۔۔ دمیر خان دو قدم چھپے ہٹا مڑ کر سنجیدگی سے ماں سے
مخاطب ہوا تھا۔

کون سے کام کرنے ہیں؟ شادی کے سب انتظامات مکمل ہیں۔
تم یہاں آؤ! میرے پاس بیٹھو۔۔۔ انیسہ خان نرمی سے اس کو

اپنے پاس بلائے لگیں جبکہ انزش کے لب دمیر خان کو دیکھتے ہی
ایک عجیب اور پرکشش مسکان میں ڈھلے تھے۔ دل زوروں سے
دھڑکا تھا۔۔

نہیں مورے!! میرے پاس بیٹھنے کا وقت نہیں ہے، میں پہلے
ہی بہت لیٹ ہو گیا ہوں۔۔۔ دمیر خان اپنی کلائی پہ بندھی
واچ کی طرف دیکھتا وقت کی قلت کا حوالہ دینے لگا۔ اس کا موڈ
اتنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

جانا کہاں ہے؟ جو اتنی جلدی مچائی ہوئی ہے؟۔۔۔۔۔ انیسہ
خان نے نا سمجھی سے پوچھا۔

پھوپھو کی طرف جانا ہے۔ وہ کل بھی نہیں آئی تھیں اور کسی
نے ان کے نہ آنے کی خبر لینا بالکل ضروری نہیں سمجھا۔ اس
لئے آج میں خود ان کو اپنے ساتھ لیکر آؤں گا۔۔۔ دمیر خان

سپاٹ لہجے میں بولتا انیسہ خان کو تلملانے پر مجبور کر گیا۔ نزہت
خان کا ذکر ہوتے ہی انکے چہرے کے نقوش تنے تھے۔
تو بیٹا! وہ شاید کل نہ آنا چاہتی ہو؟ آج آجائیں گئی۔ تم کہیں نہیں
جار ہے۔ ہم نے تھوڑی دیر بعد مہرو کے گھر جانا ہے مایوں کا
سامان لیکر۔۔۔۔۔ انیسہ خان اپنے تنے نقوش کے ساتھ حکمیہ
انداز میں بولی تھی۔۔۔

نہیں وہ ایسے نہیں آئیں گی! میں لینے جاؤں گا تو وہ آئیں گی۔۔۔
دمیر خان نے گہری نظروں سے ماں کو دیکھتے ہوئے سرسری سا
جواب دیا۔

لالا! میں پھوپھو کو لے آتا ہوں اور آپ مورے کے ساتھ چلے
جائیں۔۔۔۔۔ داعیر خان نے مفاہمتی انداز میں مداخلت کی۔

اگر تم میں عقل ہوتی تو کل ہی ان کی غیر موجودگی کو محسوس کر کے اب تک ان کو لے کر آچکے ہوتے لیکن تمہاری تو نیند بھی ابھی ٹھیک سے پوری نہیں ہوئی، تو تم کیا خاک اپنوں کا خیال رکھو گے؟۔۔۔ دمیر خان سر جھٹک کر پیچیدہ لہجے میں جواب دیتا مزید کوئی بھی بحث کئے بنا تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے لاؤنج عبور کر گیا۔۔

دنیا بدل گئی لیکن اس لڑکے کا پھوپھو کیلئے پیار نہ بدلا۔۔۔ پتہ نہیں کیا جادو کیا تھا میرے بیٹے پہ جو پاکستان آتے ہی ہر بار ان کی طرف دوڑا چلا جاتا ہے۔۔۔ ایسہ خان خفگی سے بولتی اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔ ان کو دمیر خان کا یوں نزہت خان کو خود کی بات پہ اہمیت دینا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ اس لئے وہ ناراضگی کا اظہار کرتی جگہ چھوڑ گئی تھی جبکہ

داعیر خان کا چہرہ پشیمانی سے دوچار تھا اور انزس الجھن کا شکار
بنی وہی صوفے پہ ہی منجمد ہو گئی۔

دمیر خان نے ایک دفعہ بھی اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ کیا اس
کی موجودگی اتنی غیر ضروری تھی اس کیلئے کہ اس نے اسے سلام
کرنا بھی مناسب نہ سمجھا؟ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے انزس
بزدار کا دل مٹھی میں جکڑا گیا تھا۔



جہاں اسلام آباد امر کی آماجگاہ میں شمار ہوتا ہے۔ وہی پہ اس
شہر کی رنگینی اور سبزے سے تھوڑا دور ایک سفید پوش علاقے
میں ایک چھوٹے سے گھر کا منظر کچھ اس طرح کا تھا۔
انتہائی پسماندہ حالت میں کھڑی گھر کی عمارت اپنی طرز سے
مناسب دیکھ بھال اور وقت پہ مرمت نہ ہونے کی وجہ سے

پسماندگی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ جگہ جگہ سے اترا ہوا پینٹ اور خستہ حال دیواریں اپنی بے بسی کی داستان سنارہی تھی۔ مشکل سے دو کمروں، ایک کچن اور واشروم پر مشتمل گھر بہت چھوٹا تھا۔ اس گھر کے مکین بھی اس کی طرح پسماندگی کا شکار تھے۔ شہر اسلام آباد کی روشنیاں اور رنگینی بھی اپنی چمک سے اس گھر کو تھوڑی روشنی بخش کے چمکا نہیں سکی۔

اگر غار کے اندھیرے میں کہیں روشنی کی تھوڑی سی بھی کرن پڑے تو وہ پورے غار کے اندھیرے کو غارت کر دیتی ہے اور ایک لکیر کی صورت میں آتی روشنی کی کرن پوری اندھیری غار کے نقشے کو واضح کر کے چمکا دیتی ہے مگر اس شہر کی روشنی صرف ایک حد تک محدود تھی۔ یہ روشنی کبھی کسی کو اندھیرے سے نہیں نکال سکتی تھی۔ کبھی کسی کو راستہ نہیں دیکھا سکتی

تھی۔ کبھی کسی کیلئے فائدہ مند نہیں ثابت ہو سکتی تھی۔ ہر کسی کو اپنے حصے کے اندھیرے سے لڑکے خود روشنی تلاش کرنی تھی جب امید کی کرنوں پہ ٹیکس لگنے لگ جائیں یا ان کرنوں کی وجہ سے انسان کی عزت نفس مجروح ہو تو سفید پوش طبقہ اپنے حصے کے اندھیرے میں رہنا پسند کرتا ہے، اس کو اپنی زندگی اور حالت تذلیل کی کرنوں سے روشن نہیں کرنا ہوتی۔

زر!! زر!! زر!!۔۔۔۔۔ چھوٹے سے گھر کے کونے والے کمرے سے کسی کی نقاہت زدہ، حلق سے نکلتی آواز گونجنے لگی تھی۔ اس گھر کے درو دیوار اب تو اس سسکتی آواز پہ ترس کھاتے تھے۔ پچھلے بارہ سال سے اس گھر میں کسی کی گھٹی گھٹی سسکیاں گونجتی تھی اور اب وہ سسکیاں اکثر ہچکیوں میں بدل جاتی تھی لیکن بے آواز ہچکیاں خشک آنکھوں کے ساتھ۔۔۔۔۔ آنسو دل

پہ گرتے تھے کیونکہ نزہت خان کبھی بھی اپنی ہچکیوں سے اپنی
معصوم سی گڑیا کو بہرا نہیں کرنا چاہتی تھی۔۔۔

زر بخت۔۔۔۔۔ اب کی بار نزہت خان نے تھوڑی اونچی آواز
دی، باہر صحن میں چار پائی پہ بیٹھی سترہ سالہ لڑکی ماں کی آواز پہ
چونکتی بھاگ کے اندر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔
کیا ہوا مورے؟ آپ کو کچھ چاہیے؟۔۔۔۔۔ زر بخت ننگے پاؤں
اندر دوڑی چلی آئی تھی۔ وہ اپنی ماں کا ہاتھ تھامتی فکر مندی سے
استفسار کرنے لگی جو چار پائی پہ لیٹی بخار کی وجہ سے کانپ رہی
تھی۔

مورے! آپ کو تو بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔۔۔ آپ نے مجھے
پہلے کیوں نہیں بلایا؟ اب میں کیا کروں گی؟ گھر میں تو بخار کی دوائی

بھی نہیں ہے۔۔۔ زر بخت پریشانی سے نزہت خان کے
ماتھے پہ ہاتھ رکھتی دکھی انداز میں بولی تھی۔

میں ٹھیک ہوں۔ تم ایک کام کرو اپنے اور میرے کوئی اچھے
سے کپڑے استری کر دو، آج شام کو ہم نے لالہ کے گھر جانا
ہے۔ میرے بھتیجے کی مہندی ہے۔۔۔ نزہت خان اس کی
پریشانی کو نظر انداز کرتے ہوئے متوازن لہجے میں حکم دینے
لگیں۔

مورے!! آپ کو اتنا تیز بخار ہے۔ اور آپ کہہ رہی ہیں کہ ہم
ماموں کے گھر شادی پہ جائیں گے؟ ہم لوگ سوائے ڈاکٹر کے
اور کہیں نہیں جا رہے۔ آپ اٹھیں، ہم ابھی ڈاکٹر کے پاس چلتے
ہیں۔ آپ کی طبیعت بہت خراب ہے۔۔۔ زر بخت ان کے

سر کے نیچے ہاتھ رکھ کے اوپر اٹھانے کی کوشش کرتی بھیگی ہوئی
آوازیں بولی تھی۔

ارے پگلی!! تو رو کیوں رہی ہے؟ میں بالکل ٹھیک ہوں، بس ذرا سا جسم گرم ہے۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ تو اپنے اور میرے کپڑے نکال کے استری کر لے، آج شام کو ہم نے ضرور لالہ کے گھر جانا ہے، نہیں تو وہ ناراض ہو جائیں گے کہ میں نے اتنی محبت سے بلایا ہے اور میری بہن میرے بیٹے کی خوشیوں میں شامل نہیں ہوئی۔ کل بھی ہم نہیں گئے تھے، آج لازمی جانا ہے۔۔۔ نزہت خان ہمت کر کے سیدھی اٹھ کر بیٹھتی زربخت کے آنسو اپنی پوروں سے صاف کرتے ہوئے پیار سے بولی تھی۔

لیکن مورے! آپ کو بخار ہے! آپ کیسے جائیں گی طبعیت
خرابی میں وہاں؟ پہلے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں، پھر شام تک آپ کی
طبعیت بہتر ہو جائیں گی تو ماموں کی طرف چلے جائیں گے لیکن
اگر آپ ڈاکٹر کے پاس نہ گئی تو میں ماموں کی طرف بھی نہیں جاؤ
گی۔۔۔۔۔ زر بخت اپنی ماں کا تکلیف اور بخار سے سرخ ہوتا
چہرے دیکھ کے ضدی ہوئی تھی۔ وہ کبھی بھی اپنی ماں کو
تکلیف دہ حالت میں اسد اللہ خان کے گھر نہیں لے جاسکتی
تھی۔ اس کیلئے شادی سے ضروری اپنی ماں کی صحت تھی۔
مجھے پیسے اور چادر دو، میں ڈاکٹر سے دوا لیکر آتی ہوں اور تم شام
کی تقریب کیلئے تیاری کرو۔۔۔۔۔ نزہت خان نے زر بخت کی
ضد کے آگئے ہار مانی تھی اور کچھ ان کو خود بھی آج اپنی طبعیت

زیادہ ناساز لگ رہی تھی۔ اسلئے ڈاکٹر کے پاس جانا بہتر سمجھا
تھا۔۔

اٹھا آپ سے جا نہیں رہا اور ڈاکٹر کے پاس اکیلی جائیں گی؟ میں
کہیں بھی آپ کو اکیلے نہیں جانے دوں گی، میں بھی آپ کے
ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلوں گی۔۔۔ زر بخت چارپائی سے اٹھتی اپنی
اور نزہت خان کی چادر پکڑتی اٹل لہجے میں گویا ہوئی تھی۔
اچھا چلو میری ماں۔۔۔۔۔ نزہت خان اکتا کر بولتی زر بخت کا
ہاتھ تھامے چارپائی سے اٹھیں۔ وہ اپنی ماں کو ٹھیک سے چادر
میں چھپاتی ان کا ہاتھ پکڑ کر پیار سے لبوں سے لگاتی باہر گیٹ کی
طرف بڑھ گئی۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہی وہ گھر کو لاک کرتی اپنے
چہرے پہ چادر گراتے ہوئے نزہت خان کی طرف آئی تھی جو
دیوار کا سہارا لئے مشکل سے کھڑی تھیں۔

کیا ہوا خالہ کو اور آپ لوگ کہاں پہ جا رہے ہیں؟۔۔۔۔۔
سامنے کے گھر سے ایک پینتیس سالہ مرد نکلتا زر بخت اور نزہت
خان کو دیکھتے ہی انکی طرف بڑھتا پریشانی سے استفسار کرنے
لگا۔

لالہ! مورے کو پھر سے بخار ہو گیا ہے تو اس لیے ہم ڈاکٹر کے
پاس دوالینے جا رہے ہیں۔۔۔۔۔ زر بخت نے پریشانی سے ڈوبی
ہوئی آواز میں جواب دیا۔

اچھا ایک کام کرو، تم گھر جاؤ اور میں خالہ کو ڈاکٹر کے پاس لے
جاتا ہوں۔۔۔۔۔ شہزاد بے حد شائستگی سے بولتا نزہت خان کو
اپنی گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کرنے لگا۔

نہیں بیٹا! ہم چلے جائیں گے، تم پریشان نہ ہو۔ تم جاؤ خیر سے
اپنا کام کرنے۔۔۔۔۔ نزہت خان نے فلحال شہزاد کی گاڑی میں

بیٹھنے سے انکار کیا کیونکہ ہر دفعہ شہزاد ہی ان کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتا تھا۔ ان کے سارے ٹیسٹ اس نے خود اپنے پیسوں سے کروائے تھے۔ وہ اکثر نزہت خان کی دوائیاں بھی اپنے پیسوں سے لے آتا تھا کیونکہ اس کو یہ دونوں ماں بیٹی مستحق لگتی تھی اور اسکی نیت میں اور بھی کچھ تھا۔ اور وہ کیا تھا، آگے جا کے پتہ چلے گا لیکن نزہت خان کی ہمیشہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ شہزاد سے کم سے کم مدد لیں مگر ہر مجبوری میں آکر انہیں شہزاد کی مدد لینا پڑتی تھی۔

خالہ میں اسی سائیڈ پہ جا رہا ہوں اور مجھے آپ کی صحت سے بڑھ کر کوئی کام عزیز نہیں ہے۔۔۔۔۔ شہزاد نے رسائی سے کہا اور پھر احتراماً سر جھکا کے نزہت خان کو گاڑی میں بیٹھنے کی گزارش کرنے لگا۔ نزہت خان نظروں سے زربخت کو آگے بڑھنے کا

اشارہ کرتی گاڑی کی طرف آئی تھی۔ زر بخت احتیاط سے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولے نہت خان کو بٹھاتی ان کے ہاتھ میں چند پیسوں کے نوٹ پکڑاتی گاڑی کا دروازہ بند کر گئی۔

تم گھر جاؤ اور اندر سے کنڈی لگا کے بیٹھنا۔ میں پندرہ سے بیس منٹوں میں خالہ کو ڈاکٹر سے چیک کروا کے آتا ہوں۔۔۔ شہزاد ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھتا باہر پریشانی سے انگلیاں مروڑتی زر بخت کو نرمی سے ہدایت دینے لگا۔

لالہ!! مورے کو جلدی واپس لے کر آئیے گا۔۔۔ زر بخت اپنی ماں کی طرف دیکھتی رنجیدگی سے بولی۔

میں جلدی لے کے آجاؤ گا، اب تم گھر جاؤ۔۔۔ شہزاد نے ٹھہرے لہجے میں زر بخت کو حکم دیتے ہوئے گاڑی سٹارٹ کی جبکہ وہ دوبارہ سے گھر کا لاک کھولے اندر داخل ہوتی دروازہ بند

کر گئی۔ وہ اپنی چادر اتار کے چار پائی پہ رکھتی اپنا دوپٹہ اوڑھے
واشروم کی طرف بڑھی تھی تاکہ وضو کر کے نماز ادا کر سکے۔
ظہر کی نماز کا وقت تھا۔ اور زربخت نمازوں کی پابندی کرتی
تھی۔

حالات جیسے بھی تھے، اس نے رب سے کبھی شکایت نہیں کی
تھی۔۔ وضو کر کے وہ باہر نکلتی کمرے سے جائے نماز اٹھائے
صحن میں ہی بچھا کر دوپٹہ حجاب کی صورت میں اپنے چہرے کے
گرد اچھے سے لپیٹتی نماز کی نیت باندھ گئی۔ نظریں ناک کی
سیدھ میں تھی۔ چہرہ ہر قسم کی پریشانی سے پاک تھا۔ وہ ٹھہر
ٹھہر کے ہر لفظ ادا کرتی نماز میں پوری دجمعی سے مشغول تھی۔
آٹھ رکعت وہ پڑھ چکی تھی۔ سلام پھیر کے وہ پھر سے اوپر اٹھ
کے اگلی رکعت کی نیت باندھتی جب دروازے پہ دستک ہوئی۔

زربخت کے پر سکون چہرے پہ ایک الجھن اور اضطرابی دوڑی تھی۔ وہ جھنجھلاتے ہوئے جائے نماز سے اترتی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ اسے شدید غصہ آتا تھا جب اسے نماز میں کوئی دُسرُب کرتا تھا۔ اس نے ایک اکتاہٹ چہرے پہ لئے دروازہ کھولا اور سامنے لمبے چوڑے دمیر خان آفریدی کو دیکھ کے اس کی آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں۔ وہ خوشگوار حیرت سے دمیر خان کو چند لمحے دیکھتی رہی، پھر دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی تاکہ اس کو گھر میں داخل ہونے کی جگہ دے سکے۔

دمیر خان اس وقت سفید شرٹ اور سیاہ جینز میں ملبوس، اپنی پرکشش وجاہت کے ساتھ جاذب نظر لگ رہا تھا۔ اپنی شہد رنگ آنکھوں سے سیاہ شیڈ ڈالتے ہوئے وہ زربخت کے حجاب میں لپٹے حسین چہرہ کو دیکھ کر ساکت ہوا تھا۔ اسلام آباد کی ساری

رنگینیاں ساری روشنیاں اس چہرے کے سامنے پھیل چکی پڑ گئی تھیں۔ نیلی گہری آنکھوں نے پورا سا گر خود میں سمیٹ رکھا تھا۔ دمیر خان آفریدی نے سات ملکوں میں ایسا حسین چہرہ کہیں نہیں دیکھا تھا جو ابھی اسکی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اس وقت سادہ سے نیلے سوٹ میں ملبوس اپنی نیلی آنکھوں کے جلوے سے دمیر خان پہ سحر طاری کر گئی تھی۔

نیلی آنکھیں جھکی ہوئی تھی جبکہ دمیر خان کی شہد رنگ آنکھیں پورے وثوق سے اسکے چہرے کو حفظ کرنے میں مصروف تھیں۔ ایک سال میں زربخت کتنی بڑی ہو گئی تھی؟ چہرے پہ مزید نور آگیا تھا۔ آنکھوں کا نیلا رنگ گہرا ہو گیا تھا۔ جسمانی لحاظ سے وہ کمزور سی تھی لیکن اس کا قد پہلے سے بڑا لگ رہا تھا۔ یوں کہا جائے کہ ایک سال میں وہ دمیر خان کیلئے کوئی پری بن گئی تھی

تو غلط نہیں ہوگا۔ شہد رنگ آنکھوں کی طلب مٹائے نہیں مٹ
رہی تھی۔ دمیر خان کی نظریں زر بخت کے پرکشش اور
معصوم چہرے سے ہٹنے کو انکاری تھی۔ نظریں ہمتی تو زبان کوئی
لفظ ادا کرتا؟

وہ تو بس پتھر کی مورت بن کر دور ازے میں کھڑا زر بخت کو
ندیدوں کی طرح دیکھ کر رہ گیا تھا۔ دل نے الگ سینے میں ادھم
مچایا ہوا تھا لیکن دمیر خان آس پاس کا ماحول، آوازیں، شور،
یہاں تک کہ اپنے سینے کی دیواروں سے سرٹکتے دل کی آواز بھی
فراموش کرتا ڈھیٹوں کی طرح آنکھوں کا کہا مان کے زر بخت کو
پورے حق سے تکتا رہا۔ اس نے کافی دیر تک اسکے اندر آنے کا
انتظار کیا، پھر وہ اسے ہونق بنا کھڑا دیکھ کے سادگی سے کندھے
اچکاتے ہوئے دروازہ چھوڑتی بنا کچھ بولے واپس جائے نماز کی

طرف آتی اپنی ادھوری نماز کو پورا کرنے کی نیت باندھ گئی۔ وہ جب بھی نماز کے بیچ اٹھتی تھی، کسی سے مخاطب نہیں ہوتی تھی۔ اس کے مطابق جب وہ نماز میں ہوتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو کے اس سے محو گفتگو ہوتی تھی اور پھر اللہ تعالیٰ سے اگر گفتگو شروع کی جائے تو اس کو مؤذبانہ طریقے سے دعا مانگ کر گفتگو کے سلسلے کو ملتوی کیا جاتا ہے اور پھر اگلی نماز پر وہی سلسلہ پھر شروع ہو جاتا ہے۔

زربخت کو لگتا تھا جب وہ اللہ تعالیٰ سے گفتگو کر رہی تو وہ کسی بشر سے مخاطب نہ ہو، اسلئے تو اس نے دمیر خان کو مخاطب نہیں کیا تھا۔

وہ اپنی نماز مکمل کرنے کے بعد اسے سلام اور اس کا حال چال پوچھنے کا ارادہ رکھتی تھی جبکہ دمیر خان کا زربخت کے چھپہٹنے

کی وجہ سے سلسلہ دیدار ٹوٹا تھا، اس نے ہوش کی دنیا میں پلٹ کر گھر کا دروازہ بند کیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ ایک نظر گھر کی حالت پہ دوڑانے کے بعد وہ صحن پہ پڑی چارپائی پہ بیٹھ گیا۔ زر بخت بے نیازی سے نماز میں مصروف تھی۔ دمیر خان اپنے دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں الجھاتا عنابی لبوں پہ دلفریب تبسم سجائے زر بخت کی طرف دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ نماز مکمل کر چکی تو سلام پھیر کر اپنے ہاتھ دعا کیلئے اوپر اٹھانے لگی۔ زر بخت آنکھیں موندے دل میں دعا کرتی جا رہی تھی۔ اور اسکے گلابی لبوں کی جنبش پہ دمیر خان کے منہ سے بے ساختہ ہر دعا کے بعد آئین نکل رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ زر بخت کیا مانگ رہی ہے لیکن اس کے چہرے پہ دعاؤں کی قبولیت کی تڑپ دیکھ کے وہ اسکے منہ سے

نکلے ہر لفظ پہ آئین کہہ رہا تھا۔۔ دعا مکمل کرنے کے بعد زربخت
اپنی جائے نماز سمیٹ کے ایک سائید پہ رکھتی دمیر خان کی طرف
بڑھی تھی۔

اسلام علیکم لالہ!! کیسے ہیں آپ؟ پاکستان کب آئے؟ ہم سے اتنی لیٹ ملنے کیوں آئے؟۔۔۔ زر بخت نے زخمی سا مسکرا کے بولتے ہوئے دمیر خان کو مخاطب کیا۔

وعلیکم السلام! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ابھی کل رات کو ہی آیا ہوں۔ تم بتاؤ تم ٹھیک ہو؟ پھوپھو کہاں ہے؟۔۔۔۔۔ دمیر خان نے سیدھا ہو کر بیٹھتے اسکی مسکراہٹ کے چھپے درد بھانپ کر کھوجتی نگاہوں سے سوال کیا۔

میں تو بالکل ٹھیک ہوں لیکن مورے کی تھوڑی سی طبعیت
خراب تھی تو وہ ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں۔۔۔ اس نے گہری
سانس بھر کر سوگوار لہجے میں جواب دیا۔
کیا ہوا ہے پھوپھو کو؟ کونسے ہاسپٹل گئی ہیں؟ میں ان کو لیکر آتا
ہوں۔۔۔ دمیر خان اپنی پھوپھو کی صحت خرابی کا سن کے فوراً
پریشانی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

نہیں لالہ! آپ بیٹھیں، مورے بس آتی ہوں گی، وہ شہزاد لالا کے
ساتھ قریبی کلینک سے بخار کی دوا لینے گئی ہیں۔ آپ بیٹھیں میں
آپ کیلئے چائے بنا کر لاتا ہوں۔۔۔۔ اس کو گھر سے نکلنے کی
تیاری پکڑتے دیکھ کر اس تیزی سے آگے بڑھ کر اسے روک
لیا۔

شہزاد لالہ کون ہی؟۔۔۔۔۔ یہ اجنبی سا نام سن کر دمیر خان نے
چہرے پہ سنگین تاثرات سجائے اچنبھے سے سوال کیا تھا۔
وہ ہمارے پڑوسی ہیں۔ مورے کو اکثر ڈاکٹر کے پاس وہی لے
کر جاتے ہیں۔۔۔۔۔ زر بخت نے مدہم آواز میں جواب دیا۔
اکثر؟ مطلب کہ پھوپھو ہر وقت بیمار رہتی ہیں؟۔۔۔۔۔ اس
نے سنجیدگی سے اسکی بات کی وضاحت چاہی۔

نہیں زیادہ تو نہیں لیکن ہفتے میں دو سے تین مرتبہ ان کو اب بخار
ہو جاتا ہے، پہلے اس طرح نہیں ہوتا تھا لیکن کچھلے چند ماہ سے
مسلسل ایسا ہی ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ زر بخت نے ٹوٹے ہوئے
انداز میں جواب دیا تھا۔ وہ اپنی ماں کو بیمار دیکھ کے بکھر جاتی
تھی۔ ان کو کھونے کا تصور ہی اس کی جان نکال کے رکھ دیتا

تھا۔ وہ اپنی ساری زندگی میں اپنی ماں کا ساتھ چاہتی تھی جو اس کے پاس اسکے چینے کا واحد سہارا تھا، اس کا آسرا تھی۔

اس بھری دنیا میں زربخت کے پاس صرف ایک ہی سچا اور مخلص رشتہ تھا۔۔۔ اپنی ماں کا۔۔۔ نزہت خان جب بھی بیمار ہوتی تھیں، اس کی سانس حلق میں اٹک جاتی تھی۔ وہ ان کی زرا سی تکلیف پر دھاڑیں مار مار کے رونا شروع کر دیتی تھی۔ اس کی جزباتی طبیعت کو دیکھ کر نزہت خان اکثر اپنی ناساز طبیعت کا اس سے ذکر نہیں کرتی تھی لیکن ان کا پتلا جسم چھوتے ہی وہ خود جان کے تڑپ اٹھی تھی کہ اس کی ماں تکلیف میں ہے۔

مجھے چائے نہیں پینی! تم مجھے بتاؤ پھوپھو کو کسی اچھے ڈاکٹر سے چیک کروایا؟ آئی مین کوئی ٹیسٹ وغیرہ کروائے ان کے؟ کیوں

ان کو اتنا ہر وقت بخار رہتا ہے؟۔۔۔ اس نے زر بخت کی طرف دو قدم لیتے ہوئے فکر مندانہ لہجے سے سوال کئے۔
ہاں مورے نے کچھ ٹیسٹ کروائے تھے۔ وہ ٹیسٹ رپورٹس شہزادالہ کے پاس ہیں، مورے کہتی ہیں کہ سب ٹھیک ہے، بس ایسے ہی موسم کی تبدیلی یا مچھروں کے کاٹنے کی وجہ سے بخار ہو جاتا ہے۔۔۔ وہ معصومیت سے اپنے دوپٹے کا پلو مروڑتی بھولے پن میں بولی تھی۔

پھوپھو کو ہی سارے مچھر کیوں کاٹتے ہیں؟ کیا ان کے ساتھ سوئی ہوئی تم انہیں نظر نہیں آتی؟ وہ تمہیں بھی تھوڑا بہت کاٹ لیا کریں، پھر پھوپھو کم بیمار پڑیں گئی۔۔۔ دمیر خان اس کا معصوم سا جواب سن کے شریر لہجے میں بولتا اپنی مسکراہٹ ضبط کرنے لگا۔

ہائے اللہ! مجھے تو مجھروں سے ڈر لگتا ہے، اتنی زور کا کاٹتے
ہیں، خون نکل آتا ہے اور جلد پہ نشان پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے
تو میں چادر میں چھپ کر سوتی ہوں۔۔۔ وہ جھرجھری لے کر
بچوں کی طرح خفگی سے بولتی اس کو مسکرا نے پہ مجبور کر گئی۔
اب سے تمہیں اور پھوپھو کو مجھ نہیں کاٹیں گئے کیونکہ میں تم
دونوں کو یہاں سے دور لے جاؤں گا۔ کسی جنت میں جہاں
صرف سکون ہوگا اور خوشیاں ہوگی۔ زندگی کی کوئی الجھن، کوئی
پریشانی نہیں ہوگی۔۔۔ دمیر خان پر اعتمادی سے ٹھوس لہجے
میں بولتا اس کو الجھا گیا تھا۔

کیا مطلب؟۔۔۔ وہ اس کی بات سمجھ نہ پائی۔
کچھ نہیں تم اپنا اور پھوپھو کا سامان پیک کرو! میں تم دونوں کو
داعیر کی شادی میں شرکت کرنے کیلئے ریسو کرنے آیا ہوں اور

میں پھوپھو کو بھی کسی اچھے سے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔
تم پریشان مت ہوا کرو، وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ
ان کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پہ قائم رکھے آمین۔۔۔ دمیر
خان نے اپنے چند جملوں میں ہی زربخت اور نزہت خان پہ
پورا حق جتا لیا تھا۔

آمین۔۔۔ اس نے بھی فوراً اسکی دعا پہ آمین کہا تھا۔ وہ
حیرانگی سے اپنی نیلی آنکھوں میں الجھن لئے ایک لمحے کیلئے دمیر
خان کو دیکھ کر رہ گئی تھی جو خود چل کے ان کی خبر لینے آیا تھا۔
وہ ان دونوں کو اپنے ساتھ لے جا کر مان بخش رہا تھا؟ عزت
دے رہا تھا؟ وہ بے اختیار سوچ کر رہ گئی۔ مطلب دمیر خان
ان کیلئے آج بھی ویسا ہی تھا جیسا زربخت نے اس کو بچپن میں
پایا تھا۔ وہ اپنے ساری فیورٹ چیزیں اٹھا کے اس کو دے دیا

کرتا تھا۔ جب وہ کبھی ان کی گھر اپنی ماں کے ساتھ جاتی تھی،
دمیر خان اس چھوٹی سی گڑیا کو اپنی گود میں اٹھا کے پورا دن
گھومتا رہتا تھا۔ وہ جب بھی ان کے گھر جاتی تھی، دمیر پورا
وقت اس کو محظوظ کرنے میں لگا دیتا تھا۔ اس کو چاکلیٹس اور
آئس کریم دلوانے خود لے کر جاتا تھا اور جب زر بخت
چاکلیٹس سے اپنے سارے ہاتھ اور منہ گندا کر لیتی تھی تو دمیر
خان اس کا منہ ٹیشو سے صاف کرنے کی بجائے اپنی شرٹ سے
صاف کرتا تھا۔ اس نے زر بخت کی ڈھیروں بچپن کی تصاویر
کیمروں میں قید کر رکھی تھیں۔ ہر تصویر میں زر بخت کی نیلی
آنکھوں کی چمک دمک واضح تھی۔ اس کا ایک پورا علیحدہ ایلبم زر
بخت اور اپنی بچپن کی یادوں سے بھرا ہوا تھا۔ کہیں وہ کھلہلا
رہی ہے، کہیں پہ وہ اس کی گود میں بیٹھی اس کے گال کھینچ رہی

ہے تو کہیں یہ وہ اپنا چہرہ چاکلیٹ سے بھرے پریشان بیٹھی
ہے۔ وہ جب تین سال کی تھی تب دمیر خان بارہ تیرہ سال کا
سمجھدار لڑکا تھا۔ ناجانے کیوں اس کو یہ نیلی آنکھوں والی گڑیا
شروع سے اچھی لگتی تھی حتیٰ کہ اس کے پیدا ہونے کے بعد
اس کو سب سے پہلے اٹھایا بھی دمیر خان نے ہی تھا۔
اس وقت دمیر اور داعیر خان کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ داعیر
نے تو خوشی سے ناچتے ہوئے میری ڈول میری ڈول کے
نعرے لگانا شروع کر دیئے تھے۔
نو! یہ صرف میری ڈول ہے۔۔۔ ہے نا بابا؟۔۔۔ وہ داعیر کی
بات سنتے ہی اس کو ڈپٹتے ہوئے زربخت کو مزید اپنے سینے میں
بھینچ گیا تھا۔

یہ کسی کی ڈول نہیں ہے، یہ صرف اپنی مورے کی بیٹی
ہے۔۔۔۔۔ اسد اللہ خان نے اپنے دونوں بیٹوں کو مصنوعی
گھوریوں سے نوازتے ہوئے دمیر خان کو جواب دیا تھا۔
بابا!! یہ بیٹی تو پھوپھو کی ہے لیکن ڈول صرف میری
ہے۔۔۔۔۔ دمیر خان اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پکڑتا اسکی
نیلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پر امید سے گویا تھا جبکہ بچوں کی
معصومیت دیکھتے ہوئے اسد اللہ خان اور نزہت خان خوشی
سے مسکرا دیئے تھے۔

خیر یہ بچپن کی باتیں تھیں۔ اب تو ایک عرصہ ہو گیا تھا زر بخت
اور اسکی ماں نے انیسہ خان کی حویلی کی دہلیز بھی پار نہیں کی
تھی۔ جب زر بخت چھوٹی تھی اور اسکے بابا کی ڈیٹھ کو تھوڑا ہی
ٹائم گزرا تھا تو اسد اللہ خان اکثر ان کو اپنے ساتھ اپنے گھر میں

رکھتے تھے، لیکن نزہت خان کی موجودگی وقت کے ساتھ ایسہ
خان کو کھٹکنے لگی تو انھوں نے ان کو صاف لفظوں میں اپنے گھر
سے دور رہنے کی تلقین کی تھی۔ اس کے بعد نزہت خان آج
تک اپنے بھائی کے گھر ایک رات نہیں رکی تھی۔ آج کافی
عرصے بعد وہ پھر سے ان کی حویلی جا رہی تھی۔ نا جانے اب
ان دونوں کو اپنے گھر میں دیکھ کے ایسہ خان کا کیا ری ایکشن
ہوگا یہ تو وقت ہی بتائے گا؟

اسلام علیکم پھوپھو! کیا ہوا ہے آپ کو؟۔۔۔ نزہت خان کو گھر
میں داخل ہوتے دیکھ کر دمیر نے پریشانی سے ان کی طرف
بڑھتے ہوئے سوال کیا۔

و علیکم السلام! میرا بچہ آیا ہے۔ میرا دمیر آیا ہے؟۔۔۔ وہ اس
کو دیکھتے ہی خوشگوار حیرت سے بولتی اپنی طبعیت خرابی کو نظر

انداز کرتے ہوئے تیزی سے دمیر خان کی طرف قدم بڑھانے لگیں۔ وہ بھی انہی کی طرح تیز قدم اٹھاتا ایک جست میں ان کے قریب پہنچتے ہی نزہت خان کو اپنے سینے سے لگا گیا تھا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ وہ دمیر خان کا چہرہ پکڑ کے جابجا لب رکھتی اسے مزید اپنے سینے میں بھینچے عرصے کی جدائی کی تڑپ مٹانے لگی تھی۔

میرا بچہ! کیسا ہے؟ کہاں تھا پورا ایک سال؟ پھوپھو کی یاد نہیں آئی تجھے؟۔۔۔ نزہت خان پھر سے اس کا دائیں ہاتھ پکڑ کر چومتی نروٹھے پن سے شکوہ کرنے لگیں۔ آج اتنے عرصے بعد اپنے بھتیجے کو دیکھ کے ان کے بیمار جسم میں ایک شفا کی لہر دوڑ گئی تھی۔

انسان رشتوں اور اپنوں کے ساتھ کا بھوکا ہوتا ہے۔ وہ ساری
زندگی رشتوں کو ترسی ماں بیٹی آج اپنے گھر کسی اپنے کو دیکھ کر
خوش اور پرسکون ہو رہی تھی۔ دمیر خان کا آنا ان کے ویران
گھر کو آباد کر گیا تھا۔ ایک خوبصورت احساس نے آن گھیرا تھا کہ
کوئی اس بھرے جہان میں ان کا اپنا بن کر آیا تھا اور اپنی
موجودگی سے دلوں کا سارا سوتیلا پن مٹا گیا تھا۔

پھوپھو! آپ کی بہت یاد آتی تھی۔ یوں سمجھ لیں کہ میں آپ کو
ایک پل بھی کبھی نہیں بھولا تھا۔ کل رات کو ہی پاکستان آیا
ہوں اور آج اپنی پھوپھو سے ملنے پہنچ گیا۔۔۔ دمیر خان زر
بخت کو اپنی نظروں کے حصار میں لئیے نزہت خان کے ماتھے پہ
لب رکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں صاف گوئی سے بولا۔

اچھا! اب واپس پردیس نہ جانا۔۔ اپنوں کے ساتھ رہا کرو،
اپنوں سے دوری انسان کو جیتے جی مار دیتی ہے۔ خود کو
اور اپنے سے جڑے لوگوں کو کبھی انتظار کی اذیت سے مت دو
چار کرنا۔ اپنے ملک واپس آجاؤ میرا بچہ! یہی پہ کاروبار کرو، جو
اللہ تعالیٰ کی ذات وہاں رزق دیتی وہ یہاں بھی دے گئی۔ میں تم
لوگوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتی۔ لالہ تو مجھ سے
کبھی ملنے نہیں آتے اور چھوٹا داعیر بھی نہیں آتا، میں ہر وقت
ان کی راہ تکتی رہتی ہوں۔ کوئی مجھ سے ملنے نہیں آتا سوائے
تمہارے، لیکن اب تو تم نے بھی پھوپھو سے ملنا چھوڑ دیا۔
ایک سال بعد شکل دیکھا رہے ہو؟ اپنی پھوپھو کے ساتھ اتنی
زیادتی مت کیا کروں۔ تم لوگ پھوپھو کی جان ہو۔۔ میرے
بھتیجے ہو۔ جب تک زندہ ہوں، میری آنکھوں کو میسر رہا کرو کیونکہ

مجھے اپنے لالہ کا دمیر بہت پیارا ہے۔ تم دونوں بھائی مجھے
زربخت سے بھی زیادہ عزیز ہو۔۔۔ وہ مضبوطی سے دمیر خان
کے دونوں ہاتھ پکڑتی جذباتی انداز میں بولتی چلی گئیں۔
انہیں جتنی محبت اپنے لالہ سے تھی، اس سے کئی گنا زیادہ ان
کے بیٹوں یعنی کہ دمیر اور داعیر خان سے تھی۔ انکی بھیگی آواز،
کرب زدہ چہرہ اور کانپتے ہاتھ انکے اپنوں کیلئے بے لوث محبت کا
ثبوت دے رہے تھے۔ وہ ساری زندگی اپنے لالہ کے شفقت
بھرے لمس سے محروم رہی تھی۔ وہ صرف اتنا چاہتی تھیں کہ
اب ان کے اپنے قریب رہیں۔ اس سے کبھی جدا نہ ہوں۔ وہ
ان پہ حق جتنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے لالہ اور بھتیجیوں کے ساتھ
رہ کر اپنا دکھ سکھ بانٹنا چاہتی تھیں۔

پھوپھو! کیا ہوا ہے آپ کو؟۔ آپ ٹھیک ہیں؟ اور میں وعدہ کرتا
ہوں اب اپنی پھوپھو کو کبھی چھوڑ کے نہیں جاؤں گا۔ جیسا
آپ کہیں گی ویسا کروں گا۔ بابا اور داعیر بھی آپ سے ملنے آیا
کریں گے بلکہ نہیں، آج سے آپ ہمارے ساتھ ہمارے گھر میں
رہیں گئی۔ اپنے دمیر کے ساتھ!!۔۔۔۔۔ وہ انہیں اپنے سینے
سے لگاتے انکے جذباتی پن کو دیکھتے ہوئے نرمی سے یقین دہانی
کرواتا اپنے پن کا احساس دلایا گیا تھا جبکہ ماں کی جذباتی طبیعت
دیکھ کر زربخت کے موٹے موٹے آنسو آنکھوں سے نکل کر
گالوں پہ سفر کر رہے تھے۔ اس کی ماں اپنوں کیلئے ہمیشہ ایسے ہی
تڑپتی تھی جس طرح سے اب تڑپ کے دمیر خان کے سینے سے
لپٹی کھڑی تھی۔ یوں جیسے اگر گرفت ڈھیلی کر گئیں تو دمیر خان

ان سے دور ہو جائے گا۔ اس پہ تضاد وہ اپنی ماں کے دکھی

الفاظ سن کے خود کو رونے سے نہ روک پائی۔

نہیں بیٹا! میں تمہارے گھر میں نہیں رہ سکتی۔ میں اپنے گھر
ٹھیک ہوں، بس تم مجھ سے ملنے آجایا کرو، میری آنکھوں اور
دل کے سکون کیلئے اتنا ہی کافی ہے۔۔۔ وہ متوازن لہجے میں
بولتی دمیر خان کی بات کی نفی کرنے لگیں۔ وہ اس گھر میں کبھی
نہیں رہ سکتی تھی جہاں ان کی عزت نفس کو مجروح کر کے نکالا
گیا تھا۔

تم کیوں رو رہی ہو؟؟۔۔۔ ان کے انکار پہ آنکھیں میچ کر
کھولتے دمیر خان نے تعجب سے زربخت کو مخاطب کیا جو اپنے
آنسو رگڑ کے صاف کرتی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

یہ ایسے ہی پگلی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ رو دیتی ہے۔۔۔ نزہت خان نے ہلکے بھلکے انداز میں بولتے ہوئے زر بخت کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے ان سے علیحدہ ہوتا چھپے ہٹ گیا تھا کیونکہ اس سے جھجھک کر زر بخت اپنی ماں کی طرف نہیں بڑھ رہی تھی۔ اس کے چھپے ہوتے ہی زر بخت تیزی سے نزہت خان سے لپٹ گئی جبکہ دمیر خان دماغ میں اپنی ماں اور باپ کی لاپرواہیاں یاد کرتا افسوس سے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا گیا۔۔

پھوپھو کتنی اچھی اور بے ضرر انسان ہیں۔ پھر مورے ان کے خلاف کیوں ہر وقت محاز کھڑا کئے رکھتی ہیں؟۔۔۔۔۔ دمیر خان اذیت سے سوچتا اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

چلیں پھوپھو! میں آپ کو کسی اچھے ڈاکٹر سے چیک بھی کرواتا
ہوں اور داعیر کی مہندی کے فنکشن کیلئے شاپنگ بھی۔۔۔ وہ
ازلی حکمیہ لہجے میں بولتا پھر سے نزہت خان کو اپنے حصار میں
لئے باہر کی جانب لے کے بڑھ گیا۔

نہیں بیٹا ضرورت نہیں ہے، میں ابھی دوا لیکر آئی ہوں! اب بہتر
محسوس کر رہی ہوں اور شاپنگ کی بھی ضرورت نہیں ہے
ہمارے پاس آج پہننے کیلئے کپڑے ہیں۔۔۔ انہوں نے اس کے
ساتھ چلتے ہوئے دمیر خان کی باتوں پہ نفی کی تھی۔

میں جانتا ہوں کہ آپ کے پاس سب کچھ ہے لیکن میں اپنی مرضی
سے آپ کو کچھ لے کر دینا چاہتا ہوں۔ اب اپنے بیٹے کو انکار کر
کے اس کا دل توڑیں گیں؟۔۔۔ وہ ان کی بات سنی ان سنی
کرتا اٹل لہجے میں بولا تھا۔

میرے لئے تو رکیں، میں اپنا سامان تو اٹھا لوں۔۔۔ اپنی ماں
اور دمیر خان کو باہر بڑھتا دیکھ کر معصوم سی زربخت تندہی سے
بولی تھی۔

کوئی ضرورت نہیں ہے کسی بھی چیز کی! بس چادر اوڑھو اور گھر
کو لاک لگا کے گاڑی میں بیٹھو! نہیں تو یہی پہ چھوڑ کے چلا جاؤں
گا۔۔۔ دمیر خان چھپرے کے رعب دار لہجے میں اس کو حکم دیا
اور اپنی پھوپھو کو لے کر گھر سے باہر نکلا گیا تھا جبکہ زر بخت
جلدی سے خود پہ چادر اوڑھتی کمروں کو لاک لگائے بھاگ کے
گھر سے باہر نکلتی خارجی دروازہ بھی لاک لگائی، اسے لگا کہ شاید
واقعی میں ہی دمیر خان اسے یہی پہ چھوڑ دے گا جبکہ وہ اسکی
پھرتیاں دیکھ کے غیر محسوس انداز میں مسکراتا نزہت خان کو
پاسنجر سیٹ پہ بیٹھاتے ہوئے دروازہ بند کر گیا۔ ٹھیک سے

چادر چہرے پہ کرتے ہوئے زربخت بھی چھلانگ لگا کر گاڑی
میں سوار ہوئی تھی اور دمیر خان دوسری سائیڈ سے آکر ڈرائیونگ
سیٹ سنبھالتا زن سے گاڑی اس چھوٹے سے محلے سے بھگا کر
لے گیا تھا۔

پھوپھو!! آپ ہمارے ساتھ آئیں گی؟۔۔۔ دمیر خان پارکنگ
ایریا میں گاڑی پارک کرنے کی بجائے بالکل شاپنگ مال کے
سامنے کھڑی کرتا، نزہت خان سے استفسار کرنے لگا۔
نہیں بیٹا۔۔۔ تم لوگ جاؤ، میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔۔۔ ومپیار
سے اس کے گال پہ ہاتھ رکھتی بولی تھی۔

اوکے جیسے آپ کی مرضی!! ہم صرف بیس منٹوں میں واپس آ
جائیں گے۔۔۔ دمیر خان ان کو جواب دیتے ہی گاڑی سے نکلتا

سنجیدگی سے زربخت کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرنے لگا۔ وہ ایک نظریات کی طرف دیکھ کر جھجھکتے ہوئے گاڑی سے باہر نکلی تھی۔ دمیر نے نزہت خان کو ڈاکٹر کے پاس چلنے کیلئے بہت منایا تھا لیکن وہ نہیں مانی تھیں، انہوں نے اس کو اپنی صحت سے متعلق صرف باتوں سے مطمئن کر دیا تھا لیکن شاپنگ کیلئے وہ دمیر خان کے خلوص کو منع نہیں کر پائی تھی۔

لالہ!! آہستہ چلیں۔ میں گم ہو جاؤں گی۔۔۔ زربخت تیز قدم لیتے ہوئے دمیر خان کے ہمراہ ہوتی معصومیت سے بولی جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی نظروں سے اوجھل ہو رہا تھا۔

اچھا سوری! آجاؤ، میرے ساتھ رہنا ورنہ گم ہو جاؤ گئی۔۔۔ دمیر خان اس کی آواز سننا رک کے ہلکا سا مسکراتے ہوئے بولا

تھا۔ اس کو زربخت اس وقت کیوٹ سی بچی لگ رہی تھی جو
اس کو اپروچ کرنے کے چکروں میں اپنی سانس پھولا چکی تھی۔
نہیں مجھے گم نہیں ہونا! آپ میرے ساتھ رہئیے گا، میرا ہاتھ نہیں
چھوڑئیے گا۔۔۔ وہ آس پاس اتنا رش دیکھ کر فوراً دمیر خان کا
مضبوط ہاتھ پکڑتی ڈرتے ہوئے بولی تھی۔

میں تمہارا ہاتھ کبھی نہیں چھوڑوں گا اور نہ کہیں گمنے دوں
گا۔۔۔ وہ نرمی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑواتا مدہم آواز
میں بولا تھا۔ وہ زربخت کا ہاتھ بغیر کسی رشتے کے نہیں تھام
سکتا تھا۔ وہ اس کیلئے نامحرم تھا ورنہ اس کا یوں خود سے اپنا ہاتھ
تھامنا اسے بہت اچھا لگا تھا۔ دمیر خان کا دل زوروں سے
دھڑکا تھا لیکن بغیر کسی حق کے وہ اس لمس سے سرور نہیں اٹھا
سکتا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے میں ہی دمیر خان اسکی اور اپنی پھوپھو کی ڈھیر
ساری شاپنگ کر چکا تھا۔ اس نے خوبصورت قیمتی جوڑے
زربخت کی اور زیادہ تر اپنی پسند کے لئے تھے۔ وہ تو اتنے
کپڑے لینے سے انکار کر رہی تھی لیکن دمیر خان جو بھی رنگ
اس کے چہرے کی دلکشی سوچ کے دیکھتا تھا وہی خرید لیتا تھا۔
ساری شاپنگ کرنے کے بعد وہ دونوں مال سے باہر نکل
آئے۔ دمیر خان نے کپڑوں سے لے کر جوتے، جیولری، میک
اپ سب کچھ زربخت کو لے کر دیا تھا اور آج پہلی دفعہ پیسے
خرچ کرتے ہوئے دل کو الگ ہی سکون ملا تھا۔ وہ گاڑی کا پچھلا
دروازہ کھولتا زربخت کو اندر بیٹھنے کا اشارہ کرتا سارے شاپنگ
بیگز باری باری اندر رکھتے ہوئے دروازہ بند کئے ڈرائیونگ
سیٹ کی طرف آتا گاڑی میں سوار ہو گیا۔

ہو گئی شاپنگ؟ زیادہ چیزیں تو نہیں لیں تم نے؟۔۔۔ نہت
خان چھپر خ موڑتے ہوئے زر بخت سے استفسار کرنے
لگیں۔

مورے یہ ساری شاپنگ ہے، آپ دیکھ لیں۔۔۔ اس نے
معصومیت سے جواب دیتے اپنے آس پاس پڑے شاپنگ بیگز
کی طرف اشارہ کیا۔ نازک سی زر بخت اتنے زیادہ شاپنگ بیگز
میں نظر بھی مشکل سے آرہی تھی۔

اتنی زیادہ شاپنگ کیوں کی ہے؟۔۔۔ وہ چھپر بیگز یہ نظر ڈالتی
خفگی سے بیٹی کو دیکھنے لگیں۔

یہ تو بہت تھوڑی ہے پھوپھو! میرا دل تو ابھی اور شاپنگ
کرنے کا تھا لیکن زر بخت نے مجھے روک لیا۔۔۔ اس نے
گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے ان کو مسکرا کر جواب دیا اور گاڑی

کو ٹرن کئے حویلی کی طرف بڑھا تھا کیونکہ باہر اب شام ہو چکی
تھی، حویلی میں سب اس کے منتظر بیٹھے تھے۔۔۔ دمیر خان کو
اپنے ماں باپ کی کئی کالز آچکی تھیں۔

کہاں رہ گئے تھے بیٹا؟۔۔۔ انیسہ خان جو کب سے باہر لان میں
کھڑی دمیر خان کا انتظار کر رہی تھیں، اس کو گاڑی سے نکلتا دیکھ
کر بے تابی سے سوال کیا۔

پھوپھو لوگوں کو لینے کے علاوہ ایک دو اور ضروری کام بھی
کرنے پڑ گئے اس لئے تھوڑا لیٹ ہو گیا مورے۔۔۔ اس نے
نزدہت خان کو اپنے ساتھ لئے ماں کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے
سنجیدگی سے جواب دیا۔

اسلام علیکم بھا بھی! کیسی ہیں آپ؟۔۔۔ نزہت خان جھکتے ہوئے ان کے قریب پہنچتی حال احوال دریافت کر گئی۔
اللہ کا کرم ہے۔ تم بتاؤ نزہت کیسی ہو؟۔۔۔ انیسہ خان رسمی طور پر ان کے گلے لگ کر چھپٹتی چہرے پہ جبراً مسکراہٹ سجا کے بولی تھی۔

میں بھی ٹھیک ہوں۔۔۔ نزہت خان نرمی سے بولی تھی البتہ انھوں نے آج بھی ان کے لہجے کی کڑواہٹ محسوس کر لی تھی جو ان سے ہمیشہ ملتے ہوئے وہ محسوس کرتی تھیں۔
زربخت چھوٹے چھوٹے قدم لیتی لان کی طرف بڑھ گئی۔ وہ حیرانگی سے وسیع و عریض سچی حویلی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ گردن اوپر اٹھائے رنگ برنگی لائٹس کو دیکھنے میں محو ہو گئی تھی، جلتی بجھتی لائٹس اس کی آنکھوں کو اچھی لگ رہی تھیں۔ اگر

کوئی بھی عام انسان اتنی جلتی بجھتی لائٹس کو ایک ساتھ دیکھ لے
تو وہ حیرانگی اور ستائشی انداز میں ہی ان مقیموں کی روشنی میں
ہی کہیں کھو جائے گا۔۔۔ زربخت کے چہرے سے پردہ ہٹا ہوا
تھا۔ دمیر خان اسے بچوں کی طرح لائٹس کی طرف دیکھتا پا کے
نامحسوس انداز میں مسکرا دیا۔ آج پورے دن میں دمیر خان نے
جتنا مسکرا لیا تھا، اتنا تو وہ ایک ہفتے میں بھی نہیں مسکراتا تھا۔
دمیر!! ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔ تم جا کے تیار ہو جاؤ، پھر ہمیں
مہندی کے فنکشن کیلئے ہال میں بھی جانا ہے۔ بیٹے کے چہرے
پہ بکھری مسکراہٹ نوٹ کرتی ایسہ نے چہرے پہ سنگین
تاثرات سجا کر اس کو حکم دیا۔

مورے ابھی تو بہت ٹائم ہے!۔۔۔ اس نے بمشکل اس
حسینہ سے نظریں ہٹا کر اپنی کلائی پہ بندھی گھڑی پہ نظر ڈال کے
ریلیکس انداز میں ماں کو جواب دیا۔

زر بخت!۔۔۔ نزہت خان نے بیٹی کو اپنی طرف متوجہ کروایا
جو پاگلوں کی طرح منہ اوپر اٹھائے لائٹس کو دیکھنے میں محو تھی۔
وہ ماں کی پکار سنتے ہی ان کی طرف بڑھتے ہوئے انیسہ خان کو
سلام کر گئی۔ وہ نخوت سے سلام کا جواب دیتی اس کو گلے
لگائے بغیر اندر کی طرف بڑھ گئی تھی۔۔۔ دمیر نے ماں کا بدلتا
لہجہ بخوبی نوٹ کیا تھا۔

پھوپھو!! آجائیں میں آپ لوگوں کو آپ کا کمرہ دیکھاتا ہوں۔۔۔
وہ ان دونوں کو اپنی طرف متوجہ کرواتا مسکراتے ہوئے بولا
تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ نزہت خان یا زر بخت ایک پل کیلئے

بھی اس کے ماں کے سخت رویے کو لیکر پریشان ہو اس لئے
تیزی سے ان کا دھیان اپنی طرف مرکوز کرواتا ان کو لئے اندر کی
جانب بڑھ گیا جس پہ وہ دونوں ماں بیٹی بھی بنا کچھ بولے اس کے
ساتھ خاموشی سے چل دیں۔

دمیر خان نیچے والے پورشن میں ہی ایک دائیں سائیڈ والے
کمرے کا دروازہ کھولتا ان کو لئے کمرے میں داخل ہوا تھا۔
پھوپھو!! یہ رہا آپ دونوں کا کمرہ ہے، جب تک آپ یہاں موجود
ہیں کسی بھی چیز کی ضرورت ہو مجھے بتائیے گا! کچھ کھانا ہو تو
ملازم سے کہہ کر بلا جھجک بنوا لیجئیے گا۔ یہ آپ کا اپنا ہی گھر ہے
اور میں آپ لوگوں کا سامان اندر بھیجو اتا ہوں۔ آپ دونوں تیار
ہو جائیں! پھر ہم مل کر ہال کیلئے نکلیں گے۔۔۔ وہ نرمی سے

تفصیلی انداز میں انہیں ہدایات دیتا ایک چور نگاہ زربخت پہ ڈال
کر واپسی کے لئے مڑ گیا۔

دمیر بیٹا!! لالہ اور داعیر کہاں ہیں؟ مجھے ان سے ملنا ہے۔۔۔
صوفیہ بیٹھتی نزہت خان نے تیزی سے اس کو روک کر
سوال کیا۔

بابا اور داعیر اپنے کمرے میں تیار ہو رہیں ہوں گے، میں ان کو
بھیجتا ہوں۔ آپ بتائیں؟ آپ کی طبیعت اب ٹھیک
ہے؟؟۔۔۔ ان کے بے رنگ چہرے کو دیکھ کر دمیر خان نے
فکر مند لہجے میں استفسار کیا۔

ہممم!! میری طبیعت اب ٹھیک ہے، کافی بہتر محسوس کر رہی
ہوں اب تو۔ شہزاد دوائی لیتے ساتھ ہی مجھے ادھر کلینک میں کھلا
دیتا ہے۔ بولتا ہے جب تک آپ گھر پہنچے گی تو ٹھیک ہو جائیں گی

اور پھر آپ کو بیمار دیکھ کر آپ کی بیٹی پریشان نہیں ہوگی اور
بلکل ایسا ہی ہوتا ہے میرے گھر پہنچنے تک طبیعت میں بدلاؤ سا آ
جاتا ہے۔ ایسا لگتا جیسے بخار تھا ہی نہیں۔۔۔ وہ زر بخت کی
طرف دیکھتے ہوئے ہلکے ہلکے لہجے میں دمیر کو جواب دے رہی
تھیں۔

یہ تو اچھا کرتا ہے۔ کافی اچھا انسان ہے پھر تو وہ۔۔ میں اس
سے ضرور ملنا چاہوں گا۔ زر بخت تم یہاں بیٹھ گئی ہو؟ جاؤ
لاؤنج میں لڑکیوں کے ساتھ بیٹھو! مہندی لگواؤ۔۔۔ وہ نرمی
سے نزہت خان کو جواب دینے کے بعد متوازن لہجے میں زر
بخت کو باہر جا کر مہندی لگوانے کا حکم کر گیا۔ دمیر چاہتا تھا کہ
وہ یہ شادی ہر لحاظ سے انجوائے کرے اور اسکی ساری حسرتیں
پوری ہو۔۔

نہیں لالہ!! مجھے نہیں لگوانی مہندی۔ مجھے اچھی نہیں لگتی
مہندی۔۔۔ وہ بیزاری سے بولتی نزہت خان کی طرف بڑھی
تھی۔

بیٹا تم جاؤ!! جا کے تیار ہو جاؤ! یہ مہندی نہیں لگوائے گی، سادہ
طبعیت کی مالک ہے۔ اس کو نہیں پسند زیادہ سجنا سنورنا۔
نزہت خان نے بیٹی کی طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکراتے ہوئے
اسکی سادہ طبعیت سے دمیر خان کو آگاہ کیا۔

اوکے جیسے اس کی مرضی! مہندی نہ لگوائے لیکن تیار تو ہو
جائے؟ میں تب تک آپ کیلئے کچھ کھانے کا بھیجو اتا ہوں۔ وہاں
تو کھانا لیٹ ملے گا اور آپ نے دوا لینی ہے تو آپ کا کھانا لیٹ
ہونے کی وجہ سے کہیں طبعیت نہ بگڑ جائے۔۔۔۔ وہ کہتے

ساتھ کمرے سے نکل گیا تھا۔ نزہت خان نے اسکی بات پہ
ہنکارا بھرا۔

مورے!! یہ بیڈ کتنا نرم ہے۔۔۔ اس کے جانے کے بعد زر
بخت آرام دہ بیڈ پہ بیٹھتی اس نرم بستر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے
خوشی سے گویا ہوئی۔ وہ اب ایکسائٹڈ انداز میں اٹھ کے کمرے
کی ہر چیز کو چھو رہی تھی اور ان چیزوں کو ستائشی نظروں سے
دیکھتے ساتھ ہی انکی تعریف بھی کر رہی تھی۔
کمرہ بعد میں دیکھنا، پہلے جا کے تیار ہو جاؤ۔۔ وہ بیٹی کے لہجے میں
حسرت محسوس کرتی اسے نرمی سے وقت کی کمی کا احساس
دلانے لگیں۔

مورے!! میں تیار ہوتی ہوں پہلے آپ مجھے سچی سچی بتائیں کہ
آپ کی طبیعت اب ٹھیک ہے؟۔۔۔ وہ جانچتی نظروں سے

ماں کو دیکھ کر سوال کرنے لگی۔ جب تک زربخت نے تسلی نہیں کرنی تھی کہ اس کی ماں ٹھیک ہے، اسے سکون نہیں آنا تھا۔

ہاں بھئی!! ٹھیک ہوں کتنی دفعہ بتاؤ تم لوگوں کو؟۔۔۔ وہ اب کی بار منہ بنا کر اکتا کے بولی تھی۔۔۔ آج تو بار بار سب کو وہ اپنی طبعیت کے متعلق بتا بتا کے تھک چکی تھی۔

ترخوچی موڑتہ پورہ یقین نہ وی چپ تہ رنبتیا ہم بنہ پی، ترہغہ وختہ بہ موڑیا بیابو بنتنہ کوو (جتنی دفعہ ہمیں یقین نہیں ہو جاتا کہ تم واقع میں ہی ٹھیک ہو اتنی دفعہ ہم پوچھتے رہیں گے)۔۔۔

اسد اللہ خان کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی بھاری پڑتی آواز میں جواب دے گئے۔ ان کے چھپے داعیر خان بھی کمرے میں داخل ہوا تھا۔

لالہ!!۔۔۔ اسد اللہ خان کو دیکھتے ہی نزہت خان انہیں تڑپ
کے پکارتی ان کے سینے سے جا کے لگی تھی۔ وہ ان کے گرد
بانہوں کا گھیرا ڈال کے اپنے محفوظ حصار میں لے گئے۔ آج
اتنے عرصے بعد نزہت خان کو تحفظ کا احساس ہوا تھا۔
”اپنوں کا لمس بڑا تاثیر کن ہوتا ہے، مردہ روحوں کو بھی زندگی
بخش دیتا ہے“

آج کافی عرصے بعد اپنے لالہ کے گلے سے لگ کے وہ اپنے
سارے دکھ درد غم اور پریشانیاں بھول گئی تھیں۔ وہ خود کو
ایک ایسے سایہ دار درخت کے نیچے موجود پارہی تھی جس کی
گھنی ٹھنڈی چھاؤں دکھوں کی گرم جھلستی دھوپ سے اسے
محفوظ کر گئی تھی۔ وہ دونوں بہن بھائی کافی دیر تک بنا کچھ بولے
ایک دوسرے کے حصار میں خاموش تڑپ کے آنسو بہاتے

رہے تھے۔۔۔ اسد اللہ خان شرمندہ اور معذرت آنہ انداز میں
بنا منہ سے کچھ کہے بہن کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔

اس وقت اسد اللہ خان کی آنکھوں میں معافی۔۔۔ شرمندگی۔۔۔
دکھ۔۔۔ پچھتاوا۔۔۔ اور رنجیدگی تھی۔ وہ بنا کچھ بولے اپنے
سارے اعمال کی معافی مانگ رہے تھے۔۔۔ نزہت خان نے
ان کی شرمندہ اور معذرت خواہ نظریں دیکھ کر سارے شکوے
شکایتیں بھلائے مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تھا جو اس
بات کا ثبوت تھا کہ وہ ان کی ساری بے رخیاں اور لاپرواہی پل
میں بھلا گئی تھیں۔

بہنیں ایسی ہی ہوتی ہیں بھائیوں کو دیکھ کر سا لوں کی ناراضگی
جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ نرم دل کی مالک جو ٹھہری
بہنیں۔

ارے واہ!! داڈول خود پرہ لویہ شوی دہ (ارے واہ!! یہ ڈول تو
بہت بڑی ہو گئی ہے)۔۔۔ انہیں ایموشنل ہوتے دیکھ کر
داعیر خان اپنی پھوپھو سے ملتا، اپنے باپ کے سینے سے چپکی زر
بخت کا گلابی گال پچکارتے ہوئے مزاحیہ انداز میں شرارت سے
بولا تھا۔

کہ تہ لہ واہ ہلکی نہ تر خوانی پوری رسپدای شی، نوڈول بہ ولی لویہ
نہ شی؟ (جب تم چھوٹے سے منے سے جوانی تک کا سفر طے کر
سکتے ہو تو ڈول کیا بڑی نہیں ہو سکتی؟)۔۔۔ اسد اللہ خان ہنستے
ہوئے ہلکے ہلکے انداز میں بولے تھے جو باقی سب بھی مسکرا
دئے جبکہ معصوم سی زر بخت ان سب کی توجہ خود پہ محسوس
کر کے جھینپ گئی۔

تھوڑی دیر نزہت خان کے ساتھ گپ شپ لگانے اور ملنے
کے بعد وہ دونوں باپ بیٹا ان کی تیاری کی فکر کرتے ہوئے
کمرے سے نکل گئے تھے جبکہ زر بخت سارے شاپنگ بیگز کھول
کے دیکھتی اپنا اور نزہت خان کا آج کے فنکشن میں پہننے کیلئے
ڈریس تلاش کرنے لگیں۔ سارے شاپنگ بیگز ابھی تھوڑی دیر
پہلے دمیر نے ان کے کمرے میں بھیجوائے تھے۔ وہ ان کا ڈریس
بیگ سے نکال کر بیڈ پہ رکھنے کے بعد اپنا ڈریس ہاتھ میں لئے
واشروم کی طرف بڑھ گئی۔ نزہت خان کو ملازمہ کھانا دے کے
گئی تھی۔ وہ کھانا کھانے میں مصروف ہو گئی تھیں اور زر بخت
ڈریس چینج کئے واشروم سے نکلتی سنگھار میز کے سامنے آکھڑی
ہوئی۔

وہ اس وقت ایش پنک پیروں کو چھوتی فراک میں ملبوس تھی۔
فراک ساری سیمپل تھی، صرف دامن اور بازو پہ شیشے کا کام تھا
جبکہ اس کے ساتھ ملٹی کلر دوپٹہ کام سے بھرا ہوا تھا۔ جا بجا
موتی اور شیشے سارے دوپٹے میں نہایت ہی نفاست سے
پروئے گئے تھے جبکہ دوپٹے کے کنارے گولڈن تلے کی لیس
سے مزین تھے جس کے گولڈن جھالر نما ریشے آگے کی طرف
بکھرے ہوئے تھے۔ دوپٹہ شیشے کے کام کی وجہ سے کافی
وزنی تھا۔

زر بخت میچنگ جیولری، اور اپنی سفید دائیں کلائی میں ڈریس
کے ہم رنگ سترنگی چوڑیاں پہنتی ان کی چھنکار سے محفوظ ہو
نے لگی۔ میک اپ میں صرف کاجل اور لپ اسٹک لگائی تھی۔
اتنی سی تیاری میں ایش پنک فراک کے ساتھ ملٹی کلر دوپٹہ

اوڑھے زر بخت اپنی نیلی گہری آنکھوں کے ساتھ کسی پری کا
گمان دے رہی تھی۔ کاجل میں اسکی آنکھوں کا رنگ مزید نکھر
کے سامنے آیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سمندر کے کناروں پہ
کسی نے سیاہ لکیر کھینچ کے حدیں متعین کر دی ہو۔ زر بخت
رمیز خان اپنے پورے حسن اور نیلی آنکھوں کے ساتھ قیامت
خیز لگ رہی تھی۔

ماشاء اللہ!!۔۔ اللہ میری بچی کو بری نظروں سے بچائے۔۔
نزمیت خان اپنی بیٹی کو پہلی بار اتنی خوبصورتی سے سجادیکھ رہی
تھیں۔ وہ خود کو اس کی نظر اتارنے سے نہ روک پائی۔۔ ان
دونوں ماں بیٹی نے ساری زندگی غریبی میں گزاری تھی۔۔
اتنے مہنگے کپڑے وہ زر بخت کو آج تک نہ دلا سکیں جتنے مہنگے
دمیر خان نے دلائے تھے۔۔ ایسا نہیں تھا کہ مہنگے کپڑوں کی وجہ

سے زر بخت اچھی لگ رہی تھی بلکہ یہ تو اس کا اپنا حسن تھا جو
کپڑوں کو خوبصورت بنا گیا تھا۔ اس لئے تو نزہت خان نے اپنی
بیٹی کی خوبصورتی کی نظر اتاری تھی نہ کہ مہنگے کپڑوں کی۔۔
تھوڑی ہی دیر میں نزہت خان بھی ڈیسنٹ سا سوٹ پہنے تیار
ہو کر زر بخت کو اپنے ساتھ لئے کمرے سے باہر نکلی تھیں۔
لاؤنج میں کھڑی انیسہ خان جو کہ ملازموں سے مہندی کی رسم کا
سارا سامان گاڑی میں رکھوانے کا حکم کر رہی تھی، کمرے سے
نکلتی نزہت خان اور زر بخت پہ انکی نظریں پڑی تو وہی ٹھہر گئی
تھی۔ وہ حیرانگی سے منہ کھولے دونوں ماں بیٹی کی ڈریسنگ دیکھنے
لگی جو آج ان کے لحاظ سے کافی مختلف تھی، نہ صرف مختلف
بلکہ انیسہ خان کے معیار کے مطابق تھی۔۔ لاؤنج میں بیٹھی
تمام لڑکیوں نے ایک نظر بھر کر حسن کی سوگوار زر بخت کو دیکھا

تھا۔ سب لڑکیاں انیسہ خان کی قریبی رشتہ دار تھی۔ ان میں بیٹھی انزہ بزدار نے بھی فون سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے سچی سنوری زربخت کو دیکھا تھا اور چند لمحے نظریں اس کے چہرے پہ ٹھہر گئی۔ ٹھہرنے کی وجہ ڈریس کی خوبصورتی نہیں بلکہ اس کی دلکش نیلی آنکھیں تھی۔

آئی یہ اتنی پیاری لڑکی کون ہے؟۔۔۔ شانزے نے بے ساختہ زربخت کو دیکھتے ہوئے انیسہ خان سے استفسار کیا تھا۔
میری فرسٹ کزن ہے۔۔۔ زربخت!! زربخت رمیز
خان!۔۔۔ جواب داعیر خان نے دیا تھا جو ماں کو بلانے کیلئے اندر آیا تھا۔

نائس نیم!! نام بھی پیارا اور صورت بھی پیاری
ماشاء اللہ۔۔۔ شانزے نے ستائشی نظروں سے زربخت کو
دیکھتے ہوئے کہا۔

ادھر آؤ زربخت میرے پاس۔۔۔ انزش بزدار نے نرمی سے
زربخت کو اپنی طرف بلایا۔ وہ اس کو بچپن سے جانتی تھی، جب
وہ اپنی خالہ کے گھر آتی تھی تب اس کی ملاقات یہی پہ زربخت
سے ہوئی تھی جبکہ داعیر خان نزہت خان کو اپنے ساتھ لئے باہر
گاڑی کی طرف بڑھتا ماں کو باہر آنے کا اشارہ کرنے لگا۔ ایسہ
خان خشک نظروں سے زربخت کو گھورتی رخ موڑ گئی تھی لیکن
وہ ایک طرح سے ان کی اچھی ڈریسنگ دیکھ کے مطمئن بھی
ہوئی تھی کہ کم از کم تقریب میں انکی وجہ سے اسے شرمندگی کا

سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اب ان کو کیا پتہ کہ یہ ڈریس زر بخت کو ان کے اپنے بیٹے دمیر خان آفریدی نے لے کر دیا ہے۔

سب لڑکیاں اپنا میک اپ اور جیولری وغیرہ یہی بکھیریں بیٹھی تھیں، کچھ تیار ہو چکیں تھیں اور کچھ اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دینے میں مصروف تھی۔ انزس نرمی سے زر بخت کو اپنے پاس

بٹھائے اس کا رخ موڑے اس کے سارے بھورے لمبے بال کھول کر برش اور ہئیر کرلر سے کرلزدے کے چھپے پشت پہ کھلے بکھیر رہی تھی اور سامنے کے بال اٹھا کے انہیں چھپے کرتے ہوئے بیڈزپز سے پن کر گئی۔

اب زر بخت سر سے لیکر پاؤں تک خوبصورت لگ رہی تھی، انزس کو وہ ساری پیاری لگی تھی بس اسکے بالوں کا سٹائل ٹھیک نہیں تھا جسے اس نے خود ٹھیک کر دیا تھا۔ انزس بزدار ایسی

ہی لڑکی تھی جو چیز اس کو کہیں ٹھیک نہیں لگتی تھی، وہ اسے
درست کرنے سے زرا بھی نہیں ہچکچاتی تھی۔۔۔ وہ اس وقت
مسٹر ڈیلو فرائک کے ساتھ گرین کڑھائی دار دوپٹے میں بے حد
حسین لگ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد دمیر خان اپنے سیاہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا کمرے
سے نکل کر نیچے کی جانب بڑھنے لگا۔ لاؤنج اب تقریباً خالی ہو
چکا تھا۔ صرف زر بخت اور دو لڑکیاں اور بیٹھی تھیں۔ باقی
سب باہر کی جانب بڑھ گئی تھیں۔۔۔ دمیر خان اس وقت پستہ
گرین شلوار قمیض کے ساتھ ہم رنگ ویسکوٹ پہنے، اپنے وجہیہ
نقوش کے ساتھ بے حد پیارا لگ رہا تھا۔ وہ ابھی آگے بڑھتا
جب اسکی شہد رنگ آنکھوں نے زر بخت کو بے ساختہ تلاش کیا
تھا جو اب صوفے سے اٹھتی اپنا دوپٹہ سنبھال رہی ہے۔ دمیر

خان آفریدی کے قدم زنجیر ہوئے تھے۔ وہ اس کی پسند کے
جوڑے میں اس قدر حسین لگ سکتی تھی؟ اس نے کبھی سوچا
نہیں تھا۔ وہ بنا پلک جھپکائے اس دیکھنے لگا۔

“اے حسینہ! تیرا حسن دو دھاری تلوار ہے
مسکرا کر میں اپنا سر قلم کرواؤں،
کر تو بس ایک نین کا اشارہ۔

تیرا حسین مکھڑا دیکھ کر مصور بھی حیران ہو جائے،
اس کے رنگوں سے کئی گناہ دلکش جو ٹھہرا
یہ تیرے نیلے نینوں کا کنارہ۔

میں ہزار بار تیری مہکشی کا صدقہ اتاروں
تو زمین زادی لگتی ہی نہیں،
تیرا جہان تو ہے پیروں کا سیارہ۔

میں بے رنگ اور پھیکا ہوں
مجھے رنگ دے اپنی حسین ذات کے رنگوں سے،
اے میرے بخت کا روشن ستارہ!

وہ زر بخت کو اپنی نظروں کے حصار میں لئے مدہم آواز میں یہ
چند سطر میں پڑھ کر اس کے حسین چہرے کی تعریف کرتا ہے
ساختمانی اسکی جانب قدم بڑھانے لگا۔ سب لاؤنج سے نکل چکے
تھے صرف زر بخت اپنے دوپٹے میں الجھی ہوئی تھی اور دمیر خان

اسے کے پریوں جیسے حسین مکھڑے میں الجھا ہوا جہان کا ہوش
بھلائے کھڑا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ وقت کو یہی پہ
روک دے، سلسلے تھم جائیں، تمام کام منقطع ہو جائیں،
سانسیں رک جائیں، زر بخت کوئی مورت بن جائے اور ارد گرد
کا ماحول تب تک ساکت رہے جب تک دمیر خان کے دل اور
آنکھوں کی پیاس نہیں بجھتی وہ زر بخت کو پل پل آنکھوں میں بسا
کے دل میں اتار رہا تھا۔

دمیر خان اس کے حسن کو گھونٹ گھونٹ آنکھوں سے پی کے
جسم کو سکون دے رہا تھا۔ ویسے تو جام منہ سے پیا جاتا ہے
لیکن محبت میں جام سب سے پہلے آنکھوں سے پیا جاتا ہے اور
پھر یہ جام وجود کے ہر حصے میں سرایت کر کے محبت کے
جذبے کو پروان چڑھاتا ہے اور یہ عمل اور احساس

اففف۔۔۔ بہت جان لیوا ہوتا ہے لیکن دل کی تسکین بھی
بہت زیادہ ہوتی ہے۔ دمیر خان ابھی تک ندیدوں کی طرح اس
کو پورے استحقاق سے دیکھ رہا تھا۔
اہہ!!۔۔۔ زر بخت نے جیسے ہی آگے بڑھنے کیلئے پہلا قدم لیا،
اس کا دوپٹہ پیروں میں بری طرح الجھا وہ لڑکھڑا گئی۔
بخت!!۔۔۔ وہ اس کی آواز پہ ہوش کی دنیا میں واپس لوٹتا
تڑپ کے پکارتے ہوئے اس کی طرف بڑھا تھا۔ دمیر خان کی
آوازیں فکر مندی اور ڈر کا عنصر واضح تھا۔
بچ گئی ہوں لالہ!! شکر ہے۔ نہیں تو ابھی بناپیسوں کے میرا منہ
زمین کو سلامی دے رہا ہوتا۔۔۔ زر بخت اپنا دوپٹہ پھر سے
سنجھالتی ہنستے ہوئے بولی تھی۔

اہہ!! دمیر کے بچے!! صرف ایک بار دیکھنا تھا لیکن تم تو آنکھیں
پھاڑ پھاڑ کے دیکھنے لگ گئے۔ نظر لگا دی ہے۔ ابھی وہ گر جاتی
تیری گندی نظر کی وجہ سے تو کیا ہوتا؟۔۔۔ دمیر خان دل میں
خود کو ڈپٹا زر بخت کے چہرے سے تیزی سے نگاہیں ہٹا گیا۔
چوٹ تو نہیں لگی تمہیں؟۔۔۔ وہ اس کے پیروں کی طرف دیکھتا
فکر مندی سے پوچھنے لگا۔

نہیں کوئی چوٹ نہیں لگی۔ بس ایسے ہی ڈر کی وجہ سے منہ سے
کراہ نکلی تھی۔۔۔۔ وہ مسکرا کے جواب دیتی بے نیازی سے
اس کے سامنے سے گزر کے باہر کی جانب بڑھ گئی جبکہ دمیر خان
بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ مصروف انداز میں اپنی جیب
سے ڈھیروں پانچ ہزار کے نوٹ نکالے اور زر بخت کو پتہ لگوائے
بغیر اس کے سر سے وار کے اسکی بے مثال خوبصورتی کا صدقہ

اتار دیا۔ دمیر خان کی اس حرکت کی زربخت کو خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ناک کی سیدھ میں دیکھتے آگے بڑھ رہی تھی۔ دمیر خان نہیں چاہتا تھا کہ اس کو کسی کی بھی نظر لگے اس لئے خود اس کا صدقے نکال کے داخلی دروازے پہ کھڑے ملازم کو پیسے تھما گیا۔

زربخت! تہ لہ ماسرہ لاڑشہ، لہ ماسرہ ہجھوک نہ راجھی (زر بخت!! تم میرے ساتھ آجاؤ۔ میرے ساتھ کوئی نہیں آ رہا)۔۔۔۔۔ داعیر خان جو گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا، زربخت کو باہر کھڑا دیکھ کر پشتون لب و لہجے میں اونچی آواز میں اپنی طرف متوجہ کروانے لگا۔

انیسہ اور نزہت خان کو پہلے ہی اسد اللہ خان لے کے نکل چکے تھے۔ باقی سب مہمان بھی چلے گئے تھے، صرف انزش بزدار

کھڑی تھی جس کو داعیر خان نے اپنے ساتھ بیٹھانا چاہا لیکن اس
نے صاف صاف انکار کر دیا کیونکہ اس کو دمیر خان کے ساتھ
جانا تھا۔

راروانہ یم لالہ! (آ رہی ہوں لالا!)۔۔۔ اس کی پکار سنتے ہی زر
بخت معصومیت سے جواب دیتی ایک منٹ میں ہی جا کے
اس کی گاڑی میں سوار ہو گئی۔ زر بخت کے بیٹھتے ہی داعیر خان
گاڑی سٹارٹ کر کے نکل گیا تھا۔ جبکہ دمیر خان جو زر بخت کو
کھڑا کئیے پورچ سے گاڑی نکالنے گیا تھا۔ زر بخت کی جگہ سامنے
کھڑی انزش بزدار کو دیکھ کے حیران ہوا تھا۔

زر بخت کہاں ہے؟۔۔۔ یہاں اپنی آنکھوں کے روشن
ستارے کو کہیں بھی نہ پا کر دمیر نے بے قراری سے انزش سے
استفسار کیا جو اس کی گاڑی کے پاس کھڑی تھی۔

وہ داعیر کے ساتھ چلی گئی ہے۔۔۔۔ انزس بزدار نارمل انداز
میں جواب دیتی گاڑی میں سوار ہوتی دروازہ بند کر گئی۔
چلی گئی؟۔۔۔ دمیر خان اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا کے مدہم
آواز میں خود سے بولتا گاڑی میں سوار ہونے لگا۔ وہ زربخت
کے ساتھ ہی باہر نکلا تھا لیکن ملازموں کو کچھ ہدایات دینا شروع
ہو گیا تھا، اس لئے پورچ تک آتے تھوڑی دیر ہو گئی تھی اور وہ
اتنے سے وقت میں داعیر کے ساتھ جا بھی چکی تھی؟ دمیر خان
کی ساری خوشی اور سارا مزہ غارت ہو گیا تھا جو اس کو زربخت
کو اپنے پہلوں میں بیٹھا کے آنا تھا۔

حویلی سے گاڑی نکالنے کے بعد وہ سنجیدگی سے ناک کی سیدھ میں
ڈرائیونگ کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس نے پورا راستہ
انزس بزدار کو مخاطب نہیں کیا تھا۔ وہ خود ہی باتوں کا سلسلہ

شروع کرتی اور پھر دمیر خان کی طرف سے جواب نہ پا کے
خاموش ہو جاتی تھی۔

ہال پہنچتے ہی سب لڑکیوں کو دمیر خان نے رعب سے اندر
جانے کا اشارہ کیا تھا کیونکہ باہر سب لڑکے جمع تھے جن میں
زیادہ تر داعیر خان کے دوست تھے۔ داعیر خان کے دوستوں کی
تعداد زیادہ تھی جبکہ دمیر خان دوستیاں زیادہ نہیں کرتا تھا، اس
کے صرف چند گنے چنے دوست تھے۔ اس کے دوست تعداد
میں کم تھے مگر تھے بہت خاص۔۔۔ داعیر کے دوست فائرنگ اور
آتش بازی میں مصروف اپنے یار کی خوشی دھوم دھام سے منا
رہے تھے۔ اسد اللہ خان اپنے پیٹے کے کھلتے چہرے کو دیکھ کر
دل سے مسکراتے عام بزدار کے ساتھ اندر کی طرف بڑھ گئے۔

اپنے لالہ سے پہلے شادی کرتے ہوئے تجھے شرم تو زرا بھی نہیں
آ رہی ہوگی۔۔۔ داعیر خان کا دوست اشعر اسکے کندھے پہ مکا
جھڑتے ہوئے مصنوعی خفگی سے بولا تھا۔

افکورس! داعیر خان آفریدی کا شرم سے کوئی لینا دینا نہیں ہے
کیونکہ حد سے زیادہ شرم، نصیب کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے
اور لالہ کو شادی کرنی ہی نہیں ہے تو پھر میں کیوں ان کی شادی
کے انتظار میں اپنے ننھے منے بچوں کو انتظار کی سولی پہ
لٹکاؤ؟۔۔۔ داعیر خان اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتا بے باکی اور
لاپرواہی سے بولتا سب کو منہ کھولنے پہ مجبور کر گیا۔

کس نے کہا کہ میں شادی نہیں کروں گا؟۔۔۔ دمیر جو ان سے
کچھ فاصلے پہ کھڑا کاظم شاہ کی غیر موجودگی محسوس کر کے اس کو
کال ملا رہا تھا، داعیر کی بات سن کے مداخلت کئے بنا رہ نہ پایا،

اس کی آواز میں ایک ازلی رعب تھا جس نے سب دوستوں کی
زبانوں کو بند کروایا تھا۔

شادی بھی کروں گا اور تجھے اپنے بچوں کا چاچو بھی بناؤں گا!
بیشک شادی تو مجھ سے پہلے کر رہا ہے مگر باپ بننے کا آغاز مجھ
سے پہلے حاصل نہیں کر پائے گا۔۔۔ ان سب کا سائلنٹ موڈ
ایکٹو ہوتے دیکھ کر دمیر خان مدھم سا مسکایا اور داعیر کے انداز
میں ہی جواب دے کر اس کی زبان کو بند کروا گیا جو شوخی سے
بڑکیں مار رہا تھا۔۔۔

دمیر خان سنجیدہ طبیعت کا مالک تھا۔ وہ کبھی بھی ایسی باتیں
نہیں کرتا تھا۔ لیکن داعیر خان کو چپ کروانا ضروری تھا۔ اسلئے
وہ ایسی بات کر گیا تھا۔

تو پھر کیا آپ اس کی شادی کینسل کروانے کا ارادہ رکھتے ہیں
لالا؟۔۔۔ اب کی بارتابش نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے
سنجیدگی سے دمیر خان کو مخاطب کیا۔ وہ ڈھکے چھپے انداز میں
اسے مشورے سے نواز رہا تھا۔

ہاں ایسا ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ نہ شادی ہوگی، نہ بچے پیدا ہوں
گے۔۔۔ دمیر خان بالوں میں ہاتھ پھیر کر مزے سے بولتا داعیر
خان کو تلملانے پر مجبور کر گیا تھا۔۔

استغفر اللہ!! پہلے ہی میں اتنی مشکلوں سے اس مقام تک پہنچا
ہوں اور اب تم لوگ عین وقت پر رنگ میں بھنگ نہ
ڈالو!! مجھے سکون سے گھوڑی چڑھنے دو۔۔۔ داعیر خان کلستے
ہوئے اپنے دوستوں کو جھڑکنے لگا۔ شادی کینسل ہونے کا سن
کر ہی اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

نہ!! ہم نے تجھے اتنی آسانی سے گھوڑی نہیں چڑھنے دینا۔ پہلے ہمیں گارنٹی دے کہ تو لالہ سے پہلے بچے پیدا نہیں کرے گا اور اپنے جوان جذبات کو ہر صورت لگام ڈالے گا۔۔۔ فہد کمینگی سی مسکراتا بے شرم بات بے نیازی سے کر گیا تھا۔

اہم اہم!! جذبات پہ لگام کون ڈال سکتا بھلا؟ اور پھر داعیر ہو تو لگائیں ٹوٹ جائیں گئی لیکن قابو نہیں ہونگی۔۔۔ اب کی بار فیضان ہمسے ہوئے زو معنی انداز میں بولا کیونکہ وہ داعیر کی بے شرمی کا لیول بہت اچھے سے جانتا تھا۔

داعیر خان نے جذبات بے قابو ہونے والی بات پہ فخریہ انداز میں اپنی گردن اونچی کی تھی جیسے گولڈ میڈل ملنے والا ہو۔ اور مجھے بے لگام گھوڑے کو نکیل ڈالنا بھی آتا ہے اور اسے اسٹبل میں باندھ کر بھوکا مارنا بھی۔۔۔ دمیر خان نے اتراتے

ہوئے داعیر کی پچھلی گردن نرمی سے دبوتے ہوئے دبدبے سے
باور کروایا۔

گھوڑا؟ سیریسلی لالہ۔۔۔ داعیر خان کی اتنی بے عزتی پہ اس
کے سب دوست دمیر خان کی بات پہ حیران ہوتے بے ساختہ
قمقے لگا اٹھے تھے۔

دانت مت نکالوں سالو ورنہ توڑ کے ہاتھ میں تھما دوں گا۔۔۔
انہیں ہنستے دیکھ کر داعیر ناک سکوڑ کر دانت کچکچاتے ہوئے
غرایا، ایک دمیر ہی اس کا منہ بند کروا سکتا تھا اور کسی میں اتنی
جرات نہیں تھی۔

لالہ!! اس کو گھوڑی نہیں چڑھانا تو نہ چڑھائیں مگر بے چارے کو
گھوڑا تو نہ بنائیں۔۔۔ فہد اپنے پیٹ پہ ہاتھ رکھے جان بوجھ کر
زور سے ہنستے ہوئے دمیر کو اپنی طرف متوجہ کروانے لگا۔

اب کیا کر سکتے ہیں؟ بے لگام گھوڑے کو لگام ڈالنی پڑتی ورنہ وہ
بگڑ کر خود کے ساتھ دوسروں کا بھی بیڑا غرق کرتا ہے۔۔۔ اپنے
بھائی کا پھولتا منہ دیکھ کر دمیر خان اپنی مسکراہٹ دباتا مصنوعی
افسردگی سے بولا۔

لالا!!۔۔۔ داعیر خان نے چہرہ ترچھے کر کے شکوے سے دمیر
کو دیکھا جو اس کے دوستوں کے سامنے اس کا ریکارڈ لگا رہا تھا۔
وہ جواباً آئی رول کرتے ہوئے سادگی سے کندھے اچکا گیا۔
چل میرے گھوڑے ٹک ٹک ٹک!! چل میرے گھوڑے ٹک
ٹک ٹک۔۔۔ داعیر خان کے سارے دوست اس کی طرف
دیکھتے ہوئے اونچی آوازیں بولتے اسے چڑانے لگے۔

والا! شئی تاسی تول!! تول بی غیرتہ یاست! (دفعہ ہو جاؤ تم
سب!! سب کے سب بے غیرت ہو)۔۔۔ داعیر خان غصے

سے جبرے بھیج کر انہیں پشتوں میں گالیاں بکتا فہد اور اشعر کو
ایک ایک مکا جھڑے اندر کی جانب بڑھ گیا کیونکہ جب تک اس
نے یہاں کھڑے رہنا تھا، اس کے دوستوں نے ایسے ہی اسے
تنگ کرتے رہنا تھا۔

ابے!! رک داعیر! بات سن۔۔۔ اشعر نے ہانک لگائی مگر وہ
سنی ان سنی کر گیا۔ داعیر کے سب دوست ہنستے ہوئے اس
کے چھبڑھے تھے جبکہ دمیر خان سر جھٹکتا ایک دلکش
مسکراہٹ کے ساتھ اندر کی طرف بڑھ ہی رہا تھا جب اس کا
ٹاکر ارائم خان بارکزی سے ہوا۔

پنخیر را غلے (خوش آمدید)۔۔۔ دونوں نے یک زبان ہو کر
مسکراتے ہوئے ایک جیسے الفاظ دہرائے اور آگے بڑھ کر

خوشدلی سے بغلگیر ہوئے۔ جوہ دونوں آج کافی وقت بعد مل
رہے تھے کیونکہ دمیر پاکستان آتا ہی کب تھا۔
دمیر خنگہ پی؟ (کیسے ہو دمیر؟)۔۔۔ رائم نے عنابی لبوں پہ تبسم
سجاتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔ وہ سرخ و سفید رنگت اور
وجیہ نقوش کا مالک تیس سالہ بھرپور جوان مرد مہرو خان کا بڑا
بھائی تھا۔

ستا مخ تہ ولا یریم! نو وایہ! خنگہ یم؟ (تیرے سامنے ہوں! تو بتا کیسا
ہے؟)۔۔۔ دمیر نے ہلکے بھلکے سے انداز میں جواب دیا۔ وہ
دونوں ایک دوسرے کا حال احوال پوچھنے کے بعد ایونٹ کی
تیار یوں کے متعلق باتیں کرتے ہوئے دوستوں کی طرف بڑھ
گئے۔

تھوڑی ہی دیر بعد داعیر خان کو عورتوں والی سائیڈ لایا گیا تھا۔
سیج کو بہت ہی خوبصورتی سے گیندے کے پھولوں سے سجایا
تھا۔ مہر خان کو ریڈ جھالردار دوپٹے کی چھاؤں میں سیج تک لایا
گیا تھا۔ دوپٹے کے چاروں کونوں کو لڑکیوں نے اوپر کی طرف
اٹھاتے ہوئے پکڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ مکمل ڈھکا ہوا تھا۔ وہ
اس وقت مسٹر ڈیلو کرتی کے ساتھ ملٹی کلر لہنگے میں ملبوس
تھی۔

کرتی اور لہنگا ستارے کے کام سے بھرا ہوا تھا جبکہ سر پہ نیٹ کا
لائٹ گرین دوپٹہ اس کے ڈریس کو چار چاند لگا رہا تھا۔ سفید اور
گلابی پھولوں کے گجرے دونوں کلائیوں پہ چوڑیوں کے ساتھ پہنے
ہوئے تھے۔ مہر خان اس قدر حسین لگ رہی تھی کہ اگر وہ

اپنے چہرے سے پردے ہٹا دیتی تو داعیر اس کو اپنی پسند کے
لہنگے میں دیکھ کے کنگ ہوتا اپنا آپ بھول جاتا۔
داعیر خان بھی کچھ کم نہیں لگ رہا تھا۔ وہ سفید شلوار قمیض میں
ملبوس اس پر مہر خان کے لہنگے کے ساتھ میچنگ ملٹی کلر
ویسکوٹ پہنے اپنی شہد رنگ آنکھوں اور پرکشش نقوش کے
ساتھ کوئی شہزادہ معلوم ہو رہا تھا۔ مہر خان کو سٹیج پہ لانے کے
بعد مہندی کی رسم کے لئے مردوں والی سائیڈ سے رائم خان
اپنے والد کے ساتھ اٹھ کے عورتوں والی سائیڈ پہ آگیا
تھا۔ اسد اللہ خان، عامر بزدار اور دمیر خان پہلے ہی یہاں موجود
تھے۔

مہندی کی رسم باقاعدہ طور پر شروع کی گئی تھی سب سے پہلے
مہرو النساء کے گھر والوں نے داعیر اور مہر کو مہندی لگائی تھی

اور پھر انیسہ خان نزہت، انزش اور باقی سب نے باری باری
مہندی کی رسم ادا کی تھی۔ جو بھی مہندی لگانے کے بعد
مہر خان کو مٹھائی کھلانے کیلئے گھونگھٹ تھوڑا سا ہٹاتا، داعیر
خان متجسس ہو کے اسکی طرف دیکھتا کہ کہیں سے تھوڑا سا
دیدار نصیب ہو جائے لیکن نہیں!! سب بہت احتیاط سے
گھونگھٹ کے نیچے سے مٹھائی کھلا رہے تھے۔ یہ بات داعیر خان
کی اضطرابی کیفیت میں اضافہ کر رہی تھی۔۔

رائم خان کی نظریں بار بار بھٹک کے انزش بزدار پہ ٹھہر رہی
تھی۔ یوں کہا جائے کہ وہ صرف انزش بزدار کو دیکھنے میں ہی
مصروف تھا تو غلط نہیں ہوگا۔۔ وہ سیاہ شلوار قمیض میں
ملبوس گلے کے گرد آف وائٹ اجرک لئے تقریب میں موجود
سب لڑکیوں کی نظروں کا مرکز بن رہا تھا لیکن رائم خان کی

کر سٹل گرے آنکھیں بار بار انزش بزدار کے حسین مکھڑے کو
اپنی نگاہوں کا مرکز بنا رہی تھی۔

ولی زما پیغامو نو تہ جواب نہ ور کو پی؟ (جواب کیوں نہیں دے رہی
ہو میرے پیسیجڑ کا؟)۔۔۔ سب کے مہندی لگانے کے بعد
داعیر خان مہندی کے باؤل سے تھوڑی سی مہندی اٹھا کے غیر
محسوس انداز میں مہر خان کے ہاتھ پہ لگاتا اس کے کان میں سر
گوشی کرنے لگا۔

موری منع کر ہی وہ، پہ مایو کی ددولہ مخ نہ بنی (مورے نے منع
کیا تھا۔ مایوں میں دلہے کو چہرے نہیں دیکھاتے)۔۔۔ مہر خان
نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے مدہم آواز میں جواب دیا،
ساتھ ہی ہاتھ بھی چھڑوانا چاہا مگر اس کی گرفت مضبوط تھی۔

مخ بنودل منع دي، خو خبرې كول خونہ دي! ماتہ نن شپہ، تر خو چي
زہ کورتہ رسيرم، ستا ددي لہنگا ډپر عکسونہ پہ ہر انداز کي پکار دي!
او ستا ډيغامونو خواب نہ ورکولو بي ادبي سزا بہ سبا شپہ، د سود سرہ
در کرم! (چہرہ دیکھانے سے منع کیا ہے بات کرنے سے تو نہیں!
مجھے آج رات گھر پہنچنے سے پہلے تمہاری اس لہنگے میں ڈھیر ساری
تصاویر چاہئیں ہر یوز میں! باقی تمہاری سیسجز کا جواب نہ دینے
والی گستاخی کی سزا کل رات سود سمیت تمہیں دوں گا)۔۔۔
داعیر خان پھر سے اس کے کان کے قریب جھک کر بے باکی
سے دھمکی لگانے لگا۔۔ اس کی بات سن کے مہر خان کی گردن
میں ڈر کے مارے گلٹی ابھر کے معدوم ہوئی تھی۔ وہ اس کے
انداز سے واقف تھی۔ وہ چھوٹی موٹی جسارتوں سے اسکی جان
حلق میں اٹکا کے رکھ دیتا تھا جب وہ پوری طرح اس پہ قابض ہو

گیا تب نازک سی مہر کا کیا ہوگا؟ یہ سب کچھ محض سوچ کر مہر
خان اسکو جواب دینے کی بجائے خاموشی اختیار کر گئی۔

سب لڑکیوں نے مل کے تھوڑی دیر شغل لگایا تھا۔۔۔ انزس
بزدار ان سب کے ساتھ مہندی کی تقریب انجوائے کر رہی تھی
جبکہ زربخت خاموشی سے کونے والے ٹیبل پہ بیٹھی سب کو
بس مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔۔۔ دمیر خان
کی متلاشی نگاہیں جب اس پہ پڑی تو وہ اس کو اکیلا اور خاموش
دیکھ کے فوراً اسکی طرف بڑھا تھا۔

زربخت خہ چل دی؟ خوند نہ راخی؟ (کیا ہوا زربخت؟ مزہ نہیں
آ رہا؟)۔۔۔ دمیر خان نے اس کے سر پہ پہنچ کر اپنی بارعب
اور پیاری آوازیں سوال کیا۔

نہ لالہ! خوند راحی (نہیں لالا! مزہ آرہا ہے)۔۔۔ اس نے گردن
اٹھا کے اونچے لمبے دمیر خان کو جواب دیا تھا۔ دمیر پاس پڑے
گجروں کے تھال سے دو گجرے اٹھا کے زربخت کی طرف
بڑھا۔

واغوندہ!! ستا متونہ بی لہ کلونو بنہ نہ بنکاری (پہن لو!! تمہاری
کلائیاں پھولوں کے بغیر اچھی نہیں لگ رہی)۔۔۔ دمیر نے
اسکی خالی کلائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سنجیدگی سے اس
کو گجرے تھمائے۔

داوگورہ! ماخو رٹکارنگ بنکری اغوستی دی (یہ دیکھیں! میں نے
رنگ برنگی چوڑیاں پہنی ہوئی تو ہیں)۔۔۔ زربخت اپنا چوڑیوں
والا بازو آگے کرتی اسے چمک کر بتانے لگی۔

خو کہ دامتونہ گجری واغوندي، نولابہ ہم بنکلی بنکاری (لیکن یہ
کلائیاں اگر گجرے پہنیں گی تو اور بھی اچھی لگے گی)۔۔۔ اس
کی مسکراہٹ دیکھ کر دمیر خان کی سنجیدگی ہمیشہ کی طرح ہوا ہو
گئی تھی، اس نے اب کی دفعہ محبت بھرے لہجے میں اصرار کیا
تھا۔

او کے لالہ! پہن لیتی ہوں۔۔۔ وہ اس کے ہاتھ سے گجرے
لے کر اپنی کلائیوں کی زینت بنانے لگی اور وہ میا سی آنکھوں سے
اسے دیکھنے لگا۔

بنہ بنکاری؟ (اچھے لگ رہے ہیں؟)۔۔۔ زربخت اپنے دونوں
بازو اس کے سامنے کرتی خوشی سے پوچھنے لگی۔

ہو! دہر بنکلی بنکاری (ہاں! بہت اچھے لگ رہے ہیں)۔۔۔۔۔
دمیر خان نے مدہم آواز میں جواب دیتے ہوئے اپنے بالوں میں

ہاتھ پھیرا۔ اگر وہ اس پہ حلال ہوتی تو اس کی اپنی طرف بڑھی
کلائیوں کو لبوں کے لمس سے نواز کے بتاتا کہ کتنے اچھے لگ رہے
ہیں یہ گجرے۔

وہ اس کے ساتھ ہلکی پھلکی باتیں کرنے کے بعد مردوں والی سائیڈ
گیا تھا۔ سب مہمان کھانے کا چلے تھے۔ مہندی کی تمام
رسومات بھی ادا ہو چکی تھیں۔۔۔ تھوڑی دیر بعد مہر خان کے گھر
والے اس کو لئے گھر واپس چلے گئے تھے جبکہ باقی سب مہمان
بھی آہستہ آہستہ ہال سے نکل رہے تھے۔

رات کافی ہو گئی تھی۔ نزہت خان واپسی میں داعیر خان کی
گاڑی میں بیٹھی تھیں۔ انیسہ خان اپنے شوہر کے ساتھ سوار
تھیں جبکہ انرش اپنے بابا کے ساتھ تھی کیونکہ ہال آتے ہوئے
دمیر خان نے اسے کافی بور کیا تھا اور ویسے بھی اسے اب اپنے

باپ کے ساتھ بیٹھنا تھا جبکہ زر بخت کو دمیر خان پہلے ہی اپنی گاڑی میں بیٹھا چکا تھا تاکہ وہ اب کی بار کسی اور کے ساتھ سوار نہ ہو سکے۔ دمیر خان تمام مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد اپنی گاڑی کی طرف واپس آیا تھا۔

چلیں؟۔۔۔ دمیر خان گاڑی میں بیٹھتا سیٹ بیلٹ باندھتے ہوئے مصروف انداز میں بولا تھا۔ اس نے زر بخت کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ جو منہ وندو سائیڈ کی طرف کئی آنکھیں موندے ہوئی تھی۔

زر بخت۔۔۔ اس کی طرف سے جواب نہ پا کر دمیر خان نے اسکی طرف دیکھتے ہوئے پھر سے مخاطب کیا تھا۔ لیکن جواب ندارد۔۔۔ وہ تفتیشی نظروں سے اس کی طرف جھکا تھا۔ اسکی

طرف ہلکا سا جھکتے ہی زر بخت کی چھوٹی چھوٹی چلتی سانسوں کا
شور سنائی دیا تھا۔

زر بخت ویدہ شوی؟ (زر بخت تم سوگی ہو؟)۔۔۔ دمیر خان
نے تصدیق کرنی چاہی۔ کچھ سیکنڈ انتظار کرنے کے بعد زر
بخت کی طرف سے جواب نہ پا کر وہ بے حد احتیاط سے اس کا
رخ اپنی طرف موڑتا اسکی سیٹ کی پشت کو تھوڑا نیچے کی طرف
ڈاؤن کر گیا تاکہ وہ کمفرٹبل ہو کے سو سکے۔۔۔ اسے یوں بچوں
کی طرح سوتے دیکھ کر دمیر خان اسکے نورانی چہرے سے نظریں
مشکل سے ہٹاتا مبہم سا مسکراتے ہوئے گاڑی سٹارٹ کرنے
لگا۔

زر بخت کو جلدی سونے کی عادت تھی گھر میں وہ نو بجے تک سو
جاتی تھی، آج تو اتنی دیر تک جاگتی رہی تھی، یہ اس کی ہمت

تھی۔ گاڑی میں بیٹھتے ساتھ ہی وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی تھی۔ دمیر خان نے بیس منٹ کا راستہ آہستگی سے ایک گھنٹے میں طے کیا تھا۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ یہ سفر کبھی ختم نہ ہو، زر بخت یونہی اس کی آنکھوں کے سامنے رہے اور وہ کبھی نہ ختم ہونے والے لمبے روڈ پہ گاڑی چلاتا جائے۔

گھر پہنچتے ہی دمیر خان نے ناچاہتے ہوئے بھی اس کو نیند سے بیدار کیا تھا۔ تاکہ وہ اندر چل کے آرام کر سکے۔ وہ اسے فلحال اٹھا کے اندر نہیں لے جاسکتا تھا، اس لئے اس کی نیند میں خلل ڈالنا بہتر سمجھا تھا۔ زر بخت اپنی آنکھیں مسلتی گاڑی سے اتر کر اندر کی جانب گئی تھی جبکہ وہ بھی گاڑی پورچ میں کھڑی کرتا اس کے ہمقدم ہو گیا۔ نیند تو اسے بالکل بھی نہیں آئی تھی اور نہ ہی

آج رات آنی تھی بلکہ زربخت میڈم اب اسکی ساری راتوں کی
نیندیں چرا چکی تھی۔

داعیر خان اپنے کمرے میں آتے ساتھ ہی چینج کرنے کی غرض
سے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی وہ وارڈروب سے اپنا
نائٹ سوٹ نکال ہی رہا تھا جب باہر بیڈپہ پڑا اس کا فون میسیجز کی
بیپ سے تھر تھرایا۔ وہ میسیجز موصول ہونے کی بیپ سننا تیزی
سے اپنے ہاتھ چلا کر چینج کرنے کے بعد ڈریسنگ روم سے باہر
نکل آیا۔ وہ عجلت میں خوشی سے چہکتا ہوا بیڈپہ چھلانگ لگا کے
گرا تھا اور سائیڈ ٹیبل سے اپنا فون اٹھائے اوندھا منہ ہو کر اپنی
کہنیاں تکیہ پہ جمائے فون سامنے کرتا میسیجز چیک کرنے لگا۔

سامنے سکرین پہ "نور چشم" کی طرف سے بیس فوٹوز موصول ہوتی دیکھ کے داعیر خان کی شہد رنگ آنکھوں چمکی تھی۔ وہ تیزی سے اس کی چیٹ اوپن کرنے لگا۔ چیٹ اوپن ہوتے ہی کچھ سکینڈز فوٹوز لوڈ ہونے کے بعد واضح ہوئی تھی۔ پہلی فوٹو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں حیرت اور غصے سے پھیل گئیں۔ وہ ساری بیس فوٹوز ایک ایک کر دیکھتا غصے سے اپنا نچلا لب زور سے دانتوں تلے دبا گیا۔

اسکی نور چشم یعنی مہر خان نے ساری فوٹوز گھونگٹ میں بھیجی تھیں۔ کسی بھی فوٹو میں اس کا چہرہ دیکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فوٹوز گھونگٹ میں تھی جس میں اس کا چہرہ تو کیا گردن بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ داعیر خان کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ وہ کتنا خوش ہوا تھا کہ اس کی نور چشم نے اس کیلئے اپنے چہرہ

کے دیدار کا تحفہ بھیجا ہے لیکن آگے سے نکلا کیا؟ گھونگھٹ میں

چھپا چہرہ؟

نورِ چشم!! یہ کیا مزاق ہے؟ سیدھے طریقے سے بھیجیو۔۔۔۔۔
داعیر خان نے فوراً ٹیکسٹ ٹائپ کر کے سینڈ کر دیا۔ وہ جو کب
سے اسکی چیٹ اوپن کئے داعیر خان کے رد عمل کا ویٹ کر رہی
تھی۔ اس کی طرف سے رونے والے ایموجیز کے ساتھ ٹیکسٹ
دیکھ کے کمینگی سے مسکرائی تھی۔ اس نے جان بوجھ کے اسکو
تڑپانے کیلئے ایسی فوٹوز سینڈ کی تھیں تاکہ وہ اسکی تڑپ اور بے
قراری کو تھوڑا انجوائے کر سکے۔

داعیر! کیسے بھیجیوں؟۔۔۔۔۔ مہر خان نے فوراً معصوم شکل والے
ایموجیز کے ساتھ سوال کیا۔

سیدھے طریقے سے بھیجو! مجھے چہرہ دیکھنا ہے۔ اپنے نورانی
چہرے کا دیدار کرواؤ میری جان۔۔۔ داعیر نے بے قراری
سے اسے کے ٹیکسٹ پہ ریپلائے کیا۔

اچھا داعیر ویٹ آمنٹ۔۔۔ مہر خان نے جواباً انتظار کرنے کا
کہا۔ داعیر اسکے ٹیکسٹ پہ تھمب ری ایکٹ کرتا خوشی سے نئی
فوٹوز آنے کا انتظار کرنے لگا۔ ایک منٹ بعد پھر سے دو فوٹوز

موصول ہوئی تھیں اور یہ فوٹوز بھی ہائیڈ فیس کے ساتھ
تھی۔ ان کو دیکھتے ہی داعیر خان کو اب واقعی میں غصہ آ رہا تھا۔
مہر!! تم کیا چاہتی ہو کہ آج رات ہی اپنے سسرال آکر تمہارے
اس گستاخانہ رویے کی سزا دوں؟۔۔۔۔۔ داعیر خان دانت
کچکچاتے ہوئے پھر سے مہر کو غصے والے ایموجیز کے ساتھ
ٹیکسٹ سینڈ کر گیا۔ وہ جو پھر سے سیم فوٹوز بھیج کر ہنس ہنس کر

پاگل ہو رہی تھی۔ اس کا سپلائے پڑھتے ہی اس کی حالت سوچتے ہوئے اسے مزید ہنسی آرہی تھی۔ وہ اپنی ہنسی کنٹرول کرتی پھر سے ٹیکسٹ لکھنے لگی۔

داعیر! آپ نے ہی تو کہا تھا کہ مجھے اس لہنگے کی ہرپوز میں فوٹوز چاہئیے۔ تو میں نے آپ کو ہرپوز میں اس لہنگے کی فوٹوز بھیج دی ہیں۔ آپ نے میرے چہرے کا ذکر ہی نہیں کیا تھا۔۔۔ مہر خان نے معصومیت سے انجان بنتے ہوئے جواب دیا حالانکہ داعیر نے اس لہنگے میں اسکی فوٹوز کی بات کی تھی لیکن وہ جان بوجھ کے اسے پتانے کیلئے داعیر خان کی کہی گئی بات کو پکڑ گئی تھی۔

میں نے اس لہنگے میں تمہاری فوٹوز کہی تھی نہ کہ یہ کہا تھا کہ لہنگے کی اٹھا کے فوٹوز بھیج دو۔۔۔ داعیر خان نے کلستے ہوئے اس مرتبہ

وائس یسج سینڈ کیا۔ اس نے اس کی غصے والی وائس سنتے ہی
اپنی ہنسی کو بریک لگالی تھی کیونکہ وہ اس کی لہجے میں بے حد
طیش اور سنجیدگی بھانپ گئی تھی۔

اب فوٹوز بھینچنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں تمہاری سزا سوچ
چکا ہوں، جو میں تمہیں کل رات تمہاری روح میں اتر کے دوں گا
نورِ چشم! اس جرم کی سزائیں دو راؤنڈ ایکسٹرا لگاؤں گا۔۔۔
داعیر خان نے بے باکی سے بولتے ہوئے پھر سے وائس یسج
سینڈ کیا۔ وائس نوٹ سنتے ہی مہر خان کے گال دھک کے انگارہ
ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ شرم اور ڈر سے سرخ ہوا تھا۔ وہ ابھی
داعیر خان کا وائس نوٹ سن رہی تھی جب اس کی طرف سے
ون ویو پہ ایک ویڈیو موصول ہوئی۔ مہر وائس نوٹ چھوڑ کے
متجسس ہوتی ویڈیو اوپن کرنے لگی۔ ویڈیو میں داعیر خان بنا

شرٹ کے بیڈ پہ لیٹا اپنے چٹانی سینے کی نمائش کرواتے ہوئے
اسے اپنے مضبوط ہونے کا ثبوت دیکھانے لگا۔

کہ تہ نورثہ ہم گوری، نوزہ پی ہم درتہ بنودی شم، حکہ ماتہ خودثہ
بنودو ہیچ مشکل نشہ (اگر تمہیں کچھ اور بھی دیکھنا ہے، تو میں
وہ بھی تمہیں دیکھا سکتا ہوں کیونکہ مجھے تو کوئی مسئلہ نہیں ہے
کچھ بھی دیکھانے میں)

میرا تو سب کچھ تمہارا ہے لیکن تم ظالم بن کر مجھے میرے حق
سے محروم رکھے بیٹھی ہو۔ صرف ایک چہرے کا دیدار ہی مانگا
تھا اور تم نے وہ بھی نہیں کروایا مگر خیر ہے کل آنا تو میرے
پاس ہی ہے۔۔۔ داعیر خان آنکھوں میں شرارت لئے گھمبیر
آوازیں ویڈیو میں بولتا کیمرا اب اپنے پیٹ سے تھوڑا سا نیچے
لے جانے لگا۔ اس کے پیٹ کی پھولی رگوں پہ نظر پڑتے ہی

مہر خان مزید کچھ بھی دیکھنے سے پہلے تھوک نکلتے ہوئے جلدی
سے ویڈیو بیک کرتی آف لائن ہو گئی تھی۔ اسے داعیر کا صرف
چٹانی سینہ دیکھ کے ہی ڈر لگ گیا تھا جب وہ اس کے نیچے دبے
گی، تب تو نازک سی مہر خان جان سے جائے گئی۔

ہا ہا ہا! ڈر گئی ہو؟ ابھی تو میں نے کچھ دیکھایا بھی نہیں تھا اور تم
پہلے ہی ڈر کے مارے کانپنے لگی ہو؟ جب کل رات مجھے ہر
پردے سے آزاد دیکھو گی تو پھر تمہارا کیا ہو گا نور چشم؟۔۔۔۔۔
اسے آف لائن ہوتے دیکھ کے اس نے مہر خان کو تنگ کرنے
کی غرض سے مزید تین چار میسیجز سینڈ کئے اور مزے سے فون
سائیڈ پہ رکھ دیا۔ وہ کافی تھک چکا تھا، اسے اب نیند آرہی تھی۔
اس لئے بنا وقت ضائع کئے وہ سیدھا ہو کر لیٹا کمفرٹر خود پہ
اوڑھ کے آنکھیں موندھ گیا۔

دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ سب ابھی سو کے اٹھے تھے
سوائے داعیر خان کے، وہ ابھی تک سو رہا تھا جبکہ دمیر خان بھی
اپنے کمرے میں ہی تھا۔ زر بخت اور نزہت خان ناشتہ کر چکی
تھیں، وہ اس وقت لاؤنج میں اسد اللہ خان کے ساتھ بیٹھی ہلکی
پھلکی باتوں میں مصروف تھیں اور انیسہ خان بارات کیلئے سب
چیزیں ڈیسائیڈ کرنے کے چکروں میں کبھی یہاں تو کبھی وہاں
گھن چکر ہو رہی تھی۔

اور بتاؤ زر بخت کو نسے کلج جاتی ہو؟۔۔۔ اسد اللہ خان نے
سر سری سے انداز میں استفسار کیا۔

ماموں! میں کلج نہیں جاتی، میں نے صرف میٹرک تک پڑھا ہے
۔۔۔ زر بخت معصومیت سے بولی۔

کیوں نہیں جاتی کلج؟ پڑھنے کا شوق نہیں پے یا کوئی اور مسئلہ ہے؟ اگر تمہیں پڑھنا ہے تو میں تمہیں کسی اچھے کلج میں ایڈیشن دلوادیتا ہوں۔۔۔ اسد اللہ خان اس کی آگے نہ پڑھنے والی بات پہ حیران ہوتے اسے آگے کسی اچھے کلج میں پڑھانے کی آفر کر گئے۔

نہیں لالہ!! اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر اس کو پڑھنا ہوتا، تو میں خود اس کا ایڈیشن کروادیتی لیکن اسے شوق ہی نہیں آگے پڑھنے کا۔۔۔ نزہت خان تیزی سے جواب دیتی زر بخت کو خاموش رہنے کا اشارہ کرنے لگیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان کی بیٹی کسی کے بھی آسرے یا سہارے کی امید کرے کیونکہ وہ جانتی تھیں، انیسہ خان نے ایسا کبھی نہیں ہونے دینا تھا۔ وہ اپنے لالہ کو اس معاملے میں بیوی سے بحث و تکرار

کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ایسہ خان نے پہلے کبھی
اسد اللہ خان کو اپنی مرضی کرنے دی تھی، جو اب وہ زر بخت کو
انکی کمائی سے پڑھنے دے گی؟۔۔۔ نزہت خان یہ سب کچھ
سوچتے ہوئے زر بخت کے بولنے سے پہلے ہی انکار کر گئیں۔
کیوں شوق نہیں ہے؟ پڑھنے کا شوق تو سب بچیوں کو ہوتا ہے۔
تمہیں پڑھنا ہے تو میں کل ہی دمیر سے کہہ کر کسی اچھے کالج
میں تمہارے ایڈمیشن کی بات کرتا ہوں۔۔۔ اسد اللہ خان نے
زر بخت سے اسکی مرضی جاننا چاہی۔

نہیں ماموں! مجھے نہیں پڑھنا، مجھ سے اب پڑھائی نہیں ہوتی!
تھوڑا سا ڈائجسٹ پڑھو تو سر میں درد ہونے لگا جاتا ہے۔۔۔
زر بخت ماں کے کہے کا بھرم رکھتے ہوئے ان کی بات پہ قائم
رہی۔۔۔ اس نے صرف اپنی ماں کے کہنے پر انکار کیا تھا ورنہ تو

اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ پڑھائی کے معاملے وہ کافی ذہین
لڑکی تھی۔ ہر بار اچھے گریڈز لے کے پاس ہوتی تھی لیکن اپنے
معاشی حالات دیکھتے ہوئے زربخت نے آگے پڑھنے سے انکار
کر دیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی، اب اسکی ماں صرف اسے تین
وقت کی روٹی دے سکتی ہے۔ کلج کی پڑھائی کا خرچہ برداشت
نہیں کر سکتی تھی۔۔ اسلئے تو زربخت نے اپنے آگے پڑھنے
کے شوق کو زندہ دفنا دیا تھا۔ وہ اپنی ماں کو ان خواہشات کیلئے
مجبور نہیں کر سکتی تھی جن کو پوری کرنے کی نزہت خان کی
استطاعت نہ ہو۔۔

او کے تمہاری مرضی۔ اگر پڑھنے کا شوق نہیں ہے تو نہ پڑھو!
کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔۔۔ اسد اللہ خان اس کو اپنے

فصلے اپنی مرضی سے کرنے کا اختیار دیتے ہوئے میٹھے لہجے میں
بولے تھے۔

جی لالا! اب تو بس ایک ہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری زر بخت
کے نصیب اچھے کرے! میں اپنے جیتے جی اس کو محفوظ
ہاتھوں میں دینا چاہتی ہوں۔ زندگی کا کیا بھروسہ آج ہے؟ کل ہو
نہ ہو۔۔ میں نہیں چاہتی میرے مرنے کے بعد میری زر بخت
تنہا رہ جائے۔ بن باپ کے بچی ہے بس کوئی اچھا اور نیک
انسان اس کا مقدر بنے جو اس کو تحفظ کا احساس دلائے، جو
اس کو میرے بغیر اس بھری دنیا میں زمانے کی گرم سرد ہواؤں
سے بچا کے رکھے۔۔۔ نزہت خان تکلیف سے سوچتی اپنی
بیٹی کے اچھے نصیب کی دعائیں کرنے لگیں۔ وہ جب سے بیمار
رہنے لگی تھیں، ان کی بس ایک ہی دعا ہوتی تھی کہ زر بخت کے

اچھے نصیب اور کسی نیک و ہمدرد انسان کے ساتھ کی، جو زرخفت کو پھولوں کی طرح رکھے۔

نزهت خان کے دل میں ایک وہم سا بیٹھ گیا تھا۔ وہ بس جلدی سے اس کو محفوظ ہاتھوں میں سوپنا چاہتی تھیں تاکہ وہ اگر نہ رہی تو انکی بیٹی کو درد کی خاک نہ چھاننا پڑے۔ حالانکہ زرخفت ابھی چھوٹی تھی، اس کی شادی کی عمر ہی نہیں تھی لیکن پھر بھی نزهت خان اس کا ہاتھ کسی محفوظ اور محبت کرنے والے انسان کے ہاتھ میں دینا چاہتی تھی جس کا وجود زرخفت کیلئے کسی پائیدار سائبان کی طرح ہو۔

اللہ نہ کرے مورے! یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟۔۔۔۔۔
ماں کی مرنے والی تکلیف دہ بات سن کے زرخفت کا دل مٹھی

میں جکڑا گیا تھا۔ وہ ہمیشہ باتوں ہی باتوں میں اپنے مرنے کا ذکر چھیڑ دیتی تھی اور یہ بات زر بخت کو بہت تکلیف دیتی تھی۔ آئین!! زر بخت کا نصیب ان شاء اللہ بہت اچھا ہو گا۔ آپ فکر نہ کیا کریں اور دوسری بات اللہ نہ کرے کہ کبھی آپ کو کچھ بھی ہو۔ اللہ آپ کو میری بھی عمر لگا دے اور تاحیات آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ آج تو آپ نے ایسی بات کر دی ہے، آئندہ مت کیجئے گا۔ آپ کی یہ باتیں صرف زر بخت کو ہی نہیں بلکہ ہمیں بھی تکلیف دینے کا سبب بن رہی ہیں۔۔۔ دمیر خان جو کہ ابھی لاؤنج میں داخل ہوا تھا، نزہت خان کی بات سن کے انہیں نرمی سے جواب دیتا لمبے قدم اٹھاتے ہوئے ان کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

زر بخت ابھی بھی محفوظ ہے، جب تک میں زندہ ہوں، اس کو
اب زمانے کی گرم ہوا بھی نہیں لگنے دوں گا۔۔۔ اسد اللہ
خان بہن کے لہجے میں بے اعتباری اور خالی پن دیکھ کے زر
بخت پہ حق جتا گئے تھے۔

انہوں نے نزہت خان کے چہرے پہ اپنوں سے اجنبیت اور
نظر انداز ہونے کا دکھ بغور نوٹ کیا تھا۔۔ نزہت خان یہ بات
اسلئے کر گئی تھی کیونکہ انہوں نے ساری زندگی زر بخت کے
ساتھ اکیلی گزاری تھی اور کن اذیتوں سے گزاری تھی، یہ صرف
وہی جانتی تھی۔ بنا مرد کے سائے کے عورت ادھوری ہوتی
ہے۔ زر بخت صرف پانچ سال کی تھی جب اسکے والد کی ڈیٹھ
ہو گئی تھی، اس کے بعد نزہت خان نے اپنی آبرو کی حفاظت
بھی کی اور بیٹی کو پال پوس کے بڑا بھی کیا۔ بنا شوہر کے گھر چلانا

اور بنا باپ کے سائے کے بیٹی کو پالنا کتنا مشکل ہوتا ہے، یہ
کوئی نزہت خان سے پوچھے۔

اللہ تعالیٰ میرے بچے کو لمبی عمر دے! اور ویسے بھی ہم سب
نے یہ جہان چھوڑ کے ایک دن جانا ہی ہے۔ کچھ دن پہلے جائیں
یا بعد میں جائیں کیا فرق پڑتا ہے؟۔۔۔ نزہت خان نے دمیر کا
ہاتھ پکڑ کر نرمی سے چومتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔۔
ہاں اس فانی جہاں کو چھوڑ کے ہم سب نے جانا ہے لیکن
وقت پہ، اپنے حصے کی زندگی جی کر، اپنوں کی ساری خوشیاں
سمیٹ کے، ابھی تو آپ نے میری شادی بھی کروانی
ہے۔ میرے بچوں کو بڑا ہوتے دیکھنا ہے، پھر ان کے بچے
بھی گود میں اٹھانے ہیں۔۔۔۔۔ دمیر خان نے کن اکھیوں سے زر
بخت کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکے بھلکے انداز میں تصحیح کی۔

ہا ہا لالہ! آپ کے بچوں کے بچے ہونے تک تو میں بھی بوڑھی
ہو جاؤں گی۔ مورے اور ماموں تو بالکل ہی بوڑھے ہو جائیں
گے، ان کے سارے بال سفید ہو جائیں گے اور منہ میں دانت
بھی نہیں رہیں گے۔۔۔ زر بخت کو نہ جانے کیوں دمیر خان
کے بچوں کے بھی آگے بچوں والی بات ہنسا گئی تھی۔ وہ ہنستے
ہوئے اپنی ماں اور ماموں کو دماغ میں بوڑھا اور ضعیف امیجن
کرنے لگی۔ وہ اسکی خوبصورت ہنسی کو دل میں بسانے لگا۔
نہیں بھئی! میں اپنے دمیر کے بچوں کے بچوں کو دیکھنے تک جوان
رہنا چاہتا ہوں۔ میں بالوں پہ کلر لگا کے ان کو بلیک کر لوں گا
اور دانت بھی آرٹیفیشل لگوا لوں گا۔۔۔ اسد اللہ خان خود کو
کبھی بھی بوڑھا نہ کرنے کی پلاننگ کرتے ہوئے سب کو
مسکرا نے پر مجبور کر گئے۔

ماموں پھر تو آپ سب سے زیادہ پیارے بن جائیں گے۔۔۔
زر بخت چہک کے بچوں کی طرح بولی، اس کی باتیں بھی اس کی
طرح معصوم ہوتی تھیں۔

ہاں پھر تو میں تمہاری ممانی کو بھی گھاس نہیں ڈالنے والا۔ ایسہ
بیگم تب بالکل بوڑھی ہو جائیں گے اور میں حسین و
جوان۔۔۔ اسد اللہ خان شوخ لہجے میں بولتے چھپکھڑی ایسہ
خان کو تپا گئے۔

آپ جتنے بھی مصنوعی طریقے سے جوان ہو جائیں، میرے بغیر
آپ کو کسی نے سوکھا گھاس بھی نہیں ڈالنا۔۔۔۔۔ ایسہ
خان ایرو آچکا کے تیکھنے لہجے میں بولتی ان کو بوکھلانے پر مجبور کر
گئی۔ اسد اللہ خان کو یوں بیگم سے ڈرتا دیکھ کے دمیر خان اور زر
بخت کی ہنسی بے ساختہ تھی، ابھی تھوڑی دیر پہلے جو نزہت

خان کی باتوں کی وجہ سے ماحول میں تناؤ آیا تھا، وہ اب دمیر، زر بخت اور اسد اللہ خان کے قہقہوں کی وجہ سے کم ہو گیا تھا۔

شام کے پانچ بج چکے تھے۔ بارات کی ساری تیاریاں مکمل تھی۔ سب مہمان اور گھر والے تقریباً بارات لے جانے کیلئے تیار تھے۔ زر بخت سچی سنوری جو نہی کمرے سے باہر نکلی تو اسد اللہ خان اس کو دیکھتے ہی آواز لگا گئے۔

زر بخت !! دلتہ راشہ (یہاں آؤ)۔۔۔۔۔ انہوں نے پیار سے اس کو اپنی طرف بلایا، وہ لاؤنج کے داخلی دروازے پہ کھڑے بظاہر فون پہ کسی کے ساتھ مصروف نظر آرہے تھے۔

جی ماموں ! وایہ (بولیے؟)۔۔۔۔۔ اس نے ان کے قریب آتے ہوئے اپنی پکار کا مقصد استفسار کرنا چاہا۔

جاؤ میرا بچہ، داعیر لالہ کو بلا لاؤ!!! اس کو بولو کہ ہم لیٹ ہو رہے
ہیں۔ ہمیں وقت پہ بارات لے کر نکلنا ہے۔۔۔ انہوں نے
فون کان سے ہٹاتے ہوئے زر بخت کو حکم دیا۔
جی ماموں! ابھی بولا کے لاتی ہوں۔۔۔ زر بخت سر کو خم دے
کر اپنا لہنگا سنبھالتے ہوئے اوپر داعیر خان کے کمرے کی جانب
بڑھ گئی جو کہ ابھی تک تیار ہو رہا تھا۔
لالہ!!! اس کو رہنے دیتے ہیں نہ! مجھے اچھا نہیں لگتا۔۔۔
داعیر خان نے منہ بسورے ہوئے کلہ پہننے سے انکار کیا۔
اسے کے بغیر دولہا نہیں لگو گے اور اگر دولہا نہیں لگو گے تو
لڑکی والے دلہن نہیں دیں گے۔۔۔ دمیر خان مسکراہٹ ضبط
کرتا سمجھانے والے انداز میں بولتے ہوئے داعیر خان کے سر پہ
کلہ پہنانے لگا۔

اچھا پھر تو پہنا ہی دیں۔ ویسے میری دلہن کو اب مجھ سے کوئی دور نہیں کر سکتا، کیونکہ میں نے پہلے سے نکاح کر کے کام پکا کر رکھا ہے۔۔۔۔۔ داعیر خان اپنی شیرانی سیٹ کرتا اتر ا کے بولا تھا۔ وہ اس وقت سیاہ ایمبرائیڈڈ شیرانی پہ میرون کلمہ پہنے، اپنے چہرے کی خوشی اور چمک کے ساتھ کافی ڈیشنگ لگ رہا تھا جبکہ اسکے ساتھ کھڑا د میر خان کریم کلر کے شلوار قمیض کے ساتھ ہم رنگ دھاگے کی کڑھائی سے مزین ویسکوٹ میں ملبوس داعیر خان کی طرح جاذب نظر لگ رہا تھا۔

تیرے جیسا شاطر بندہ میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا۔ تو فیوچر پہلے ہی پلان کر کے رکھ لیتا ہے۔ اب جیسا کہ تجھے معلوم تھا کہ مہر والے رشتے پہ بعد میں انکار بھی ہو سکتا ہے۔ اسلئے تو نے پہلے چالاکی سے ڈائریکٹ نکاح کیا تھا تا کہ بعد میں ان کے

پاس انکار کا کوئی جواز ہی نہ بچے؟۔۔۔۔۔ دمیر خان آنکھیں
چندھیا کرتا غور سے داعیر کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے
اسکی چالاکیاں گنوانے لگا۔

مہرو اور داعیر دونوں یونیورسٹی فیلوز تھے، وہی سے ان کی محبت
کی داستان شروع ہوئی تھی لیکن پرانی خاندانی دشمنی کے باعث
ان کے رشتے میں کافی رکاوٹیں پیدا ہوئی تھیں جنہیں اسد اللہ خان
اور رائم خان بارکزئی نے سمجھداری سے ختم کرنے کا فیصلہ کیا
تھا کیونکہ وہ دونوں ہی ان کی محبت سے واقف تھے۔ مہرو نے
صرف اپنی ماں کو اپنی پسند کا بتایا تھا اور انہوں نے ہی آگے
بات چلائی تھی۔

پٹھان گرانے میں لو میرج کرنا ایک گھٹن مرحلہ ہوتا ہے، داعیر کی
طرف سے ہر کوئی راضی تھا لیکن جب اس نے پریوزل مہرو کے

گھر بجھوایا تھا، تب کافی تماشے کھڑے ہوئے تھے جنہیں رائم خان بارکزی نے خود ختم کیا تھا کیونکہ وہ اپنی بہن سے بہت پیار کرتا تھا، اسے جب داعیر خان ہر لحاظ سے ہر فیکٹ لگا، اس میں خامیوں کی بجائے صرف خوبیاں نظر آئیں تو وہ اپنی بہن کے لئے پورے خاندان سے لڑنے کو تیار ہو گیا۔ خاندان میں بھی مہرو کے کافی رشتے تھے لیکن اس نے سب کو ٹھکرا کر اپنی بہن کو داعیر خان آفریدی کے حوالے کیا تھا۔

تو اچھا کیا تھا نہ!! آپ کو جب بھی موقع ملے، سب سے پہلے نکاح کیجئے گا۔۔۔ یہ منگنی کے چکروں میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ منگنی کسی بھی وقت ٹوٹ جاتی ہیں اور پھر انسان کی اپنے ہمسفر کے معاملے میں سوچ دو بدو ہو جاتی ہے۔ اسلئے بسم اللہ کریں اور نکاح کر کے کام پکا کریں تاکہ ایک ہی انسان

کے ساتھ آپ مضبوطی سے جڑیں رہیں۔ منگنیاں توڑنا آسان ہوتی ہیں لیکن نکاح اتنی آسانی سے نہیں توڑے جاتے۔۔۔۔۔
داعیر خان اب آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا اپنا عکس دیکھتے ہوئے
پر سوچ انداز میں سمجھداری سے بولا۔

لیکن جن کو رشتے نہیں نبھانے ہوتے، وہ نکاح توڑنے میں بھی
ایک لمحہ نہیں لگاتے۔۔۔۔۔ دمیر خان چائے کا کپ ٹیبل سے اٹھا
کے لبوں سے لگاتار نجیدگی سے بولا۔

رشتے وہ توڑتے جن کو اپنے ہمسفر سے محبت نہیں ہوتی یا جن کو
ان سے بہتر کی تلاش ہوتی ہے۔ جن میں محبت ہوتی ہے، وہ
کبھی اپنے نکاح میں بندھے ہوئے ہمسفر کو نہیں چھوڑتے۔۔۔۔۔
داعیر خان اپنی نور چشم کے بارے میں سوچتا ہوا مدہم آواز میں
بولا تھا۔۔۔ اس کا لہجہ اور آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ مہر

خان کو کتنا چاہتا ہے اور اس کا ساتھ داعیر خان کیلئے کس قدر ضروری ہے۔

یہ محبت کے قصے کہاں سے رٹے ہوئے ہیں تو نے؟ جو آج محبت پہ اتنی گہری باتیں کر رہا ہے۔۔۔۔۔ دمیر خان نے اسکی گہری باتوں پہ آبرو آچکا کر سوال کیا۔

محبت قصہ نہیں ہوتی، محبت حقیقت ہے اور اس کو رٹنے کی ضرورت نہیں پڑتی، یہ جذبہ خود ہی پروان چڑھتا ہے۔ جب آپ کو ہو گئی نہ تب آپ سے پوچھوں گا کہ آپ نے کہاں سے لی ہیں محبت کی کلاسز؟۔۔۔۔۔ داعیر خان خود پہ پرفیوم کا چھڑکاؤ کرتا مصروف انداز میں بولا۔ دمیر خان ابھی کوئی جواب دیتا جب دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔

آجائیں۔۔۔۔۔ دمیر خان نے آنے والے کو اپنی بارعب آواز
میں اندر آنے کی اجازت دی۔

لالہ!!! آپ کو ماموں بلا رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ جلدی تیار
ہو جائیں، ہم بارات کیلئے لیٹ ہو رہے ہیں۔۔۔۔۔ زر بخت
کمرے میں داخل ہوتے ہی آئینے کے سامنے کھڑے داعیر خان
سے مخاطب ہوئی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی صوفے پہ بیٹھے دمیر خان
کے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ لبوں سے ہٹا تھا۔ آج پھر سے وہ
اس کا نکھرا روپ دیکھ کر نظریں ہٹانا بھول گیا تھا۔ وہ میرون
لہنگے میں ہلکے سے میک اور جیولری کے ساتھ بے حد حسین لگ
رہی تھی۔

او کے!! میں آرہا ہوں۔۔۔ داعیر خان نے گردن موڑ کر نرمی
سے زر بخت کو جواب دیا البتہ دمیر خان کی نظریں ابھی تک اس
کے چہرے پہ ٹھہری ہوئی تھیں۔

گڑیا رکو۔۔۔ زر بخت کو واپسی کیلئے مرتے دیکھ کر داعیر خان
نے بے اختیار اسے روک لیا۔

جی لالہ! کیا ہوا؟۔۔۔ اس نے چہرے پہ الجھن لئے پوچھا۔
یہاں آؤ میرے پاس!! کیا تم یہ میرے بازو پہ باندھ دو گی؟ میری
اور لالہ کی کوئی بہن نہیں ہے، کیا تم ہماری بہن بن کے اپنے لالہ
کو تمام بلاؤں سے محفوظ کروں گی؟۔۔۔۔۔ داعیر خان ماشاء اللہ
کا امام ضامن اپنے ہاتھ میں لیے زر بخت کی طرف بڑھتا سوا لیہ
انداز میں گویا ہوا تھا۔

ہاں ضرور کیوں نہیں!!! آپ دونوں کی بہن بن کے مجھے جو رتبہ ملے گا، میرے لئے وہ اعزاز کی بات ہوگی۔ دمیر خان جو داعیر کی باتوں کو ذرا بھی نہیں سن رہا تھا، وہ تو بس زر بخت کو دیکھتے ہوئے چائے کا کپ پھر سے لبوں سے لگا گیا تھا لیکن زر بخت کا جواب سن کر اسے چائے کا سپ لیتے ہوئے اچھو لگا تھا۔۔۔ کیا ہوا ہے لالہ آپ کو؟۔۔۔ زر بخت فکر مندی سے دمیر خان کی طرف دیکھ کے استفسار کرنے لگی۔

کچھ نہیں ہوا، بس چائے گرم تھی۔۔۔ دمیر خان نے چائے واپس ٹیبل پہ رکھتے ہوئے متوازن لہجے میں جواب دیا۔ وہ اپنے پورے سترہ سال اس سے محبت میں گزارے بیٹھا تھا اور زر بخت نے ایک منٹ میں خود کو اسکی بہن کا خطاب دے کر

محبت کی ایسی کی تیری کر کے رکھ دی تھی۔ یہ بات سنتے ہوئے
دمیر خان کا چائے سے حلق تک کڑوا ہوا تھا۔

تو نہ پیس گرم چائے! منہ کیوں جلا رہے ہیں؟۔۔۔ داعیر خان
نے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات بخوبی نوٹ کئے تھے
لیکن وہ فلوقت اس کے چہرے کو پڑھنے سے قاصر تھا، اسلئے بنا
جج کئیے نارمل لہجے میں بولا تھا۔ زربخت جلدی سے داعیر کے
ہاتھ سے ماشاء اللہ کا امام ضامن پکڑے اسکی سیدھی کلائی پہ
باندھ گئی۔

ماشاء اللہ لالہ!! آپ بہت پیارے لگ رہے ہیں۔۔۔ زربخت
خوشی سے اپنی دونوں مٹھیاں بند کر کے ٹھوڑی کے نیچے رکھتی
چہک کے بولی تھی۔

شکریہ گڑیا۔۔۔۔۔ داعیر خان اس کا شکریہ ادا کرتا ڈریسنگ ٹیبل
پہ پڑا ایک سرخ ویلوٹ باکس اٹھا کے اس کی طرف بڑھا گیا۔
یہ کیا ہے لالہ؟۔۔۔۔۔ زر بخت نے باکس کو دیکھتے ہی نا سمجھی
سے سوال کیا۔

بہن بنایا ہے تو پھر تمہارا حق بھی پورا ادا کروں گا۔ یہ تمہارا نیک
ہے میری طرف سے۔۔۔۔۔ داعیر خان باکس اس کے ہاتھ میں
پکڑاتا زر بخت کو بھائیوں والا مان دینے لگا۔

لالہ!! یہ تو اتنا مہنگا ہے، میں نہیں لے سکتی اتنا مہنگا
تحفہ۔۔۔۔۔ زر بخت نے باکس میں ڈائمنڈ کا سیٹ دیکھتے ہی
معصومیت سے اس کو لینے سے انکار کر دیا۔

کیوں نہیں لے سکتی؟ خود کو میری بہن کہتی ہو۔ مجھے لالہ کہتی
ہو تو پھر اپنے لالہ کے دیئے ہوئے تحفے کو انکار کیوں کر رہی

ہو؟۔۔۔۔۔ داعیر خان باکس واپس اسکی طرف دھکیلتا خفگی سے
یادہانی کروانے لگا۔

آپ میرے لالہ ہیں مگر پھر بھی لالہ میں یہ اتنا قیمتی اور نایاب
تحفہ نہیں لے سکتی۔۔۔۔۔ زر بخت اپنی بات پہ قائم رہی۔
کیسی باتیں کر رہی ہو زر بخت؟ چیزیں قیمتی نہیں ہوتی بلکہ
احساس اور رشتے قیمتی ہوتے ہیں۔ لے لو داعیر جو دے رہا
ہے، تمہارا حق ہے اس گھر پہ اور اس کے مکینوں پر۔۔۔۔۔
اب کی بار دمیر خان نے سنجیدگی سے مداخلت کی تھی۔
اچھا ٹھیک ہے لالہ! آپ ناراض نہ ہو میں آپ کی دی ہوئی نینگ
قبول کر رہی ہوں۔۔۔۔۔ زر بخت نے روہان سے انداز میں وہ
باکس پھر سے تھام لیا۔ اس کو آج بہت اچھا لگا تھا، یوں داعیر
خان کا اسے بہنوں کی طرح تحفظ اور مان دینا اور زندگی میں آج

پہلی دفعہ ماں کی محبت کے علاوہ کسی اور رشتے کی اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔۔ داعیر خان کو یہ ڈائمنڈ کا سیٹ اسد اللہ خان دے کر گئے تھے اور باور کرایا تھا کہ وہ نیگ کی صورت میں یہ سیٹ زر بخت کو دے گا۔ اسلئے تو انہوں نے زر بخت کو اس کے کمرے میں بھیجا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد سجا سنورا دلہا داعیر خان باہر کی جانب بڑھا تھا۔ سب اس کو دیکھ کر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ اسکی نظر بھی اتار رہے تھے۔ آتش بازی اور فائرنگ کی گونج میں بارات دھوم دھام سے حویلی سے نکلی تھی۔

داعیر خان کی سیاہ گاڑی سرخ پھولوں سے سچی تھی۔ زر بخت آج بھی اس کی گاڑی میں سوار تھی۔ اس کے ساتھ انزباز اور انیسہ خان بھی تھی اور انیسہ خان کو زر بخت کی اپنے ساتھ

موجودگی بلکل بھی اچھی نہیں لگی تھی لیکن وہ آج خوش تھی۔
اسلئے چہرے پہ خوشی کے تاثرات قائم رکھے جبکہ دمیر خان کے
ساتھ آج بھی برا ہوا تھا۔ وہ اپنے ساتھ زر بخت کو بیٹھانا چاہتا
تھا لیکن اسکے ساتھ خاندان کی تین لڑکیاں زبردستی سوار ہو
گئی۔ زر بخت کو دمیر خان کے نکلنے سے پہلے ہی اسد اللہ خان
نے داعیر کی گاڑی میں بیٹھا دیا تھا جس پر وہ صبر کا گھونٹ بھرتا
گاڑی سٹارٹ کر گیا اور نزہت خان اپنے لالہ کی گاڑی میں سوار
تھی۔ داعیر خان کے سب دوستوں نے پورا راستہ فائرنگ اور
نوٹوں کی بارش کی تھی۔ وہ اپنے سر گاڑیوں سے باہر نکالے
ہوٹنگ اور فائرنگ کرتے اپنے یار کی بارات کو یادگار بنا رہے
تھے۔

ہال پہنچتے ہی رائم خان کی طرف سے بھی بارات کا شاندار استقبال کیا گیا تھا۔ سب مرد حضرات کو رائم اور اسکے والد صاحب نے گرمجوشی سے بغلگیر ہو کر مہمانوں کو عزت بخشی تھی۔ تمام خواتین کو دمیر خان نے ہال کی دوسری سائیڈ سے مردوں کے جمع ہونے سے پہلے ہی انٹر کروا دیا تھا۔ اب ہال کے داخلی دروازے پہ دلہا بناداعیر خان کھڑا تھا۔ اور اسکے دوست ڈھول کی تھاپ پہ جھومتے ہوئے بار بار اس کے سر سے ڈھیروں پیسے وار کے ہوا میں منتشر کر رہے تھے۔ باجے اور شہنائیوں کی آواز ہر طرف خوشیوں کی خبر سنارہی تھی اور داعیر خان ہلکا سا مسکراتے ہوئے اپنے دوستوں کے کرتوت ملاحظہ کر رہا تھا جو اب جان بوجھ کر اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے ہوئے اسے محظوظ کر رہے تھے۔۔

شاہ کہاں ہے؟ تیری بات ہوئی اس سے؟ رات کو وہ مہندی کی
تقریب پہ بھی نہیں آیا تھا۔۔۔ رائم قدم بڑھا کر دمیر کی طرف
بڑھتا اسکے بغلیں ہوتے ہوئے فکر مندی سے استفسار کرنے

لگا۔

شاہ چرتہ دی؟ تالہ ہنغہ سرہ خبرہ کبریٰ وہ؟ تیرہ شپہ ہنغہ د مہندی پہ
مراسمو کی ہم نہ و راغلی (ہاں میری شاہ سے بات ہوئی ہے۔ وہ
راستے میں ہے! آ رہا ہے)۔۔۔ دمیر خان نے اس سے الگ
ہوتے ہوئے کاظم شاہ کی آمد کے بارے میں آگاہ کیا۔

تیرہ شپہ ولی نہ و راغلی؟ ماور تہ زنگ و ہلی و، خود ہنغہ نمبر بند و
(رات کو کیوں نہیں آیا تھا؟ میں نے اس کو کال کی تھی مگر اس کا
نمبر ہی آف تھا)۔۔۔ رائم خان نے فکر مندی سے استفسار
کیا۔ نمبر بند نہ و، ہنغہ پروں لہ خیل کورنی سرہ د بنار نہ بہرو! نو د

سیکنل دستونزہی لہ املہ ٹیلیفون نہ ترل کہدہ (نمبر آف نہیں تھا، وہ
کل آؤٹ آف سٹی تھا اپنی فیملی کے ساتھ! اس لئے
سگنلز پر اہلم کی وجہ سے فون نہیں لگا تھا)۔۔۔ دمیر خان
نے سنجیدگی سے کاظم شاہ کی کل مہندی پہ نہ آنے کی وجہ بتائی۔
بنہ سمہ وہ! خونن راخی کہ نہ؟ (اچھا ٹھیک ہے! لیکن آج تو آرہا
ہے نہ؟)۔۔۔ رائم خان سوالیہ انداز میں گویا ہوا۔

ہو پہ لارہ دی! راروان دی۔ گورہ راخی!۔۔۔ (ہاں راستے میں
ہے! آرہا ہے۔ لو آگیا)۔۔۔ دمیر خان نے ابھی اپنی بات مکمل
ہی نہیں کی تھی جب سامنے سے اسے کاظم شاہ اپنی گاڑی سے
نکلے ہوئے دیکھائی دیا تھا جبکہ چادر میں چھپی اسکی بیوی کو گاڑی
سے نکلتے دیکھ کے رائم اور دمیر دونوں نے نگاہیں جھکالی
تھیں۔۔۔

اوزی!! تم منت کو لے کر اندر جاؤ۔۔۔ کاظم شاہ احتیاط سے
سوئی ہوئی منت کو ایزل شاہ کے حوالے کرتا نرمی سے اندر
جانے کا حکم دینے لگا۔

کاظم شاہ آف وائٹ شلوار قمیض میں ملبوس گلے میں شال لئے
اپنے ازلی رعب اور سنجیدگی کے ساتھ پر نور وجیہ شخصیت کا
تاثر دے رہا تھا۔

چاچو جان۔۔۔۔ رائم خان کو دیکھتے ہی از میر گاڑی سے اتر کر
اسکی طرف چمکتے ہوئے بھاگ کے بڑھا تھا۔
میر!! آرام سے بیٹا کر جاؤ گے۔۔۔ از میر کو یوں تیز بھاگتے دیکھ
کر کاظم شاہ نے فکر مندی سے اسے ٹوکا تھا۔

چاچو کی جان۔۔۔۔ رائم خان محبت بھرے لہجے میں بولتا
از میر کو اپنی طرف آتے دیکھ کر آگے بڑھتے ہوئے اس کو اپنے

بازوؤں میں اٹھائے اوپر ہوا میں اچھالنے لگا۔ یوں اوپر ہوا میں
اچھالے جانے پر از میر کی ہنسی کی آواز دور تک گونجی تھی۔
از میر اکثر رائم خان سے ملتا رہتا تھا۔ اس کو رائم خان کی اسے
یوں ہوا میں اچھالنے والی حرکت بہت پسند آتی تھی۔ از میر
جب بھی اس سے ملتا تھا، ہوا میں اچھالنے کی خواہش ضرور کرتا
تھا۔

بیٹا ہے میرا، کوئی فٹ بال نہیں جو تو ہر دفعہ اس کو ہوا میں
اچھال دیتا ہے۔۔۔ کاظم شاہ اس کے قریب پہنچتے ہی جبرے
بھینچ کر بولتا رائم خان کو از میر کو نیچے اتارنے کا اشارہ کرنے
لگا۔

اپنے تو اس کے بچے نا جانے کب ہونے ہیں؟ تب تک
دوسرے کے ہی اچھال کے مزے لینے دے۔۔۔۔۔ دمیر خان

قہقہہ لگاتے ہوئے کاظم شاہ کے بغلگیر ہوتا رائم کی موجودہ
حالت پہ افسوس کا اظہار کرنے لگا جواب از میر کو سینے سے
لگائے اس کے ماتھے پہ لب رکھ رہا تھا۔

اپنے بھی ہو جائیں گئے بہت جلد۔۔۔ رائم خان فرضی کالر
آچکا کر بولتے ہوئے اب از میر کو نیچے اتارتا کاظم شاہ کی طرف
بڑھاتا تھا۔

تیرے بچے ہونے تک تو نے میرے میر کو ہوا میں اچھال اچھال
کر ہی چوٹیں لگوا دینی کسی دن۔۔۔ کاظم شاہ اس سے ملتا ہوا
مصنوعی خفگی سے بولا تھا۔

جب میرے ہو جائیں گے، تم بھی ہوا میں اچھال کے حساب
برابر کر لینا۔ میں تیری طرح برا نہیں مناؤ گا۔۔۔ رائم خان
نے اس سے الگ ہوتے ہوئے دو بدو جواب دیا۔

بابا جان! چاچو مجھے نہیں گراتے، مجھے مزہ آتا ہے۔۔۔ از میر جو
کہ اب دمیر خان کی گود میں تھا اپنے باپ کی بات سنتے ہوئے رائم
خان کی سائیڈ لینے لگا۔ از میر شاہ کی ڈریسنگ سیم اسکے باپ
جیسی تھی۔ وہ ہیزل گولڈن آنکھوں میں چمک لئے لبوں پہ
معصوم مسکراہٹ سجا کر بے حد کیوٹ لگ رہا تھا۔
اے کتنا وزنی ہے یہ بچہ!! تو کیسے اس کو ہوا میں اچھال لیتا
ہے؟ یہ تو بھالو ہے پورا۔۔۔ دمیر خان نے از میر کو ہوا میں
اچھالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے شریر لہجے میں آنکھ دبا کر
مصنوعی تعجب سے کہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ از میر ہمیشہ بھالو نام
سے چڑکھاتا ہے حالانکہ اب وہ بالکل بھی بھالو نہیں لگتا تھا جیسے
وہ پہلے تھا۔ ہاں وہ صحت مند ابھی بھی تھا لیکن دمیر خان نے
جان بوجھ کر اسے چھوڑنا چاہ

اپنی گندی نظریں میرے بیٹے سے دفعہ دور کر!! خبردار جو
میرے میر کو نظر لگائی۔۔۔ کاظم شاہ اسے آنکھیں دیکھا کر
مصنوعی غصے سے بولا۔

چاچو!! آپ مجھے بھالو نہیں بول سکتے، میں ہینڈ سسم ہوں اور بھالو
مجھے صرف میری سویٹ ہارٹ بول سکتی ہے اور کوئی
نہیں۔۔۔ از میر شاہ اسکی گود سے اترتے ہوئے ناک سکوڑ کر
ایک ادا سے بولا تھا۔ از میر کے یوں منہ پھولانے پر تینوں کی
ہنسی بے ساختہ تھی۔

شرم کر لے دمیر!! داڑھی تیری سفید ہونے والی ہے اور
تیرے پاس ایک عدد سویٹ ہارٹ بھی نہیں ہے؟ بچے کو دیکھ،
اتنی سی عمر میں سویٹ ہارٹ لئے پھرتا ہے۔۔۔۔۔ رائم خان
نے اپنی ہنسی کا اثر ذائل کرتے ہوئے دمیر خان آفریدی کے

سنگل پن پہ چوٹ کیا۔۔ وہ دونوں از میر کی سویٹ ہارٹ یعنی
یسری کے بارے میں بھی جانتے تھے۔ کاظم شاہ اکثر از میر اور
منت کی کیوٹ کیوٹ حرکتیں اور باتیں ان کو بتاتا رہتا تھا۔
تیرے پاس ہے جو تو اس کو چڑا رہا ہے؟۔۔۔ دمیر کی بجائے
جواب کاظم شاہ کی طرف سے آیا تھا، وہ آبرو آچکا کر رائم خان کی
طرف دیکھ رہا تھا۔

زخموں پہ نمک چھڑکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے شاہ! ابھی
نہیں ہے لیکن بہت جلد آجائے گی۔۔۔ رائم خان اپنی کرسٹل
گرے آنکھوں میں چمک لئے خفگی سے جتانے والے انداز میں
بولا تھا۔

ان شاء اللہ!۔۔۔ کاظم شاہ نے اس کے چہرے کی چمک
دیکھ کے پر امید سے کہا۔ دمیر خان نے رائم کی بات کی

طرف توجہ نہیں دی تھی، وہ از میر کو منانے میں مصروف تھا جو
منہ پھولائے اب اس کو نخرے دیکھا رہا تھا۔

از میر آجاؤ نہ چاچو کی گود میں؟۔۔۔ دمیر خان پیار سے از میر کو
پچکارتے ہوئے اپنی گود میں اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔
پہلے بھالو بولتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ میری گود میں آؤ؟ میں نہیں
آؤں گا۔۔۔ از میر منہ دوسری سائیڈ کئے خفگی سے اپنے
چھوٹے چھوٹے گلابی ہونٹ مروڑ کے بولتا ناراضگی کا اظہار
کرنے لگا۔

ہائے میرا بچہ!! بالکل بھی بھالو نہیں ہے۔۔۔۔۔ دمیر خان اس
کے اتنے کیوٹ انداز میں شکوہ کرنے پر محبت سے لبریز لہجے
میں بولتا ایک جست میں از میر شاہ کو اپنی بانہوں میں بھرے اوپر
ہوا میں اچھال گیا۔ یوں ہوا میں اچھالے جانے پر از میر اور دمیر

خان کا قہقہہ پھر سے بے ساختہ تھا جبکہ کاظم شاہ اور رائم خان
بھی ان کو دیکھ کے مسکرا دیئے۔

تھوڑی گپ شپ لگانے کے بعد وہ تینوں از میر کو لئیے اندر ہال
کی جانب بڑھ گئے جبکہ داعیر خان پہلے ہی اپنے دوستوں کے
ساتھ اندر جا چکا تھا۔ دمیر خان نے پاکستان آنے کے بعد سب
سے پہلی ملاقات کاظم شاہ سے فارم ہاؤس پہ کی تھی جہاں پہ
انھوں نے بزنس سے ریلیٹڈ کچھ اہم پوائنٹس ڈسکس کئے تھے۔

داعیر خان اس وقت سٹیج پہ موجود تھا۔ اس کے ساتھ انیسہ اور
نزدہت خان بھی دائیں جانب بیٹھی تھی۔ ایزل شاہ کو دیکھتے
ہی انیسہ خان خوشدلی سے اسٹیج سے اتر کے اسکی طرف آئیں۔

السلام علیکم ایزل!! خوش آمدید! بہت اچھا لگا کہ تم ہماری
خوشی میں شریک ہوئی۔۔۔ انیسہ خان بانہیں پھیلانے ایزل شاہ
کے گلے ملتی رسماً گویا ہوئی تھیں۔

وعلیکم السلام! خوشیوں میں شریک ہونا تو بنتا تھا، آخر کو میرے
لالہ کی شادی جو تھی۔۔۔۔ ایزل شاہ مسکراتے ہوئے اپنائیت
بھرے احساس میں بولی تھی۔

اور بتاؤ کیسی ہو؟ بچے کیسے ہیں؟۔۔۔۔ انیسہ خان سوئی ہوئی
منت کا گال پیار سے پچکارتی حال احوال دریافت کرنے لگیں۔
ہم سب تو ٹھیک ہیں الحمد للہ!! آپ سنائیں؟ آپ ٹھیک
ہیں؟۔۔۔۔ ایزل شاہ بھی جواب دے کر انہی کے انداز میں
استفسار کرنے لگی۔

میں حسین ہوں اور تمہارے سامنے ہوں۔۔۔ انیسہ خان
تھوڑی سی چچھے ہوتی خود پہ نظر ڈالتے ہوئے ناز سے بولی تھی۔
لہجے میں شرارت تھی۔

ہاہاہا!! وہ تو میں جانتی ہوں، آپ جیسی گورجنئیس شخصیت کسی
کی نہیں ہے۔۔۔ ایزل شاہ ہنستے ہوئے بولی تھی کیونکہ وہ جانتی
تھی، انیسہ خان کتنی خود پسند ہیں۔

خود پسند ہونا بری بات نہیں ہے بلکہ یہ تو اچھی بات ہے۔ ہمیں
ہمیشہ دوسروں سے پہلے خود پہ توجہ دینی چاہیے، اپنی ذات کو اول
رکھنا چاہیے۔ باقی سب رشتے ناٹے بعد میں آتے ہیں۔ اپنی ذات
پہ کسی دوسرے کو فوقیت نہیں دینی چاہیے۔

وہ ایزل شاہ کو نرمی سے بیٹھنے کا اشارہ کرتی مہر خان کی طرف
بڑھ گئیں جس کو لڑکیاں اب اسٹیج پہ لا رہی تھی۔ ہال کی ساری

لائٹس بند کر دی گئی تھی۔ ایک فوکس لائٹ کی روشنی میں مہر خان چلتے ہوئے اسٹیج کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بیک گراؤنڈ میوزک کی دھن پہ لال رنگ میں سبھی مہر خان فوکس لائٹ کی روشنی میں چلتی کسی پری کا گمان دے رہی تھی۔ داعیر خان بے ساختہ اٹھ کے آگے ہوتا مہر خان کا نازک ہاتھ پکڑے اسے سہارا دیتے ہوئے صوفہ پہ بیٹھانے لگا۔ مہر خان کا چہرہ آج بھی گھونگھٹ کے چھپے چھپا ہوا تھا۔ اپنے پہلو میں بیٹھی مہر خان کو دیکھ کر داعیر کا دل الگ لے لے پہ دھڑک رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی اس کا گھونگھٹ اٹھا کے اس کے ماتھے پہ لب رکھ دے۔

نور چشم!! میرے انتظار کا پھل میٹھا ہونے والا ہے۔ مجھے میرے صبر کا اجر ملنے والا ہے، بس تم نے میرا ساتھ دینا ہے۔

آج کی رات میری زندگی کی حسین راتوں میں شمار ہونے والی ہیں۔ اففف کیا جان لیوا احساس ہو گا جب تم میری قربت کی شدت سے ٹوٹ کے میری بانہوں میں بکھرو گی اور میں تمہیں خود میں سمیٹ کر پھر سے بکھیروں گا اور اس سمیٹنے بکھیرنے کے عمل میں صبح ہو جائے گی لیکن میری تڑپ تمہارے لئے کم نہیں ہوگی۔۔۔۔۔ وہ مہر و النساء کے کان کے پاس جھک کر بے باک سرگوشیاں کرتا اس کا چہرہ شرم اور خوف سے سرخ کر گیا۔ داعیر!!!۔۔۔۔۔ اس کی بے باک سرگوشیوں کی تاب نہ لاتے ہوئے مہر خان نے اس کے بازو پہ چپکے سے چٹکی کاٹتے ہوئے دے دے دے غصے سے ٹوکا۔

ابھی تو میں نے کچھ کیا ہی نہیں ہے اور تم پہلے ہی چٹکیاں کاٹ رہی ہو؟ جب میں کچھ کروں گا تب تو تم مجھے پوری طرح سے

کاٹ کھاؤ گی لیکن خیر ہے کاٹ لینا، میں نے بھی تو تمہیں ملن
کی تکلیف دینی ہے نہ۔۔۔ داعیر خان باز آئے بغیر پھر سے شریر
لہجے میں سرگوشی کر گیا تھا۔ مہر خان اسے کوئی بھی جواب دینے
کی بجائے شرم کے مارے تھوڑا سا پرے کھسکی تھی کیونکہ وہ
جانتی تھی، جب تک وہ داعیر خان کے قریب رہے گی، وہ ایسے
ہی اپنی بے باک باتوں سے اس کا چہرہ اور کان سرخ کرتا رہے
گا۔۔ تھوڑی دیر بعد سب لڑکیاں اسٹیج کی طرف بڑھتی دودھ
پلائی کی رسم کرنے لگی جبکہ زربخت آج بھی چھپے کوئے والے
ٹیبل پہ خاموش بیٹھی سب کو دیکھ رہی تھی۔ ایزل شاہ اس کو
یوں اکیلے بیٹھے دیکھ کر بے اختیار اسکی طرف بڑھ گئی۔
گڑیا!! تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ سب لڑکیاں انجوائے کر رہی
ہیں، تم بھی جاؤ اسٹیج پر۔۔۔۔ ایزل شاہ کو سمجھ نہ آیا کہ وہ اس

نازک سی لڑکی کو کیا کہہ کر مخاطب کرے جو خاموشی سے کونے
کے میں بیٹھی سب کو خالی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر
ایزل شاہ نے اسکی معصومیت اور عمر دیکھ کر اسے پیار سے
گرہیا کا لقب دے دیا۔۔

نہیں دیدہ!! زیادہ رش میں جانے کو میرادل نہیں کرتا، میرا دم
گھٹتا ہے۔۔۔ زر بخت نے معصومیت سے ایزل شاہ کو دیدہ
کہہ کر جواب دیا تھا کیونکہ وہ اس کی گود میں منت کو دیکھ کر اتنا تو
سمجھ چکی تھی کہ وہ اس سے بڑی ہے، ویسے ایزل شاہ قد سے
چھوٹی سی ہی لگتی تھی۔

یہ آپ کی کیا لگتی ہے؟۔۔۔ ایزل شاہ کے چئیر پہ بیٹھتے ساتھ ہی
زر بخت نے منت کا چھوٹا سا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے سوال کیا
تھا۔

میری بیٹی ہے۔۔۔ ایزل شاہ نے محبت بھری نگاہ زر بخت پہ
ڈالتے منت کو اس کی گود میں تھما دیا تھا کیونکہ وہ اسکی گہری نیلی
آنکھوں میں منت کو اٹھانے کی خواہش دیکھ چکی تھی۔

تمہارا نام کیا ہے؟۔۔۔ ایزل شاہ نے اسکی آنکھوں سے نظریں
ہٹائے بغیر سوال پوچھا تھا۔

زر بخت!! میرا نام زر بخت ہے اور آپ کا اور اس ڈول کا کیا
نام ہے؟۔۔۔ زر بخت نے نرمی سے منت کا گال چومتے
ہوئے ایزل سے اس کا نام دریافت کیا۔

ماشاء اللہ بہت پیارا نام ہے بالکل تمہاری صورت کی طرح! میرا
نام ایزل شاہ اور میری بیٹی کا منت کاظم شاہ ہے۔۔۔۔ اس
کی نظریں زر بخت کے معصوم حسین چہرے سے ہٹ ہی نہیں

رہی تھی اور اسکی اپنے جیسی نیلی آنکھیں دیکھ کر ایزل شاہ کو
اس سے اپنائیت کی مہک آئی تھی۔

دیدہ!! آپ دونوں کے نام بھی بہت پیارے ہیں۔۔۔ زر بخت
مسلسل منت کو پیار کرتی جا رہی تھی۔ اسکو بچے بہت پیارے
لگتے تھے۔ زر بخت کے یوں دیوانوں کی طرح پیار کرنے پر
منت کسمساتے ہوئے نیند سے بیدار ہو گئی۔

بابا زان۔۔۔ وہ تقریباً اڑھائی سال کی ہو چکی تھی لیکن اس کی
زبان ابھی بھی صاف نہیں تھی۔ منت نے آنکھیں مسلتے
ہوئے سب سے پہلا سوال اپنے باپ کے بارے میں کیا تھا
کیونکہ وہ جب سوئی تھی تو کاظم شاہ کی گود میں تھی اور اب
سامنے نا آشنا زر بخت کے چہرہ کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

بابا باہر ہیں۔۔۔ ایزل شاہ نے نرمی سے منت کے بال درست کرتے ہوئے آگاہ کیا۔

مزے بابا زان تے پاش دانا (مجھے بابا جان کے پاس جانا)۔۔۔۔ منت نے اپنے گلابی ہونٹ مڑوڑتے ہوئے ضد کی تھی۔

اچھائیں بلاتی ہوں، تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔۔۔ ایزل شاہ نے آس پاس نظریں دوڑاتے ہوئے از میر کو ڈھونڈا چاہا جو پہلے ادھر ہی بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا تا کہ وہ منت کو کاظم شاہ کے پاس لے جاسکے لیکن وہ اب یہاں نہیں تھا۔۔

مزے ابی دانا بابا زان تے پاش!! (مجھے ابھی جانا بابا جان کے پاس)۔۔۔۔ منت ضدی انداز میں بول ہی تھی کہ ٹیبل پہ پڑا ڈرنک کا گلاس غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ لگنے کی وجہ سے الٹ

گیا اور ڈرنک کچھ نیچے فرش پہ اور کچھ ایزل شاہ کے کپڑوں پہ گر گیا تھا۔

اہہہہ!! منت یہ کیا کیا بیٹا؟۔۔۔۔ اس اچانک افتاد پہ ایزل شاہ اپنی فراک پکڑتی استعجاب سے بولی۔

مما شولی میں نے نئی تیا (مما سوری میں نے نہیں کیا)۔۔۔۔۔
منت فوراً پریشانی سے اپنی صفائی دینے لگی۔

مجھے پتہ ہے میرا بچہ! آپ نے نہیں کیا ہے۔ آپ آپنی کے پاس
رکو، میں دو منٹ میں واشروم سے ہو کر آتی ہوں اور پھر میں
آپ کو بابا کے پاس بھجوا دیتی ہوں۔۔۔۔۔ ایزل شاہ اپنی فراک
سنبھالے منت کو سمجھانے کے بعد واشروم کی طرف بڑھی
تھی تاکہ اس پہ لگی ڈرنک واش کر سکے۔

آپ تی آئج میلی ممدایسی ایس (آپ کی آئز میری ممدایسی
ہیں)۔۔۔۔۔ منت اپنی چھوٹی سی انگلی اٹھا کے زربخت کی
آنکھوں کی طرف اشارہ کرتی چمکتے ہوئے بولی تھی۔

اور آپ اپنی ممدایسی پیاری ہو۔۔۔۔۔ زربخت پھر سے منت کا
گال چومتی اسکی صورت کو ایزل شاہ سے تشبیہ دے گئی تھی۔
دمیر خان جو ابھی عورتوں والی سائیڈ آیا تھا۔ منت اور زربخت
کو کھلکھلاتے دیکھ کر آگے اسٹیج کی طرف جانے کی بجائے ایک
دلکش مسکراہٹ کے ساتھ قدم انکی طرف موڑ لئے۔
یہ دو دو ڈولز اتنا کیوں مسکرا رہی ہیں؟۔۔۔۔۔ وہ زربخت کے سر
پہ پہنچتا اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر پرسکون لہجے میں
استفسار کرنے لگا۔

لالہ! دیکھیں نہ یہ کتنی پیاری ڈول ہے ماشاء اللہ۔۔۔۔۔ زر بخت
اپنی گود میں موجود منت کی طرف ستائشی نظروں سے
دیکھتی معصومیت سے بولی۔

بے شک یہ ڈول پیاری ہے لیکن میری ڈول بھی بہت پیاری
ہے۔۔۔۔۔ دمیر خان مدہم آوازیں بولتا نیچے جھک کر منت کا
ہاتھ پکڑ کر نرمی سے چومنے لگا۔ دمیر خان کے یوں اتنا قریب
ہونے پہ زر بخت نا محسوس انداز میں اپنا چہرہ چھپ کر گئی کیونکہ
دمیر کے سر کے بال اس کی ٹھوڑی کو چھو رہے تھے جبکہ اسکے
اتنے قریب آنے پہ وہ زر بخت کے جسم سے اٹھتی مہک اپنے
ناک کے نتھنوں سے محسوس کرتا آنکھیں موندے چند لمحے کیلئے
وہی ٹھہر کے منت کا ہاتھ بار بار لبوں سے لگا رہا تھا۔

لالہ!! اس کو اپنے بابا کے پاس جانا ہے۔۔ کیا آپ منت کو
اس کے بابا کے پاس چھوڑ دیں گے؟۔۔۔۔۔ دمیر خان کے
چچھے ہٹتے ہی زر بخت نے سنجیدگی سے استفسار کیا تھا۔
ہاں کیوں نہیں، چھوڑ آتا ہوں۔۔۔۔۔ دمیر خان نے منت کو زر
بخت کی گود سے اٹھانا چاہا۔

لالہ!! کیا آپ میری منت کے ساتھ دو تین تصاویر بنا دیں گے؟
مجھے یہ بہت اچھی لگی ہے۔۔۔۔۔ زر بخت اسے منت کو
اٹھانے سے روکتی اسکے ساتھ تصویر بنانے کی خواہش ظاہر کر
گئی تھی۔۔۔۔۔

لاؤ اپنا فون دو؟ میں بنا دیتا ہوں۔۔۔۔۔ دمیر خان نے نرمی سے
مسکرا کر زر بخت کا فون مانگا تھا۔

وہ تو مورے کے پاس ہے، آپ اپنے فون میں بنالیں پھر بعد
میں مجھے بھیج دیجئیے گا۔۔۔ زر بخت نے معصومیت سے
جواب دیا اور اس کا جواب سن کر دمیر خان کے من میں لڈو
پھوٹے تھے۔ یہ تو نیکی اور پوچھ پوچھ والا معاملہ ہو گیا تھا۔ دمیر
خان تو کل بھی اس کی ہر لمحے کی تصویر بنا کے اپنے پاس رکھنا
چاہتا تھا لیکن کل موقع ہی نہیں ملا تھا اور اجازت کے بغیر وہ
چوری اس کی تصویر نہیں بنا سکتا تھا۔ ہاں اس کے پاس پہلے
جتنی بھی زر بخت کی تصاویر تھیں وہ پرانی تھیں۔ اب نئی اس
کے پاس کوئی بھی نہیں تھی۔ دمیر خان جلدی سے اپنا فون
جیب سے نکالتا منت اور زر بخت کے کھکھلاتے چہرے
کیمرے میں قید کرنے لگا۔

میں بھی آجاؤ تم لوگوں کے ساتھ؟ ایسے خود سے کمرہ میں والی
فیلنگ آرہی ہے۔۔۔ دمیر خان بالوں میں ہاتھ پھیرتا انکی
ڈھیروں تصاویر بنانے کے بعد مصنوعی معصومیت سے بولتا زر
بخت اور منت کے ساتھ تصویر بنوانے کی فرمائش کر گیا۔۔
ہاں لالہ کیوں نہیں؟۔۔۔ زر بخت نے فوراً اثبات میں سر ہلا
کر معصومیت سے جواب دیا۔ اجازت ملتے ہی دمیر خان
دوسری چئیر گھسیٹ کے ان کے قریب ہوتا سیلفی کیمرہ آن کئے
ڈھیروں زر بخت اور منت کی مسکراہٹوں کو اپنے فون میں قید
کرنے لگا تھا۔ وہ تینوں یوں ساتھ بیٹھے ہوئے کمپلیٹ چھوٹی سی
فیملی لگ رہی تھی۔ سب اپنی دھن میں مصروف تھے۔ ان
تینوں کو کسی نے نہیں دیکھا تھا سوائے انیسہ خان کے۔۔

اور وہ دمیر خان کو زربخت کے اتنا قریب دیکھ کر تلملا اٹھی
تھی۔ ان کے چہرہ پہ نفرت کی لہر دوڑ اٹھی۔ وہ بمشکل اپنے
غصیلے تاثرات کنٹرول کئے جگہ کا لحاظ کر گئی تھی ورنہ وہ دمیر
کے ساتھ بیٹھی زربخت کو تھپڑ جھڑنے سے زرا بھی گریزنہ کرتی

اور اس کا سایہ بھی دمیر خان پہ نہ پڑنے دیتی۔۔
ساری رسومات کی ادائیگی ہونے اور کھانا وغیرہ کھانے کے بعد
اب رخصتی کا وقت تھا۔۔ رائم خان پہلے بالکل بھی عورتوں
والی سائیڈ نہیں آیا تھا مگر اب اسکو اپنی بہن کو رخصت کرنا تھا۔
اس لئے وہ اب آیا تھا اور آتے ساتھ ہی پہلی نظر انزش بزدار پہ
پڑی تھی جو اسٹیج پہ کھڑی اپنی سیلفیاں بنانے میں مصروف
تھی۔ وہ بھاری کڑھائی سے مزین میرون شرٹ کے ساتھ گولڈن
ایمبرائیڈڈ شرارہ پہنے، گولڈن ہی دوپٹہ گلے میں لئے، بے حد

خوبصورت لگ رہی تھی۔ رائم خان کی آج بھی نظریں اسکے چہرے سے ہٹنے کو انکاری ہوئی تھی۔ وہ چاکلیٹ براؤن شلوار قمیض پہنے، گلے میں شال لئے کسی علاقے کا بارعب سردار لگ رہا تھا۔ باری باری سب سے ملنے کے بعد مہر خان کے گھر والوں نے اسے نیک دعاؤں اور بھاری دل کے ساتھ رخصت کیا تھا۔ مہر خان کے والدین کی آنکھیں لبالب پانیوں بھری تھی لیکن وہ اپنی بیٹی کو دعا کے ساتھ خوشی خوشی رخصت کر رہے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے، داعیر خان ان کی بیٹی کو پھولوں جیسے سنبھال کے رکھے گا۔

رخصتی کے بعد تمام مہمانوں نے نکلنا شروع کیا تو کاظم شاہ بھی ان کو الوداعی کلمات کہتا اپنے بیوی اور بچوں کو لیکر کر حویلی کی جانب روانہ ہو گیا۔ ایزل شاہ جانے سے پہلے انیسہ خان اور

زربخت سے مل کے گئی تھی۔۔۔ ایزل کو زربخت بہت اچھی لگی تھی۔

زر بخت آجاؤ۔۔۔ نہت خان کو اپنے ساتھ لئے باہر کی
جانب بڑھتے دمیر نے زر بخت کو آواز لگائی جو فون میں اپنی اور
منت کی تصویریں دیکھنے میں محو تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی
دمیر خان نے اسے یہ تصاویر سینڈ کی تھیں۔ اس کی پکار سنتے ہی
وہ اپنا لہنگا سنبھالے بھاگ کے باہر کی جانب گئی تھی۔ آدھے
گھنٹے میں ہی سب دلہن کو لیکر حویلی پہنچ چکے تھے۔۔

داعیر خان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔۔ وہ مہر خان کے دیدار کیلئے تڑپے جا رہا تھا۔ وہ جلد از جلد اپنے کمرے تک پہنچنا چاہتا تھا لیکن اس کے راستے میں روڑے اٹکانے کیلئے اس کے

دوست کھڑے تھے جو اسے ٹائم پہ کمرے میں ہرگز بھیجنے کا ارادہ
نہیں رکھتے تھے۔

مہر خان کب سے داعیر خان کے انتظار میں بیٹھی نیند کی وجہ سے
جھول رہی تھی۔ مسلسل دو دن کے فنکشنز اور شادی والا گھر
ہونے کی وجہ سے وہ پچھلی دو راتوں میں ایک بار بھی ٹھیک سے
نیند نہیں لے پائی تھی۔ کھانا وہ کھا چکی تھی، انیسہ خان خود اسے
کھانا دے کر گئی تھی۔ اب وہ صرف داعیر خان کا ویٹ کر رہی
تھی تاکہ وہ جلدی سے آئے، اسے منہ دکھائی دے اور وہ چینج کر
کے سو جائے لیکن اس بات سے انجان کہ آج کی رات ایک
سیکنڈ بھی داعیر خان اسے سونے نہیں دے گا۔

وہ بلڈ ریڈ کلر کے لہنگے میں ملبوس اپنے خوبصورت نقوش اور
میک اپ کے ساتھ کوئی اسپر ا معلوم ہو رہی تھی۔ سرمئی
آنکھوں میں آج ایک الگ چمک تھی۔ اپنی محبت کو پانے کی
چمک جو اس کی آنکھوں کو نور کی طرح روشن کر رہی تھی لیکن
سرمئی آنکھیں نیند کی وجہ سے بوجھل بھی ہو رہی تھی۔ مہر خان
کے نازک نفیس ہاتھ گولڈ کی چوڑیوں اور گجروں سے سجے تھے۔
وہ گھونگھٹ کے نیچے سے فون کی سکریں پہ بار بار ٹائم دیکھتی
انگلیاں مروڑتی داعیر خان کی راہ تگنے لگی۔

رات کے پونے دو ہو رہے تھے جب داعیر خان کمرے میں
داخل ہوا تھا۔ وہ بڑی مشکلوں سے اپنے دوستوں کے چنگل
سے بچ کے آیا تھا ورنہ اس کے دوستوں کا ارادہ آج پوری رات
داعیر خان کو تڑپانے کا تھا۔ داخلی دروازے سے لیکریڈ تک

جانے کا راستہ پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ اس راستے کے کناروں
پہ لائن میں رکھی گئی چھوٹی چھوٹی کینڈلز سے جلمگا رہی تھی۔
پورا کمرہ سرخ گلاب کے پھولوں اور پتیوں سے مہک رہا تھا۔
کمرے کی سجاوٹ ایک طرف اور بیڈ پہ بیٹھی مہر خان سرخ
جوڑے میں سبھی ایک طرف۔۔

وہ داعیر خان کی پسند کے لہنگے میں سبھی اسکی دل کی دھڑکن
سرپٹ دوڑا گئی تھی۔۔ وہ اپنے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ
لاک کرتا، دبے پاؤں بیڈ کی طرف بڑھا تھا۔ اس کو اپنے قریب
بیٹھتا دیکھ کر مہر خان کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی تھی۔

داعیر خان اپنا ایک گھٹنا فولڈ کئے بیڈ پہ بیٹھتا آگے بڑھ کر بے تابی
سے مہر خان کے چہرے سے گھونگھٹ ہٹا گیا تھا اور سامنے کا
منظر دیکھ کے ہی اس کا دل چند لمحے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ شہد

رنگ آنکھوں کو قرار ملا تھا۔ دودن کے بعد شفاء جیسے چہرے کا
دیدار نصیب ہوا تھا اور اس دیدار سے داعیر خان کے پورے
جسم میں سکون کی لہر دوڑ گئی تھی۔

ماشاء اللہ! اے نورِ چشم!

تو ہے اتنی حسین کہ تیرے حسن کا صدقہ
میں اپنی جان دے کے نکالوں

اسیر ہوں تیرے حسن کا، تیرے قاتل نین جو ایک بار دیکھ لوں،
تو مجال ہے میں دوسری سانس بھی حلق سے نکالوں

تجھے ہر لمحہ نظروں کے سامنے رکھوں
تیرے دیدار کا لمحہ میں چلتے وقت سے چرا لوں

تو پیروں سے بھی حسین ہے
تیرے ملائم وجود کو میں خود میں کہیں چھپا لوں

تیرے وجود کی شبہنم سے میں معطر کروں روح اپنی
تیری سانسوں کی خوشبو سے خود کو مہکا لوں

تیرا ساتھ مجھے تاحیات بخش دیا گیا ہے
تیرے ہونے سے میں بھی آج خود کو خوش قسمت کہلوا لوں

ہر حال میں تُو مجھے اپنے ساتھ پائے گی
تیرا انمول وجود میں ساری زندگی اپنی آنکھوں میں بسا لوں

اے نورِ چشم! تُو ہے اتنی حسین کہ تیرے حسن کا صدقہ
میں اپنی جان دے کے نکالوں

اے نورِ چشم! اے نورِ چشم!

داعیر خان اپنے دل کے مقام پہ ہاتھ رکھ کے مخمور لہجے میں بولتا
اپنے چند خوبصورت جملوں میں ہی مہر خان کے حسن، ساتھ
نبھانے کے عہد و اقرار، اور اس کے وجود کو اپنے لئے خوش
قسمتی کی علامت قرار دے گیا تھا۔ داعیر خان کا اندازِ بیاں

عقیدت اور محبت سے لبریز تھا جبکہ مہر خان کی کرسٹل گرے آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اپنے لئے تعریفی کلمات سن کر اس کی آنکھوں کے کنارے خوشی سے نم ہوئے تھے۔ وہ نرمی سے اس کی ٹھوڑی پکڑ کے مہر کا چہرہ اوپر کرنے لگا۔ داعیر خان کی شہد رنگ آنکھیں جذبات سے بھرپور تھیں۔ ان میں پیار، محبت، شدت، جنون، تڑپ، توحش پن سب کچھ تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ساتھ اپنے لئے اتنے جذبات دیکھتے ہوئے مہر خان نے بے ساختہ نظریں جھکائی تھی۔ وہ اسکی محبت اور جنوں بھری نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی تھی۔

نورِ چشم!!! ایسے نہیں کرتے۔ مجھے خود کو دیکھنے تو دو۔

"ان آنکھوں کو دیدار ضروری ہے تیرا

وگرنہ میری بینائی چلی جائے گی"

داعیر خان بھاری گھمبیر آواز میں بولتا مہر خان کے ماتھے پہ لب
رکھتے ہوئے اس کا چہرہ پھر سے اوپر کی طرف کرتا مہر خان کی
کر سٹل گرے آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ وہ دیوانوں کی طرح مہر
خان کے ایک ایک نقوش کو فرصت سے دیکھ رہا تھا۔ اور ہر بار
اسکی نگاہوں کا مرکز مہر خان کے یا قوتی ہونٹ بن رہے تھے جو
اس وقت ریڈ لب اسٹک سے سجے تھے۔ اسکی نتھ کا ایک
گھنگھرو مہر خان کے بالائی لب کو چھو رہا تھا۔ داعیر خان نے
فوراً اس نتھ کو احتیاط سے مہر خان کے ناک سے اتار کے دور کیا
تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے علاوہ کوئی بھی شے ان
پنکھڑیوں کو چھوئے۔

داعیر۔۔۔ اسے دیوانوں کی طرح اپنی طرف دیکھتا پا کر مہر خان
نے اسے مدہم آواز میں پکارا تھا۔

جی داعیر کی مہر۔۔۔۔ وہ محبت بھرے لہجے میں جواب دیتا

اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کے چومنے لگا۔

کیا آپ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ آپ صرف میرے
حسن کے صدقے اپنی جان واردیں گے؟۔۔۔ مہر خان خوشی
اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات سے بولتی اس کے کہے گے
جملوں کی وضاحت جاننا چاہ رہی تھی۔ وہ صرف یہ جانتی تھی کہ
داعیر خان اس سے محبت کرتا ہے لیکن بے پناہ کرتا ہے یہ جان
کے حیرت ہو رہی تھی۔

تمہیں کوئی شک ہے میری محبت پر؟ جان تو بہت چھوٹی سی چیز
ہے میرا بس چلے تو اپنے اس بوسیدہ وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کر
کے تمہارے سر سے وار کے پھینک دوں۔۔۔۔ داعیر خان

آنکھوں میں سچے جذبات کا سمندر لئے بولتا مہر خان کو حیران کر
گیا تھا۔

داعیر پلیز! اپنے وجود کو بوسیدہ مت بولیں، مجھے تکلیف ہوتی
ہے۔ مجھے آپ کی محبت پہ خود سے بھی زیادہ یقین ہے۔ آپ
اور آپ کا وجود بہت تبرک ہے میرے لئے۔۔۔ مہر خان
اس کے الفاظ سنتی تڑپ کے بولی۔۔

اچھا پھر تم بتاؤ تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے؟۔۔۔۔۔ داعیر
خان اب اس کے ہاتھ پکڑ کر ان پہ لگی مہندی میں اپنا نام تلاشتا
شریر لہجے میں بولا تھا۔

پہلے آپ میری مہندی میں اپنا چھپا نام ڈھونڈھ کر دیکھائیں، پھر
بتاؤ گئی۔۔۔۔۔ مہر خان لاڈ سے بولی تھی۔

وہ تو میں نے ابھی ڈھونڈھ لینا ہے، اس میں اتنا مشکل کام کونسا ہے؟۔۔۔ داعیر خان اب آنکھیں چندھیا کئے اس کی مہندی سے سچی ہتھیلیوں میں اپنا نام تلاشنے لگا۔

اہہ! "داعیر کی مہر"۔۔۔ داعیر قربان اپنی مہر پہ، مل گیا مجھے اپنا نام تمہارے ہاتھ کی لکیروں میں بھی اور تمہارے دل کی دھڑکن میں بھی۔۔۔ وہ اس کی ہتھیلی پہ اپنا سجا نام دیکھتا محبت سے چور لہجے میں بولتا اس کی دونوں ہاتھ چوم گیا تھا۔

چلو اب بتاؤ مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو؟۔۔۔ داعیر خان نے اپنی شہد رنگ آنکھوں میں چمک لئے سابقہ سوال دہرایا تھا۔ بہت زیادہ کرتی ہوں۔ خود سے بھی زیادہ کرتی ہوں۔ آپ کے علاوہ مجھے اس جہان میں کوئی چیز عزیز نہیں ہے۔ آپ کا ساتھ میرے لئے ایسے ضروری ہے جیسے دل کیلے دھڑکن، جسم کیلئے

روح، جینے کیلئے زندگی اور سکون کیلئے خوشی، ایسے لازم و ملزوم
ہے آپ کا ساتھ میرے لئے۔۔۔ آپ کے بغیر میں نامکمل ہوں
لیکن جب آپ سے منسلک ہوتی ہوں تو میری ذات پایہ تکمیل کو
پہنچ جاتی ہے۔۔۔۔۔ مہر خان نے بنا ہچکچائے اپنے جذبات کا
اقرار کیا تھا۔۔۔ مہر النساء کے اقرار پہ داعیر خان کا دل کانوں
میں دھڑکا تھا۔۔۔ اس کے لفظوں نے اس کی محبت کو امر کیا تھا اور
داعیر خان کا دل مہر خان کے اقرار سے سرشاری میں ڈوب کے
ابھرا تھا۔

کیا کر سکتی ہو میری محبت میں؟ مطلب کس حد تک جا سکتی ہو
میری لئے؟۔۔۔۔۔ داعیر خان اب شریر لہجے میں پوچھنے لگا۔

جو آپ کہیں گے، وہ کروں گی اور آپ کیلئے تو میں ہر حد کو پار کر سکتی ہوں۔۔۔۔۔ مہر خان نامحسوس انداز میں اسکے لبوں کی جسارت اور اسکی نزدیکی پہ کنفیوز سی ہوئی تھی۔

اوکے!! مجھے بس آج رات تمہارا ساتھ چاہیے۔ اور پورا چاہیے۔ کوئی مزاحمت کوئی شرمیلا پن نہیں چلے گا۔۔۔۔۔ داعیر خان حکمیہ لہجے میں بولتا اب بیڈ سے اٹھ کر الماری کی طرف بڑھتا وہاں سے تین ریڈ ویلوٹ کے باکس اٹھائے بیڈ پہ لایا تھا۔ مہر خان نے اسے کوئی بھی جواب نہیں دیا تھا کیونکہ وہ اسکی آنکھوں میں اڈتے جذبات دیکھ کر سمجھ چکی تھی کہ وہ کس ساتھ کی بات کر رہا ہے۔ وہ اب خاموشی سے ریڈ ویلوٹ کے باکسز کو دیکھ رہی تھی جنہیں داعیر خان کھول رہا تھا۔۔۔ وہ ایک باکس کھولے

اس میں سے ڈائمنڈ سیٹ نکال کے مہر خان کی طرف بڑھا گیا
تھا۔

داعیر!! یہ بہت خوبصورت ہے۔۔۔ مہر خان اس خوبصورت
سے ڈائمنڈ سیٹ کو دیکھتی چہکی تھی۔

تم سے زیادہ خوبصورت نہیں ہے میری مہر۔۔۔ داعیر خان
نرمی سے اس کا بھاری دوپٹہ سر سے اتار کر سائیڈ پہ رکھتا یکے بعد
دیگرے اسکی ساری جیولری ریموو کرتا ڈائمنڈ نیکلیس مہر خان
کے ہاتھ سے پکڑ کے اس کے گلے کی زینت بنانے لگا۔
اب یہ درحقیقت خوبصورت لگ رہا ہے۔۔۔ داعیر خان اسکے
کندھے پہ لب رکھتا مہر کا نیکلیس سیٹ کرنے لگا۔

آج کی رات میں تمہیں اپنی محبت اور اسکی نشانیاں دے کر
ہیرے سے بھی زیادہ انمول کر دوں گا۔۔ میری محبت کا ایک
ایک لمحہ تمہارا ہے۔

صرف تم حق دار ہو داعیر خان کی محبت کی!
میری مہر حق دار ہے میری بے پناہ محبت کی! داعیر خان باقی
دونوں باکس کھولے سائیڈ پہ رکھتا اپنی شیروانی اتارنے لگا۔
داعیر! رات تو آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے، مجھے نیند آرہی
ہے۔۔۔ مہر خان نے اس کے چٹانی سینے کو دیکھتے ہی ڈر کے
مارے تھوک نکلتے ہوئے نیند کا بہانہ بنایا۔

نورِ چشم! یہ آدھی سے بھی تھوڑی رات میری قربت میں
تمہارے لئے گزارنی مشکل ہو جائے گی اور جہاں تک رہی
سونے کی بات، وہ ہم فجر کی نماز پڑھنے کے بعد سوئیں گے اور

مجھے بتاؤ تمہیں کچھ چاہئے تو نہیں؟ مطلب بھوک تو نہیں لگ رہی؟۔۔۔ داعیر خان مخمور لہجے میں بولتا نرمی سے مہرو النساء کا جبرٹا پکڑے اس کے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیر کے تر کرتا

سوالیہ انداز میں گویا ہوا۔

نہیں مجھے کچھ نہیں چاہئے، میں نے کھانا کھا لیا تھا۔۔۔ مہر خان شرم سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ بولتی چھپکھسکنے لگی۔

تمہیں چاہئے تو بہت کچھ اور میں تمہیں آج رات سب کچھ میسر کروں گا نور چشم۔۔۔ داعیر خان نے شرارت سے کہتے ساتھ ہی مہرو النساء کے ہونٹ اپنے عنابی لبوں کی قید میں لے گیا تھا۔ وہ اس اچانک افتاد پر ہڑبڑاتی ہوئی اسے کندھوں سے تھام گئی۔۔۔ داعیر خان تھوڑی دیر اس کی پنکھڑیوں کو نرمی سے چومنے کے بعد اب شدت سے سک کرنے لگا تھا۔ وہ مہر کو چھپ

تکیے پہ گراتا اس کی زبان سے اپنی زبان الجھا کر ساری نمی سک
کرنے لگا۔ وہ اسکی نازک پنکھڑیوں کو اپنے لبوں اور دانتوں
میں دبا کے چھوڑتا پھر سے انہیں اپنے لبوں میں قابو کر جاتا۔ وہ
اس کے کندھوں پہ ہاتھ جمائے اسے ہوش دلانے کی کوشش
کرنے لگی جو ہمیشہ کی طرح بے حد ہار ش ہو رہا تھا۔
کس می بیگ۔۔۔ داعیر خان دو سکینڈز کیلئے اس کے لبوں کو
چھوڑتا حکمیہ انداز میں بولا۔ اس کے حکم پہ تضاد اس کی
آنکھوں میں جنون دیکھ کے مہرو النساء شرم سے سرخ ہوتے
چہرے کے ساتھ داعیر خان کے بالائی لب کو اپنے لبوں میں لیتی
سک کرنے لگی تھی۔ اس دوران داعیر خان نے بنا کوئی حرکت
کئے مہرو النساء کو اپنے لبوں کے جام سے سیراب ہونے دیا
تھا۔

وہ آنکھیں موندے اپنا ہاتھ داعیر خان کی بئیر ڈپہ جماتی نرمی سے
اسکے لبوں کو سک کرنے لگی تھی۔ وہ اس کے لبوں کی چاشنی
کو اپنی زبان پہ محسوس کرتا اسکے بال کھول کے پشت پہ بکھیرتا،
مہر خان کو پچھلی گردن سے پکڑے شدت سے اسکے لبوں میں
اپنے لب پیوست کر گیا۔ اس کا جبرٹاوا کئے داعیر نے اس کے
دونوں لبوں کو اپنی زبان کی گرفت میں لیا اور ڈپیلی کس کرنے
لگا۔ کس کا دورانیہ لمبا ہونے لگا۔ سانسیں حلق میں اٹکنے لگی
تھی۔

مہر خان نے اس کے سینے پہ ہاتھوں کا زور بڑھاتے ہوئے اپنے
لب چھڑوانے کی سعی کی۔ اس کا چہرہ شرم اور سانس گھٹنے کی وجہ
سے انگارہ ہو رہا تھا۔ داعیر خان اس کا سرخ ہوتا چہرہ دیکھ کر
فوراً اس کے لبوں کو دانتوں میں دبا کے باہر کی جانب کھینچتا رہائی

بخش گیا تھا۔ لب آزاد ہوتے ہی وہ لمبی سانسیں لیتے ہوئے
خود کو نارمل کرنے لگی تھی۔ سانسیں نارمل کرنے کے بعد داعیر
اسے کمر سے پکڑ کر اوپر کی طرف اٹھاتا ایک جھٹکے میں مہر خان کا
سراپہ فٹ بلاؤز کی قید سے رہا کر گیا۔ مہر خان کی ریڑھ کی ہڈی میں
سنسنی دوڑی تھی۔

شرم سے پانی ہوتی مہر و النساء اس کے سینے میں چھپنے کی کوشش
کرنے لگی لیکن داعیر خان بے چینی سے اسکی ریڈیڈ سٹریپ
میں انگلیاں الجھاتا مہر خان کے نرم و ملائم گداز سراپے کو خود پہ
عیاں کر گیا تھا۔ وہ پورے استحقاق سے اسکے خوبصورت
خدو خال کو نظروں سے ماپ رہا تھا۔ مہر خان اس کی نظروں کی
تپش خود پہ محسوس کرتی شرم سے لال انار ہوتی کروٹ بدل
گئی۔

داعیر خان اسے کندھوں سے پکڑ کر اس کی لچکیلی کمر پر ڈھیروں
بو سے دے کر سیدھا کرتا، اس کے سر اُپے پہ ہاتھ پھیر کے
سہلانے لگا۔ وہ اس کے سر اُپے کی رعنائیاں دیکھتا تھو کہ نگلتے
ہوئے اپنا خشک حلق تر کرتا آگے جھک کر اپنی زبان کی نوک
اس کے بدن کے ملائم حصہ پہ پھیر کے انہیں لبوں میں دبائے
سک کرنے لگا۔ مہر خان اس کی زبان کی سختی اپنے سینے پہ
محسوس کرتی اس کے بالوں میں انگلیاں الجھائے اس کے جنونی
لمس کو برداشت کرنے لگی۔ داعیر خان بے قابو ہوتا پر جوش
انداز میں اسکے سر اُپے کو لبوں اور دانتوں سے چھونے کے
ساتھ دوسرے ہاتھ سے انہیں اپنی مٹھی میں جکڑے بے رحمی
دیکھانے لگا۔

آہہ داعیر!! بی جینٹل۔۔۔۔ مہر خان نے اسکی بے رحمی پہ
سکتے ہوئے اسے کندھوں سے تھام کر گزارش کی۔۔

میری مہر۔۔۔ وہ اس کے سینے سے چہرہ نکالتا پیار سے مہر خان
کی ٹھوڑی چوم گیا۔ دونوں کی آنکھوں سے خمار کی سرخی چھلک
رہی تھی۔۔

آج اجازت دو میری مہر کہ میں اپنی محبت کو امر کروں۔ تمہیں
خود میں چھپا کے سکون کے ایک الگ جہان میں لے جاؤ، میری
تڑپ کو آج آخری کرو! قربت کے لمحات میں میرا ساتھ
دو۔۔۔۔۔ داعیر اس کی گردن سک کرتے ہوئے مہر خان کی
قربت کو پانے کیلئے ملتجی ہوا تھا۔

اسکی سرخی چھلکتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مہرو النساء نے اس کے ماتھے پہ بکھرے بال اپنے نازک ہاتھ سے چھپے کئے اور اس کی بیڑیہ لب رکھ کر دھڑکتے دل کے ساتھ اجازت دے گئی۔ داعیر کی مہر۔۔۔ وہ اس کے اتنے پیارے انداز پہ گھائل ہوتا اس کے چہرے کو جا بجا چومتا اوپر کو اٹھاتا تھا۔ مہر خان کا بھاری لہنگا ایک جست میں اس کے تن سے جدا کرتا وہ خود کو بھی ہر پردے سے آزاد کرنے لگا۔ معنی خیز نظروں سے مہر خان کو دیکھنے کے بعد وہ اسکا حیا سے جھکتا چہرہ اٹھا کر خود کے مقابل کرنے لگا۔

داعیر!! پلیز لائٹ آف کریں۔۔۔ ایک ہی نگاہ اس کے مضبوط وجود کو دیکھ کر مہر خان شرم سے سرخ گلاب ہوتی تیزی سے نظروں کا زاویہ بدلتی خود پہ کفر ٹر دے گئی۔۔۔

دیکھ لو یار! کل بھی تم نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ سین آدھا رہ گیا تھا لیکن آج تم مجھے ہر لحاظ سے لائیو دیکھ سکتی ہو۔۔۔ داعیر خان اس کے یوں نظریں بدلنے پر پُر لطف لہجے سے بولتا آگے بڑھ کر کمفرٹر اس کے جسم سے کھینچ کر دور اچھا ل گیا تھا۔
داعیر!! لائٹ آف کریں۔۔۔۔۔ مہر خان نے اپنی بکھری حالت اور اس کے مضبوط وجود کو دیکھتے ہوئے لڑکھڑاتی آوازیں التجا کی تھی۔ شرم کے مارے اس کا جسم اور چہرہ بھاپ چھوڑ رہا تھا، ڈر کے مارے ہتھیلیاں پسینے سے بھیک چلی تھی۔۔۔
داعیر نے اسکی التجا اور غیر ہوتی حالت دیکھ کر مسکراہٹ دباتے ہوئے تیزی سے کمرے کی لائٹس آف کر دیں۔ لائٹس آف ہوتی دیکھ کر مہر و النساء کی سانس میں سانس آئی تھی وگرنہ داعیر خان تو آج اسے ویسے ہی بے ہوش کرنے کا ارادہ کر رکھا

تھا۔ اب صرف کمرے میں مدہم رومانوی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اس کے پاس آتا اس پر سایہ فگن ہوا تھا۔ داعیر خان کے برہنہ وجود کو اپنے وجود کے ساتھ مس ہوتا محسوس کر کے مہر خان شرم اور خوف سے خود میں سمٹی تھی۔

ڈرو مت میری مہر! تمہیں بالکل بھی تکلیف نہیں دوں گا بلکہ میرا وجود صرف تمہارے لئے سکون کا باعث بنے گا۔۔۔۔۔ داعیر اس کی برہنہ پشت سہلاتے ہوئے اس کے ماتھے پہ لب رکھے نارمل کرنے لگا۔ اس کے دوسرے ہاتھ کی گستاخیاں مہر خان کی لوئر بیل سے ہوتی انر تھائی پہ آ کے رکی تھیں۔ وہ یہی رک کر اپنے ہاتھ کی موومنٹ بڑھانے لگا۔

داعیر۔۔۔۔۔ مہر خان اس کے ہاتھ کی بے باکی پہ مچل اٹھی تھی۔

ششش! بس خود کو پر سکون کرو اور فاصلہ بناؤ۔۔۔ داعیر خان
بھاری گھمبیر آواز میں بولتا اسے سختی سے ٹوک گیا، جو بار بار خود
میں سمٹتی اس کی مومنت میں خلل ڈال رہی تھی۔

اہہ۔۔۔ دا۔۔۔ غیر۔۔۔ مہر خان اس کے سینے میں چھپتی اس
کے ہاتھ کی بے باک جسارت پہ سسکتے ہوئے مدہوش ہوئی اور
اس کا ہاتھ چھپے ہٹانے کی سعی کرتی داعیر خان کے سینے پہ دانت
گاڑنے لگی۔ وہ چھپے ہٹتا اسکے لبوں کو چومتے ہوئے اس کے
سراپے کی ناز کی کو اپنی دونوں مٹھیوں میں بھر کے چھوڑتا نیچے
اس کے پیٹ پہ آیا تھا۔ اس کے بیلی بٹن میں اپنی زبان کی نوک
پھیرتا اس کے پیٹ کی سکن سک کرتا اپنے ایک ہاتھ سے اسکی
ٹانگوں کو سہلانے لگا۔ اس کا ہاتھ اور لبوں کا گیلہ لمس اپنی تھائیز
کے درمیان محسوس کرتی مہر خان اسکو بالوں سے جکڑتی سسکتے

ہوئے مدہوشی میں اپنی کمر اوپر اٹھائے تکیہ سے سر اٹھا کر چھپے
ہٹنے لگی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں خمار کی سرخی دیکھتا سائیڈ
ٹیبل پہ پڑے باکس میں سے ایک خوبصورت سی ویسٹ چین
نکالے اس کی کمر میں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے اوپر کی طرف اٹھاتے
چین کو نیچے سے گزار کر اس کی لچکیلی کمر میں پہنا گیا تھا۔

داعیر خان اس کے چین سے سچے پیٹ پر جا بجا لب رکھتا اٹھ
کے بیٹھا اور مہر خان کو سیدھا کرتے ہوئے اس کی تھائیز سے پکڑ
کر اپنی رانوں میں ایڈجسٹ کرتا اپنا سخت لمس بے باکی سے اس
کے نازک وجود سے مس کرنے لگا۔

داعیر! مجھے ڈر لگا رہا ہے۔۔۔ مہر خان کانوں تک سرخ پڑتی
ڈرتے ہوئے اسے پکارنے لگی۔ ڈر کے مارے اسکا پورا جسم

تھر تھرا رہا تھا۔ ہونٹ خشک ہو گئے اور گلے میں گلی بھر کے
معدوم ہوئی تھی۔

ڈرو مت! تمہارا داعیر کبھی تمہیں تکلیف نہیں دے سکتا۔ مجھ
پہ بھروسہ رکھو۔ باخدا نرمی سے پیش آؤ گا۔ میں جانتا ہوں،
میری مہر پھول ہے اور میں اپنے پھول کو ناز کی سے چھوؤں
گا۔۔۔ وہ اس کے خشک لبوں کو اپنی زبان سے تر کرتا اسکی
بھگی ہتھیلیاں چوم کر اپنے سینے پہ رکھ گیا۔

داعیر خان تھوڑا سا آگے ہوتا اس کی دونوں تھائیز کو نرمی سے
سہلا کر ایک ہاتھ مہر کے کندھے پہ رکھے دوسرے ہاتھ کو
بروئے کار لاتے ہوئے وہ مہر خان کی کر سٹل گرے آنکھوں
میں دیکھتا بے حد نرمی سے اپنا وجود اس میں شامل کرنے لگا۔

اہہہہ۔۔۔۔۔ داعیر۔۔۔۔۔ مہر خان اس کی ذرا سی سختی محسوس
کرتی فوراً اچھل کے چھپے ہوئی۔ چہرے پہ خوف اور درد کی لہر
دوڑی تھی۔

مہر!! کچھ نہیں ہوگا، میں تمہیں تکلیف نہیں دوں گا میری جان!
بس تھوڑی سی پین ہوگی۔۔۔۔۔ داعیر خان سرخی چھلکتی آنکھوں
میں ملن کی تڑپ لئے یقین دہانی کرواتا پھر سے اسکی تھائیز سے پکڑ
کر خود کے قریب کر گیا۔ اب کی بار داعیر اس کی تھائیز پہ اپنے
دونوں ہاتھوں کی گرفت مضبوط کرتا اس کو چھپے ہٹنے سے قاصر کر
گیا تھا۔ وہ اس کی رانوں پہ اپنی انگلیاں پیوست کرتا نرمی سے
اس میں اپنا وجود تھوڑا سا شامل کر کے چھپے ہٹتا، پھر سے شامل
کرتا۔۔۔۔۔ دو تین کوششوں کے بعد چوتھی بار داعیر خان ایک جھٹکے
سے اپنا مکمل وجود اس میں شامل کر گیا تھا۔

آہہہ۔۔۔ داعیر۔۔۔ اس کی بے رحم حرکت پہ مہر خان کی
دلخراش چیخ نکلی تھی۔

نور چشم۔۔۔۔۔ وہ محبت سے لبریز لہجے میں اسکی پکار کا جواب
دیتا آگے کو جھک کر اس کے ماتھے پہ عقیدت سے لب رکھتا
، اس کی کر سٹل گرے آنکھوں پہ ٹکے آنسو اپنے لبوں سے پی گیا
تھا۔

پلیز! داعیر۔۔۔ آہستہ۔۔۔ مہر خان نے سہمتے ہوئے کہا تھا
کیونکہ وہ اسکے جنونی انداز سے ڈرتی تھی۔۔

آہستہ تو مزہ نہیں آئے گا نور چشم۔۔۔ داعیر خان اس کی چھوٹی
سی ناک کو لبوں میں دبا کے چھوڑتا گھمبیر آواز میں بولتے ہوئے
اپنے نچلے وجود کو ہلکا سا موو کرنے لگا۔ وہ اس کی طرف سے
نرمی پا کر اس کے سینے کے بالوں میں انگلیاں الجھائے میٹھی

سسکیاں بھرنے لگی۔۔ تھوڑی دیر نرم رہنے کے بعد مہر خان
کو ریلیکس ہوتا دیکھ کر داعیر خان اسکی تھائیز پہ اپنے ہاتھوں کی
گرفت مضبوط کرتا اپنی حرکت میں تیزی لانے لگا۔ مہر خان نے
بوکھلاتے ہوئے اسکے بازوؤں پہ اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط
کی تھی۔

میری۔۔ طرف۔۔ دیکھو۔۔ اور مجھے۔۔ زور۔۔
سے۔۔ پکڑو۔۔۔۔ داعیر خان بھاری سانسوں کے درمیان
بولتا اسکی دونوں ٹانگوں کو پنڈلیوں سے پکڑ کر چھپے پنڈ کرتا مہر خان
کے سینے سے لگا کر ان پہ ہاتھوں کا دباؤ دیتے ہوئے اس میں
آخری حد تک سمایا تھا۔۔ مہر خان نے اس کے جان لیوا لمس پہ
ہڑبڑاتے ہوئے اس کے بازوؤں کو چھوڑ کے کندھوں سے جکڑ

لیا۔ داعیر خان گھٹنوں کے بل ہوتا اپنے وجود کی حرکت
خطرناک حد تک بڑھا گیا۔۔

اہہہ۔۔ اہہہ۔۔ دا۔۔۔ داعیر۔۔۔۔۔ بس کریں۔۔
مجھے۔۔ پین۔۔۔۔۔ ہو۔۔۔ رہی۔۔۔ ہے۔۔۔۔۔ مہر خان اپنے
لرزتے وجود کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بولی تھی۔
نور چشم!! تھوڑی تو۔۔ پین۔۔ ہوگی۔۔ بعد میں۔۔۔ تمہیں
مزہ۔۔۔ آئے گا۔۔۔ وہ پھولی سانسوں سے بولتا اس کے
سینے کی نازکی کو اپنی مٹھیوں میں دبائے نرمی سے اس کے خشک
ہوتے لبوں کو چومنے لگا تھا۔ مہر خان پیاسوں کی طرح اپنے
لب اس کے لبوں کے ساتھ جوڑتی انہیں سک کرتے ہوئے
اپنا خشک ہوتا حلق تر کرتی سسکیاں بھرنے لگی تھی۔۔ داعیر
خان اب گھٹنوں کے بل ہو کے اٹھتا نچلا وجود مہر خان کی تھائیز

پہ جھکائے اپنے دونوں ہاتھ بیڈ کراؤن پہ جماتا شدت پسند ہوا
تھا۔۔ مہر خان کی آنکھیں پانیوں سے بھریں، کیلجہ منہ کو آیا تھا

--

داعیر!! پلیز! ایک۔۔ دفعہ۔۔ رک۔۔ جائیں۔۔ میں
مر۔۔ جاؤں۔۔۔ گی۔۔ مہر خان اس کے جان گداز سٹروکس
کی تاب نہ لاتے ہوئے سسک کر بول اٹھی تھی۔ وہ اس کی
آنکھوں اور چہرے پہ تکلیف کا عنصر دیکھتا فوراً چھپہٹ گیا۔
تم ٹھیک ہو؟۔۔۔ وہ اس کے آنسو اپنے لبوں سے صاف
کرتا اس کے ماتھے پہ لب رکھنے لگا۔

آپ بہت زیادہ بے شرم ہیں داعیر۔۔۔ اس نے غصے سے اس
کی گردن پہ دانت گاڑتے ہوئے شکوہ کیا۔ دونوں کے جسم پسینے

سے تر تھے۔ اور تیز چلتی سانسوں کا شور پورے کمرے میں گونج رہا تھا۔۔

مجھے شرعی رشتے کے ساتھ حیا میں رہ کے بے شرم ہونا بہت پسند ہے میری مہر۔۔۔ داعیر خان اس کے چہرے اور جسم کو اپنے لبوں سے مہکاتا، اسکو خود میں سمیٹتے ہوئے بیڈ سے اتر کے صوفے پہ لے آیا تھا۔

نرمی سے اس کو صوفے پہ لیٹائے اس کا پورا جسم تھوڑی دیر اپنے ہاتھوں سے سہلاتا وہ مہر خان کو اپنی قربت کیلئے پھر سے تیار کرنا لگا تھا۔ مہر والنساء اس کے ہاتھوں اور لبوں کی جسارتیں اپنے وجود کے ہر اعضاء پہ محسوس کرتی مدہوشی میں اپنے لب کاٹنے لگی۔۔۔ داعیر خان بے باکی سے اپنا وجود اسکی تھائیز سے مس کرنے لگا جس پر مہر خان نے تڑپتے ہوئے بے

ساختہ آگے بڑھ کر اسکے بالوں میں انگلیاں پھیری تھیں۔ اسکی آنکھیں خمار کی شدت سے لہو ہو رہی تھی۔ داعیر خان نے اپنا ایک گھٹنہ فولڈ کرتے ہوئے صوفے پہ رکھا جبکہ دوسرا پیر زمین پہ جما کر اس کی ایک تھائی پہ ہاتھ رکھے دوسری تھائی اپنے سینے سے لگاتا ایک دفعہ پھر سے اس میں طوفان کے جیسے شامل ہوا تھا۔ وہ اپنی خطرناک شدتوں سے مہر خان کو منہ کھولنے پر مجبور کر گیا تھا۔

اہہہ! امم!!۔۔۔۔۔ وہ منہ کھولے ان اذیت سے بھرپور لمحات سے لذت اٹھانے لگی تھی جبکہ داعیر خان اس کی میٹھی سسکیاں سنتا مزید اپنے دونوں لب دانتوں تلے دبائے جنونی ہوا تھا۔
تم صرف۔۔۔ داعیر کی ہوا!! تمہارا۔۔۔ وجود۔۔۔ داعیر کیلئے بنا
۔۔۔ کیا ہے۔۔۔ میری۔۔۔ محبت کے۔۔۔ قابل صرف۔۔۔ تم

ہو۔۔۔۔۔ داعیر خان اپنے غیر ساکت وجود کے ساتھ اسکے کان
میں میٹھی سرگوشیاں کرتا اسے اپنی جان لیوا قربت میں پگھلانے
لگا تھا۔

مہرو النساء لمحہ بہ لمحہ ٹوٹ کے بکھرتی اس کے وجود میں سمٹ
رہی تھی۔ داعیر خان کا بدن پسینے سے تر ہو چکا تھا۔ اس کے
جسم سے نکلتی پسینے کی بوندیں مہر خان کے جسم کو بھیگو رہی
تھی۔ کافی دیر بعد مہر خان نے اس کا وزن نہ برداشت کرتے
ہوئے مزاحمت کی تھی۔

داعیر!! میری۔۔۔۔۔ سانس۔۔۔۔۔ بند۔۔۔۔۔ ہو۔۔۔۔۔ رہی۔۔۔
ہے۔۔۔۔۔ مہر خان نے اس کے کندھے پہ اپنے ناخن پیوست
کرتے ہوئے اسے ہوش دلانے کی کوشش کی جو جہان کا ہوش
بھلائے اس میں سرایت کر رہا تھا۔ اپنے کندھے پہ جلن

محسوس کرتا داعیر ایک جست میں مہر خان کو اپنے نیچے سے
نکال کر گود میں شفٹ کر گیا تھا۔

اب بتاؤ مجھے کبھی اپنے دیدار سے محروم رکھو گی؟ ابھی تو دو
راؤنڈ میرے باقی ہیں جو تمہیں سزا کے طور پر بھگتنے ہیں۔۔۔
داعیر خان اس کی گردن اور لبوں پہ دانت گاڑتا اپنی پچھلی رات
کی دھمکی یاد دلانے لگا۔

نہیں! آپ پہلے ہی حساب برابر کر چکے ہیں۔ اب بس میں تھک
چکی ہوں۔۔۔ مہر خان تھکے ہوئے لہجے میں کہتی اس کے برہنہ
سینے میں منہ چھپا گئی اور اس کے سینے کے بالوں میں انگلیاں
پھیرے اپنا نام لکھنے لگی تھی۔

اچھا دو نہیں تو پھر ایک کر لیتے ہیں لیکن کرو گی تم۔۔۔۔۔ وہ مہر
خان کا چہرہ اپنا سینے سے نکالے اس کی ٹھوڑی پہ لب رکھتے
ہوئے آنکھوں سے بے باک اشارہ کرنے لگا۔۔

داعیر!! یہ میں نہیں کروں گی۔۔۔۔۔ وہ اس کا اشارہ سمجھتے ہی
شرم سے دوہری ہوتی اسکے سینے پہ مکے برسائے لگی۔

چلو!! ٹھیک ہے میں خود کر لیتا ہوں، پھر نہ کہنا میں زیادہ ہار ش
ہو رہا ہوں۔۔۔۔۔ وہ اپنی مسکراہٹ ضبط کرتا مہر خان کو کمر سے
جکڑ کر تھوڑا سا اوپر اٹھا کے اپنی رانوں پہ بیٹھاتا، اپنا پورا وجود
اس میں منتقل کر گیا تھا۔

اہہ۔۔۔۔۔ مہر خان ایک جان گداز آواز نکالتی اس کو کندھوں
سے تھام گئی تھی۔۔۔ وہ اس کی کمر کو تیزی سے حرکت دیتا خود کو
لطوفت سے دوچار کرتا معنی خیز آوازیں حلق سے نکالنے لگا

تھا۔ وہ بے قراری سے مہر خان کی دھڑکنوں کو لبوں میں دبا کے
چھوڑتا ان پہ اپنی جنون خیزیاں رقم کرنے لگا۔ مہر خان کے
گھنے بال داعیر خان کے چہرے پہ گرے ہوئے تھے۔ اس کے
جسم کی نازکی اور اسکے بالوں سے اٹھتی خوشبو داعیر خان کو مزید
پاگل کر رہی تھی۔۔۔ پورا کمرہ ان کے ملن کی آوازوں میں ڈوبا ہوا
تھا۔۔۔ گزرتی رات کے ساتھ داعیر خان کی شدت میں اضافہ ہو
رہا تھا۔ نازک سی مہر والنساء اپنے محرم کی قربت میں پگھلتی
اس کے وجود میں گم ہو رہی تھی۔

داعیر!! بس۔۔۔ کریں۔۔۔ میری۔۔۔ کمر۔۔۔ میں۔۔۔ درد۔۔۔
ہو رہی۔۔۔ ہے۔۔۔۔۔ مہر خان اب ادھ مونہی ہوتی اسکے
کندھے پہ سر ٹکا گئی۔ وہ مہر کو تھوڑا سا اٹھا کر اپنے سینے سے لگاتا
خود کو اس سے الگ کر گیا تھا۔۔

کہاں درد ہو رہی ہے؟۔۔۔ داعیر خان اس کے سارے بال
سمیٹ کر چھپ کر تا مہر خان کے کندھے پہ بوسہ دے گیا۔۔
کمر میں ہو رہی ہے۔۔۔ مہر خان تھکے ہوئے انداز میں جواب
دیتی خفگی سے اس کے سینے پہ دانت گاڑنے لگی۔

نور چشم!! تمہارا یہ کاٹنے کا انداز بتا رہا ہے کہ ابھی تک تم میری
قربت سے سیر نہیں ہوئی ہو؟۔۔۔ داعیر خان نرمی سے اسکی کمر
دبا کر شرارت سے بولتا درد کی شدت کم کرنے لگا تھا۔
چپ کر جائیں داعیر! ورنہ میں آپ کو کھا جاؤ گی۔۔۔۔ مہر خان
کمر کے درد سے تھوڑا آفاقہ پاتی کلس کے بولی تھی۔ اس کے
ہاتھوں کا بیٹھا لمس اسکی کمر کی پین کو کم کر رہا تھا۔

ٹھیک ہے تم مجھے کھا لو!! میں تمہیں کھا لیتا ہوں۔۔۔ وہ شریر
لہجے میں بولتا مہر خان کو اپنے سینے سے نکال کے اس کے سر اُپے

یہ حملہ آور ہوا تھا۔ وہ پھر سے مہر خان کی جان ہلکان کرنے کیلئے
تیار ہو چکا تھا۔ اور اس کو اکسایا مہر خان نے خود تھا۔۔۔ اب
داعیر خان کے حصار سے رہائی مہر خان کو فجر کے بعد ہی ملنی
تھی۔

زر بخت۔۔۔ زر بخت۔۔۔ نزہت خان آنکھیں بند کئے
اپنے پہلو میں ہاتھ پھیرتے ہوئے تکلیف سے نقاہت زدہ آواز
میں زر بخت کو پکارنے لگی لیکن ان کے ساتھ سوئی زر بخت شاید
شادی کی تھکاوٹ کی وجہ سے گہری نیند میں تھی، اس لئے وہ
اپنی ماں کی پکار کا جواب نہیں دے رہی تھی۔

زر بخت۔۔۔ اب کی بار انہوں نے جی جان لگاتے ہوئے
آواز کو تھوڑا بلند کیا اور اگلے ہی لمحے زر بخت ہر بڑا کے اٹھ
بیٹھی تھی۔

مورے!! کیا ہوا ہے؟۔۔۔ وہ تیزی سے سائیڈ لیمپ آن
کرتے ہوئے تڑپ کر اپنی ماں کے قریب ہوئی۔

میری دوا مجھے لا دو، بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ نرہت خان
تکلیف سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ با مشکل بولی تھیں۔
مورے!! آپ کو اتنا تیز بخار ہے۔ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں
اٹھایا؟۔۔۔ اس نے جیسے ہی ماں کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا، ان کا
جسم آگ کی مانند بخار میں دھک رہا تھا۔

آپ کی دوا کہاں ہے؟۔۔۔ وہ پریشانی سے بیڈ سے اترتی
سینٹرل ٹیبل پہ پڑا دواؤں کا چھوٹا سا بیگ پکڑے بیڈ پہ لائی تھی

اور ان میں سے بخار کی دو تلاش کرتی تین گولیاں نکال کے
نزدہت خان کی طرف بڑھا گئی۔ زر بخت باقی دوائیں واپس رکھتی
سائیڈ ٹیبل سے پانی کا گلاس بھر کے ماں کو اپنے ایک ہاتھ کا سہارا
دیتے ہوئے اوپر اٹھائے پانی کا گلاس ان کے لبوں سے لگا رہی
تھی۔۔۔ وہ دو گھونٹ پانی کے بھرنے کے بعد اب دوا اپنی منہ
میں رکھتی اوپر سے مزید دو گھونٹ پانی کے بھر کے دوا حلق میں
اتار گئی۔

مورے!! آپ نے شام کو دوالی تو تھی پھر آپ کو دوبارہ کیسے
بخار ہو گیا؟۔۔۔ زر بخت نرمی سے ان کا سردباتی فکر مندی
سے استفسار کرنے لگی۔

نہیں لی تھی۔ شام کو ہم ہال تھے اور میں ساتھ دوالے جانا
بھول گئی، پھر گھر آکر بھی بچوں کی خوشی میں مصروف ہو گئی

اور دوا لینا میرے دماغ سے ہی نکل گیا تھا۔۔۔ نزہت خان
چھپے تکیے پہ سر رکھ کے لیٹتی مشکل سے بولی تھی۔۔۔

آج میں بھی بھول گئی تھی آپ کو دوا دینا اور آپ نے بھی مجھے
یاد نہیں کروایا۔۔۔ زر بخت ان کے پاس بیٹھتی ان کا سر
دباتے ہوئے بار بار نزہت خان کے ماتھے پہ لب رکھ رہی
تھی۔ اس وقت زر بخت کے پورے وجود میں بے چینی کی لہر
دوڑ رہی تھی۔ اپنی ماں کو یوں بخار میں پتا دیکھ کے اس کی نیلی
آنکھیں بار بار نم ہو رہی تھی۔۔۔ زر بخت اپنی ماں کی زرا سی
تکلیف پہ تڑپ اٹھتی ہے۔

زر!! میری گڑیا تم سو جاؤ۔۔۔ انہوں نے پیار سے زر بخت
کے گال پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے سونے کا حکم دیا۔

نہیں مورے!! جب تک آپ کا بخار نہیں اتر جاتا، میں نہیں
سونے والی۔۔۔۔۔ اس نے فوراً انکار کیا تھا۔

ارے پگلی!! میں نے دوالے لی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد میرا
بخار بھی اتر جائے گا اور میں ٹھیک بھی ہو جاؤ گی۔۔۔ تم سو جاؤ
تھکی ہوئی ہونہ۔۔۔۔۔ نزہت خان نے پھر سے بیٹی کو
سمجھاتے ہوئے سونے کی تلقین کی تھی۔

نہیں نہ مورے!! مجھے نیند نہیں آئے گی۔ آپ سکون سے
آنکھیں بند کریں اور سو جائیں، جب تک آپ کا جسم ٹھنڈا نہیں
ہوتا میں نہیں سونے والی، اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔۔۔ زر
بخت ضدی لہجے میں بولتی ان کے ہاتھ پکڑ کر چومنے لگی۔

پاگل ہو تم۔۔۔ انہوں نے تاسف سے سر جھٹکا۔ زر بخت کو
اپنی صحت کے متعلق تسلیاں دینا فضول کیونکہ نزہت خان کی

صحت کے معاملے میں وہ ان کی ایک نہیں سنتی تھی اور ہمیشہ
اپنی من مانی کر کے ساری ساری رات ان کے سر اہنے بیٹھ کے
ان کا سر اور پاؤں دباتی رہتی تھی۔

مورے۔۔۔ کافی دیر بعد زر بخت نے ان کو مخاطب کیا تھا۔
ہمم!۔۔۔ انہوں نے آنکھیں کھولے بغیر ہی ہنکارا بھرا تھا۔
مورے!! لالہ بول رہے تھے کہ وہ آپ کو کسی اچھے ڈاکٹر سے
دوا لیکر دیں گے اور آپ کے ٹیسٹ کروائیں گے، تو پھر آپ
صبح ان کے ساتھ چلی جائیں کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس تاکہ پتہ چل
سکے کہ آپ کو کیوں ہر وقت اتنا بخار رہتا ہے؟۔۔۔ زر بخت
تشویشی اور پر سوچ انداز میں بولی تھی۔۔۔

نہیں زر بخت!! تم نے آج یہ بات کر دی ہے، آئندہ نہ کرنا! اگر
بھابھی کو پتہ چلا کہ دمیر میرا چیک اپ کروا رہا ہے اور دوائیں لیکر

دے رہا ہے تو وہ اس کو ہمارے گھر آنے سے منع کر دی گی اور دوسری بات اپنے اللہ کے سوا کسی سے امید مت باندھنا، اس کی ذات کے سوا کسی کے آگے ہاتھ مت پھیلا نا، دوسروں کے سہاروں کی منتظر نہ رہنا، ہمیشہ اپنے اللہ پاک کی ذات پہ بھروسہ رکھنا، اسی سے مدد طلب کرنا۔ انسان کی مدد وقتی مدد ہوتی ہے جو کہ بعد میں مستقل طعن بن جاتی ہے۔ ہمیں اپنے اللہ کے سوا کسی سے امید نہیں رکھنی چاہیے، اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو دکھ دیتا ہے تو وہ اسے سکھ بھی نصیب کرتا ہے۔ بس ہمیں دکھ کے وقت صبر سے گزارنا ہوگا اور ویسے بھی شہزاد مجھے جس ڈاکٹر کے پاس لے کے جاتا ہے، وہ بہت قابل اور اچھا ڈاکٹر ہے۔ ہم بس شہزاد کی ہی تھوڑی بہت مدد لے سکتے ہیں اور کسی کی نہیں۔ میں نے کل شہزاد کے سارے پچھلے پیسے بھی

چکا دئے تھے جو اس نے میری دواؤں پہ خرچ کیے تھے۔ اگر
ضروری ہو تو غیروں سے عارضی مدد لے لینا لیکن اپنوں کے پاس
مت جانا، وہ مدد بھی نہیں کریں گے اور عزت نفس
بھی مجروح کر کے رکھ دیں گے۔۔۔ نزہت خان بیٹی کی بات
سننے کے بعد اپنی آنکھیں کھولے رنجیدگی سے بولتی اسے گہری
باتیں سمجھا گئی تھیں۔ ماضی کی پرانی یادیں تازہ ہوئیں جب
انھوں نے مدد کیلئے اپنے لالہ کے سامنے ہاتھ پھیلا یا تھا اور انیسہ
خان نے وہ ہاتھ جھٹک کر ان کی عزت نفس کو مجروح کرتے
ہوئے گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ وہ کبھی بھی داعیر خان کی
شادی پہ اس گھر میں واپس نہ آتی لیکن وہ بہن تھیں، ان کا دل
نرم تھا وہ سب کچھ بھلائے اس دہلیز پہ قدم رکھ گئی تھیں، جہاں
سے اسے نکالا گیا تھا۔ اب نزہت خان بالکل بھی نہیں چاہتی

تھیں کہ انکی بیٹی کسی اپنے سے کوئی بھی امید باندھے اس لئے وہ
اسے تیزی سے ٹوک گئی تھی۔۔

لیکن مورے!! لالہ تو بہت اچھے ہیں۔ وہ کبھی بھی ہمیں طعنہ
نہیں دیں گئے۔۔۔ وہ دمیر خان کو سوچتی معصومیت سے پر
اعتماد لہجے میں گویا ہوئی۔

تو میں نے کب کہا کہ دمیر برا ہے؟۔ میں بس چاہتی ہوں کہ
تمہیں حقیقت سے آگاہ رکھوں، تمہیں بتاؤں کہ جب ہم خود کی
ذات کی عزت نہیں کرتے تو دوسرے بھی ہماری ذات کو پیروں
تلے روند کے بے عزت کر دیتے ہیں۔ ہمیشہ اپنی ذات کا بھرم
بنائے رکھنا اگر تم اپنے معیار سے گری تو دوسرے انسان بھی
تمہاری ذات کو بے بھرم کر دیں گئے۔۔۔ نزہت خان
سنجیدگی سے مزید بولی تھی۔

مورے!! مجھے آپ کی مشکل باتیں سمجھ نہیں آ رہیں۔۔۔ اس نے نزہت خان کی باتیں سن کر جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔۔۔ تمہیں سمجھ آنی بھی نہیں ہے۔ ابھی تمہارے دماغ کو نیند نے جکڑا ہوا ہے، چلو سیدھی ہو کے سو جاؤ، اب میری طبیعت بہتر ہے۔ جسم ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ نزہت خان اس کو بازو سے پکڑ کے اپنے ساتھ لیٹاتی تھکتے ہوئے حکمیہ انداز میں گویا ہوئیں تھی۔

مورے!! آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میرے دماغ کو نیند چڑھی ہوئی ہے؟۔۔۔ وہ اپنا چہرہ اوپر اٹھائے نزہت خان کو دیکھتی شریر لہجے میں پوچھنے لگی۔

ماں ہوں تیری! مجھے سب پتہ ہوتا ہے، چلو اب آنکھیں بند کرو اور سو جاؤ۔۔۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔۔۔ نزہت خان محبت

سے اس کا ماتھا چومتی آنکھیں موند گئی تھیں۔ ان کے ساتھ لیٹی
زر بخت بھی ان کا بخار اترتا محسوس کر کے سکون سے آنکھیں
موندتی نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔ وہ کافی تھکی ہوئی تھی۔ جتنا
وہ دودن فنکشنز کی وجہ سے جاگ چکی تھی، اتنا تو وہ نزہت خان
کی دیکھ بھال کے علاوہ کبھی نہیں جاگی تھی۔



مہر۔۔۔ وہ نرمی سے اس کی تھائیز پہ ہاتھ پھیرتا ان کی سرخی
زائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ قربت کے لمحات میں اس
نے اسکی تھائیز پہ ہاتھوں کی کافی سختی دیکھائی تھی، جس کی وجہ
سے مہر خان کے نازک سے بدن پہ اسکی انگلیاں کے نشان
پیوست ہو گئے تھے اور تھائیز کے ارد گرد سارا حصہ سرخ اور
درد سے چور ہو رہا تھا۔

ہم۔۔۔ اس کے ہاتھوں کے لمس سے سکون پاتی مہر جو
آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھی، اسکی آواز سن کر ہنکارا بھرا۔
میں زیادہ ہار ش تو نہیں ہوا تمہارے ساتھ؟۔۔۔ داعیر اب نیچے
جھک کر اس کی سرخ ہوتی اپر تھائیز پہ لب رکھنے لگا۔
نہیں ہار ش تو نہیں ہوئے، لیکن میرے لئے آپ کو برداشت
کرنا تھوڑا مشکل تھا۔۔۔ مہر خان اس کے لبوں کے لمس پہ خود
میں سمٹتے ہوئے شرم و حیا سے لڑکھڑاتے لہجے میں بولی۔
پہلی بار تھانہ اس لئے زیادہ تکلیف ہوئی لیکن تم بہت مضبوط ہو
نور چشم!! داعیر خان کی شدتیں صرف تم ہی برداشت کر سکتی
ہو، کیونکہ تم ہی میری محبت اور شدتوں کے قابل ہو۔ تھینک یو
سوچ مجھے سہنے کیلئے، سکون دینے کیلئے، میری شدتوں کو خود میں
جذب کرنے کیلئے، میری محبت کو مکمل کرنے کیلئے، مجھے مکمل

کرنے کیلئے۔۔۔ داعیر خان اسے کمفرٹر سے نکال کر زور سے
اپنے سینے میں بھینچتا اسکے ماتھے پہ لب رکھ گیا۔

جب آپ کی ہوں تو پھر آپ کی ہی جنونی محبت، اور شدت
پسندی سہنے پڑے گی۔۔۔ مہر خان اس کے سینے میں چہرہ
گھسیڑے مان بھرے لہجے میں بولی تھی۔۔۔

آہا!! ایسی بات ہے؟ اس کا مطلب ہے میری مہر مجھ سے
بہت پیار کرتی ہے اور اگلا ایک گھنٹہ مزید وہ میری شدتیں سہنے
کیلئے تیار ہے؟ رائٹ؟۔۔۔۔۔ داعیر خان شریر لہجے میں بولتا اس
کی برہنہ ٹانگ پکڑ کر اپنی رانوں پہ رکھتے ہوئے اس کو خود میں
لاک کر گیا۔

داعیر!! میں نے ایسا کچھ نہیں بولا۔۔۔ مہر خان فوراً اپنے چہرہ
اوپر کئے اس کے گال پہ دانت گاڑھ گئی جبکہ اپنی ٹانگ اس کی

گرفت سے نکالنے کی سعی کرتی شرم سے سرخ ہونے لگی
تھی۔۔

ہا ہا ہا! تمہارے انداز بتا رہے ہیں کہ تم ابھی اور سسکیاں بھرنا
چاہتی ہو۔۔ یہ لو بائٹ مجھے تب دینا جب میں تمہاری روح کی
گہرائیوں میں گم ہو کے تمہارے وجود کا ہر راز پھر سے فاش
کروں گا میری مہر! مجھے پسند ہے تمہارے وجود میں ہر بار گھل
کے نئی لذت تلاش کرنا، مجھے پسند ہے اذیت کے لمحوں میں
لذت کی انتہا کو پہنچنا، مجھے پسند ہے تمہارا گھٹتی سانسوں سے
سرخ ہوتا چہرہ تکنا، مجھے پسند ہے تمہارا مجھ میں ٹوٹ کے بکھرنا،
مجھے پسند ہے تمہارے منہ سے قربت کے لمحات میں میرا نام
پکارنا، مجھے پسند ہے تمہارا، میری شدتوں سے نڈھال ہو کے
اپنے تشنہ لبوں کو میرے لبوں سے جوڑنا، مجھے پسند ہے اپنا

جنون تم میں اتارنا اور پھر تمہارا بدلے میں میرا سینہ نشانوں سے
بھرنا، مجھے پسند ہے تمہارے اس مخملی وجود کو بے رحمی سے
چھونا، مجھے پسند ہے تمہاری ان پنکھڑیوں کا رس شدت سے
نچوڑنا، مجھے پسند ہے تمہارے مخروطی انگلیوں میں اپنی انگلیاں
الجھا کے روحانیت کو چھونا، مجھے پسند ہے تمہارے ساتھ
محبت میں رہ کے ظالم ہونا، مجھے پسند ہے تمہارے وجود کے ہر
اعضاء پہ اپنے نام کی مہر ثبت کرنا، مجھے پسند ہے تمہارے
چاندنی جیسے بدن کو زبان سے ماپنا، مجھے پسند ہے تمہیں اپنے
لمس کی تپش سے جھلسانا، مجھے پسند ہے اپنی محبت کی برسات
میں تمہیں بھگونا، مجھے پسند ہے تمہارے ساتھ حیا میں رہ کے
بے حیائی کرنا، مجھے پسند تمہیں سینے سے لگا کے تمہاری خوشبو
محسوس کرنا، مجھے پسند ہے تمہاری رقصندہ دھڑکنوں کو مٹھی

میں جکڑنا، مجھے پسند ہے تمہیں دانتوں سے کاٹ کھانا، مجھے میری
مہر سر سے لیکر پاؤں تک پسند ہے۔ مجھے داعیر کی مہر تا قیامت
پسند رہے گئی۔ مجھے پسند ہے سرمئی نینوں والی میری نور
چشم۔۔۔ وہ مہرو کے اوپر آتا اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اوپر
پن کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ اور لبوں سے اس کے پورے
وجود کو اپنے لمس سے مہکانے لگا۔

مہر خان بنا مزاحمت کئیے اس کے لبوں کی آہٹ اپنی جسم پہ
محسوس کرتی آنکھیں موندھ گئی تھی۔ داعیر خان جب بھی اس
کا چاندی جیسا مہکتا بدن دیکھتا، وہ یونہی ہر لمحے بے خود ہو جاتا
تھا۔ وہ شدت سے اس کا گال دانتوں میں دبا کے چھوڑتا تیز تیز
سانسیں بھرنے لگا تھا۔ وہ اس کے چہرے سے گردن اور گردن

سے سراپے پہ آتا ان پر اپنے لبوں اور دانتوں کی پھر سے مہریں
ثبت کرنے لگا۔

داعیر۔۔۔ اس کا پاگل لمس برداشت کرتے ہوئے مہر نے
تڑپ کر اسے پکارا۔ وہ اس کی سنے بغیر اس کے نچلے وجود پہ

قابض ہوتا وہاں پہ اپنے ہاتھوں سے حق جتانے لگا۔

مجھے پسند ہے آپ کے بے لگام جذباتوں کو لگام ڈالنا، مجھے پسند
ہے آپ کی بڑھتی گستاخیوں پہ آپ کو سزا سنانا، مجھے پسند ہے
آپ کے حد سے تجاوز کرتے لبوں کو حد یاد دلانا، مجھے پسند ہے
آپ کے بہکتے لہجے کو روک لگانا، مجھے پسند ہے آپ کو بے شرمی
میں شرم دلانا، مجھے پسند ہے آپ کو چکما دے کے اپنی جان
چھڑوانا، مجھے پسند ہے آپ جیسے ہاتھی سے خود کو بچانا، مجھے
پسند ہے اپنے ہاتھوں سے آپ کو گنجا کروانا، مجھے پسند بدلے میں

آپ جیسے ڈھیٹ مخلوق کو دانتوں سے کاٹ کھانا۔۔۔ مہر خان بھی اس کی جسارتوں کے آگے مزاحمت کرتی ناک سکوڑتے ہوئے خفگی سے داعیر خان کے بالوں سے پکڑ کر کھینچتی اسی کے انداز میں بولی تھی۔۔۔ وہ تھک چکی تھی اب اس کو سہتے سہتے، پورا وجود اس کا درد سے چور تھا۔ وہ جب سے کمرے میں آیا تھا صرف پچیس منٹوں کیلئے اس کو رہائی بخشی تھی۔ ایسا نہیں تھا وہ اس کا استحصال کر رہا تھا بلکہ وہ بوس و کنار کے ساتھ وقفے وقفے سے اسے ریلیکس کئے مہر سے اپنا حق وصول کر رہا تھا لیکن پھر بھی نازک سی مہر خان کی اس کے چٹانی وجود کے آگے اب بس ہو چکی تھی۔

ہاہا۔۔۔ اس کا جواب اور اس کا خفا انداز دیکھ کے، داعی
خان کا ایک بلند قہقہہ کمرے کی زینت بنا تھا۔۔

نور چشم!! اتنی ظالم نہ بنو! میں تمہاری قربت کا مارا کہیں تڑپ
تڑپ کے مرنے جاؤ؟۔۔۔ وہ ہنستے ہوئے زور سے مہر خان کے
لب چومتا اسے سینے سے لگا گیا تھا۔۔

میری مہر تو خطرناک بھی ہے، یہ مجھے آج پتہ چلا۔ چلو خیر ہے تم
سب کچھ کرو مجھے کاٹ لو، نوچ لو، زخمی کرو لیکن مجھے خود سے
دور نہ کرو نور چشم۔۔۔ وہ اس کی کمر سہلاتا مصنوعی
معصومیت سے بولا تھا۔۔

نہیں مجھے کچھ نہیں کرنا میں بس سونا چاہتی ہوں۔۔۔ مہر خان
فوراً بولی تھی۔

لیکن اب تو فجر کی اذان ہونے والی ہے، نماز پڑھ کے اکھٹے
سوتے ہیں۔۔۔ داعیر خان اس کے ہاتھ اپنی انگلیوں میں الجھاتا
اسے وقت سے آگاہ کرنے لگا۔

ابھی نماز میں ٹائم ہے، تھوڑی دیر سو جاتے ہیں، پھر پڑھ لیں
گئے۔۔۔ تھکاوٹ سے چور مہر خان سامنے وال کلاک پہ نگاہ
دوڑاتی مدہم آواز میں بولی تھی۔

یہ ٹائم تو ہمارا باتھروم رومینس میں ہی گزر جانا ہے، آئی میں
شاو رلیتے گزر جانا۔۔۔ داعیر خان شیر لہجے میں بولتا اس کی
چھوٹی سی ناک لبوں میں دبا گیا۔

مجھے ابھی شاو ر نہیں لینا۔۔۔ مہر خان اس کے ارادے بھانپ
کر کلس کے بولی تھی۔۔

اگر شاو ر نہیں لینا تو پھر میری شدتوں کے اثرات کیسے مندمل
ہوں گے؟ آج تو نور چشم تم نماز پڑھنے کے بعد ہی سو سکوگی
کیونکہ یہ میری محبت اور مردانگی کی تذلیل ہوگی کہ تم میرے پہلو

میں رہ کر نیند کا ایک جھونکا بھی لو۔۔۔ داعیر خان کہتے ساتھ ہی اس کے اور خود کے گرد کمفرٹر لپیٹتا ہاتھروم کی طرف بڑھ گیا۔ نہیں میں خود شاور لے لوں گی، آپ مجھے نیچے اتاریں۔۔۔ اس نے بوکھلاتے ہوئے اسے کندھوں سے تھام لیا۔

غلام کے ہوتے ہوئے آپ خود کو کیوں تکلیف دیں گئی، جب غلام آپ کو سروس دینے کیلئے حاضر ہے تو پھر اس سروس کا فائدہ اٹھائیں۔۔۔ داعیر خان شرارت سے بولتا اس کو لئے ہاتھروم میں داخل ہو گیا۔ ہاتھروم کا منظر دیکھ کے ہی ایک دفعہ پھر سے مہر خان کے گلے میں گلی بھر کے معدوم ہوئی تھی۔ وہ اس کے سارے ارادے سمجھ گئی تھی۔ مطلب کے اس کی جان بخشی اتنی آسانی سے نہیں ہونے والی تھی۔

پورا باتھروم گلاب کی پتیوں سے سجا تھا۔ ہاٹ واٹر ٹب میں
گلاب کی پتیاں تیر رہی تھی۔ ٹب کے کناروں کے گرد جلتی
کینڈلز، مدہم رومانوی روشنی اور ٹب کے اوپر لڑیوں کی
صورت میں جھلملاتی چھوٹی چھوٹی سی چکور شپس میں جلتی بجھتی
لائٹس باتھروم کے منظر کو رومانیت سے بھر رہی تھی۔۔۔ وہ
نرمی سے اس کو نیچے اتارتا اس کے گرد سے کمفرٹر ہٹا گیا تھا
چونکہ اندر مدہم روشنی تھی، اسلئے مہر خان بنا ہچکچائے کھڑی
رہی۔ داعیر خان باتھروم کا دروازہ کھولے کمفرٹر کو گول مول کر
کے وہی پہ کھڑا ہو کے بیڈ پہ اچھا لگیا تھا۔ وہ پھر سے باتھروم کا
دروازہ بند کرتا مہر خان کے پاس آیا تھا۔ جو برف بنی وہی پہ جمی
کھڑی تھی۔

کیا ہوا نور چشم!! ناراض ہو؟۔۔۔ اسے یوں

خاموشی سے کھڑا دیکھ کر وہ اس کا نورانی چہرہ اپنے دونوں
ہاتھوں میں لیتا فکر مندی سے دریافت کرنے لگا۔
نہیں میں نے کیوں ناراض ہونا ہے؟۔۔۔ مہر خان خود کو
چھپانے کی کوشش کرتی اس کے چوڑے سینے میں منہ گھسیڑنے
لگی۔

اگر تمہیں میری قربت سے اذیت ہوتی ہے تو ہم صرف شاور
لے کے باہر جاسکتے ہیں۔ تم مجھے بتا سکتی ہو، میں تمہیں بالکل بھی
مزید نہیں چھوؤں گا۔۔۔ داعیر خان اس کے کندھوں پہ لب
رکھتا ڈراماٹک انداز میں بولا تھا۔ وہ تو تڑپ رہا تھا اس کے وجود
میں سمانے کیلئے، لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ زبردستی کر کے اسے
تکلیف نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے ایسا کب بولا آپ کی قربت مجھے اذیت دیتی ہے؟ یا آپ کا چھونا مجھے اچھا نہیں لگتا؟۔۔۔ وہ فوراً اس کے سینے سے منہ نکالے پریشانی سے بولی تھی، اس نے اسے اپنے قریب آنے سے ایک بار بھی منع نہیں کیا تھا تو پھر وہ ایسی بات کیوں کر رہا تھا؟۔ کیا وہ اس کی سونے والی بات پہ ناراض ہو رہا تھا؟ مہر خان نے آنکھوں میں الجھن لئیے داعیر خان کے چہرے کو پڑھنا چاہا۔۔

نہیں تم نے ایسا نہیں بولا۔ بس مجھے ایسا لگا کہ شاید تم میری قربت سے اکتا گئی ہو۔۔۔ وہ اس کے سامنے آتے بالوں کو کان کے چھپے کرتا سنجیدگی سے بولا تھا۔

میں کبھی اکتا سکتی ہو آپ سے؟ مہر اپنی ذات سے اکتا سکتی ہے لیکن داعیر آپ سے، آپ کی محبت، آپ کی قربت سے کبھی

نہیں اکتا سکتی۔۔ آپ کو اختیار ہے آپ میرے وجود سے جتنی دفعہ مرضی سکون پائیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے اور نہ ہی کبھی ہوگا۔۔ مہر خان اس کی بئیرڈ پہ اپنا نازک ہاتھ رکھتی سمجھانے والے انداز میں بولی تھی، داعیر خان کے چہرہ پہ دوڑتی سنجیدگی اسے پریشان کر گئی تھی۔

سوچ لو میری جان لیوا قربت تمہاری جان نکال لے گی۔۔۔
داعیر خان نے معصومیت کے ساتھ اپنی ایکٹنگ جاری
رکھی۔ اسے ساتھ ساتھ مہر خان کی سادگی اور معصومیت پہ
ٹوٹ کے پیار آ رہا تھا جو اس کی چالاکیاں بھی نہیں سمجھ رہی
تھی۔

آپ تو ایسے بول رہے ہیں جیسے میں نے آپ کی قربت کو کمرے
میں تو سہا ہی نہیں ہے؟ اگر پہلے سہہ سکتی ہوں تو اب بھی سہہ
سکتی ہوں مجھے ہلکے میں مت لینا۔۔

مہر خان انگلی اٹھا کے جتانے والے انداز میں بولی تھی۔۔
میں بھلا داعیر کی مہر کو ہلکے میں لے سکتا ہوں؟۔ اگر تم داعیر کی
ہو سکتی ہو تو اسکی قربت کو سہہ بھی سکتی ہو۔ وہ دونوں ہاتھ
کھڑے کئے اپنی مہر کے آگے ہار مان گیا تھا۔ وہ اسکا خوبصورت
چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتا اس کی سرمئی آنکھوں میں
جھانکنے لگا تھا۔

سن اے نورِ چشم!!

تو اتنی حسین ہے کہ تیرے لیے
پوری کائنات کی رنگینیاں قربان کی جا سکتی ہیں

تو اتنی دلکش ہے کہ تیرے لیے
ہر پرکشش منظر پس پشت ڈالا جا سکتا ہے

تو اتنی مہک سے لبریز ہے کہ تیرے لیے
خوشبوؤں کا وجود بھی جھٹلایا جا سکتا ہے

تو اتنی انمول ہے کہ تجھے پانے کے لئے
تخت و بادشاہت ٹھکرائی جا سکتی ہے

تو اتنی پر تاثیر ہے کہ تیرے ایک دیدار کی خاطر
آنکھیں ہتھیلی پر رکھ کر نثار کی جا سکتی ہیں

تو اتنی پر نور حور ہے کہ تیرے لمس کی روشنی میں
میری بے معنی ذات کی ساری ادائیں مٹائی جا سکتی ہیں

مختصر یہ کہ تیرے قاتل نین میرا دل گھائل کر چکے ہیں
اب داعیر خان کے دل کی تدفین احتراماً تیرے
قدموں میں کی جا سکتی ہے!

اے نور چشم!!

داعیر خان پھر سے اس کو اپنے حصار میں لئے اس کے چہرے کا
ہر نقوش چومتا محبت سے بھرپور لہجے میں بولتا مہر خان کی آنکھیں
نم کر گیا تھا۔ وہ خوشی سے اس کی آنکھوں پہ لب رکھتی اس کی
گردن کے گرد بازو حائل کرتی نرمی سے اس کی بیئر ڈچوم گئی۔
یہ نہیں کرنا تھا میری جان! میں بہت خطرناک ہوں، جب تم
میرے جذبات جگاتی ہو تو اپنے ساتھ خود زیادتی کرتی ہو۔ داعیر
خان اسے بانہوں میں بھر کے اوپر اٹھاتا اس کا چہرہ اپنی گردن
سے نکالے اس کو لبوں پہ جھکا تھا۔ وہ اس کی جسارت پہ
سکون پاتا سر شار ہوا تھا۔ وہ بے صبری سے اس کے لبوں کو
کاٹتا ساتھ ہی وینٹی سلیب پہ بیٹھا گیا۔ داعیر خان اس کے
ہونٹوں کو چھوڑے بنا اس کی دونوں ٹانگیں کھول کے اپنی پشت

پہ ریپ کرتا، مزید اس کے قریب ہوا تھا۔ مہر خان نے اچانک
سہمتے ہوئے چھپھٹنے کی کوشش کی تھی۔

اگر تم رضا مند نہیں ہو تو میں ہٹ جاتا ہوں چھپ۔۔۔ داعیر خان
نے اس کے لبوں کو آزاد کرتے ہوئے بھاری آوازیں
استفسار کر گیا تھا۔ اسے یوں مہر خان کا سہم کے چھپھٹنا فکر مند
کر گیا تھا۔

نہیں!! آپ کا جو دل کرے وہ کریں۔۔۔ مہر خان شرم سے
بھاپ چھوڑتے چہرے کے ساتھ فوراً بولی تھی۔ اچانک اس کی
سر مئی آنکھوں میں بھی سرخی دوڑی تھی۔ اس کی حالت دیکھ
کر داعیر خان اپنے لفظوں کے انتخاب پہ خود کو سراہتا، نرمی
سے مہر خان کو تھائیز سے پکڑ کر خود کے نزدیک کرتا ایک جھٹکے
میں اس کی روح میں بے قراری سے اپنا وجود منتقل کر گیا تھا۔

اہہہ داعیر!! اس کے اچانک لمس پہ اس کی چھوٹی سی سسکی نکلی تھی۔۔۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ چھپے سلیب پہ رکھتی آہستہ سے داعیر خان کو خود میں اترتا محسوس کرنے لگی تھی۔۔۔

نور چشم! داعیر خان محبت بھرے لہجے میں بولتا اس کی کنپٹی پہ لب رکھ گیا۔ اس نے کچھ سکینڈز رکنے کے بعد ہلکا سا اپنے وجود کو موو کرنا شروع کیا تھا۔ تھوڑی دیر وہ بے حد ٹھہر کے حرکت دیتا، یکدم برق رفتار ہوا تھا۔ داعیر خان اس کی تھائیز کو چھوڑ کر پنڈلیوں سے پکڑتا شدت سے اس میں سما نے لگا۔۔۔ مہر خان نے اپنے لرزتے وجود کو قابو کرنے کیلئے سلیب کے کناروں پہ ہاتھوں کی گرفت مضبوط کی تھی۔۔۔ باتھروم کی تنگ فضا میں دونوں کی سانسوں کا شور اور مہر خان کی سسکیاں باتھروم کی دیواروں سے ٹکرا کے واپس ان کے کانوں میں گونج

رہی تھی۔۔ داعیر خان کا پورا جسم تانبے جیسا دھکنے لگا، اس کے وجود کی گرمی مہر خان کو اندر تک جھلسا رہی تھی۔ وہ سختی سے جبرے بھینچے اپنا چہرہ نیچے جھکائے، اپنی بے رحم حرکت میں مزید تیزی لا گیا۔۔

داعیر!! میں۔۔ گر۔۔ جاؤ۔۔ گئی۔۔ آہستہ۔۔ کریں۔ مہر خان وینٹی کی چھوٹی سی سلیب پہ خود کو نیچے گرتے محسوس کرتی خوف سے داعیر خان کو مخاطب کر رہی تھی لیکن داعیر خان شاید نہیں یقیناً اس کی نہیں سن رہا تھا۔ وہ اپنا چہرہ نیچے جھکائے اس کی پنڈلیوں کو مضبوطی سے جکڑے تو حش پن کی آخری حد پہ تھا۔ وہ مہر خان کی نازک گہرائیوں میں ڈوبتا لذت کی انتہا پہ تھا۔ داعیر!! میری۔۔ بات۔۔ سنیں۔۔ ادھر۔۔ میری۔۔ طرف۔۔ دیکھیں۔۔ مہر خان پھر سے اپنی ٹوٹے پھوٹے

لفظوں میں آواز دیتی، ایک ہاتھ سلیب سے ہٹائے داعیر خان
کے گال پہ رکھے اسے ہوش دلانے لگی تھی۔ جواب آنکھیں
موندے اپنے عمل میں مگن تھا۔۔

داعیر!! میری۔۔ طرف۔۔ تو۔۔ دیکھیں۔۔ مہر خان نے
اب روتے ہوئے اس کا چہرہ اپنا ہاتھ سے اوپر کیا تھا۔
ایم سوری!! کیا ہوا؟ داعیر خان فوراً آنکھیں کھول کے مہر خان کو
روتا دیکھ کے اپنی حرکت روک گیا تھا۔

کیا ہوا میں ہو رہی ہے؟۔۔۔ اس نے فکر مندی سے پوچھا۔
نہیں مجھے ڈر لگ رہا ہے، میں یہاں سے نیچے گر جاؤ گی۔ مہر نے
داعیر خان کی گردن کے گرد بازو حائل کرتی رو ہانسی ہو کے بولی
تھی۔

ششش!! رونا بند کرو۔۔ میں بھلا کرنے دوں گا اپنی مہر کو۔۔۔
وہ محبت سے اس کے ماتھے پہ لب رکھتا اس کے سارے آنسو
اپنے پوروں صاف کر گیا تھا۔۔

لیکن مجھے لگایں نیچے گرجاؤ گئی۔۔۔ وہ سوں سوں کرتے
ہوئے مزید بولتی اس کے چٹانی سینے پہ مکے برسا گئی تھی۔
اچھا چلو آجاؤ ٹب میں چلتے ہیں۔۔۔ وہ اسے اپنی طرف کھینچتا
اسی حالت میں اٹھا کے ہاتھ ٹب میں لایا تھا۔ وہ مہر خان کو نیچے
کرتا خود گھٹنوں کے بل ہوتا مزید کچھ دیر اس میں گھلتا خود کو
روحانی سکون پہنچانے لگا۔ مہر خان نے ٹب کے کناروں پہ ہاتھ
جماتی اس کی جنون خیزیاں برداشت کرنے لگی تھی۔ کافی دیر
بعد داعیر خان چھپٹتا عقیدت سے اسکا ماتھا چومتے خود نیچے ہوتا
اسے اپنے سینے میں بھینچ گیا تھا۔ چند منٹ تک وہ اس کے جسم

کو پورے وثوق سے اپنے ہاتھوں سے سہلانے کے بعد اسے
باڈی شیمپو لگانے لگا۔ مہر خان بنا کوئی حرکت کئے اسے من
مانیاں کرنے کی اجازت دے گئی تھی کیونکہ اب اس میں
مزاحمت کرنے کی ہمت ہی نہیں بچی تھی۔ پندرہ منٹوں بعد داعیر
خان اس کو اور خود کو میرون ہاتھ روب پہنائے، مہر خان کو اپنی
بانہوں میں بھرتا، واشروم سے باہر نکلا تھا۔ وہ سیدھا اسے
ڈریسنگ روم میں لایا تھا، احتیاط سے مہر خان کو صوفے پہ
بیٹھانے کے بعد وہ وارڈروب سے اپنا اور مہر خان کا سیمپل
سا آرام دہ شلوار قمیض نکالتا اس کی طرف بڑھا تھا۔ ڈریسنگ
روم کی لائٹ ڈم تھی۔ داعیر خان سب سے پہلے اس کو ہاتھ
روب سے آزاد کرتا اسے لباس پہنانے لگا۔ مہر خان کو لباس

پہنانے کے بعد وہ خود بھی لباس زیب تن کرتا، وال کلاک پہ
ٹائم دیکھنے لگا۔

فجر کی اذان ہو گئی ہے۔ پہلے وضو کر کے نماز پڑھ لیتے ہیں پھر
میں تمہارے بال ڈرائے کروں گا۔۔۔ داعیر خان وقت
دیکھتے ہی اس کے دونوں ہاتھ چوم کے، اس کو لئے ڈریسنگ
روم سے باہر نکلا تھا۔ مہر خان خاموشی سے اس کے ساتھ چلی
جا رہی تھی۔ اس میں کچھ بھی کہنے یا کرنے کی ہمت نہیں تھی،
اسلئے تو بنا مزاحمت کے داعیر خان کو اپنے کپڑے بدلنے دئے
تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں وضو کر کے فجر کی نماز ادا کرنے
لگے تھے۔ مہر خان جتنا بھی تھکی ہوئی تھی۔۔ نماز اس نے
داعیر خان کے ساتھ پوری و جمعی اور توجہ سے پڑھی تھی۔
نماز پڑھنے کے بعد دونوں نے دعا مانگی تھی۔۔ داعیر خان اپنی

دعا کے درمیان بار بار مسکرا کے مہر خان کے چہرے کی طرف
دیکھ رہا تھا۔ جو آنکھیں موندے اپنی دعا مانگے میں مشغول
تھی۔ دعا مانگنے کے بعد وہ مہر کو جائے نماز سے اٹھا کے بیڈ پہ لا
کے لیٹاتا چھبہ ہٹا تھا۔ وہ سب سے پہلے دونوں جائے نماز اٹھا
کے تہہ کرتا انہیں ریک میں رکھ گیا اور پھر ہئیر ڈرائیر لئیے مہر خان
کے پاس بیڈ پہ واپس آیا تھا۔ وہ مہر خان کے بالوں کو دوپٹے سے
آزاد کرتا انہیں ہئیر ڈرائیر سے ڈرائے کرنے لگا جبکہ وہ کروٹ
بدلتی سکون سے آنکھیں موندھ گئی تھی۔ داعیر خان اس کے
بال ڈرائے کرنے کے بعد ہئیر ڈرائیر سائیڈ ٹیبل پہ رکھ گیا۔ وہ
ریموٹ سے کمرے کی لائٹس ڈم کرتا سیدھا ہو کے لیٹتا مہر خان
کی کمر کے نیچے سے ہاتھ گزار کے اسے اپنے سینے پہ منتقل کرتا پیار
سے اس کے سر پہ لب رکھا گیا تھا۔

کہیں پین تو نہیں ہے؟۔۔۔ داعیر خان نے فکر مندی سے
استفسار کیا تھا۔

نہیں ہے۔۔۔ مہر خان مدہم آوازیں مختصر سا جواب دیتی اس
کے سینے پہ اپنا سر اور ہاتھ رکھتی نیند کی وادیوں میں کھونے لگی
تھی۔ داعیر خان خود پہ اور اس پہ کمفرٹ اوڑھتا اس کے جسم
سے اٹھتی دھیمی خوشبو محسوس کرتا آنکھیں موندھ گیا۔

گڈ مارنگ۔۔۔ دمیر خان متوسط چال میں سیرٹھیاں اترتا لاؤنج
میں داخل ہوتے ہی ماں باپ کو سلام کرتا ان کی طرف بڑھتا تھا۔
گڈ مارنگ!! اٹھ گیا میرا بچہ۔۔۔ ایسہ خان چائے کا کپ لبوں
سے ہٹاتی محبت بھرے لہجے میں بولی تھی۔

بیٹا! آج تو تمہاری میٹنگ تھی نہ! اسد اللہ خان کچھ سوچتے
ہوئے بولے تھے۔۔

جی بابا بالکل تھی۔ آپ میٹنگ سے ریلیٹڈ کوئی فکر نہ کریں میں
نے اپنی جگہ ہے ظہیر صاحب کو بھیج دیا ہے وہ سب سنبھال
لیں گے۔۔۔ وہ صوفے پہ بیٹھتا ان کو میٹنگ سے متعلق مطمئن
کر گیا تھا۔

پلیز!! بچے کو دو دن بھائی کی خوشی انجوائے کرنے دیں آپ کا
بزنس سارا سال اس نے سنبھالنا، فلوقت وہ شادی پہ آیا ہے
اسے سکون سے شادی اٹینڈ کرنے دیں۔۔۔ انیسہ خان دونوں
باپ بیٹے کو پھر کاروباری معاملات ڈسکس کرتے دیکھ کر اکتا
کے بولتی اسد اللہ خان کو سخت نگاہوں سے جتا گئی۔

بھئی کرے شادی انجوائے، میں نے کونسا منع کیا ہے؟ میٹنگ
کا اس لئے پوچھ رہا تھا کیونکہ وہ میٹنگ ضروری تھی۔ یوں سمجھ
لیں ہمارا پورے سال کا کاروبار اسی میٹنگ پہ منحصر کرتا ہے۔
اس میٹنگ میں ہم نے پورے سال کے کنٹریکٹ سائن کرنے
ہوتے ہیں اور کلائنڈز کو اپنے ساتھ جوڑ کے رکھنا ہوتا ہے۔۔۔
وہ نرمی سے بولتے ہوئے انیسہ خان کو میٹنگ کی اہمیت سے
آگاہ کر گئے تھے۔

مورے!! پھوپھو لوگ ابھی تک نہیں اٹھے؟۔۔۔ دمیر خان
ارد گرد نظریں دوڑاتا نزہت خان اور زربخت کی غیر موجودگی کو
نوٹس کرتے ہوئے سنجیدگی سے استفسار کرنے لگا۔

ہمم! شاید وہ دونوں سو رہی ہیں۔ کمرے سے تو ابھی تک نہیں
نکلیں۔۔۔ انیسہ خان چائے کا سپ لیتی سر سری سا بولی تھی۔

ابھی تک سو رہی ہیں؟ پھوپھو تو اتنی دیر تک نہیں سوتی۔ آپ
نے پتہ کیا شاید پھوپھو کی طبیعت ٹھیک نہ ہو؟ اس لئے وہ ابھی
تک نہ اٹھی ہو؟۔۔۔۔۔ دمیر خان پریشانی سے تحقیق کرنے
لگا۔ اسے تشویش ہو رہی تھی۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے لیکن
نزدہت خان اور زربخت ابھی تک سو رہی تھی؟
نہیں بیٹا! ہم نے ڈسٹرب نہیں کیا۔ ان دونوں کو آرام کرنے
دو، رات کو بھی وہ کافی لیٹ کمرے میں گئی تھیں۔ شادی کی
تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔ پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں
ہے۔۔۔۔۔ اسد اللہ خان نے دمیر خان کو نرمی سے جواب دیا
تھا۔۔۔

ہاں یہ بھی ہے۔ شادی کی تھکاوٹ تو مجھے بھی ہو رہی ہے
۔۔۔۔۔ دمیر خان متفق نظر آتا صوفے کی پشت کے ساتھ ٹیک

ولیمے والے دن ان کو میری وجہ سے کوئی پریشانی اٹھانی پڑے
۔۔ وہ اس کے قریب آتی بے تاثر لہجے میں بولیں۔

اس میں پریشانی والی کیا بات ہے؟ اگر کوئی بیمار ہو تو اس کو دوا
لیکر دینے میں کیسی وقعت ہو سکتی ہے بھلا؟ اور ویسے بھی لالہ
کیلئے آپ کی صحت سے بڑھ کر کچھ بھی ضروری نہیں ہے
۔۔ زربخت چہرے پہ الجھن لئے ان کے چہرے کی طرف
دیکھتی ان کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کرنے لگی کہ وہ اپنی
صحت خرابی سے متعلق کسی اور کو بتانا نہیں چاہتی تھی یا چھپانا
چاہتی تھی؟ وہ سمجھ نہ سکی۔

اس لئے تو کہہ رہی ہوں کہ اگر دمیر کو پتہ چل گیا تو وہ فوراً سب
کچھ چھوڑ چھاڑ کے مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جائے گا۔ اور میں
ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا چاہتی کیونکہ میری طبیعت اب بہتر

ہے۔ ولیمے کی تقریب ختم ہوتے ہی ہم دونوں اپنے گھر واپس
چلے جائیں گے تم اپنا سارا سامان سمیٹ کے رکھنا۔ وہ اسکو
سنجیدگی سے آگاہ کرتی کمرے سے نکل گئیں۔

اچھا مورے ٹھیک ہے۔۔۔ زربخت سر پہ دوپٹہ سیٹ کرتی
نزہت خان کے ہمقدم ہوئی تھی۔

اسلام علیکم پھوپھو!!۔۔۔ لاؤنج میں داخل ہوتی نزہت خان
کو دیکھتے ہی دمیر صوفے سے اٹھ کر تیزی سے ان کی طرف بڑھتا
ان کا ہاتھ پکڑے صوفے تک لایا تھا۔

وعلیکم السلام بیٹا! نزہت خان خوشدلی سے جواب دیتی صوفے
پہ بیٹھی تھی جبکہ زربخت بھی چھوٹے چھوٹے قدم لیتی صوفے
تک آنے لگی۔

پھوپھو!! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟۔۔۔ دمیر خان نے

تشویشی نگاہوں سے نزہت خان کی طرف دیکھا تھا۔

جی میرا بچہ!! میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔۔ انہوں نے کا ہاتھ

پکڑ کر اپنے ساتھ بیٹھاتے ہوئے نرمی سے جواب دیا۔

زر بخت یہاں آؤ۔۔۔ میرے پاس بیٹھو تم۔۔۔ اسد اللہ خان

نرمی سے مسکرا کر زر بخت کو اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کر رہے

تھے جو خاموشی سے صوفے کی پشت پہ ہاتھ رکھے اپنی ماں کی

طرف دیکھ رہی تھی۔۔۔

جی ماموں۔۔۔ وہ ان کی پکار پہ ان کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

دمیر خان نے چور نظروں سے اس کے چہرے پہ لمحے میں آتی

پریشانی کو پرکھا تھا۔

لیکن پھوپھو!!! آپ کا چہرہ تو بتا رہا ہے کہ آپ کی رات کو طبعیت
ٹھیک نہیں تھی۔۔۔ دمیر خان کھوجنے والے انداز میں تحقیق
کرنے لگا تھا۔ نزہت خان کا چہرہ زرد پڑا ہوا تھا۔ لہجے میں
نقاہت واضح تھی۔

نہیں مجھے کیا ہونا میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہارے سامنے بیٹھی ہوں۔۔۔ وہ پر اعتمادی سے بولتی اپنی رات کی طبعیت کی بات دمیر خان سے چھپانے لگی۔

تو پھر آپ کا چہرہ کیوں زرد پڑ رہا ہے؟ لہجہ کیوں تھکاوٹ زدہ ہے؟۔۔۔ اس نے جانچتی نظروں سے ان کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ نزہت خان اور زر بخت اس سے کچھ چھپا رہی ہیں۔

نہیں میرا بچہ! تم ایسے ہی وہی ہو رہے ہو۔ مجھے کچھ نہیں ہوا
اور چہرہ تو زرد اب ہو گا نہ عمر کا بھی تقاضا ہے۔ اب جیسے جیسے
دن گزریں گے، میں نے کمزور ہی ہونا ہے۔۔۔۔۔ نزہت خان
متوازن لہجے میں بولتی دمیر خان کو یقین دہانی کروانے لگی۔
کل میں آپ کو لے کے جاتا ہوں کسی اچھے سے ڈاکٹر کے پاس،
سارے ٹیسٹ بھی کرواؤں گا اور دوائیں بھی لے کر دوں
گا۔۔۔ دمیر خان حکمیہ لہجے میں بولتا پھوپھو کو اپنے حصار میں
لینے لگا۔

ہاں بیٹا! ٹھیک کہہ رہے ہو تم! کل ہی نزہت کے سارے
ٹیسٹ وغیرہ کروالینا کہ آخر وجہ کیا ہے جو اسے ہر وقت بخار
رہنے لگا ہے؟۔۔۔ اسد اللہ خان بیٹے کی بات پہ متفق نظر آتے
پریشانی سے بولے تھے۔ نزہت خان دونوں باپ بیٹے کی بات پہ

خاموش رہیں۔ انہیں بار بار دمیر خان کے خلوص کو ٹھکرانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسلئے فلحال اسے منع نہ کر سکی جبکہ زربخت بے نیازی سے سب کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ اپنی ماں کی خراب طبیعت کی وجہ سے بجھی بجھی سی تھی۔

اچھا چلیں باقی باتیں بعد میں کرتے ہیں، پہلے ناشتہ کر لیتے ہیں۔۔۔ دمیر خان صوفے سے اٹھ کر سب کو اپنے ساتھ لئیے ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ سب نے مل کے ناشتہ کیا تھا سوائے داعیر خان اور مہر خان کے، کیونکہ وہ دونوں ابھی تک اپنے کمرے سے نہیں نکلے تھے شاید وہ سو رہے تھے۔۔

انیسہ خان نے مہر خان کے گھر والوں کو کافی اصرار کے بعد ناشتہ لانے سے منع کیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھیں جب داعیر خان کے سسرال والے آئیں گے تب تو وہ سو رہا ہو گا۔ وہ اپنے بیٹے اور

بہو کو صرف ناشتہ کیلئے اتنی جلدی نہیں اٹھا سکتی تھی۔ اسلئے مہر
خان کے گھر والوں کو ناشتہ لانے سے منع کر دیا تھا۔

اسلام علیکم!!۔۔۔ زر بخت اور انزہ بزدار کے ساتھ دمیر
خان کی ساری ننھیال سائیڈ کی کزنز ایک ساتھ کمرے میں داخل
ہوتی مہر خان کو سلام کرنے لگیں۔ وہ ناک کئے بنا ہی اندر آئی
تھیں کیونکہ وہ جانتی تھی اس وقت داعیر خان کمرے میں موجود
نہیں ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی باہر نکلا تھا اور داعیر خان
کو باہر نکلتا دیکھ کے سب لڑکیوں نے مہر خان کو تھوڑا تنگ
کرنے کیلئے اس کے کمرے کا رخ کیا تھا۔ خیر انزہ اور زر بخت
تو صرف مہر خان سے ملنے آئی تھیں نہ کہ تنگ کرنے۔

وعلیکم اسلام۔۔۔ مہر خان آئینے کے سامنے کھڑی اپنا نیکلیس
سیٹ کر رہی تھی جو رات کو داعیر خان نے اسے منہ دیکھائی
میں دیا تھا۔ سب کی آواز پہ وہ چونکتی ہوئی چھپڑ کر ان کو دیکھتی

سلام کا جواب دیتے ساتھ ہی تیزی سے اپنا دوپٹہ شانوں پہ
پھیلائے اپنی گردن اور گلے کی نشانات چھپا گئی تھی۔ وہ شاید
ابھی سو کے اٹھی تھی۔ اس لئے اس کی اس کی آنکھیں سرخ
ہو رہی تھیں۔

اہممم!! اتنی سرخ آنکھیں ساری رات نہیں سوئی ہو
کیا؟۔۔ شانزے نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے مصنوعی
سنجیدگی سے سوال کیا۔

لالہ سونے دیتے تو سوتی نہ۔۔۔ دعا نے آنکھ دباتے ہوئے
شانزے کو ٹوکا تھا۔

کیا۔۔ کیا مطلب؟۔۔ مہر و شرم سے نگاہیں بدلتے ہوئے ہاتھ
میں پکڑا بریسلٹ ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھنے لگی۔

اب اتنی بھی انجان مت بنو، ابھی رات کی ہی تو بات ہے۔ تم
اتنی جلدی بھول بھی گئی؟۔۔۔ شانزے اس کے انجان پن پہ
چوٹ کرتی چہرے پہ کمینگی سی مسکراہٹ لئے اس کو زو معنی
نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

شرم کرو تم دونوں!! یہ باتیں میرے کرنے کی ہیں اور کر تم
لوگ رہے ہو!۔۔۔ سنیہہ آپنی ان دونوں کو مصنوعی غصے سے
ڈپٹی مہر خان کی طرف بڑھیں۔

اب تم مجھے کان میں بتاؤ گزری رات کی داستان۔۔۔ سنیہہ آپنی
شرارت سے مہر کو گلے سے لگاتی اس کے کان کے پاس جھکی
تھی۔

آپی کیا بتاؤ؟۔۔۔ مہر خان سرخ چہرے لئے نا سمجھی سے بولتی
سنیہہ آپی سے فاصلہ کر گئی۔

کیا یار لالہ کی قربت کا رنگ اتنا پھیکا تھا جو صبح ہوتے ہی جسم
اور دماغ سے دھندلا ہو گیا ہے؟۔۔۔ سنیہہ آپی پھر سے مہر کے
قریب ہوتیں بیزاری سے بولی تھی جبکہ ان سب کی باتیں زربخت
کے سر سے اوپر گزر رہی تھی اور انزس بزدار مبہم سا مسکراتی
صوفے کی طرف بڑھ گئی۔

میں نہیں مانتی کہ ہمارے لالہ کی محبت کے رنگ اتنے کچے ہیں
جو صبح ہوتے ہی دھندلے پڑ جائیں۔ ذرا پردہ ہٹاؤ اور پھر دیکھو
کیسے چمکتی ہیں محبت کی سوغاتیں!!۔۔۔۔۔ دعا بے شرمی سے
بولتی دبے پاؤں مہر کی طرف بڑھی تھی۔ اس کے یوں دبے
پاؤں بڑھنے کے انداز پہ مہر النساء نے سیٹھاتے ہوئے اپنے

دوپٹے پہ ہاتھ کی گرفت مضبوط کی تھی۔ اس کے یوں اپنا دوپٹہ
درست کرنے پہ سب کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

چھپے ہٹ جاؤ۔۔۔ میرے قریب نہیں آنا۔۔۔ مہر خان
بوکھلاتے ہوئے دو قدم چھپے ہوئی۔

ہاہاہا!! ڈرتو ایسے رہی ہے جیسے ہم نے اسکی عزت لوٹنی
ہے۔۔۔ شانزے بھی شوخ لہجے میں بولتی دعا کے ہم قدم
ہوئی تھی۔ مہر خان سرخ چہرے کے ساتھ ان دونوں سے اپنا
دوپٹہ بچا رہی تھی۔ اس کے پہلو کھڑی سنیہہ آپی نے موقع کا
فائدہ اٹھاتے ہوئے تھوڑا سا دوپٹہ مہر خان کی گردن سے نیچے سر
کا دیا اور دوپٹہ نیچے سر کتے ہی داعیر خان کے دئیے گئے دانتوں
کے نشانات پوری آب و تاب سے چمکنے لگے۔

اوو تیری کی اتنا شدت والا پیار!! سب مہر خان کی گردن
پہ نشانات دیکھتے ہی کمینگی سے قہقہہ لگا گئیں۔ انز ش بزدار کی بھی
ہنسی بے ساختہ تھی۔

شرم ہے تم لوگوں میں کوئی؟ بے شرموں۔۔۔ مہر و کلس کے
بولتی تیزی سے اپنا دوپٹہ پھر سے درست کرتی ان سے کچھ فاصلے
پہ ہو گئی۔ داعیر خان کی سب کزنز آزاد خیال اور کھلی سوچ کی
مالک تھیں۔ اور ان کو یہ سب حرکتیں مہر خان کے ساتھ کرتے
ہوئے بالکل بھی جھجھک محسوس نہیں ہو رہی تھی جبکہ انز ش
بزدار بھی انکی حرکتوں پہ ان کو ٹوکنے کی بجائے ان کا ساتھ دے
رہی تھی۔

دیدہ! آپ بھی ان کے ساتھ ملی ہوئی ہے؟۔۔۔ مہر خان مدہم
سا مسکراتی ہو ہی انز ش کو دیکھ کر بے یقینی سے بولی، وہ اس کو

کافی شریف اور سلجھی ہوئی لڑکی سمجھتی تھی لیکن یہ مہر خان کی سوچ تھی کہ انز ش بزدار شریف ہے، وہ کاروباری لڑکی ضرور تھی۔ اس کی مصروفیات بھی زیادہ تھی لیکن جتنی وہ اپنے فرینڈز سرکل میں بے باک اور بے شرم تھی، اتنی تو کوئی بھی نہیں تھی دعا اور شانزے بھی اس کی شاگردی میں تھی۔

انز ش بزدار ایسی بولڈ لڑکی تھی کہ وہ صرف اپنی باتوں سے ہی سب لڑکیوں کے جذبات ابھار کے ان پہ ایک کیفیت طاری کر سکتی تھی جبکہ زر بخت حیرانگی سے منہ کھولے مہر خان کی گردن پہ نشانات دیکھتی ہے اس کی طرف بڑھی تھی۔

دیدہ!! آپ کو کیا ہوا ہے؟ اتنے نشان کیوں پڑے ہوئے ہیں؟
آپ کو چوٹ لگی ہے؟۔۔۔ زر بخت نے پریشانی سے مہر خان

کے قریب پہنچتے ہوئے سوال کیا۔۔۔ زربخت کا چہرہ سنجیدگی
اور فکر مندی میں ڈوبا ہوا تھا۔

نہیں مجھے کچھ نہیں ہوا۔۔۔ مہر خان اس کو جواب دیتی نظروں کا
زاویہ بدل گئی۔۔۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ زربخت اسے تنگ کر رہی
ہے؟ یا واقعی ان سب چیزوں سے انجان ہے؟

چوٹ؟ چوٹ نہیں چوٹیں لگی ہیں۔۔۔۔۔ دعا نے زو معنی انداز
میں زربخت کو جواب دیا۔

نہیں چوٹ نہیں لگی زربخت! مہر کو رات میں مجھرنے کا ٹاٹھا،
اس لئے نشان پڑ گئے ہیں۔۔۔۔۔ شانزے نے ہلکا سا ہنستے
ہوئے بات کو طول دیا۔

ہائے مجھ تو ایسے نہیں کاٹتا ہے کہ اتنے نشان پڑ جائیں؟ مجھ
مجھے بھی کاٹتا ہے لیکن اتنے زخم تو کبھی نہیں آئے جتنے دیدہ کو آ

گئے ہیں۔۔۔ زربخت معصومیت سے بولتے ہوئے مہر خان کی
طرف ترحم بھری نگاہ ڈالنے لگی۔

سیریسلی!! تمہیں نہیں پتہ یہ نشانات کیسے آئے ہیں؟۔۔۔
شانزے کو تو لگ رہا تھا کہ زربخت جان بوجھ کے انجان بن رہی
ہے لیکن اس کا جواب اور معصومیت دیکھ کے وہ حیرانگی سے
استفسار کرنے لگی۔

ہاں مجھے نہیں پتہ! کیسے آئے یہ نشانات؟ آپ مجھے
بتائیں!!۔۔۔ زربخت نا سمجھی سے پوچھتی مہر کی گردن پہ آئے
نشانات کی وجہ جاننا چاہ رہی تھی۔۔۔

ہاہا!! وجہ بہت ڈارک ہے۔۔۔ ڈارک کاپتہ ہے نہ کیا ہوتا
ہے؟۔۔۔ شانزے متجسناہ انداز میں زربخت کی طرف

بڑھی۔

میں بتاتی ہوں! یہ جو نشانات مہر کی گردن پہ ہے نہ! یہ لو بائٹس
ہیں، جو رات کو لالہ۔۔۔

شٹ اپ دعا!!۔۔۔ انزس بزدار جو پہلے ان سب کی باتوں
سے محظوظ ہو رہی تھی، زربخت کے چہرے پہ دوڑتی پریشانی
اور فکر مندی دیکھ وہ سمجھ چکی تھی کہ وہ ان سب باتوں سے
انجان ہے۔ اس کا نا فہمی سے دوچار ہوتا چہرہ دیکھ کر انزس
بزدار کے چہرے پہ دوڑتی ہنسی رکی تھی۔ وہ سختی سے دعا کو مزید
کچھ بولنے سے ٹوک گئی تھی۔

کیا یار!! بتانے دو بچی کے کام آئے گا۔۔۔ شانزے نے بے
تکلفی سے انزس کو مخاطب کیا تھا۔

تم دونوں بے شرموں کو پتہ ہے اتنا کافی ہے۔ اسے نہ بتاؤ! وہ
معصوم ہے اسے معصوم ہی رہنے دو۔ اور یہ جو تم دونوں کی یہ

سب دیکھتے ہوئے ترتر زبان چل رہی ہے جب وقت آئے
گاتب میں تم دونوں سے پوچھوں گی کہ دکھاؤ کتنے موٹے مچھرنے
تمہیں کاٹا ہے؟ پھر اپنا حال بتاتے ہوئے تم دونوں کی منہ سے
زبان ہی غائب ہو جائے گئی۔۔۔ انزش بزدار ٹانگ سے ٹانگ
ہٹا کے سیدھی ہو کے بیٹھتی سنجیدگی سے انہیں جھڑکنے لگی۔
ہم تو نہیں شرمائیں گے بلکہ اپنے جسم پہ چمکتے دھمکتے نشانات
تمہیں دیکھا کے شرمانے پہ مجبور ضرور کریں گئی۔۔۔ شانزے
بغیر کسی ہچکچاہٹ کے آنکھیں گھما کر بولتی انزش بزدار کو حیران
کر گئی۔

بہت بے شرم ہو تم دونوں!! زربخت تم جاؤ، خالہ جان کے
کمرے سے مہرو کی جیولری لے کر آؤ!! آج ولیمے کی تقریب کیلئے
اسے میں تیار کروں گی۔۔۔ انزش بزدار تاسف سے شانزے

اور دعا کی طرف دیکھتی زربخت کو یہاں سے جانے کا حکم دینے
لگی۔

جی اچھا دیدہ، میں لیکر آتی ہوں۔۔۔ زربخت خوشدلی سے بولتی
کمرے سے باہر نکلی تھی۔۔۔ ویسے بھی وہ یہاں انکمفرٹیبل فیل کر
رہی تھی۔ شانزے اور دعا کی باتیں اسے پریشان کر رہی
تھی۔ اس لئے اس نے کمرے سے نکل جانا ہی بہتر سمجھا۔۔
ہاں اب تم زرا ادھر آؤ اور ہمیں دکھاؤ! لالہ نے کہاں کہاں پہ
اور کتنے گہرے نشانات دیئے ہیں؟۔۔ شانزے پھر سے
آنکھوں میں شرارت لئے مہر خان کو سپٹانے پر مجبور کر گئی
تھی۔

دیدہ۔۔۔ مہر خان نے مدد طلب نظروں سے انزس بزدار کو
پکارا تھا۔

اب میں کیا کر سکتی ہوں یہ تو ہیں ہی بے شرم۔۔۔ انزس بزدار
کو مہر خان کی روہانسی حالت مزہ دے رہی تھی۔ اس لئے وہ
شانزے اور دعا کو روکنے کی بجائے مزے سے کندھے آچکا کے
بولی تھی۔۔ کافی دیر تک مہر خان کو شانزے اور دعا نے چھوٹی
چھوٹی حرکتوں اور بے باک باتوں سے چھیڑے رکھا تھا جبکہ
انزس خاموشی سے یہ سارا سین بیٹھ کے انجوائے کرتی رہی
تھی۔

ہیلو دمیر۔۔۔ انزس ایک دلکش مسکراہٹ چہرے پہ لئے دمیر
خان کی طرف بڑھتی اس کو مخاطب کر گئی تھی جو باہر لان میں
بیٹھا لیپ ٹاپ پہ نگاہیں جمائے کچھ کام کرنے میں مصروف
تھا۔

ہائے انزش!! بیٹھو۔۔۔ دمیر خان رسماً مسکراتا لپ ٹاپ
سے نگاہیں ہٹا کے بولتا انزش بزدار کو بیٹھنے کا اشارہ کرنے لگا۔
کیا ہو رہا ہے؟۔۔۔ وہ نشست سنبھالتی ہلکے بھلکے انداز میں
گویائی تھی۔

کچھ خاص نہیں۔ آج کی میٹنگ میں ڈسکس ہونے والے پوائنٹس
کی ہائی لائٹس چمک کر رہا تھا۔۔۔ دمیر خان لپ ٹاپ سے
نظریں ہٹائے بغیر سر سرے سے انداز میں بولا۔
او اچھا! کیسی رہی پھر آج کی میٹنگ؟ کچھ نئے پروجیکٹس ملے یا
وہی پرانے ری نیو ہوئے؟۔۔۔ انزش بزدار ٹانگ پہ ٹانگ
جماتی چھپ چھیر کے ساتھ ٹیک لگا کے بولتی سوال کر گئی۔

ہمم!! کچھ نئے پروجیکٹس ملے ہیں اور کچھ پرانے کلائنڈز نے
اعتماد دکھایا ہے۔ ہمارے ساتھ آئندہ کئی سالوں تک کام کرنے

میں۔۔۔۔ اس نے عام لہجے میں جواب دیا۔
تم بتاؤ کیا بنا اس پروجیکٹ کا جو تمہاری کمپنی نے شاہ کمپنی سے
لیا ہے؟۔۔۔۔ دمیر خان لیپ ٹاپ پہ انگلیاں چلاتے ہوئے
سنجیدگی سے استعلام کرنے لگا۔

وہ تو چل رہا ہے۔ ایون اس پہ کام بھی شروع ہو چکا ہے لیکن
میں ایک اور پروجیکٹ میں پھنسی ہوئی ہوں۔ وہ کام سیدھا
ہو جاتا تو میں اس پروجیکٹ پہ بھی کام شروع کروا دیتی۔۔۔۔ وہ
باہم اپنی انگلیاں پیوست کئے فکر مندی سے بولی تھی۔

کیوں کیا مسئلہ ہے اس پروجیکٹ میں، جو تم کام شروع نہیں کروا سکتی؟۔۔۔ دمیر خان نے لیپ ٹاپ پرے کرتے ہوئے الجھی نگاہوں سے سوال کیا۔

پروجیکٹ کیلئے جو زمین ہم نے خرید تھی، اس پہ کسی نے قبضہ جما رکھا ہے۔۔۔ نہ وہ خود اب خریدتا ہے اور نہ ہمیں آگے بچنے دیتا ہے لیکن اب میں اس کے بھیجے ہوئے بندوں سے نہیں ڈروں گی، مجھے جلد از جلد اس پروجیکٹ کو مکمل کرنا ہے۔ زمین بابا کے نام ہے، ہم نے قیمت ادا کی ہوئی ہے۔ میرے پاس زمین کے اور یجنل پیپر ہیں جس میں قانونی طور پر ہم اس زمین کے مالک ہیں اور ہمیں ہماری زمین پہ کام کرنے سے اب کوئی نہیں روک سکتا۔۔۔ انرش بزدار سید ہی ہو کے بیٹھتی ٹھوس لہجے میں گویا ہوئی۔

کون لوگ ہیں وہ جو حق ملکیت کا دعویٰ کر رہے ہیں اور تم نے
زمین کس سے خریدی تھی؟۔۔۔۔۔ دمیر خان کو تشویش ہوئی۔
وہ انرش کو ہمیشہ ایسے مسئلوں سے دور رہنے کی تلقین کرتا تھا
کیونکہ وہ جانتا تھا یہ قبضہ مافیا لوگ کیسے ہوتے ہیں اور کتنے
خطرناک ہوتے ہیں اور انرش بزدار جیسی لڑکی ان کا آسان
ٹارگٹ بن سکتی تھی۔۔

مجھے ان لوگوں کو نہیں پتہ اور نہ ہی میں نے ان کو دیکھا ہوا ہے،
ہر دفعہ وہ اپنے کرایے کی غنڈے بھیج دیتا ہے جب بھی میں
وہاں ویزٹ کیلئے جاتی ہوں، اور وہ غنڈے گن پوائنٹ پہ ہمیں
ڈرا دھمکا کے واپس بھیج دیتے ہیں۔ یہ زمین بابا نے آج سے دو
سال پہلے پراپرٹی ڈیلر فرید شیخ سے ہاؤسنگ سوسائٹی بنانے کیلئے
لی تھی۔ اس نے بھی بچنے سے پہلے نہیں بتایا تھا کہ زمین متنازعہ

ہے ورنہ ہم کروڑوں خرچ کر کے زمین خریدتے ہی نہ۔۔۔ مگر
اب خرید لی ہے تو میں اس کو اپنا بنانے کے ہی میں دم لوں گی۔۔۔
انزس بزدار متوازن لہجے میں بولتی اس کو پوری بات سے آگاہ کر
رہی تھی۔

تم ایک کام کرو اس پروجیکٹ کو چھوڑ دو! میں اس کو دیکھ لوں گا
یا ایسا کرو جب تم نے کام شروع کروانا ہو تو مجھے بتا دینا، میں
تمہارے ساتھ چلوں گا۔۔۔ اب دوبارہ وہاں اکیلے جانے کی
غلطی مت کرنا۔۔۔ وہ لوگ تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں یا خدا
نخواستہ کچھ اور بھی ہتھکنڈے اختیار کر سکتے ہیں۔۔۔ دمیر خان
فکر مندی سے بولتا انزس بزدار کو ہدایت دینے لگا۔۔۔ اس کا لہجہ
اپنائیت کے احساس سے بھرپور تھا۔ اور اس کے چہرے پہ

اپنے لئے اتنی فکر دیکھ کے انزس بزدار کے لب اور آنکھیں
خوشی سے مسکرائی تھی۔۔۔

اور بتاؤ کیا چل رہا ہے؟ آج ولیمے کی تیاری کیسی ہے؟۔۔۔
دمیر خان نے یونہی نارملی کنورزیشن کو طول دیا۔
ولیمے کی تیاری تو زبردست ہے اور چل تو کچھ خاص نہیں رہا۔
سوچ رہی ہوں۔ ایک ہفتہ آفس نہ جاؤ۔ کام سے بریک لے
لوں۔ کہیں گھومنے پھرنے کا دل کر رہا ہے۔ کام کر کر کے
تھک گئی ہوں۔ اب کچھ دن اپنے لئے جینا چاہتی ہوں، تھوڑی
یادیں اور تھوڑی خوشیاں سمیٹنا چاہتی ہوں۔ مسلسل کام بھی
بندے کو ڈل کر دیتا ہے۔۔۔۔۔ وہ ٹیبل پہ ہاتھ رکھ کے بولتی
دمیر خان کی طرف دیکھنے لگی اس امید کے تحت کہ وہ یہ ایک ہفتہ
اس کے ساتھ گزارے۔۔۔ وہ دونوں مل کر کوئی ٹرپ پلان

کریں اور تھوڑا وقت ایک ساتھ گزاریں۔۔۔ انزس ہمیشہ دمیر
کے ساتھ وقت گزارنے اور اس سے بات کرنے کو ترستی
رہتی تھی۔

تو پھر کہاں جانے کا پلان ہے؟۔۔۔ اس نے سرسری سا
سوال کیا۔

مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہی کہاں جاؤ! تم بتاؤ کوئی اچھی سی جگہ،
اپنی پسند کی، جہاں میں جاؤں تو اکیلی بھی نہ رہوں اور بور بھی نہ
ہوں؟۔۔۔ انزس سمجھ داری سے بولتی ان ڈائریکٹلی دمیر خان
کو اپنے ساتھ آنے کی فرمائش کر گئی۔

ایسی تو کوئی جگہ نہیں ہے جہاں تم خود کو اکیلا اور بور فیل کرو،
گھومنے پھرنے کی سب جگہوں پہ رونقیں ہوتی ہیں۔ ہر طرف

گہما گہمی ہوتی ہے۔۔۔ وہ اس کے غیر متوقع جواز پہ ہلکا سا سر
کو جھٹکتا خوبصورتی سے مسکرا دیا۔

وہ لوگ ہمارے ساتھ تو نہیں ہوتے، وہ تو اپنوں کے ساتھ
انجوائے کرتے ہیں۔ وہ بھلا میرا اکیلا پن اور بوریّت کیسے دور
کر سکتے ہیں؟ میری بوریّت تو تبھی دور ہو گئی جب میرے ساتھ
کوئی میرا اپنا ہوگا جو ہر وقت مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلا کے
میرے ساتھ حسین مناظر انجوائے کرے۔۔۔ وہ اداسی سے
بولی تھی، وہ چاہ رہی تھی کہ دمیر خان ہر صورت اس کے ساتھ
چلے۔۔۔

اچھا! اداس ہونے کی ضرورت نہیں ہے تم میرے ساتھ
آسٹریلیا آجانا! میں نے اگلے ہفتے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں
۔ تم گھوم پھر لینا اور میں کام کر لوں گا۔ کام سے وقت ملا تو

تمہارا ساتھ گھومنے پھرنے بھی چلا جاؤں گا۔۔۔ اس کی اداس
شکل دیکھ کر وہ مفاہمتی انداز میں گویا ہوا۔

او کے ڈن!! انزب بزدار اس کی بات سنتی خوشی سے چہک
اٹھی تھی۔۔۔ دمیر خان کی ذرا سی بات اس کا دن بنا گئی
تھی۔ وہ دل سے مسکراتی ہوئی ایک تشکر بھری نگاہ دمیر خان پہ
ڈالتی یہاں سے اٹھ کے اندر کی طرف بڑھ گئی کیونکہ اسے ولیمے
کی تقریب کیلئے مہر خان اور خود کو تیار کرنا تھا جبکہ دمیر پھر سے
چہرے سے رسمی مسکراہٹ غائب کرتا لیپ ٹاپ اٹھا کے
سامنے رکھتے ہوئے اپنے کام میں مگن ہو گیا۔

دمیر خان رشتوں کے معاملے میں بے حد حساس تھا۔ اس کی
ہمیشہ کوشش ہوتی تھی کہ اس سے جڑا ہر انسان محفوظ، سلامت
اور خوش رہے اور وہ اپنے ہر عمل سے اپنے سے جڑوں لوگوں

کو اپنائیت کا احساس دلاتا تھا۔ وہ اپنوں کی خوشیوں کیلئے ہر حد تک جا سکتا تھا کیونکہ اس کی نظر میں اس کی زندگی میں رشتے سب سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے اور یہی رشتے ناطے دمیر خان کی ترجیحات میں سر فہرست ہوتے تھے۔

اس کی نظر میں اپنوں کا ساتھ اور ان کا ہونا ایک قیمتی خزانے جیسا ہے۔ اور اس خزانے کے بغیر دمیر خان کنگلا اور غریب تھا، جب اس کے اپنے اس کے ساتھ جڑتے تھے تو وہ خود کو دنیا کا امیر ترین شخص تصور کرتا ہے۔۔۔ رشتوں سے محبت دمیر خان آفریدی کی نس نس میں دوڑتی تھی۔

منت!! جلدی ڈیسائیڈ کرو آپ نے کیا پہننا ہے؟ تاکہ میں آپ کو تیار کر سکوں پھر مجھے خود بھی تیار ہونا ہے۔ ہم لیٹ ہو

جائیں گے، ابھی آپ کے بابا کو بھی جا کے اٹھانا ہے، وہ سو رہے ہیں۔۔۔ ایزل شاہ تھکے ہوئے انداز میں بیڈ پہ بیٹھتی منت سے مخاطب ہوئی جس نے کچھلے بیس منٹوں سے اس کو گھوما کے رکھا ہوا تھا۔

بیڈ پہ منت کے سارے فینسی ڈریس بکھرے پڑے تھے لیکن وہ ہر ڈریس کو انکار کر رہی تھی کیونکہ اسے کوئی پسند نہیں آرہا ہے اور ایزل اسے ڈریس دیکھا دیکھا کے تھک چکی تھی مگر مجال تھی جو منت کسی بھی ڈریس کو پہننے کیلئے راضی ہوئی ہو۔ وہ آج ضدی بنی بیٹھی تھی۔ شاید وہ اداس تھی اس لئے صبح سے چڑچڑی ہو رہی تھی، بات بات پہ ضد کر رہی تھی۔ اور اس کی اداسی اور چڑچڑے پن کی وجہ یا اور اوریسری کا کشمیر جانا تھا ورنہ منت بہت بے ضرر سی بچی تھی، وہ جلدی بات مان جاتی

تھی کبھی ضد نہیں دیکھاتی تھی لیکن آج تو بلا وجہ اس کا ضد
کرنے کو دل چاہ رہا تھا اور وہ کر رہی تھی۔۔

مما! زے مزے شند نئی اے ان تا تکر اشانی اے (مما! یہ مجھے
پسند نہیں ہے ان کا کلر اچھا نہیں ہے)۔۔۔ منت بیڈ پہ پڑی
ساری فراکس کی طرف اشارہ کرتی اپنے گلابی چھوٹے چھوٹے
ہونٹ مروڑتے ہوئے ناپسندیدگی سے بولی تھی۔

اچھا رکو!! میں آپ کیلئے سب سے پیاری فراک لاتی ہوں جو آپ
کے بابا کل لے کر آئے تھے۔۔ اس کا اداس چہرہ دیکھ کر ایزل
چمکتے ہوئے بولی۔ اس نے بچوں کو ضد کی وجہ سے کبھی بھی
نہیں ڈانٹا تھا۔ وہ ہمیشہ انہیں پیار سے ڈیل کرتی تھی، کبھی ان
کی ضد کی وجہ اکتاتی نہیں تھی۔ ان کے ساتھ زور زبردستی کر
کے اپنی مرضی مسلط نہیں کرتی تھی۔

مام! آپ پرنس کو وہ پہنا دیں جو وہ پہنا چاہتی ہے
سمپل۔۔۔ از میر نے اپنی گولڈن آنکھیں گھماتے ہوئے
مصروف انداز میں مداخلت کی۔ وہ بالکل تیار کھڑا آئینے کے
سامنے اپنے بالوں میں برش پھیرتا انہیں ترتیب دے رہا تھا۔
ایزل اسے پہلے کا تیار کر چکی تھی لیکن پھر بھی از میر اپنی تیاری کو
فائل ٹچ دینے کیلئے بار بار اپنے سیٹ کئے گئے بالوں کو دوبارہ
سے سیٹ کر رہا تھا اور وہ یہ حرکت کرتے ہوئے بالکل ارزم
شاہ کی کاپی لگ رہا تھا۔ وہ بالکل کسی بڑے مرد کی طرح اپنے
بالوں میں ہاتھ اور برش پھیرتے ہوئے آئینے میں اپنے چہرے کو
ہر زاویے پہ موڑ کے دیکھ رہا تھا۔ آئینے میں مشکل سے اس کو
صرف اپنا چہرہ ہی نظر آ رہا تھا کیونکہ مکمل طور پہ خود کو دیکھنے کیلئے
از میر کا قد ابھی چھوٹا تھا۔ اس لئے وہ ایڑیاں اٹھا کے خود

سنوار رہا تھا۔ عمر کے لحاظ سے اس کا قد بہت اچھا تھا مگر
سنگھار میز کچھ زیادہ ہی اوپر تھا۔

جی سرکار جو آپ کا حکم۔۔۔۔۔ ایزل شاہ کو از میروں آئینے کے
سامنے کھڑا برش کرتا ہوا کوئی سنجیدہ عمر کا مرد لگ رہا تھا۔ اسلئے
اس نے الماری سے منت کا ڈریس نکالتے ہوئے مسکراہٹ
دبا کر اسے چھپڑنے کی غرض سے ایسا جواب دیا۔

جی! میری پرنس کو اس کی پسند کا ڈریس پہنائیں، میں اپنی
پرنس کو اداس نہیں دیکھ سکتا۔۔۔۔۔ از میر برش ڈریسنگ
ٹیبل پہ رکھتا سنجیدگی سے بولا۔ وہ منت کی معاملے میں بہت
حساس خیالات رکھتا تھا۔ وہ منت کو کسی چیز پہ سمجھوتہ نہیں
کرنے دیتا تھا۔ جو منت کو چاہیے ہوتا وہ اس کو اسی وقت میسر
کرنا از میر کی خواہش ہوتی تھی۔

منت! یہ دیکھو یہ کیسی ہے فراک؟ پیاری ہے نہ؟ ممابھی اس کلر کا ڈریس پہن رہی ہے۔۔۔ از میر کی بات توجہ سے سن کر وہ منت کی طرف بڑھتی اسے ایک خوبصورت سی میرون کلر کی نیٹ اور ٹیشو فبرک کے امتزاج کی پرنس فراک دیکھانے لگی۔ ون شولڈر پرنس فراک پہ نفاست سے ایک سائیڈ موتی جرے تھے جبکہ بوٹم میں بڑے سائز کی سلک فبرک میں بوکنندہ تھی۔۔ منت نے اپنی نیلی آنکھیں ٹپٹپا کے فراک کو غور سے دیکھا جبکہ از میر اور ایزل اب اس کے جواب کے انتظار میں کھڑے اسی کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ منت کے چہرے کے تاثرات ابھی بھی سنجیدہ تھے، ان میں کوئی بدلاؤ نہیں آیا تھا مطلب اسے یہ فراک بھی پسند نہیں آئی تھی؟

مما اب زی تله پهنے دی دو میلی فاک تا اے (مما! آپ یہی کلر
پهنیں گی جو میری فرائک کا ہے؟)۔۔۔ منت اپنی نیلی آنکھیں
اٹھا کے معصومیت سے ماں سے سوال کرنے لگی۔ وہ اس
وقت صوفے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی اپنی چھوٹی چھوٹی
انگلیاں مروڑتے ہوئے لاڈ دیکھا رہی تھی۔ از میر اور ایزل کو وہ
اس وقت ضدی اور ناراض سی بے حد پیاری لگ رہی تھی۔
منت کا معصوم سا چہرہ بالکل سنجیدہ تھا۔ گلابی گال مزید پھولے
ہوئے لگ رہے تھے اور چھوٹی سی ناک پہ ضد اور تھوڑا سا
چڑچڑاپن بیٹھا تھا۔

جی میری جان! میں بھی اسی کلر کا ڈریس پہن رہی ہوں۔ میری
بیٹی بہت پیاری لگے گی اس ڈریس میں، چلو اب جلدی سے تیار
ہو جاؤ پھر ہم نے زربخت آپی سے ملنا بھی ہے۔ آپ تیار نہیں

ہوں گی تو پھر زر بخت آپ سے کیسے ملے گے؟ آپ کیا پھر ان
گندے کپڑوں میں جائیں گئی وہاں؟۔۔۔ ایزل شاہ نرمی سے
منت کی طرف بڑھتی ہلکی پھلکی سی باتیں کرتے ہوئے اس کو
اپنی گود میں اٹھانے لگی۔

مما! ام شر بخت آپی شے بی ملے دے؟ مزے ذہ فاک پائیں میں
پاری بن تے ان شے ملو دی (مما! ہم زر بخت آپی سے بھی ملیں
گے؟ مجھے یہ فراک پہنائیں میں پیاری بن کے ان سے ملو
گئی)۔۔۔ زر بخت کا نام سنتے ہی منت چہک کر بولی تھی۔
ساری ضد اور چڑچڑاپن مسمار ہوا تھا۔ لبوں پہ مسکراہٹ اور
چہرہ پہ خوشی کی لالی دوڑ اٹھی تھی۔ نیلی آنکھیں یک دم چمکی تھی
۔۔۔ منت ایک ملاقات میں ہی زر بخت کے بے حد پیار دینے کی
وجہ سے اس سے مانوس ہو گئی تھی۔

ہا ہا ہا!! شربخت؟ مام شربخت کون ہے؟۔۔۔۔۔ منت کے منہ
سے شربخت سنتے ہی از میر کا قہقہہ بے ساختہ تھا جبکہ ایزل کی بھی
ہنسی نکلی تھی۔

شر بخت نہیں، زربخت نام ہے اس کا۔۔۔۔۔ ایزل شامپیار سے
منت کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی اس کی درستگی کرنے لگی۔
مما لالہ مزہ ہنش لا اے (مما!! لالہ مجھ پہ ہنس رہا ہے)۔۔۔۔۔
از میر کو یوں پاگلوں کی طرح ہنستے دیکھ کر منت خفگی سے ناک
سکوڑ کر شکایتی انداز میں بولی۔

میری بیٹی پر نہیں ہنسو میر!۔۔۔۔۔ ایزل اپنی ہنسی ضبط کرتے
ہوئے از میر کو مصنوعی گھوری سے نوازنے لگی۔

مما میں نہیں ہنس رہا! ہنسی خود ہی آرہی ہے۔ اب آپ جلدی
سے پرنس کو تیار کر دیں پھر ہم نے شربخت آپی سے۔۔۔۔۔ آئی

میں زربخت آپی سے بھی ملنا ہے۔۔۔ از میر پھر سے اپنی
گولڈن آنکھیں ٹپٹپا کے لہجے کو شوخ بنا کر بولا۔

سدھر جاؤ میر ورنہ تمہارے بابا جان کو شکایت لگاؤں
گی۔۔۔ از میر کو پھر سے زربخت کا غلط نام لیتے دیکھ کر ایزل
اس کو وارن کرتی منت کو لئیے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھی
تھی تاکہ وہ اس کو تیار کر سکے۔

میں بابا جان کو جگانے جا رہا ہوں۔۔۔ وہ اپنے بال اچھے سے
سیٹ کرنے کے بعد اعلانیہ انداز میں ماں کو آگاہ کرتا اپنے روم
سے نکل کر کاظم شاہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

بابا!۔۔۔ از میر نے باپ کے روم میں داخل ہوتے ہی بلند
آوازیں اس کو آوازیں لگانا شروع کر دیں۔

بابا جان اٹھیں! آپ خود تو بولتے ہیں کہ رات کے اس وقت
نہیں سونا چاہیے۔۔۔۔۔ وہ اب کاظم شاہ کے بیڈ کی جانب بڑھتا
سنجیدگی سے اسی کے الفاظ ریپیٹ کر رہا تھا جو وہ اکثر اس کو
مغرب کے وقت سوئے دیکھ کر بولتا تھا۔

آج کاظم شاہ آفس نہیں گیا تھا۔ وہ صبح جلدی اٹھ گیا تھا کیونکہ
احان شاہ اور گلالئی کو کشمیر کیلئے نکلنا تھا، اس لئے کاظم شاہ
نے ہمیشہ کی طرح بڑوں والا فرض نبھاتے ہوئے اسے ہدایت
دے کے رخصت کیا تھا کہ وہ بچوں کو اور گل کو احتیاط اور
حفاظت سے لے کر جائے اور کاظم شاہ کے ہدایت نامے سن
کے ہمیشہ کی طرح احان شاہ نے ناک سے مکھی اڑاتے ہوئے
خود کو کافی زیادہ سمجھدار اور عقل مند قرار دیا تھا اور اس کی یہ

بات سن کر کاظم شاہ نے دانت پیستے ہوئے اسے مزید حفاظتی
ہدایات دے کر تپایا تھا۔

احان شاہ اور بچوں کو رخصت کرنے کے بعد کاظم شاہ نے کافی
دیر تک منت کے ساتھ وقت گزارا تھا جو یاور کے جانے کی
وجہ سے اداس اور چڑچڑی سی ہو گئی تھی کیونکہ سید یاور شاہ
کے ساتھ پورا دن کھیلنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ایزل دوپہر
کے ٹائم منت کو اس کے کمرے میں لے کر گئی تھی اور کاظم
شاہ کی چونکہ پہلے ہی نیند پوری نہیں تھی اس لئے وہ سو گیا تھا اور
ابھی تک سو رہا تھا۔

بابا کو بہت نیند آرہی ہے میرا ڈونٹ ڈسٹرب می۔۔۔ وہ اپنے
برہنہ کندھوں تک ٹھیک سے چادر لیتا نیند سے لبریز بھاری آواز
میں بولا۔

But I was born to disturb you

وہ بیڈ پہ چڑھتا ہوا بے نیازی سے کندھے اچکا کر بولا، تکیے میں چہرہ
چھپا کر سوائے کاظم نے اس کی حاضر جوابی پہ مسکراہٹ
دبائی۔

You know that ! Huh? I'm your one and only official

troublemaker !

ازمیر شاہ اپنے کپڑوں کا خیال کئے بغیر کمفرٹ میں گھستا ہوا حق
جتانے والے انداز میں بولا اور پھر اس کی خاموشی پہ اپنے
چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی مدد سے باپ کا چہرہ تکیے سے نکالنے
کی کوشش کرنے لگا۔

Tsk tsk, Not the one and only ! Manat gets the VIP spot

first

کاظم شاہ نے چہرہ باہر نکالے بغیر اسے تنگ کرنے کی غرض سے
ایسا جواب دیا۔

Fine ! I'm not jealous... Princess comes first for me too,

even before you ! Huhh

وہ اس کے گال سے ہاتھ ہٹاتا ہوا منہ پھولا کر بولا۔ منت کے معاملے میں وہ جیلز نہ ہونے کی پوری کوشش کرتا تھا کیونکہ وہ اپنی چھوٹی سی بہن پہ جان چھڑکتا تھا لیکن پھر بھی کبھی کبھار جب کاظم جان بوجھ کر منت کو اس سے زیادہ امپورٹینس دیتا تھا تو وہ آٹو میٹکلی جیلز ہوتا تھا۔

Oh Really?

اس کے لہجے میں جیلسی اور ناراضی کی رفق محسوس کرتے ہوئے کاظم شاہ نے لبوں پہ بکھرا تبسم چھپا کر چہرہ تکیے سے باہر نکالا اور یہاں سے جانے کی تیاری پکڑتے از میر شاہ کو ایک جست میں اپنے چوڑے بازو میں سماتا ہوا شرارت سے کنفرم کرنے والے انداز میں پوچھنے لگا۔

Any doubt?

ازمیر ناراضی جتانے کی غرض سے دور ہونے کی کوشش کرتا منہ
کے زاویے بگاڑ کر بولا۔

ماشاء اللہ! میرا بیٹا بہت پیارا لگ رہا ہے۔۔۔ کاظم نے کمفرٹر
اس پر سے ہٹایا اور نیند کے خمار سے سرخ ہوتی آنکھوں سے
ازمیر کا جائزہ لیتا ہوا تعریف کئے بنا رہ نہ پایا۔ وہ سفید شلوار
قمیض پہ میرون ویسکوٹ پہنے اپنے بالوں کو ٹھیک سے سیٹ
کئے بے حد خوبصورت لگ رہا تھا۔ اس کی سرخ و سفید رنگت
پہ میرون ویسکوٹ کافی جچ رہی تھی۔

تھینک یو بابا! اب اٹھیں اور تیار ہو جائیں۔۔۔ وہ کاظم شاہ کے
منہ سے اپنی تعریف سن کر بے اختیار خوش ہوتا اس کے
چوڑے سینے میں گھسنے لگا۔ باپ کے پاس لیٹتے ہوئے اسے نہ

اپنے قیمتی اور نئے کپڑوں کی پروا تھی اور نہ ہی ان بالوں کی
جنہیں اس نے گھنٹہ لگا کر سیٹ کیا تھا۔

میر۔۔۔ اسے جواباً شرارت کی بجائے اتنی شرافت کا مظاہرہ
کرتے دیکھ کر کاظم نے بے ساختہ نرمی سے پکارا۔

ہمم؟۔۔۔ از میر شاہ نے محض ہنکارا بھرا۔

Are you feeling sad or something?

کاظم نے فکر مندی سے سوال کرتے ہوئے اس کے بالوں پہ
ہونٹ رکھے۔

Kinda sad 'cause I am missing my sweetheart

وہ اس کے برہنہ سینے پہ لاڈ سے ٹھوری ٹکاتا ہوا اداسی بولا۔
از میر کے جواب پہ کاظم نے دانت کچکچائے، اسے لگا نجانے کیا
ہو گیا ہے جو اس کا بیٹا عادتاً سیویج ریپلائز دینے کی بجائے ایک

دم سے اتنا شریف ریکٹ کر رہا ہے لیکن وجہ اب سمجھ آئی تھی۔

اگر تم سویٹ ہارٹ کی جگہ یاور کا نام لیتے تو مجھے خوشی ہوتی۔۔۔ کاظم شاہ نے افسوس سے کہتے ہوئے اس کے گولڈن حمکتے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

Come on Baba ! I just can't miss that ugly little monkey !

میر نے بے پرواہی سے سر جھٹکتے ہوئے ہلکا سا ہنس کر جواب دیا۔ وہ چاہے یاور کی غیر موجودگی کو جتنا مرضی مس کرتا لیکن زبان سے اعتراف کرتے ہوئے جان جاتی تھی۔

Too Bad, Meer !

اس کا جواب سن کے کاظم شاہ نے اسے آنکھیں دیکھا کر افسردگی کا اظہار کیا۔

Yes! it's too bad... lying there all half-naked in front of
your own kid. Seriously Baba?

از میر نے جو اباً شرمندہ ہونے کی بجائے ہونٹ سکوڑتے ہوئے
کاظم شاہ کے شرٹ لیس وجود پہ چوٹ کرتے ہوئے تاسف
سے نفی میں سر ہلایا۔

اچھا بس!! میرے باپ نہ بنا کرو۔ گرمی لگ رہی تھی، اس
لئے شرٹ اتار دی۔۔۔ اسے اپنے ازلی روپ میں آتے دیکھ
کر کاظم شاہ نے مصنوعی رعب دار لہجے میں بہانہ گھڑتے ہوئے
سائیڈ ٹیبل پہ پڑا والٹ اٹھایا اور اس میں سے پیسے نکال کے
از میر کے سر پر سے وارنے لگا کیونکہ وہ نظر لگ جانے کی حد تک
پیارا لگ رہا تھا۔ ان دونوں کی نوک جھوک ابھی مزید چلنی
تھی۔

دس منٹوں میں ہی وہ منت کا ڈریس چینج کروا کے اسے بازوؤں
میں اٹھا کر باہر لاتی ڈریسنگ ٹیبل پہ بیٹھا رہی تھی۔

لالا تہا دے ماما؟ (لالا کہاں گئے ماما؟)۔۔۔ روم میں چاروں
طرف نگاہیں گھمانے کے بعد منت نے معصومیت سے ماں
سے استفسار کیا۔

بابا جان کو جگا۔۔۔ ایزل کا جواب ابھی منہ میں ہی تھا جب
ازمیر شاہ کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

واؤ مام! پرنس کتنی پیاری لگ رہی ہے۔۔۔ وہ جو باپ کو
اچھا خاصہ زچ کرنے کے بعد بالکل ابھی روم میں داخل ہوا تھا،
منت کو نگاہیں اٹھا کے دیکھتے ہی ستائشی انداز میں مسکرا کر
تعریف کرنے لگا۔

میری پرنس ہے ہی پیاری تو پیاری ہی لگے گی نہ!۔۔۔ ایزل
اپنی ننھی سی شہزادی کے بالوں میں برش کرتے ہوئے پیار سے
بولی اور ساتھ ہی منت کا گال چوم لیا۔

مما!! پرنس کا صدقہ نکالیں! اس کو نظر لگ جائے گی۔۔۔
ازمیر قدم انہی کی طرف بڑھاتے ہوئے سنجیدگی سے بولا کیونکہ
اپنے بچوں کو یوں تیار دیکھ کے کاظم شاہ اکثر اوقات ان کا صدقہ
نکالنے کا عادی تھا اور یہی چھوٹی چھوٹی باتیں ازمیر پک کرتا تھا۔
میں آپ دونوں کا صدقہ نکالوں گی میری جان کیونکہ میرے دونوں
بچے بہت پیارے لگ رہے ماشاء اللہ۔۔۔ وہ منت کے سر پہ
پرنس ہیڈ بینڈ سیم فرائک کے کلر کا لگاتی، عاجزانہ طور پر فخریہ
نگاہ اپنے دونوں بچوں پہ ڈالنے لگی۔ ایزل شاہ نے اپنے معصوم
بچوں کے حسین معصومیت سے بھرے چہرے دیکھ کر اللہ

تعالیٰ کی ذات کا شکر ادا کیا تھا جس نے اسے اتنی پیاری رحمت
اور نعمت دونوں سے نوازا تھا۔

بابا جاگ گئے ہیں؟۔۔۔ منت کو مکمل طور پہ تیار کرنے کے بعد
ایزل نے گردن موڑ کر نرمی سے از میر سے استفسار کیا۔
میں جگا رہا تھا لیکن پھر سو گئے۔۔۔ وہ بے نیازی سے کندھے
اچکا کر جواب دیتا اپنے سلکی بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے
انہیں سیٹ کرنے لگا۔

چلو!! میں ان کو دیکھتی ہوں اور اب آپ دونوں نیچے عرش کے
پاس جاؤ۔۔۔ میں اور بابا تیار ہو کے آتے ہیں۔ پھر بابا آپ
دونوں کا صدقہ بھی نکال دیں گے۔۔۔ وہ منت کو ٹیبل سے
نیچے اتارتی وال کلاک پہ ٹائم دیکھتے ہوئے عجلت میں بولی تھی۔
از میر سر کو خم دے کر نرمی سے منت کا ہاتھ پکڑے سیر ھیوں کی

طرف بڑھ گیا کیونکہ عرشمان اس وقت نیچے لاؤنج میں ڈائشہ خان
کے پاس تھا اور جہاں پہ ذی بے بی ہو وہاں پہ ارزم شاہ نہ ہو؟
ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ دونوں اس وقت لاؤنج میں بیٹھے اپنے
بیٹے کی شرارتیں اور باتیں انجوائے کر رہے تھے۔ از میر اور
منت کو احتیاط سے سیرٹھیاں سے اترتے دیکھ کر ایزل شاہ
مطمئن ہوتی تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی کیونکہ شام
کے سات ہونے والے تھے اور آٹھ بجے تک انہیں وہاں
تقریب میں موجود ہونا چاہئے تھا۔

شاہ جی! اٹھ جائیں! سات بجنے والے ہیں۔ ہم تقریب کیلئے
لیٹ ہو جائیں گے۔ از میر بھی آپ کو جگانے آیا تھا لیکن کوئی
حال نہیں۔۔۔ وہ جیسے ہی روم میں داخل ہوئی، کاظم کو ابھی

تک سوئے دیکھ کر افسوس سے بلند آواز میں بولی۔ اس نے
آگے بڑھ کر صوفے اور کارپٹ سے منت کے کھلونے سمیٹنا
شروع کئے جو وہ دوپہر میں آکر کھیلتے ہوئے سارے بکھیر گئی
تھی۔

آپ کو میری آواز آرہی ہے شاہ جی؟ اٹھیں۔ ہمیں لالہ کے
ولیمے میں جانا ہے۔۔۔ کاظم شاہ کی طرف سے کوئی جواب نہ پا
کر ایزل اب کی مرتبہ زرا اونچی آواز میں گویا ہوئی۔
اوزی۔۔۔ سونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کاظم شاہ نے آواز
کو بوجھل بناتے ہوئے ایزل کو صدا لگائی۔
جی!!۔۔۔ سارے کھلونے باسکٹ میں رکھتی ایزل نے بے
دھیانی سے جواب دیا۔

مجھے بہت تھکاوٹ ہو رہی ہے یار۔ آج ایونٹ میں نہیں جاتے
ہیں۔۔۔ وہ تکیے میں منہ گھسیڑے مدہم آوازیں بولتا اپنی
مسکراہٹ چھپانے لگا۔

تھکاوٹ ہو رہی ہے؟۔۔۔ ایزل نے نا سمجھی سے اس کا جملہ
زیر لب دہرایا۔

ہمم! میرا پورا جسم تھکاوٹ سے چور ہو رہا ہے۔ کہیں جانے کو
دل نہیں کر رہا۔ دل چاہ رہا ہے، میں بس سوتا رہوں اور تم
میرے پہلو میں مجھے میسر رہو۔۔۔ وہ آوازیں افسردگی اور
تھکاوٹ کا عنصر نمایاں کرتا تھکے ہوئے لہجے میں بولتا کروٹ بدل
کے سیدھا ہوا، چہرے کے نقوش بھی ڈھیلے کر لئے۔

کیوں شاہ جی کیا ہوا ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟۔۔۔
اس کا کمزور لہجہ محسوس کرتے ہی وہ فکر مندی سے بیڈ کی طرف
بڑھ گئی۔

ہاں طبیعت تو ٹھیک ہے! بس کہیں بے چینی سی ہے۔۔۔
کاظم شاہ تھوڑا سا اٹھ کر بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹیک لگاتے
ہوئے مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔ اس کے چہرے پہ ایک
شرارتی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ایزل نے قریب پہنچتے ہی اس
کے چہرے پر سنجیدگی کے لبادے میں چھپی شریر مسکراہٹ
دیکھ لی تھی، اس لئے وہ بیڈ پر بیٹھنے کی بجائے ناک سکور کے
زرا فاصلے پہ کھڑی ہو گئی۔

ادھر آؤ ناں یار! دیکھو تو میرا جسم کس قدر تھکن سے چور ہے
۔۔۔ اسے فاصلے پہ رکتے دیکھ کر کاظم اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا

کر مصنوعی معصومیت سے بولتا ایزل کو اپنے طرف کھینچنے کی
کوشش کرنے لگا۔

آپ نے تو کچھ کیا ہی نہیں ہے! پھر تھکاوٹ کس بات کی ہو
رہی ہے۔۔۔ اس نے آبرو آچکا کے کاظم شاہ کو مشکوک
نظروں سے دیکھا جو آج آفس نہیں گیا تھا لیکن پھر بھی جناب کو
تھکاوٹ ہو رہی تھی۔

کیوں؟ تمہیں کچھ کروانا ہے؟۔۔۔ وہ اپنا نچلہ لب دانتوں تلے
دباتا گھمبیر آوازیں زو معنی انداز میں استفسار کرنے لگا۔
نہیں!! میں نے ایسا کب بولا؟۔۔۔ وہ اسکی بات کا مطلب
سمجھ کر ہڑبڑاتے ہوئے شرم سے نظروں کا زاویہ بدل گئی۔
ایک کاظم شاہ کی زو معنی نظریں اور دوسرا اس کا سفید چٹانی
برہنہ سینہ دیکھ کر اس نے تھوک نکلتے ہوئے اس کے ارادوں

سے پناہ مانگی کیونکہ اس کی آنکھیں کچھ اور ہی کرنے کی کہانی سنا
رہی تھی۔

لیکن میں بہت تھکا ہوا ہوں! مجھے اپنی تھکاوٹ اتارنی
ہے۔۔۔ کاظم شاہ نے مخمور آواز میں بولتے ساتھ ہی ایک
حٹکے سے آگے ہاتھ بڑھا کر ایزل شاہ کو بازو سے پکڑا اور اپنے
سینے پہ گرا لیا۔

شاہ جی!!۔۔۔ ایزل نے اس اچانک اتفاق پر بوکھلاتے ہوئے
اس کے برہنہ سینے پہ ہاتھ رکھ کر فاصلہ قائم کرنا چاہا مگر کاظم شاہ
اس کے گرد اپنے دونوں بازوؤں کا حصار باندھتا سختی سے اپنے
سینے میں قید کرنے لگا۔

اب پوچھو! مجھے کیوں تھکاوٹ ہو رہی ہے؟۔۔۔ وہ شرارت
سے ایزل کی کان کی لوں کو لبوں میں دبا کے بولتا اس کے جسم پہ
اپنے ہاتھوں کی گستاخیاں سرزد کرنے لگا۔

نہیں! میرا کہنے کا مطلب تھا کہ آج تو آپ آفس بھی نہیں
گئے۔ صبح سے سو رہے ہیں تو پھر تھکاوٹ کس چیز کی ہو رہی
ہے؟۔۔۔ وہ اس کے بے باک ہاتھوں کی گستاخیوں پہ خود میں
سمٹی لڑکھڑاتے ہوئے بولی تھی۔

وہی تو میں تمہیں سمجھانا چاہا رہا ہوں کہ مجھے کسی اور ٹائپ کی
تھکاوٹ ہو رہی ہے اور جب تک وہ تھکاوٹ اترے گی نہیں،
میری طبیعت ناساز رہے گی۔۔۔ وہ ایزل شاہ کو اپنے سینے سے
نکال کر اس کا چہرہ اپنے مقابل کرتے ہوئے جھکا اور اس کے
لبوں پہ زبان پھیرتے مخمور محویت میں سرگوشی کرنے لگا۔

ہم۔۔۔ ولیمے کیلئے۔۔۔ لیٹ ہو جائیں گئے۔۔۔۔۔ ایزل نے
اسکی آنکھوں میں چھائی سرخی دیکھ کر تھوک نکلتے ہوئے وقت کا
احساس دلایا۔

ولیمے پر نہیں جاتے!! آج بس ایک دوسرے کا ساتھ محسوس
کرتے ہیں۔ تھکن اتارے ایک ہفتہ ہو گیا ہے یار! آج میرا وجود
بے قراری اور طلب کی شدت سے بوجھل ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ وہ
اس کی گردن میں منہ گھسیڑے اس کی نرم جلد سک کرتے
ہوئے فرمائی ہوئے۔ کاظم شاہ کا انداز اس وقت بہکا ہوا تھا۔
ارادے خطرناک تھے اور اس پہ متضاد اس کے وجود سے
اٹھتی ہیٹ محسوس کر کے ایزل شاہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی
دوڑی تھی۔

نہیں!!! ایونٹ پہ ہر حال میں جانا ہے کیونکہ باہر بچے ہمارے
انتظار میں بالکل تیار بیٹھے ہیں۔ اگر جانے کا پروگرام کینسل کریں
گے تو ان کا دل برا ہو جائے گا۔۔۔ وہ اس کے لبوں اور
دانتوں کا لمس اپنی گردن پر محسوس کرتی جھنجھلاتے ہوئے
بولی۔

اچھا پھر پروگرام کینسل نہیں کرتے، بس آدھے گھنٹہ لیٹ کر
لیتے ہیں؟۔۔۔ کاظم نرمی سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے
اوپر کی طرف اٹھاتا صحیح سے اپنی گود میں بیٹھانے لگا۔
نہیں پلیز شاہ جی! ایسے تو ہم پھر جا ہی نہیں پائیں گے۔۔۔
ایزل نے ہڑبڑاتے ہوئے جواز پیش کیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی،
جب ایک بار کاظم شاہ اسے اپنی قربت میں لیتا تھا تو پھر رہائی
آسانی اور جلدی ملنا مشکل ہو جاتی تھی۔

کاظم شاہ نے جواب دینے کی بجائے نرمی سے ایزل کا جبرہ اپنے ایک ہاتھ کی گرفت میں قید کیا اور بے صبروں کی طرح اس کے گلابی لبوں کو اپنے عنابی ہونٹوں کی قید میں لئے ان کی مٹھاس اپنی زبان پہ محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ کاظم کے لمس کی جسارت پہ اس کو کندھوں سے تھام گئی جبکہ وہ بے قراری سے اپنا ہاتھ اس کی دھڑکنوں پہ پھیرتا شدت سے اس کی نازک پنکھڑیوں کو سک کرنے لگا تھا۔

وہ ایک ہاتھ چھپے جا کر ایزل کی فراک کی زپ کھولتا اس کو کندھوں سے نیچے کی طرف سرکانے لگا۔ کاظم بے چینی سے اس کی دھڑکنوں کے پردے کو بے ترتیب کرتا اسکے سینے کی ابھری نزاکت کو اپنی مٹھیوں میں بھرنے لگا تھا۔ وہ جنونی ہوتا اس کے لبوں کو دانتوں میں دباتے ہوئے اس کی دھڑکنوں کو

سختی سے اپنی ہتھیلیوں میں جکڑنے لگا۔ ایزل نے اس کے
برہنہ کندھوں پہ اپنے ناخن ثبت کرتے ہوئے ہوش دلانے کی
کوشش کی تھی جو اپنے لبوں اور ہاتھوں کے بے رحم لمس پہ
اس کی جان نکال رہا تھا۔ مسلسل لبوں سے لیٹے رہنے کی وجہ
سے اب ایزل کی سانسیں بند ہونے لگی تھی۔ چہرہ سرخ ہوا
تھا۔

اس نے کلس کر کا ظم شاہ کے بالائی لب پر زور سے دانت گاڑھ
کر چھبٹنا کا اشارہ کیا لیکن وہ چھبٹنے کی بجائے اس کی
میٹھی جسارت پہ سرشار ہوا تھا۔ وہ مزید اس کے لبوں کو
شدت سے چومتا اس کی زبان کی نمی کو سک کرنے لگا۔ اسے
بے قابو ہوتے دیکھ کر وہ اپنے ہونٹوں کو چھڑوانے کی کوشش
کرتی اس کے کندھوں پر پھر سے اپنے ناخن زور سے پیوست

کرنے لگی۔ بالآخر کاظم شاہ کو جب اس کی سانسیں مدہم ہوتی
محسوس ہوئیں تو وہ آخری بار اس کے نازک لبوں کو زور سے
چومتا آزادی بخش گیا تھا۔ آزادی ملتے ہی وہ اپنی سانسیں ہموار
کرتی اس کے سینے پہ سر ٹکا گئی۔

وہ محبت سے اس کے سر پہ لب رکھتا اس کو کندھوں سے تھام
کر زرا سا پیچھا کرتا ایزل کے سینے کی ساخت پہ جھکتا اس کی
نزاکت محسوس کرنے لگا۔ وہمیا سوں کی طرح ان کو اپنے لبوں
میں دبا کے چھوڑتا اس کو سسکنے پر مجبور کر رہا تھا۔ کاظم شاہ
کے وجود کی سختی اور گرماہٹ محسوس کر کے اس کے گلے میں
گلی بھر کی معدوم ہوئی۔

شاہ جی۔۔۔ ایزل نے خوف سے تھوک نکلتے ہوئے اسے پکارا
تھا۔

ہم۔۔۔ کاظم نے اس کے سینے کی ناز کی کو اپنے ہاتھ سے
سہلاتے ہوئے گھمبیر آواز میں ہنکارا بھرا۔ اس کی آنکھوں میں
خمار اور طلب کے ڈورے دوڑ رہے تھے۔

وہ۔۔۔ بچے۔۔۔ باہر۔۔۔ ہمارا۔۔۔ انتظار۔۔۔ کر رہے۔۔۔ ہیں۔۔۔
ایزل شاہ اس کے ہاتھ کی سختی اپنی دھڑکنوں پہ شدت سے
محسوس کرتی سسکتے ہوئے بولی۔

یہ زیادتی ہے ویسے! پہلے شوہر کو بہکا لو پھر اور بہانہ بنا کے نکل
جاؤ۔ ابھی چھوڑ رہا ہوں لیکن یاد رکھنا واپسی پہ سارے حساب
برابر کروں گا۔۔۔ وہ پیار سے اس کے لبوں کو چومتا جتانے
والے انداز میں گویا تھا۔

میں نے کب بہکایا آپ کو؟۔۔۔ اس نے ناک سکوڑتے
ہوئے شکوہ کیا۔

یہ تمہارا روپ۔۔ تمہاری نیلی آنکھیں۔۔ تمہارے جسم کی
نازکی۔۔ تمہاری ادائیں۔۔ تمہاری معصومیت۔۔ یہ سب مجھے
بہکاتی ہیں۔ تم اپنے حسن سے ہر لمحہ میرے دل پہ وار کرتی ہو۔
مجھے گھائل کر کے رکھا ہوا ہے۔ اپنا اسیر بنا کے قید کیا ہوا
ہے۔۔۔ وہ نرمی سے ایزل شاہ کے عارض لبوں میں دبا کے
بولتا اپنے بے لگام جذبات کا الزام ایزل شاہ کے حسن کے سر
ڈال گیا۔

اچھا! اٹھیں نہ تیار ہو جائیں۔۔۔ وہ حیا سے گلنار ہوتی اپنی
فراک کا گلہ درست کرتے ہوئے کاظم شاہ کی گود سے نکل گئی۔
اس نے بھی اب کی مرتبہ اسے خود سے دور ہونے پہ ٹوکا نہیں
تھا کیونکہ اگر مزید دو منٹ ایزل اس کی گود میں رکتی تو کاظم شاہ
کے جذبات بے لگام ہو جانے تھے جنہیں وہ فلوقت اپنے بچوں

کے انتظار کرنے کی وجہ سے لگام ڈال گیا تھا۔ اس کے جذبات
جب ابھرتے تھے، تب وقت کی قلت پڑ جاتی تھی اس لئے وہ
فلحال اپنی قربت سے ایزل کو رہائی بخش گیا تھا۔

کون سے کپڑے نکالوں آپ کے؟۔۔۔ وہ بیڈ سے اٹھ کر دوپٹا گلے
میں ڈالتی کاظم سے پوچھنے لگی جو آنکھیں موندے اپنا نچلا لب
دانتوں تلے دباتا شاید خود پہ قابو پا رہا تھا۔

کوئی سے بھی نکال دو۔۔۔ اس نے بنا آنکھیں کھولے جواب دیا
تھا۔ وہ سر کو خم دیتی الماری کی طرف بڑھ گئی جبکہ کاظم بیڈ سے
اٹھ کے واشروم کی طرف جانے ہی والا تھا کہ اسکی نظر کٹی
میڈم پہ پڑی جو بیڈ کے کونے پہ اوندھے منہ لیٹی نیند کے مزے
لے رہی تھی۔

تمہیں ہر وقت میرے کمرے میں ریست کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے؟۔۔۔ وہ آگے بڑھ کر ایک جست میں کٹی کو اٹھا کے کاریٹ پہ پٹکتا کلستے ہوئے غرایا۔ کٹی بیچاری جو نیند میں غرق تھی، یوں زمین پہ پٹکے جانے پر میاؤں میاؤں کرتی ہڑبڑا کے اٹھی تھی۔ آنکھیں کھلتے ہی وہ زہریلی نظروں سے کاظم شاہ کو گھورتی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی تھی جو ہمیشہ اس پہ نیند میں حملہ کر کے اس کا سارا سکون برباد کر دیتا تھا۔

کیا ہوا ہے کٹی کو؟۔۔۔۔۔ ایزل جو الماری سے کاظم کے کپڑے نکال رہی تھی، کٹی کی غصیلی آواز سن کر فوراً چھپڑی۔

میرے اپنے بچے مجھ سے الگ سوتے ہیں۔ میں نے خود ان کا روم الگ کر دیا تا کہ ہماری پرائیویسی انویڈ نہ ہو! مگر تف ہے اس کمینی کٹی پہ! نجانے مجھ سے کیا دشمنی نکال رہی ہے جو کسی

صورت میرے کمرے سے ٹلنے کا نام ہی نہیں لیتی! نہ شرم، نہ
مروت! میرے ہر رومانٹک مومنٹ پر ایسے عقاب کی نظر رکھتی
ہے جیسے کسی خفیہ مشن پہ نکلی ہو!۔۔۔ وہ تپے ہوئے انداز
میں کشن اٹھا کے کٹی کی طرف اچھالتا دانت کچکچاتے ہوئے
شکایتی انداز میں بولا۔ کٹی کی ہمیشہ اپنے کمرے میں موجودگی اور
اس کا ایزل کے ساتھ بلاوجہ چپکنا کا ظم کو بالکل بھی پسند نہیں
تھا۔ اس کے کشن پھینکنے سے کٹی اپنے بچاؤ کیلئے تندہی سے
ایزل کی طرف بھاگی۔

وہ سو رہی تھی اس نے کچھ نہیں دیکھا۔۔۔ ایزل مسکراہٹ
دبا کر کٹی کو اٹھا کے اپنی بانہوں میں بھرتی اس کے انجان پن کی
گواہی دینے لگی۔

سب دیکھتی ہے! بڑی یسنی ہے!! جس دن یہ مجھے اکیلی مل گئی، اس سے اگلے دن اس ناگن کی قبر پر فاتحہ خوانی ہو رہی ہو گی اور پھر میں جی بھر کر اللہ کا شکر ادا کروں گا۔۔۔ وہ قہر برساتی نظروں سے کٹی کو دیکھتا تیزی سے واشروم میں کی طرف بڑھ گیا جبکہ ایزل اس کی باتوں کو سرے سے نظر انداز کرتی کٹی کے بال پیار سے سہلاتے ہوئے روم سے باہر چھوڑ آئی تھی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کٹی بیچاری کی کاظم شاہ سے پھر سے بلاوجہ بے عزتی ہو۔ اس کو باہر چھوڑنے کے بعد وہ سیدھا ڈریسنگ روم کی طرف گئی اور پھر پانچ منٹوں میں ہی وہ میرون کلر کی ڈیسنٹ سی میکسی زیب تن کئے باہر نکلتی آئینے کے سامنے آگئی۔ ایزل تیزی سے بالوں میں برش چلاتی انہیں سنوارنے لگی تھی جب اچانک کلک کی آواز سے واشروم کا

دروازہ کھلا تھا اور کاظم شاہ اپنے گیلے بالوں میں ٹاول پھیرتا باہر نکلا تھا۔

ایزل شاہ نے اس کی طرف مڑ کے نہیں دیکھا تھا جبکہ وہ ایک نظر اس پہ ڈالتا مسکراتے ہوئے اس کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ اس کے بھاری قدموں کی چاپ سن کر بھی ایزل نے اس کی طرف ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ وہ مصروف انداز میں آئینے میں خود کو دیکھ کے سنوار رہی تھی۔ کاظم شاہ بے حد آہستگی سے اس کے قریب پہنچا اور اسے چھپے سے پکڑ کر اپنے حصار میں قید کر گیا۔ ایزل شاہ کے اپنے بالوں میں چلتے ہاتھ رکے تھے۔ بہت پیاری لگ رہی ہو۔۔۔ وہ اس کے کندھے پہ لب رکھتا اپنے ہاتھ اس کے پیٹ کے گرد ریپ کرنے لگا۔

ابھی تو پوری تیار بھی نہیں ہوئی ہوں۔۔۔۔۔ اس کی مونچھوں
کی چبھن اپنے کندھے پہ محسوس کرتے ہوئے وہ ذرا سا
کسمسائی۔

اگر پوری تیار ہو گئی تو باخدا آج کی تاریخ میں تم اس کمرے سے
باہر نہیں نکل پاؤ گی۔ میرے دل کیلئے تمہارا اتنا حسن برداشت
کرنا مشکل ہو جاتا ہے یا۔ جب تم خود کو اس طرح سے
سنواری ہو تو بے رحمی سے میرے دل کا قتل عام کرتی
ہو۔۔۔ کاظم شاہ بہکے ہوئے انداز میں محبت بھری سرگوشیاں
کرتا اس کے کندھے پہ ٹھوڑی ٹکا چکا تھا۔

تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں جان بوجھ کے تو آپ کے دل
کو قتل نہیں کرتی۔ آپ کا دل مجھے دیکھ کے بے ایمان ہو جاتا
ہے تو اس میں میرا کیا گناہ ہے؟ آپ اپنے دل کو سمجھائے، یوں

ہر بار خود کو قتل نہیں کیا کرتے۔۔۔۔۔ ایزل شاہ اپنے لبوں پہ
لب اسٹک لگاتے ہوئے مسکراہٹ چھپا کر بے نیازی سے
بولی۔

تمہارا دل بھی تو مجھے پہرتا ہے نا؟ پہلے تم اپنے دل کو سمجھا لو،
پھر میں بھی اپنے دل کو قتل ہونے سے بچا لوں گا۔۔۔ وہ اس
کے لب اسٹک سے سچے ہونٹوں کو فوکس میں لیتا جتانے والے
انداز میں بولا۔

میرا دل ہر وقت آپ پہ نہیں مرتا!۔۔۔ وہ آنکھوں میں شرارت
لئے غلط بیانی کرنے لگی۔

تم چاہ رہی ہو کہ میں ابھی اسی وقت تمہاری اس تیاری کو اور
تمہارے آگ جوالہ روپ کو اپنی قربت سے مہکا کر تمہیں یاد
دلاؤں کہ تم مجھ پہ کتنا مرتی ہو؟۔۔۔ اس نے بے باکی سے

ایزل کو خود کے ساتھ لپٹاتے ہوئے چیلنجنگ انداز میں استفسار کیا۔

نہیں ابھی میں کچھ نہیں چاہ رہی! آپ جا کے کپڑے بدلیں، بچے اوپر ہی آرہے ہیں۔۔۔ وہ سٹیٹا کر تیزی سے اس کے حصار سے نکلی کیونکہ از میر اور منت کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھیں جو شاید ان کے کمرے میں ہی آرہے تھے۔۔

رات کو بتاتا ہوں تمہیں!!۔۔۔ وہ ایزل کو بازو سے پکڑ کر خود کی جانب کھینچتا زور سے اس کے گال پہ لب رکھ کے چومتا چھپتے ہوئے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا کیونکہ منت اور از میر اب باہر دروازے کے قریب پہنچ چکے تھے اور کاظم شاہ نے اس وقت صرف اپنے گرد ٹاول لپیٹ رکھا تھا۔ اسلئے وہ اتنی آسانی سے اس کی جان بخشی کر گیا تھا۔

مام!! بابا جان کہاں ہیں؟۔۔۔ منت کا ہاتھ پکڑ کے کمرے میں
داخل ہوتا از میر ارد گرد نگاہیں دوڑاتے ہوئے سنجیدگی سے
سوال کرنے لگا۔

بابا چینج کر رہے ہیں۔۔۔ بس باہر آنے والے ہیں۔۔۔ ایزل نے
ایک آخری بار خود کو آئینے میں دیکھ کر چھپہٹتے ہوئے از میر کو
جواب دیا۔

منت بیٹا!! بال خراب بھی کر لئے ہیں آپ نے!۔۔۔ منت
کا ہیڈ بیڈ اور بے ترتیب بال دیکھ کر ایزل اس کی طرف بڑھتے
ہوئے گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

مما! میں نے نئی تئیے اش نے تئیے ایس (مما! میں نے نہیں کئے،
عرش نے کیے ہیں۔۔۔ منت نے معصومیت سے لب مڑوڑ کر
جواب دیا۔

عرشمان ہمیشہ منت کے بالوں کا معائنہ کرتے ہوئے انہیں
بے ترتیب کر دیتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے سر پہ لگی پنز اور کلر
فل ہئیر بینڈز کو دیکھ کر اڑیکٹ ہوتا تھا اور پھر ان کو چھونے
کیلئے منت کے سر پر حملہ کر دیتا تھا۔ عرشمان بہت شرارتی بچہ
تھا اور وہ ہمیشہ منت کو ستاتا رہتا تھا کیونکہ باقی بچے اس بڑے
تھے، اس لئے وہ اس کے ہاتھ نہیں آتے تھے لیکن کبھی کبھار
وہ بھی عرشمان کے حملوں سے بچ نہیں پاتے تھے کیونکہ وہ بچہ
جو اپنے ارزم شاہ جیسے باپ کو انگلیوں پہ نچا سکتا تھا، وہ کچھ
بھی کر سکتا تھا۔ زوریز شاہ کے بچے بہت کم حویلی آتے تھے
کیونکہ وہ انہیں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس لئے عرشمان کے پاس
تنگ کرنے کیلئے ایک چھوٹا پیس منت کا بچا تھا۔ اور وہ اسے
خوب تنگ کرتا تھا۔

اچھا کوئی بات نہیں! میں پھر سے بال بنا دیتی ہوں اپنی بیٹی کے
۔۔ وہ نرمی سے بولتی دوبارہ سے منت کے بال اپنے ہاتھوں
سے سیٹ کرنے لگی۔

بابا زان۔۔۔ کاظم شاہ کو ڈریسنگ روم سے نکلتا دیکھ کر منت
تیزی سے ایزل کے حصار سے نکل کر چہکتے ہوئے اپنے باپ کی
طرف دوڑی۔

میری پرنس!۔۔۔ وہ نیچے جھک کر اس کو اپنی بانہوں میں
اٹھاتا محبت سے اس کے گلابی گال چومنے لگا۔

بابا زان!! میں پاری لگ امی اوں نہ؟ مزے آد شربخت آپی شے
ملنا اے (بابا جان!! میں پیاری لگ رہی ہوں نہ، مجھے آج
زربخت آپی سے ملنا ہے)۔۔۔ منت نگاہیں جھکا کر ستائشی

نظروں سے خود کو دیکھتی معصومیت سے باپ سے دریافت
کرنے لگی۔

ماشاء اللہ! میری پر نس بہت پیاری لگ رہی ہے، میری
آنکھوں کا نور لگ رہی ہے۔۔۔ وہ محبت بھرے لہجے میں بولتا
جا بجا منت کے چہرے پہ لب رکھنے لگا البتہ اس کے منہ سے
شر بخت لفظ سن کے کاظم نے تفصیل کیلئے ایزل کی طرف آبرو
اچکا کے دیکھا۔

"زربخت" دمیر لالہ کی کزن ہے۔ ان کی پھوپھو کی بیٹی ہے۔
ابھی کل ہی ہماری ملاقات ہوئی ہے اس سے اور منت کی اس
سے دوستی بھی ہو گئی۔ بہت پیاری لڑکی ہے
زربخت۔۔۔ معصوم سی سادہ سی۔۔۔ کاظم کی سوالیہ نگاہیں خود
پہ محسوس کرتے ہوئے ایزل نے مسکرا کر منت کی کہی گی

بات کی وضاحت دی۔ زربخت کو سوچتے ہوئے ایک دفعہ پھر
ایزل شاہ کے لبوں کو مسکراہٹ نے چھو لیا تھا۔

بابا زان! شربخت آپ کی آئینج ممدایشی ایس (بابا جان! زربخت آپ کی
آئینج ممدایشی ہیں)۔۔۔ منت اگلے ہی لمحے اپنے نیلی آنکھیں
تعجب سے پھیلاتی، اپنے ہاتھوں اور آنکھوں کے اشارے سے
حیران کن تاثر دینے لگی۔

اچھا!! لیکن آپ کی بھی تو آئینج ممدایشی پیاری ہیں۔۔۔ کاظم
شاہ لاڈ سے بولتا ایک نظر ایزل شاہ پہ ڈال کے منت کی آنکھیں
پیار سے چومنے لگا۔

بابا جان پلیز! پرنس کو فوراً زربخت آپ کی پاس لے جائیں ورنہ
یہ انہیں شربخت، شربخت کہہ کر شربت بنا دے گی۔۔۔ از میر

جو منت کے منہ سے بار بار شربخت سن کر اپنی ہنسی دبائے کھڑا
تھا، اس بار سنجیدگی سے کاظم شاہ سے فریاد کر بیٹھا۔
ایسے نہیں بولتے میر۔۔ ایزل نے آنکھیں سکیڑ کر از میر شاہ کو
ڈپٹا۔ تھوڑی دیر بعد وہ چاروں بالکل تیار ہو کے حویلی سے نکل
کر دمیر خان کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ کاظم شاہ نے اپنے
بچوں اور بیوی کا صدقہ سب سے پہلے نکالا تھا۔ وہ تینوں آج حد
سے زیادہ حسین لگ رہے تھے اور وہ خود بھی کچھ کم نہیں لگ
رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اپنی سنجیدہ اور بارعب شخصیت کے
ساتھ جازبِ نظر لگ رہا تھا۔

اسد اللہ خان کی حویلی پہنچے ہی منت بے تابی سے گاڑی سے نکل کر اندر کی طرف بھاگی۔ اس کے چھپے ہی از میر بھی ایکسائیٹڈ انداز میں اسی کے انداز میں بھاگا تھا۔

منت، از میر بھاگو مت بیٹا!! گر جاؤ گے۔۔۔ ان دونوں کو لاپرواہی سے بھاگتے دیکھ کر ایزل فکر مندی سے گویا ہوئی۔ تم اندر جا کر ان کو دیکھو۔۔۔ کاظم شاہ سنجیدگی سے اس کو حکم دیتا ہوا گاڑی سے اتر کر مروں والی سائیڈ بڑھ گیا جبکہ ایزل سر کو خم دیتی اپنی چادر سنبھالتے ہوئے اندر کی طرف گئی۔

شر بخت آپی! شر بخت آپی!۔۔۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی منت چہک کے زربخت کو آوازیں لگانے لگی۔ لاؤنج میں میٹھے اسد اللہ خان اور نزہت خان نے چونک کر چھپے کی طرف دیکھا

تھا اور منت اور از میر کو دیکھ کر ان کے چہرے پر مسکان
دوڑی تھی۔

شر بخت آپی تاں اے؟ (زر بخت آپی کہاں ہیں؟)۔۔۔ منت
لاؤنج میں نگاہیں دوڑا کے معصومیت سے پوچھتی اسے تلاشنے
لگی۔

آپ کی آپی کمرے میں ہے۔۔۔ جواب نزہت خان نے
مسکراتے ہوئے دیا تھا۔

السلام علیکم!!۔۔۔ ایزل شاہ لاؤنج میں آتی ہی سامنے بیٹھ
اسد اللہ خان اور نزہت خان کو سلام کرتی بے تاب سی منت
کا اپنی گود میں اٹھانے لگی۔

و علیکم السلام! آؤ بیٹا بیٹھو۔۔۔ اسد اللہ خان خوشی دلی سے
صوفے سے اٹھ کر ایزل کے سر پہ شفقت بھرا ہاتھ رکھتی اسے

بیٹھنے کا اشارہ کرنے لگے۔ نزہت خان بھی اٹھ کے اس کے گلے ملی تھیں اور پیار سے منت کا چھوٹا سا ہاتھ پکڑ کے چومنے لگیں۔ وہ بغیر نگاہیں ہٹائے محبت سے منت کو دیکھ رہی تھی۔ ان کو ایسا لگ رہا تھا جیسے انکی زربخت چھوٹی سی بن کے سامنے آگئی ہو۔

لالہ!! ایسا لگتا ہے جیسے زربخت کا بچپن لوٹ آیا ہو۔ یہ گڑیا بالکل زربخت جیسی لگ رہی ہے۔۔۔ نزہت خان خوشدلی سے بولتی اسد اللہ خان کو اپنی طرف متوجہ کروانے لگیں۔

ہاں میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ یہ تو ہماری زربخت کا بچپن لوٹ آیا ہے۔۔۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے ان کی بات کی تائید کی۔

ماشاء اللہ! بہت پیاری بچی ہے، اللہ اس کے نصیب اچھے
کرے۔۔۔ نزہت خان پھر سے منت کا ہاتھ کر چوم کر اسے
دعائیں دینے لگیں۔

آمین!!۔۔۔ ایزل شاہ نے مسکرا کے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے
نزہت خان کی دعا پہ آمین کہا۔

مما! مزے شربخت اپنی تے پاش زانا اے (مما! مجھے زربخت آپنی
کے پاس جانا ہے)۔۔۔ ایزل کو صوفے پہ بیٹھتا دیکھ کے منت
ناک سکوڑتے ہوئے بولی تھی۔

ہاہاہا!! لے جاؤ اس کو اپنی شربخت آپنی کے پاس، وہ سامنے
والے کمرے میں زربخت ہے۔۔۔ نزہت خان چھوٹی سی
منت کی بات سمجھ چکی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، اس لئے ہنستے
ہوئے اس کو اندر کمرے میں جانے کا اشارہ کرنے لگیں۔ وہ

نرمی سے مسکرا کے احتیاط سے منت کو اٹھاتی از میر کو اپنے
ساتھ آنے کا اشارہ کرتی زربخت کے کمرے کی طرف بڑھی
تھی تاکہ اپنی بیٹی کی بے چینی ختم کر سکے جو زربخت سے ملنے
کے بعد ہی ختم ہونی تھی۔

ولیمے کی تقریب آج حویلی کے لان میں ہی منعقد کی گئی تھی۔ آج
بھی مدعو کئے گئے مہمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔۔۔ مردوں اور
عورتوں کا علیحدہ انتظام کیا گیا تھا۔ عورتوں والی سائڈ
خوبصورت ساسفید پھولوں سے مزین سٹیج بنایا گیا تھا۔ سٹیج کے
پس منظر لڑیوں کی صورت میں جھلملاتی مقیموں کی روشنی اس کی
خوبصورتی کو چار چاند لگا رہی تھیں۔ سب مہمان آچکے تھے

سوائے مہر خان کے گھر والوں کے۔۔ وہ شاید لیٹ ہو چکے
تھے، اس لئے انہیں پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی۔

داعیر خان تھوڑی دیر بعد مہر والنساء کو اپنے ہمراہ لئے سٹیج کی
طرف بڑھنے لگا۔ مہر خان نے خوبصورت سی ایکوا بلیو کلر کی
میکسی زیب تن کر رکھی تھی جو سٹون ورک سے بھری ہوئی
تھی۔ دوپٹے کے پلو اور میکسی کا بارڈر گولڈن مرر اور ستارہ
ورک لیس سے مزین تھا۔

یہ کلر مہر خان کی سرخ و گلابی رنگت پہ بہت سوٹ کر رہا
تھا۔ گولڈ کی جیولری اور میک اپ کے ساتھ وہ آج بھی اپنے
پرکشش نقوش کے ساتھ نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ
رہی تھی جبکہ اس کے ساتھ چلتا داعیر خان بھی بروکن وائٹ

تھری پیس سوٹ میں ملبوس اشیر نظر لگ رہا تھا۔ دونوں کی
جوڑی ایک ساتھ خوب چچ رہی تھی۔

وہ دونوں اپنے پٹھانی طلسماتی نقوش کے ساتھ تقریب میں موجود
تمام عورتوں کی نگاہوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ ان کی
خوبصورت جوڑی کو دیکھ کر سب کی آنکھیں خوشی اور ستائش
سے چمک رہی تھی۔۔۔ داعیر خان اسٹیج تک پہنچتا نرمی سے مہر
کا ہاتھ پکڑے اس کی میکسی سنبھالتے ہوئے اسے صوفیہ بیٹھا
رہا تھا۔

داعیر!! مورے لوگ ابھی تک کیوں نہیں آئے؟۔۔۔ مہر نے
صوفیہ پہ بیٹھتے ہی فکر مندی سے اس کو مخاطب کیا۔

آ رہے ہیں! راستے میں ہیں۔ میری رائم لالہ سے بات ہو گئی
ہے۔۔۔۔۔ داعیر خان نے اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے نرمی
سے جواب دیا۔

اچھا!! میں بہت مس کر رہی ہوں مورے کو۔۔۔ وہ اداسی
سے بولی۔

میرے ہوتے ہوئے بھی تمہیں کسی کی کمی ہو سکتی ہے؟ میں
جب تمہاری ہر اداسی دور کرنے کیلئے ہوں تو پھر کیوں بلا وجہ
اداس ہوتی ہو؟۔۔۔ وہ اس کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتا
محبت سے بھرپور لہجے میں بولا تھا۔

داعیر! آپ کا ساتھ تو الگ احساس بخشتا ہے! آپ کے ساتھ تو
میں مکمل ہوتی ہوں لیکن انسان کی زندگی میں باقی رشتے بھی
ضروری ہوتے ہیں جن کے بغیر ہم کبھی نہیں رہ سکتے اور

رشتوں میں ماں باپ سرفہرست آتے ہیں۔ ان کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ جو خوشی ماں باپ کا وجود اولاد کو دیتا ہے، وہ دنیا کا کوئی رشتہ نہیں دے پاتا! جو اداسی ماں باپ کی ذات دور کر سکتی ہے، وہ اداسی دنیا کی کوئی رنگینی نہیں دور سکتی۔ ہمیں زندگی کے ہر حصے میں رشتوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن زندگی گزرنے کے ساتھ جیسے جیسے ہم بڑے ہوتے ہیں تو ہمارے رشتے بدلتے ہیں۔ ہم کسی کی زندگی میں شامل ہوتے ہیں یا کوئی ہماری زندگی میں خوش نما رنگ بن کر آتا ہے تو اس کا ہرگز مقصد یہ نہیں ہوتا کہ ہم نئے رشتے سے منسلک ہو کر پرانے رشتوں سے دستبردار ہو جائیں اور ماں باپ کا تو رشتہ ہی ایسا ہے جو ساکھ کی بنیاد ہے۔ ان سے دوری ہماری ذات کے سبز پتوں کو زرد کر ہی دیتی ہے۔۔۔

کسی بھی لڑکی کیلئے ماں باپ سے بچھڑنا آسان نہیں ہوتا۔۔
بہت تکلیف دہ عمل ہوتا ہے! جس طرح ایک گھنے سائے دار
پیڑ کی جب شاخ کاٹی جاتی ہے تو در پیڑ کی جڑوں تک سرائیت کر
جاتا ہے، اسی طرح جب بیٹیاں ماں باپ سے دور ہوتی ہیں تو ان
سے جدائی کا درد پورے جسم میں تکلیف کا باعث بنتا ہے اور
بیٹیاں وہی شاخ ہیں جو وقت آنے پر گھنے پیڑ سے کاٹ دی جاتی
ہیں۔ ماں باپ سے علیحدہ کر دی جاتی ہیں اور اس کی تکلیف
شاخ اور پیڑ دونوں کو اٹھانی پڑتی ہے۔۔ وہ داعیر خان کے ہاتھ
پر انگلیوں کی گرفت مضبوط کرتی بھگے لہجے میں بولتی چلی گئی۔ وہ
ہمیشہ اپنے ماں باپ اور لالا سے بہت ایٹچ رہی تھی، اس لئے
ایک دن کی دوری نے اس پر بہت اثر کیا تھا۔

ارے! میں نے کب بولا کہ ماں باپ کا کوئی نعم البدل ہوتا ہے؟
یا میں تمہارے ماں باپ کی کمی پوری کر سکتا ہوں؟ کوئی بھی رشتہ
ماں باپ کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ میں تمہارے ابتدائی رشتوں کی
نہ کمی پوری کر سکتا ہوں اور نہ ان کی برابری کر سکتا ہوں مگر میں
تمہاری زندگی خوشیوں سے ضرور بھر سکتا ہوں۔ تمہیں ہر تکلیف
سے محفوظ رکھ سکتا ہوں۔ اپنی ذات کو تمہارے لئے راحت
اور سکون کا ذریعہ بنا سکتا ہوں۔ زندگی کے کسی بھی موڑ پہ،
کسی بھی حالات میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ اگر تم میرے
لئے اپنے ماں باپ اور گھر بار سب کچھ چھوڑ کے آ سکتی ہو تو
پھر میرا بھی فرض ہے تمہاری رضا اور خوشی کو اول رکھوں۔
تمہارے لئے ہر وہ چیز ترک کر دوں گا جو تمہیں ناگزیر گزرے۔

نور چشم!! تم پیڑ سے کٹی ہوئی شاخ نہیں ہو بلکہ تم پیڑ کا میٹھے رس
سے بھرا ہوا پھل ہو جو میرے حصے میں دیا گیا ہے۔ تمہاری
ذات کی مٹھاس نہ صرف مجھے بلکہ میری زندگی کو بھی لذت سے
بھرپور کر چکی ہے۔۔ آئندہ خود کو کبھی بھی کٹی ہوئی شاخ سے
تشبیہ نہیں دینا میری مہر! تم پھل ہو۔ جب پیڑ پہ پھل پک کے
تیار ہو جاتا ہے تو پیڑ خود کہتا ہے کہ اسے مجھ سے لے جاؤ۔۔
اس کے ذائقے چکھو اور مجھے سراہوں کہ میں نے کتنا میٹھا پھل
اللہ کے حکم اور اسکی قدرت سے تیار کیا ہے۔۔ پھر وہی پھل
ہزاروں بے ذائقہ زبانوں کو ذائقہ بخشتا ہے۔ ان کو زندگی کی
مٹھاس سے متعارف کرواتا ہے۔ تم نے بھی مجھے زندگی کی
مٹھاس سے متعارف کروایا ہے۔ تم سے پہلے زندگی پھیکی اور بد
ذائقہ تھی لیکن اب تمہاری ذات کی چاشنی میرے وجود میں گھل

کے میرے ہر اعضاء کو شیریں کر رہی ہے۔۔۔ داعیر اس کی
کر سٹل گرے آنکھوں میں جھانکتا بے حد دھیمے لہجے میں بولتا
اسے محبت سے سمجھانے لگا۔ اس کا سمجھانے کا انداز بھی
مٹھاس سے بھرپور تھا۔

تو میں آپ کیلئے پھل ہوں؟۔۔۔۔۔ مہر خان نے آنکھوں میں
چمک لئے اس کی شہد رنگ آنکھوں میں جھانک کے اسی کے
الفاظ دہرائے۔

ہمم!! وہ بھی میٹھا والا!۔۔۔۔۔ داعیر خان عقیدت سے آنکھیں
موندھ کے بولا۔

کتنا میٹھا؟ آئی مین کونسا پھل ہوں میں؟۔۔۔۔۔ مہر خان نے
متجسس ہو کر پوچھا۔

رات کو ہر جگہ سے ٹیسیٹ کر کے بتاؤں گا۔ ابھی جو گزری
رات کو چکھا تھا وہ میری زبان بھول رہی ہے۔ یہ پھر سے
تمہارے وجود کا ذائقہ چکھنا چاہتی ہے۔ بس جلدی سے تقریب
ختم ہو جائے تو پھر فرصت سے بتاتا ہوں کہ تم کو نسا پھل
ہو!۔۔ وہ اس کی انگلیوں میں باہم اپنی انگلیاں الجھاتا شریر لہجے
میں بولا تھا۔

نہیں آج تو توریب ختم ہوتے ہی میں نے مورے لوگوں کے
ساتھ چلے جانا ہے۔ آپ کو یہ ذائقہ کچھ دن چکھنے کو نہیں ملنے
والا۔۔۔ مہر خان لب دباتے ہوئے اپنی کر سٹل گرے آنکھیں
گھوما کے مزے سے بولی۔

کس خوشی میں جانا ہے؟ میں ایک منٹ بھی خود سے دور تمہیں
کہیں نہیں جانے دوں گا۔ تمہیں میٹھا پھل کہا ہے تو پھل بنو نہ کہ

کڑوا کر یلا بن کے مجھے سے دور جانے کی باتیں کرو۔۔۔ وہ اس
کی دور جانے والی بات پہ بدمزہ ہوا۔

میں کڑوا کر یلا نہیں ہوں آپ لالچی ہیں اور حرصی ہیں جس کو ہر
وقت میٹھا پھل کھانے کی پڑی رہتی ہے۔ کبھی کبھار وقفہ لے
کر صبر بھی کر لینا چاہیے کیونکہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور
ویسے بھی میٹھے پھل کا ایک سیزن ہوتا ہے۔ آپ اس سیزن کا
پھل رات کو کھا چکے ہیں۔ اب صبر کا دامن تھائیے اور اگلے
سیزن کا انتظار کیجیے، مطلب میرے واپس آنے کا۔۔۔ وہ اپنی
ہنسی ضبط کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔ اسے داعیر خان کی
اتری شکل دیکھ کے مزہ آرہا تھا۔

اور آپ کو لگتا ہے کہ میں یہ سیزن خوب جی بھر کے پھل کھائے
بغیر ہاتھ سے جانے دوں گا؟۔۔۔ داعیر نے آئرو آچکا کے مہر کو
ترچھی نگاہوں سے دیکھا۔

داعیر پلیز جانے دے نہ!! پکا پرویس! پرسوں واپس آجاؤں
گی۔۔۔ وہ اس کے اٹل ارادے بھانپ کر ملتجی ہوئی تھی۔
او کے چلی جاؤ لیکن دو دن نہیں صرف ایک دن کیلئے، کل شام کو
تیار رہنا میں خود تمہیں لینے آؤں گا کیونکہ تمہارے بغیر اب میں
صرف ایک رات بھی مشکل سے گزار سکتا ہوں لیکن اس ایک
رات کی وصولی تم سے ڈبل کر کے لوں گا اور کوئی رحم نہیں
کھاؤں گا۔۔۔ داعیر خان نے ناچاہتے ہوئے بھی اس کو جانے
کی اجازت دے دی تھی کیونکہ وہ اس کو ماں باپ کے پاس
جانے سے نہیں روک سکتا تھا۔

داعیر!!۔۔۔ اس کی آخری بات سن کے وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دباتے ہوئے خفگی سے بولتی جگہ کا لحاظ کروانے لگی۔

اس وقت اسٹیج پہ صرف وہ دونوں موجود تھے، اس لئے اتنی گفتگو ہو گئی تھی وگرنہ سب کی موجودگی میں مہر خان اس بے باک انسان کو مخاطب کرنے سے بھی سو بار ڈرے۔

کیا یار!! اب تو سب کو پتہ ہے کہ ہم نے رات کو کیا تھا! اب کیا شرمانا؟۔۔۔ داعیر خان بے شرمی سے بولتا کندھے آچکانے لگا۔ ایک کام کریں! جا کے سب کو بتا دیں کہ رات کو میں نے کتنی بے شرمی کی ہے۔۔۔ وہ کلس کے بولتی داعیر خان کو گھوری سے نوازنے لگی۔

ہے شرمی نہیں پیار کیا ہے! وہ بھی شدت والا اور میں اپنے سب دوستوں کو بتاؤں گا آئی مین بیچاروں کو گائیڈ کروں گا کہ

فرسٹ نائٹ یہ کب کیا اور کیسے کرنا ہوتا ہے۔۔۔ وہ شریر لہجے
میں مزید بولتا مہر خان کا چہرہ غصے اور شرم سے سرخ کر گیا تھا۔
گزری رات کا سارا منظر اور داعیر خان کی بے شرمیاں آنکھوں
کے سامنے لہرائی تھی۔

آپ کو شرم نہیں آئے گی اپنے دوستوں کے ساتھ ایسی باتیں
کرتے ہوئے؟۔۔۔ مہر خان صدمے سے بولی۔

مجھے تو شرم آتی ہے لیکن وہ بے شرم ہیں! وہ مجھ سے خود ایسے
سوالوں کے جواب جاننا چاہتے تو میں بتا دیتا ہوں! کیا پتہ میرے
بتانے سے کسی کا بھلا ہو جائے؟۔۔۔ داعیر خان نارمل انداز
میں گویا ہوتا اب جان بوجھ کے مہر کو چھیڑ رہا تھا ورنہ وہ اپنی اتنی
پر سنل باتیں خاص کر اپنے رشتے سے ریلیٹڈ کسی سے ڈسکس

نہیں کرتا تھا۔ دوستی میں بے شرمی تھی مگر ایک حد تک۔ وہ
رشتوں کا تقدس اور لحاظ کبھی نہیں بھولا تھا۔

تو آپ اپنے دوستوں کو اپنی گزری رات کے بارے میں بتائیں
گے؟۔۔۔ مہر خان نے پریشانی الجھے ہوئے انداز میں سوال

پوچھا۔

نہیں میں کیوں اپنی پرسنل لائف کو اپنے دوستوں میں زیر بحث
لاؤں گا۔ میں مزاق کر رہا تھا نور چشم!! کبھی بھی اپنے اور
تمہارے بیچ کے خوبصورت رشتے کو زیر بحث نہیں لاؤں گا۔
مجھے رشتوں کی فضیلت اور ان کا پاکیزہ پن پتہ ہے میری
مہر۔۔۔ وہ مسکرا کے بولتا اس کا وہم دور کرنے لگا۔ وہ
مطمئن ہوتی نظریں جھکا گئی۔

رائم خان ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنے ماں باپ کے ساتھ آیا تھا۔
وہ سب سے پہلے اپنی لاڈلی بہن سے ملا تھا۔ مہر خان کے ساتھ
تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد عورتوں کی موجودگی سے انکمفرٹیبل فیمل
کرتا وہ اٹھ کے مردوں والی سائیڈ بڑھ رہا تھا، جب سامنے سے
فون کی سکرین پہ نظریں جھکائے انزباز آتی دیکھائی
دی تھی۔ رائم خان نے اپنے چلتے قدموں کو وہی بریک لگائی
تھی۔ آنکھیں اور لب خوشی سے جھوم اٹھے تھے۔ دل اچھل
اچھل کر سینے سے باہر جھانک کر اس کو تگنے لگا۔
انزباز نے اس وقت زنک کلر کی خوبصورت سی میکسی
پہن رکھی تھی جس کا بارڈر میرون کانٹراسٹ میں تھا جبکہ پوری
میکسی پہ میرون ہی ہینڈ ورک نہایت ہی سلیقے اور نفاست سے
کیا گیا تھا۔ بالوں کا بن بنائے انہیں پھولوں کے گجرے میں قید

کیا گیا تھا اور چہرے کی دونوں سائیڈز کر لڑبالوں کی لٹیں جھول رہی تھی، گلے میں لیا ہلکا کام دار دوپٹہ، حسین مغروری مکھڑے پہ ہلکا سا میک اور شخصیت میں جاذب پن انزس بزدار کو محفل کی جان بنا رہا تھا۔

اتفاقاً رائم خان نے بھی زنک کلر کی شلوار قمیض پہ ہم رنگ پلین ویسکوٹ زیب تن کر رہی تھی۔۔۔ وہ اپنے نکھرے چہرے اور کرسٹل گرے آنکھوں کے ساتھ وجیہ لگ رہا تھا۔ دونوں کے ڈریس کا کلر سیم تھا اور یہی بات رائم خان کی خوشی میں اضافہ کر رہی تھی۔

آپ نے میری کاپی کی ہے؟۔۔۔ وہ انزس کے قریب پہنچتا آنکھیں چندھیا کرتے ہوئے استفسار کرنے لگا۔ انداز ہمیشہ کی طرح اس کو تپانے والا تھا۔

کچھ کہا آپ نے؟۔۔۔ وہ جو ایک ہی جگہ ٹھہر کے کسی کو میسیجز
کر رہی تھی، اس کی آواز پہ نگاہیں اٹھا کر نا سمجھی سے پوچھا۔
میں کہہ رہا ہوں کہ آپ نے میری کاپی کی ہے؟۔۔۔ رائم خان
نے تھوڑا سا اس کی طرف جھک کر اپنا سوال دہرایا۔
کیا مطلب؟ میں کچھ سمجھی نہیں؟۔۔۔ اس نے آنکھوں میں
الجھن لئے سوال کیا۔

میرا مطلب ہے کہ آپ کا اور میرا ڈریس سیم ہے۔۔۔ جیسا میں
نے پہنا ہوا ہے، ویسا ہی آپ کا بھی ہے۔ اگر آپ کو میری
کاپی کرنی تھی تو مجھے بتا دیتی۔۔۔ میں کچھ اور ٹرائی کر لیتا۔۔
رائم اپنی کرسٹل گرے آنکھوں میں شرارت لئے بولتا اپنے
ڈریس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انزس کو ٹھٹکا گیا تھا۔

کیا آپ نے میکسی زیب تن کر رکھی ہے؟۔۔۔ انزش کی فون
پہ چلتی انگلیاں رکی تھی۔ وہ سر سے لیکر پاؤں تک رائم خان
کو طنزیہ نظروں سے سکین کرتی جبرے بھینچ کر بولتی اس کو
شرمندگی سے دوچار کر گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ رائم خان کلر کی
بات کر رہا ہے لیکن انزش بزدار نے بھی اس کے فضول سوال
پہ اسی کے انداز میں فضول جواب دیا تھا۔

میں کیوں میکسی پہنوں گا؟ میں کلر کی بات کر رہا تھا۔۔۔۔۔ رائم
خان اس کی حاضر دماغی پہ دوبدو ہوا تھا۔

آپ کا اور میرا ڈریس سیم ہے مسٹر خان لیکن آپ کی لک
میرے ساتھ میچ نہیں کر رہی۔۔۔۔۔ وہ بات چھوڑنے کی
 بجائے غور سے رائم خان کا ڈریس دیکھتے ہوئے مصنوعی
سنجیدگی سے بولی۔

آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟ کھل کے کہیں؟۔۔۔ رائم خان اب صحیح معنوں میں پھنسا تھا۔ چہرے پہ خجالت سے دوچار ہونے کے اثرات واضح ہوئے تھے۔

I am just saying...

کہ ویسے تو ہمارے ڈریس سیم ہیں لیکن اگر آپ پھولوں کے گجرے ہاتھوں میں پہن لیں اور ایک پھول بالوں میں لگالیں تو تب ہماری لک بھی سیم سیم لگے گی جسٹ لائک ٹوئن سٹریز!!۔۔۔ انزش نے مسکراہٹ دبا کر زومعنی نظروں سے رائم خان کو دیکھتے ہوئے پاس والے ٹیبل پہ پڑا ایک گلاب کا پھول اٹھا کے اس کے کان پہ اڑسا دیا۔

اب لگ رہی ہو آپ مس گلابو!!۔۔۔ انزش بزدار دلکش ہنسی ہنستے ہوئے بھرپور مردانہ وجاہت کے حامل رائم خان کو سر سے لیکر پاؤں تک مس گلابو سے تشبیہ دے گئی تھی۔

استغفار! کیوں مجھے بھری محفل میں ایسے زنانہ خطاب سے نواز کر میری مردانگی پر سوال اٹھا رہی ہیں؟۔۔۔ رائم خان بوکھلاتے ہوئے ارد گرد نگاہیں دوڑاتا اپنے کان سے گلاب کا پھول ہٹا کے دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔ ہاں البتہ اس کو انرش کی ہنسی کافی بھلی لگی تھی اور وہی پہ اس کی اپنے ساتھ بے تکلفی حیران کن بھی لگی تھی۔

وہ ایسے تو کبھی کسی انجان سے پیش نہیں آتی تھی جیسے آج آرہی تھی۔۔۔ رائم خان نے ذہن کے کسی کونے میں سوچا۔ مس گلابو! آپ مجھے بتا دیں کہ آپ کو کس قسم کی ڈریسنگ کرنا پسند ہے؟ تاکہ اگلی بار میں جب اپنی شاپنگ کروں تو ساتھ میں آپ کیلئے بھی کچھ لازمی خریدوں۔۔۔ انرش بزدار نے اس

کے جواب کو خاطر میں لائے بغیر ہنسی ضبط کرتے ہوئے اگلا

سوال داغا۔

ہمیشہ رائم خان اسے الٹی سیدھی باتیں کر کے پتاتا تھا مگر آج انزش نے اس کو تھوڑا پتانے کا سوچا تھا کیونکہ شروعات اس نے خود کی تھی بے تکا سوال کر کے۔۔۔ مغروری انا پرست پتھر کی مانند سخت اور بے حد سنجیدہ طبیعت کی مالک انزش بزدار کی ایک سائیڈ یہ بھی تھی اور اس کی یہ سائیڈ صرف اس کے بہت قریبی لوگ جانتے تھے۔

جی نہیں میرا دماغ اتنا خراب نہیں ہوا کہ میں جینٹس ڈریسنگ چھوڑ کے لیڈیز ڈریس پہننا شروع کر دوں۔۔۔۔۔ رائم خان نا روٹھے پن سے بولتا ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کرنے لگا۔ اس کے گال غصے اور شرم سے سرخ ہو رہے تھے اور اس کا

سرخ چہرہ انزش بزدار کو مزہ دے رہا تھا۔ اس لئے وہ اپنے
خلاف مزاج جا کر رائم خان کو چھیڑ رہی تھی۔

آپ شادی میں اور دوسروں کا مذاق اڑانے میں مصروف رہیں،
اور ادھر میں آپ کے پروجیکٹ پر ہاتھ صاف کر لوں گا۔ شاہ
کمپنی سے جو معاہدہ آپ نے لیا ہے، وہ آپ کی عدم توجہی کی وجہ
سے بہت جلد میرے ہاتھ میں ہو گا۔ پھر نہ مس انزش بزدار کی
ہنسی نکلے گی اور نہ ہی آپ مجھے زنانہ ڈریسز پہنانے کے خواب
دیکھیں گی۔۔۔ اس کے مزید کچھ بولنے سے پہلے ہی رائم خان
اب کی مرتبہ اپنی ازلی فارم میں آتا انزش کو تمللانے پر مجبور کر گیا
تھا۔

آپ کو واقعی لگتا ہے مسٹر خان کہ آپ میرا سائن کیا گیا
پروجیکٹ ہتھیا سکتے ہیں؟ پہلی بات آپ ایسا کر نہیں سکتے

اور اگر آپ نے ایسا غلطی سے بھی کر دیا تو میں سچ میں آپ کو
گھاگھرا چولی پہنا کے پورے اسلام آباد کا چکر لگاؤ گی اور اعلان
کروں گی کہ رائم خان بارکزی نے انزس بزدار کو چیلنج کرنے کی
حماقت کی تھی اور اب نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ خود اپنی ہی جنس
کے لیے چیلنج بن چکے ہیں۔۔۔ انزس بزدار بے نیازی سے
اپنے بالوں کی لٹ جھٹک کر بولتی رائم خان کی چلتی زبان کو تالو
سے چپکا گئی تھی۔

مجھے صرف لگتا نہیں ہے بلکہ میں بہت جلد ایسا کر کے بھی دیکھا
دوں گا اور جہاں تک رہی میری جنس کو چیلنج کرنے والی بات تو
یہ تو اندھے کو بھی دیکھ کر پتہ چل جائے گا کہ میں بھرپور جوان مرد
ہوں۔۔۔ رائم خان جبرے بھینچے ”بھرپور جوان مرد“ والے

الفاظ پہ زور دے کے بولا۔ یہ لڑکی مغروری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی سوچ بھی زیادہ خطرناک تھی۔

ول!! مسٹر خان!! مجھ اس دن کا شدت سے انتظار رہے گا جس دن آپ مجھے زیر کر پائیں گے اور ہاں اپنی شخصیت اور الفاظ کو رعب دار بنائیں تاکہ آپ کو جوان مرد سمجھنے میں اندھے کو دیکھنے کی ضرورت نہ پڑے بلکہ وہ آپ کی شخصیت اور لفظوں کا پر تاثر رعب محسوس کر کے آپ کو جاندار مردانہ شخصیت کا مالک تصور کر سکیں۔۔۔ مرد ہونے اور مرد بننے میں بہت فرق ہوتا ہے۔۔۔ مرد تو سبھی ہوتے ہیں لیکن مردانگی کسی کسی میں ہوتی ہیں اور مردانگی صرف خاندانی اور ایک سلجھے ہوئے مرد میں ہوتی ہے جو اسکی پاکیزہ سوچ، انداز بیان، عاجزانہ لہجے، نیک فاعل

اور حیا سے ترنگا ہوں سے پتہ چلتی ہے۔۔۔۔۔ انزش بزدار
استہزایا انداز میں سر جھٹکتے ہوئے پرسوچ انداز میں بولی۔
تو میں کیا مرد نہیں ہوں؟ میں نے کیا ہاتھوں میں چوڑیاں پہن
رکھی ہیں؟ آپ میری مردانگی پہ سوال اٹھا رہی ہیں مس
انزش۔۔۔۔۔ رائم خان نے دبے دبے غصے سے کہتے ہوئے
استعجابیت سے اس کے الفاظ کی وضاحت جاننا چاہی۔۔۔ وہ جانتا
تھا کہ انزش کسی اور لحاظ سے یہ بات کر رہی ہے لیکن رائم
خان نے بات کو طول دینے کیلئے مزید ایک سوال داغایا شاید وہ
اس کی شخصیت کے برعکس اس کی باتوں اور حرکتوں کو سوچ
کے بولی تھی؟

اب انزش بزدار کو کون بتائے کہ رائم خان کا یہ بچپنہ، لہجے میں
شوخی لانا اور خلافِ شخصیت حرکتیں کرنا یہ سب انزش بزدار

کیلئے تھا ورنہ رائم خان تو وہ تھا جو ہفتوں مسکراتا نہیں تھا۔ وہ بلا ضرورت ایک لفظ منہ سے نہیں نکالتا تھا۔ اس کی چہرہ پہ مسکان آنے کو ہفتہ ہفتہ ترستی تھی لیکن وہ انزس کیلئے سب کچھ خلاف طبعیت کرتا تھا۔

ہم کچھ لوگوں کیلئے بدلتے ہیں اور جن کیلئے بدلتے ہیں وہ بہت خاص ہوتے ہیں۔ ہماری شخصیت کا رعب و دبدبہ صرف اس ایک خاص انسان کیلئے کہیں عرق ہو جاتا ہے اور ہم اس خاص انسان کیلئے اپنی شخصیت کو بدلنے سے زرا بھی نہیں ہچکچاتے۔ آہہ! مس گلابو افینڈ ہو گئیں؟۔۔۔ انزس بزدار پھر سے اپنی آنکھوں میں شرارت لئے مصنوعی سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔ رائم خان کی کرسٹل گرے آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں۔۔۔ چہرے پہ پھر سے غصے اور شرمندگی کے تاثرات واضح ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر مزید دونوں کی طنز و تکرار جاری رہی تھی۔ آخر کار رائم خان نے ہار مانتے ہوئے مردوں کی سائیڈ نکلنے کی تھی ورنہ انزس بزدار آج واقعی میں ہی اپنی باتوں سے اسے چوڑیاں اور گھاگھرا چولی پہنانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس کے یوں جان چھڑانے والے انداز پہ انزس بزدار نے اس کی پشت کو گھورتے ہوئے ایک جاندار قہقہہ لگاتی اسٹیج کی طرف بڑھی تھی۔۔۔ وہ آج کافی دنوں بعد اپنی چل سائیڈ کی جھلک دکھلا گئی تھی۔ رائم خان کو اس کا یہ نیا انداز بہت اچھا لگا تھا۔

ہاں بھئی!! اب تیرے کیا ارادے ہیں شادی کے؟۔۔۔ کاظم شاہ نے سنجیدگی سے دمیر خان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے استفسار کیا۔

ارادے ان کے ہوتے ہیں جن کے پاس کچھ میسر ہو! لیکن
افسوس اس کے نصیب میں "قبول ہے" کہنے والی کوئی دوشیزہ
نہیں ہے۔۔۔ دمیر خان نے ابھی کچھ بولنے کیلئے لب واپی
کئے تھے۔ جب سامنے سے آتے رائم خان نے طنزاً مسکراتے
ہوئے جواب دے کر اس کے الفاظ کا وہی منہ میں گلہ گھونٹ
دیا۔ دمیر خان اسے قہر برساتی نظروں سے گھور کے رہ گیا۔
ہمم! تم ٹھیک کہہ رہے ہو خان! اس کو "ش" سے شہرت و
کامیابی سمیٹنے سے فرصت ملے تو یہ "ش" سے شادی کرنے کے
بارے میں سوچے نہ؟ ورنہ مجھے تو لگ رہا ہے کہ اس معاملے میں
اس کی قسمت میں "ش" سے شروع ہونے والی "شکست" ہی
لکھی ہے۔۔۔ دمیر خان کا سپاٹ اور جذبات سے عاری چہرہ

دیکھ کر کاظم شاہ مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے بولتا رائم خان
کی بات پہ متفق نظر آیا۔

تم دونوں کو کیا لگتا ہے کہ میں شادی نہیں کروں گا؟؟ میں شادی
کروں گا اور تم دونوں کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہونے دوں
گا۔۔ پھر تم لوگ میری شادی کے لڈو نہیں بلکہ ڈائریکٹ میری
پروڈکٹ کی آمد کا لڈو کھاؤ گے۔۔ دمیر خان اپنی شہد رنگ
آنکھوں میں بلا کی سنجیدگی سجائے، فخریہ سینے پھیلا کے بولا تھا۔۔
چلو دیکھتے ہیں!! تمہارا فارمولہ کتنا کام کرتا ہے۔۔ پروڈکٹ لانچ
بھی ہوگی یا بیسک فارم کے کسی کونے میں ہی پڑی ایکسپائر ہو
جائے گا؟۔۔۔ کاظم شاہ چہرے پہ یکساں تاثرات لئے زو معنی
انداز میں بولا تھا۔ اگر دمیر خان نے پروڈکٹ کی بات کی تھی تو
اس کی تیاری پہ بات کرنا اب ضروری تھا۔

شاہ! مجھے تو لگتا ہے دمیر اپنی پروڈکٹ کی لانچنگ آرٹیفشل طریقے سے کرنے والا ہے کیونکہ اور یجنل فارمولے اور تجربے کیلئے لیبارٹری کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ دمیر کو میسر نہیں ہے تو پھر کیسی پروڈکٹ؟ کیسے فارمولے؟ سارے تجربے بیکار ہیں۔۔۔ رائم خان اپنی کرسٹل گرے آنکھوں میں شرارت لئے بے شرمی سے بولتا ان کے چہرے حیرت سے دوچار کر گیا۔ کاظم شاہ کے لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ دوڑی تھی جبکہ دمیر خان کے چہرے کے نقوش غصے سے تنے تھے۔

تو میری لیبارٹری کی فکر چھوڑ!! مجھے لیبارٹری بھی مل جائے گی اور پروڈکٹ بھی کریئیٹ ہو جائے گی۔ تو اپنی فکر کر، تیرے پاس تو لیبارٹری کیلئے لینڈ بھی نہیں ہے۔ تجربے تیرے کیا

خاک ہوں گے؟۔۔۔ دمیر خان جبرے بھینچے مزے سے بولتا
رائم خان کو تلملانے پہ مجبور کر گیا۔۔

تیرے پاس لینڈ ہے؟۔۔۔ کاظم شاہ نے اسکی پروتوق بات کی
وضاحت چاہی۔ اس کی نظریں دور داعیر کے ساتھ کھلکھلاتے
اپنے از میر پہ ٹکی ہوئی تھیں۔ اگر یہ دونوں بے شرم جواب دے
سکتے تھے تو وہ بھی کاظم شاہ ان کا باپ تھا۔ وہ بھی بے باک
سوال کرنے سے کہاں کترانے والا تھا؟

ہاں ہے! تبھی تو ملکیت کا دعویٰ کر رہا ہوں۔۔۔ دمیر خان پر
اعتمادی سے بولتا آنکھوں سے کاظم شاہ کو مزید کوئی بھی ایسا
سوال کرنے سے خبردار کر گیا۔

یہ نہ ہو تیری ملکیت کے دعوے دھرے رہ جائیں اور قبضہ کوئی
اور جمالے۔۔ اس کے کانفیڈنٹ انداز پہ رائم خان اسے
سلگانے کی غرض سے طنزاً مسکرایا۔۔

البتہ کاظم اور رائم کو دمیر خان کی پر اعتمادی ٹھٹھکی تھی۔۔ وہ
اتنے وثوق سے کیسے یہ بات کر سکتا تھا۔؟ کیا اس نے کوئی لڑکی
تلاش کر لی تھی؟ یا کوئی اس کے دل میں گھر کئے بیٹھی تھی؟ یہ
سوچ ان دونوں کو بیک وقت آئی تھی۔ مگر انہوں نے اس
متعلق پوچھا نہیں تھا۔

جو دمیر خان آفریدی کا ہے وہ صرف اس کا ہی رہتا ہے اور
انشاء اللہ تاقیامت وہ میرا روشن بخت رہے گا۔۔ شادی تو ہر
کسی کی ہو جاتی ہے چاہے کوئی، ادھیڑ عمر ہو جو ان ہو، بد اخلاق
ہو، بد تمیز، بد گو ہو، خوش اخلاق ہو، اچھا ہو یا نیک ہو۔۔ شادی

ہر کسی کی ہونی ہوتی ہے لیکن ہم اللہ تعالیٰ سے صرف آدھے سکون کی دعا نہ مانگیں بلکہ یہ دعا مانگیں کہ وہ جس انسان کو ہمارے ساتھ رشتہ ازدواجیت میں منسلک کر رہا ہے۔ وہ اسے ہمارے لئے جنت تک ساتھ دینے والا بنائے۔ سکون کا ذریعہ بنائے، ہمیشہ ہر قسم کے حالات میں ساتھ نبھانے والا بنائے، صبر و شکر کرنے والا اور نیک عمل کرنے والا بنائے۔ اپنے شریک حیات پہ اعتماد کرنے والا بنائے تاکہ ہمارا یہ جہان بھی امر ہو اور ہم اگلے جہان بھی سرخرو ہو سکیں۔ اللہ ہم سب کو نیک اور بہترین ہم سفر عطا فرمائے آمین۔۔۔ دمیر خان چہرے پہ دھیمی مسکراہٹ کی لچک لئے سمجھداری سے بولا۔

آمین!۔۔۔ کاظم شاہ اور رائم خان نے بھی زیر لب دہرایا تھا۔

یہ اچھا ہے!! پہلے بے شرم باتیں کر لو اور بعد میں اسلامک ٹچ
دے کر شیطان کو بھی کنفیوز کر دو۔ میری باری ہر دفعہ اس
سالے کو خطبے دینے یا آجاتے ہیں۔۔۔ رائم خان نے دہائی تھی
۔ اس نے ابھی "لینڈ" والی بات پہ دمیر خان کو کرار جواب دینا
تھا لیکن وہ پہلے ہی اسلامی ٹچ دے کر بات ختم کر گیا تھا۔
ہاہاہا! روتا کیوں ہے؟ تو پہلے کون سا ولیوں کی فہرست میں تھا جو
اب نصیحتوں سے سدھر جائے گا! چھوڑ یہ نیکو کاروں کی ایکٹنگ،
اپنی اصل حالت میں آ، اور چل بے شرم باتیں کر کے مجلس
گرم کر!۔۔۔ کاظم شاہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کو بات
پوری کرنے کا اشارہ کیا۔ جبکہ رائم خان کی بیچارگی سی شکل دیکھ
کے دمیر خان کے عنابی لبوں پہ مسکراہٹ دوڑی تھی۔

کافی دیر تک وہ تینوں ہلکی پھلکی باتوں میں مصروف رہے
تھے۔۔۔ وہ تینوں جب بھی اکٹھے ہوتے تھے، ان کے درمیان
ہر قسم کی گفتگو ہوتی تھی۔ پھر وہ چاہے اچھی ہو یا بے باک
ہو۔۔ ہر موضوع کو زیر بحث لانا اور پھر اس پہ قہقہے لگانا ان کی
محفل کی جان ہوتی تھی۔۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے، ولیمے کی تقریب اختتام پذیر ہو چکی
تھی۔ مہر خان اپنے والدین اور لالہ کے ساتھ گھر چلی گئی تھی۔
کاظم شاہ بیوی بچوں کو لیے گھر روانہ ہو گیا تھا۔ آج پھر منت
نے زربخت کے ساتھ بہت انجوائے کیا تھا۔ دمیر خان نے خود
سب مہمانوں کو عزت سے رخصت کیا تھا جبکہ نزہت خان اور
زربخت کو بھی دمیر خان گھر واپس چھوڑ آیا تھا۔ اس کا ارادہ

اپنی پھوپھو کو گھر بھیجنے کا بالکل نہیں تھا مگر نزہت خان نے مزید
رکنے سے انکار کرتے ہوئے اپنے گھر جانے کو ترجیح دی تھی۔
نزہت خان کی ضد کو دیکھتے ہوئے دمیر مزید ان پہ دباؤ ڈالنے کی
 بجائے خاموشی سے ان کو گھر واپس چھوڑ آیا تھا لیکن وہ ان کو
ڈاکٹر سے چیک کروا کے دوا لینے کے بعد انہیں گھر کی طرف لے
کے بڑھا تھا۔ فی الحال کوئی ٹیسٹ نہیں کروائے تھے۔ وہ ان
کے سارے ٹیسٹ بعد میں تسلی سے کروانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

(ایک مہفتے بعد)

مورے! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟۔۔۔ زربخت جو کچن میں کھڑی
چائے بنا رہی تھی، باہر نزہت خان کو ابکائیاں لیتے دیکھ کر بھاگ
کے ان کی طرف بڑھی تھی۔ چونکہ گھر بہت چھوٹا سا تھا اور

کچن کی کھڑکی سے صحن اور گیٹ کا منظر صاف نظر آتا تھا اور وہ
یوں ماں کو دیکھ کے تڑپ اٹھی تھی۔

مورے کیا ہوا ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟۔۔۔ وہ ماں
کی پیٹھ پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے پریشانی سے پوچھنے لگی۔

میں ٹھیک ہوں! بس ناشتہ کچھ زیادہ کر لیا تھا اس لئے طبیعت
خراب ہو گئی۔۔۔ نزہت خان بیسن پہ جھک کر کلی کرتے

ہوئے کمزور آواز میں زر بخت کو جواب دے دہی تھیں۔

آپ کو کتنی دفعہ کہا کہ خود ناشتہ مت بنایا کریں۔۔۔ خود ہی بناتی
ہے اور پھر خود ہی بغیر سوچے سمجھے کچھ کے اپنی طبیعت بھی

خراب کر لیتی ہیں۔ میں ہوں نہ؟ آپ مجھے بول دیتی ہیں آپ کو

پرہیزی ناشتہ بنا دیتی۔۔۔ زر بخت خفت سے بولتی ان کو سہارا

دے کر چارپائی تک لائی تھی۔

مورے!! آپ کو آج بخار تو نہیں ہے پھر آپ کی طبیعت کس
وجہ سے ناساز ہو رہی ہے؟۔۔۔ وہ ان کے ماتھے پہ ہاتھ رکھتی
تشویشی انداز میں بولی تھی۔ نزہت خان کا پورا چہرہ زرد پڑ رہا تھا
اور ان کے پیٹ سے اوپر والے حصے میں ہلکا سا درد بھی تھا۔
زر بخت!! جاؤ اندر سے میری چادر اور پیسے لے آؤ۔ میں زرا
اپنی دوا لے کر آؤں۔ میری طبیعت بہت ناساز ہو رہی ہے لگتا
ہے دوا لئے بغیر افاقہ نہیں ہو گا۔۔۔ نزہت خان نقاہت زدہ
آواز میں زر بخت کو حکم دے رہی تھیں۔
لیکن اس حالت میں آپ اکیلی کیسے جائیں گی مورے؟ میں بھی
آپ کے ساتھ چلوں گی۔۔۔ وہ نرمی سے ان کا ہاتھ پکڑ کر
عقیدت سے چومنے لگی۔ وہ اپنی ماں کی آئے روز طبیعت خرابی
کی وجہ سے ذہنی طور پر پریشان اور الجھ کر رہ گئی تھی۔

نہیں!! تمہاری ضرورت نہیں ہے شہزاد آنے والا ہے میں نے
اس کے ساتھ جانا ہے۔ اسے میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے
کال کر بلایا تھا اور بتایا ہے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے مجھے
ہسپتال جانا ہے۔ وہ بس پندرہ منٹوں میں آتا ہی ہوگا تم بس
میری چادر اور پیسے لاؤ۔۔۔ نزہت خان بمشکل بولتی اس کو
ساری تفصیل سے آگاہ کرنے لگیں۔

مورے!! پیسے تو بہت تھوڑے سے ہیں! مشکل سے پانچ ہزار ہے۔ پانچ ہزار میں آپ کی دوا آجائے گی؟۔۔۔ زربخت نے تکلیف سے آنکھیں میچ کے کھولی تھیں۔ ہر مہینے پیسے سوچ سمجھ کر لگانے پڑتے تھے۔ ضروری چیزوں کو بھی نظر انداز کر کے صرف بے حد ضروری چیزیں خریدی جاتی تھی جن میں مہینے کا راشن اور گھر کا باقی خرچہ شامل تھا۔ زربخت کی کوئی چیز یا خوشی

ان پیسوں سے نہیں خریدی جاسکتی تھی کیونکہ باقی کے بچتے پیسے
نزدہت خان کی دواؤں پہ خرچ کئے جاتے تھے۔

تم فکر نہیں کرو! وہ میں شہزاد سے لے لوں گی اور جب تمہارے
بابا کی پنشن آئے گئی تب میں اسے لوٹا دوں گی۔ اب جاؤ! جتنے
بھی پیسے ہیں، لے آؤ۔۔۔ انہوں نے نرمی سے اس کو حکم دیا۔
زربخت سر کو خم دیتی اندر سے چادر اور پیسے لئے ان کے پاس
واپس صحن میں آئی تھی۔

چلو آجاؤ! دروازہ بند کر لو۔ میں بس دوا لیکر جلدی واپس آجاؤ
گی۔۔۔ باہر گاڑی کے ہارن کی آواز سنتے ہی نزدہت خان خود کو
چادر میں چھپاتی زربخت کو سمجھاتے ہوئے باہر کی جانب بڑھ گئی
تھیں۔

مورے! جلدی واپس آئیے گا۔۔۔ زربخت نے بھیگی ہوئی
آوازیں صدا لگائی۔۔ نیلی گہری آنکھوں میں پانی لبالب بھرا
تھا۔

ہاں جلدی واپس آؤں گی اپنی بچی کے پاس! دروازے کو کنڈی
لگا لو۔۔۔ وہ زبردستی چہرے پہ مسکراہٹ لا کے اپنا درد
چھپاتی اس کو تسلی دے کر گھر سے نکل گئی تھی جبکہ ان کے نکلنے
کے بعد اس نے فوراً دروازے کو کنڈی لگائی تھی۔ وہ دروازہ بند
کرنے کے بعد شکستہ لہجے میں صحن میں پڑی چار پائی پہ ڈھ سی
گئی جیسے کوئی انسان زخموں سے چور ہوتا ہے۔ اور اس میں
کھڑے رہنے کی طاقت نہیں ہوتی، بلکل ایسے ہی زربخت کا وجود
اپنی قسمت کے زخموں سے چور تھا۔ آخر کو زخمی وجود کتنی ہی
دیر کھڑا رہ سکتا ہے؟

وہ اپنے چہرے پہ کہنی رکھے زار و قطار رونے لگی تھی۔
موٹے موٹے آنسو گہری نیلی آنکھوں سے نکل کر کنپٹی
سے سرکتے چار پائی پہ بچھی چادر میں جذب ہو رہے تھے۔ رونا
اسے کیوں آرہا تھا وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ بس اپنی معاشی
حالت دیکھ کر اس کا رونے کو دل کر رہا تھا اور وہ رو رہی
تھی۔ یہ رونا بہت سی وجوہات پہ مبنی تھا۔۔۔ زربخت اپنی
غریبی پہ رو رہی تھی، اپنی ماں کی دن بہ دن بگڑتی حالت پہ رو
رہی تھی۔۔۔ اپنی بے بسی پہ رو رہی تھی، یتیمی پہ رو رہی تھی،
بے سہارا ہونے کے ڈر سے رو رہی تھی، اکیلا اور تنہا رہ
جانے کی اذیت پہ رو رہی تھی۔ ساری زندگی اپنی ماں کے گھٹ
گھٹ کر جینے پہ رو رہی تھی۔۔۔

غربت صرف سننے میں اور دیکھنے میں ہی تکلیف نہیں دیتی بلکہ جو اس دوچار ہیں! ان سے پوچھ کے دیکھیں کہ ضروریات کو کیسے پورا کیا جاتا ہے؟ خواہشات کو کس طرح مارا جاتا ہے۔ ہر لمحہ غریبی میں گزارنا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے! کوئی ان سے پوچھے، جن پہ غریبی پنچے گاڑھی بیٹھی ہے۔۔۔ اگر آپ امیر ہو تو سب مسئلے حل اور ہر مسئلے کا حل پیسے میں مخفی ہوتا ہے۔

امیر لوگوں کی پریشانیاں پیسہ خود میں جذب کر لیتا ہے لیکن غریب لوگوں کی پریشانیاں پیسے کی قلت کہ وجہ سے غموں میں بدل جاتی ہیں، پھر غم دائمی خساروں میں بدل جاتے ہیں، خسارے درد کی شکل اختیار کر لیتے اور درد جان لیوا ہوتے ہیں۔۔۔ غریب انسان کی ساری زندگی اس دو بدو میں گزر جاتی کہ کاش میرے پاس اس وقت پیسے ہوتے تو میں کوئی غم زندگی سے

نکال باہر پھینک دیتا، تھوڑی خوشیاں خرید لیتا، چند مسکراہٹوں کا سودا طے کر لیتا، پریشانیوں کو ختم کر دیتا، زندگی سے خوشیاں نقد خرید لیتا لیکن ایسا تب ہی ہوتا جب انسان کے پاس پیسے ہوتے۔۔

کاغذ کے نوٹ کبھی کبھی بہت اہمیت رکھتے ہیں۔۔ ایسا نہیں ہے کہ پیسے کے بغیر خوشیاں نہیں مل سکتی، سکون نہیں مل سکتا۔ اطمینان اور راحت بخش زندگی میسر نہیں آ سکتی، سب کچھ مل سکتا ہے! تب مل سکتا ہے جب آپ کے ساتھ مضبوط اور مخلص سہارے کھڑے ہو۔ ایک مخلص اور بے لوث محبت کرنے والے انسان کا سہارا ہی زندگی کی تمام محرومیوں کو خود میں جذب کر کے خوشیوں کو تقسیم کرتا ہے لیکن اگر آپ کے

پاس سہارا ہی نہ ہو تو پھر آپ کو زندہ رہنے اور پرسکون زندگی
جینے کیلئے پیسے پہ منحصر ہونا پڑتا ہے۔۔

زر کی تقسیم بھی بڑی غیر منصفانہ ہے۔ کسی کو وافر مقدار میں
ملتا ہے۔ اور کسی کو ضرورت کے مطابق بھی نہیں ملتا۔ جن کو
وافر مقدار میں ملتا ہے وہ اس پیسے کے بل بوتے پر زمینی خدا
بنے پھرتے ہیں۔ اور جو لوگ کاغذی نوٹوں سے محروم ہوتے
ہیں ان لوگوں کو اپنا وجود زمین پہ اضافی لگتا ہے۔ زربخت اپنی
آنکھوں پہ بازو رکھے مسلسل سوچتے ہوئے روئے جا رہی
تھی۔ جب اچانک دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔ دستک کی
آواز پہ وہ چونکتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ وہ تیزی سے اپنا دوپٹہ درست
کرتی آنسو بے دردی سے رگڑ کے صاف کرتے ہوئے
دروازے کی جانب بڑھی۔

کون ہے؟۔۔۔ زربخت نے متوازن آواز میں باہر کھڑے وجود
سے استفسار کیا تھا۔

(زہ زربخت یم!! دروازہ خلاص کرئی) میں ہوں زربخت!!
دروازہ کھولو۔۔۔ دمیر خان نے اپنی گہری پیاری آواز میں
جواب دیا۔ البتہ وہ اس کی آواز میں لرزش پہ چونکا تھا۔ چہرے
کی نقوش استعجابیت میں تنے تھے۔

لالہ!!۔۔۔ وہ تیزی سے دروازہ کھولتی سامنے کھڑے دمیر
خان کے سینے سے بے ساختہ لپٹی تھی۔ آنکھوں سے آنسو پھر
رواں ہوئے تھے۔ وہ دمیر خان کے سینے میں منہ چھپاتی ہچکیوں
سے رونے لگی تھی۔ ہر انسان کو رونے کیلئے کسی کندھے کی
ضرورت ہوتی ہے جس پہ وہ اپنا سر رکھ کے غموں کا بوجھ آنسو
کے ذریعے ہلکا کر سکے۔ زربخت بھی سامنے کسی اپنے، کسی

ہمدرد اور کسی پر امید سائبان کے جیسے دمیر خان آفریدی کو دیکھ
کر بلا جھجھک اس کے سینے سے لگ کر اپنے غموں کا بوجھ ہلکا
کرنے لگی تھی۔ وہ شش و پنج میں مبتلا غیر ارادی طور پر اپنے
ایک ہاتھ کا حصار اس کے گرد باندھ گیا۔

زربخت کیا ہوا؟۔۔۔ دمیر خان اس کے یوں رونے پہ تڑپ
کے بولا تھا۔ اس کے چہرے پہ فکر مندی دوڑی تھی، دل کسی
احساس کے تحت بند ہونے لگا تھا۔

مورے!! مورے کی۔۔۔ طبعیت۔۔۔ ٹھیک۔۔۔ نہیں۔۔۔
ہے۔۔۔ اس نے ہچکیوں کے درمیان اپنی لرزتی آوازیں
جواب یا۔ دمیر خان نے اس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے
نرمی سے اپنے سینے سے الگ کیا اور گھر کے اندر داخل ہوتا
دروازہ بند کرنے لگا۔ زربخت اس کے سینے پہ سر رکھ کر آنسو

بہاتی دمیر خان کے دل کو زخمی کر گئی تھی۔ وہ اتنی نزدیکی سے
اسکے آنسوؤں کا گرم لاوا برداشت نہیں کر سکتا تھا، اس لئے
تیزی سے اپنے سینے سے الگ کر گیا ورنہ کوئی بعید نہیں تھی
زربخت کے دھکتے گرم آنسو اس کا سینہ اور دل جھلسا دیتے۔۔
رونا بند کرو اور مجھے بتاؤ پھوپھو کو کیا ہوا ہے؟ کہاں ہے پھوپھو
؟۔۔۔ وہ پریشانی سے بولتا اس کے آنسو اپنے انگوٹھے کے
پوروں سے صاف کرتا آس پاس نگاہیں دوڑائے نہت خان کو
تلاشنے لگا۔

مورے ہاسپٹل گئی ہیں دوا لینے!۔۔۔ وہ اپنے آنسوؤں پہ قابو
پاتی بھگی ہوئی آوازیں بولی۔

کس کے ساتھ؟ اور کونسے ہاسپٹل؟۔۔۔ اس نے نرمی سے
زربخت کو چارپائی پہ بٹھایا اور فکر مندی سے اگلا سوال داغا۔

شہزاد لالہ کے ساتھ گئی ہیں۔۔۔ لالہ!! مورے مجھے بتاتی نہیں
ہیں لیکن وہ بہت تکلیف میں ہیں۔ ان کا چہرہ درد سے زرد پڑ جاتا
ہے۔ جب ان کی طبیعت خراب ہوتی ہے تو سانس میں
اٹک جاتی اور ہاتھ پیر کمزوری سے کانپنے لگ جاتے ہیں۔۔۔۔۔
وہ اپنا چہرہ نیچے جھکائے رنجیدگی سے بولی تھی۔
زربخت!! ادھر میری طرف دیکھو! رونا بند کرو۔ پھوپھو کو کچھ
نہیں ہوا، بس زرا سا بخار ہے! اس کی وجہ سے انکی صحت
خراب ہو رہی ہے۔ بہت جلد وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گئی۔ تم
پریشان مت ہو! میں جا کے دیکھتا ہوں ان کو۔۔۔ وہ پنچوں
کے بل ہو کے زربخت کے سامنے بیٹھتا اس کے نازک ہاتھوں
کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں لئے تسلی دینے لگا۔

تو بخار انہی کو ہر وقت کیوں رہتا ہے؟ ہر وقت طبعیت خرابی کی وجہ بخار نہیں ہو سکتا۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وجہ کوئی اور ہے؟ اور مورے مجھے وہ وجہ بتاتی نہیں ہے۔ میں نے کئی بار پوچھا ہے۔۔۔ اس نے پھر سے رونا شروع کرتے نگاہیں اٹھا کے دمیر خان کی طرف دیکھا تھا۔ زربخت کی نیلی آنکھوں میں درد کی سرخی دوڑ رہی تھی۔

زربخت!! پاگل ہو گئی ہو۔ ایسے کون روتا ہے؟ بلا وجہ رورو کے اپنی آنکھیں خراب کر رہی ہو۔۔ اتنی پیاری آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔ میں نے کہا نہ پھوپھو بالکل ٹھیک ہیں۔ میں ابھی جا کے ان کو اپنے ساتھ لے کے آتا ہوں۔ ایسے چھوٹی چھوٹی باتوں پہ روتے نہیں ہے زربخت!!۔۔۔ وہ آنکھیں میچ کے کھولتا ٹھہرے لہجے میں اسے سمجھانے لگا۔ اسے

بار بار اس کی آنکھوں سے نکلتے موتیوں جیسے آنسو تکلیف میں مبتلا
کر رہے تھے۔

کاش میرے بابا زندہ ہوتے تو آج مجھے اور مورے کو یوں بے
بس نہ ہونا پڑتا۔ مورے کو کسی غیر کا سہارا نہ لینا پڑتا۔ ہم کسی
کی مدد کے منتظر نہ رہتے۔ بابا سب سنبھال لیتے، وہ مورے کو
کبھی کوئی تکلیف نہ ہونے دیتے۔ مجھے اور مورے کو زمانے کے
تمام غموں اور دکھوں سے محفوظ رکھتے۔ وہ ہمیں کبھی بھی یوں
زندگی کے ساتھ اکیلے لڑنے نہ دیتے، بلکہ ہر جگہ پہ ہماری ڈھال
بن کے زندگی کی مشکلات کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ کاش
میرے بابا آج میرے ساتھ ہوتے تو وہ مجھے کبھی نہ رونے
دیتے، مجھے جب بھی زندگی ڈرانے کی کوشش کرتی تو میں ان کے
سینے میں چھپ جاتی، میں بھی رات کو پرسکون نیند لے پاتی، دن

خوشی سے گزار پاتی، اس احساس کے تحت کہ مورے کے پاس کوئی ان کا خیال کرنے والا ہے۔ کوئی ہے جو ان کی زرا سی آہ پہ اٹھ بیٹھ گا۔ کوئی تو ہے جو تکلیف میں میری مورے کو پانی کے دو گھونٹ پلائے گا۔ کوئی تو ہے جو ان کی تکلیف وہ حالت دیکھ کر تڑپ اٹھے گا۔ کوئی تو ہے جو مورے کیلئے اپنی پوری رات جاگ کے گزار دے گا۔ پچھلے ایک ہفتے سے میں ٹھیک سے سوئی نہیں ہوں لالہ!! مجھ سونے سے اب ڈر لگتا ہے۔ جیسے ہی تھوڑی سی آنکھ لگتی ہے، میں فوراً اٹھ کے بیٹھ جاتی ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو میں سو جاؤ اور میری مورے تکلیف میں مجھے پکارتی رہیں اور میں ان کی پکار نہ سنو۔ میری آنکھوں سے نیند رخصت ہو رہی ہے۔ ایسا ڈر لگتا ہے کہ اگر میری آنکھیں بند رہی تو یہ پھر کھلنے پر مورے کو نہیں دیکھ پائیں گئی۔ پریشانیاں

اور غم جسم میں بستے جا رہے ہیں۔ اور ایک انجانہ خوف میرے
وجود کے ہر اعضاء کو اپاہج کر رہا ہے۔ آپ کو پتہ ہے لالہ!! باپ
کی موجودگی زندگی میں کتنی ضروری ہوتی؟ ایک بیٹی کیلئے باپ کا
سایہ صحرا میں گھنے پیڑ کی چھاؤں جیسا ہوتا ہے جو اسے صحرا کے
قحط اور تپتی دھوپ سے محفوظ رکھتا ہے۔ باپ کا سائبان
کائنات کے ہر سائبان سے مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے۔ اس کا
ساتھ کھلتے رنگوں جیسا ہوتا ہے۔ جب تک باپ کے سائے میں
رہو گے، زمانے کی دھوپ سے بچے رہو گے۔ محفوظ سائبان
میں رہو گے تو جان و عزت کی آفیت ہوگی، زندگی کے رنگوں
سے رنگیں رہو گے، خوشیاں ہمارے آنگن میں کھلکھلاتی رہیں
گی۔ ہر وقت احساس تحفظ ہمیں گھیرے رکھے گا۔ باپ کی
موجودگی ہمیں تمام بلاؤں سے محفوظ رکھتی ہے لیکن ان کی غیر

موجودگی زندگی کے رنگوں کو پھیکا کر دیتی ہے۔ خواہشات مر جاتی ہیں۔ مزاج کا شوخا پن اجر جاتا ہے۔ باپ کے بغیر دل اور گھر ویران ہو جاتے ہیں۔ بہاریں رخصت ہو جاتی اور خزائیں مستقل حیات میں ڈیرے جما لیتی ہیں۔۔۔ آپ بھرے جہان میں دکھوں اور تکلیفوں کو جھیلنے کیلئے اکیلے چھوڑ دئیے جاتے ہو، اس بات سے بے نیاز ہو کر کہ آپ میں ان زمانے کے دکھوں اور غموں کو جھیلنے کی استطاعت ہے بھی کہ نہیں؟ لیکن آپ کو زندگی بغیر کسی سبق اور تجربے کے میدان میں لڑنے کیلئے کھڑا کر دیتی ہے، پھر چاہے آپ مقابلہ کرتے کرتے تھک کیوں نہ جائیں؟ جسم کا ہر اعضاء زخمی کیوں نہ ہو جائے؟ ہڈیاں ٹوٹ ہی کیوں نہ جائیں؟ جسم کو تھڑوں کی شکل ہی کیوں نہ اختیار کر لے؟ ہمیں لڑنا پڑتا ہے۔ تب تک لڑنا پڑتا ہے، جب تک ہمارے

زخمی وجود میں آخری سانس باقی رہتی ہے۔ زندگی بہت بے
رحم ہے، ترس نہیں کھاتی!! زخموں پہ مرہم لگانے کی مہلت
بھی نہیں دیتی۔ تازہ زخموں کے ساتھ پھر سے کسی آزمائش کے
ساتھ لڑنے کیلئے پھینک دیتی ہے۔ بس بنا رکے بنا تھکے لڑتے
رہنا ہے۔ اذیتوں کے بوجھ کے ساتھ مرتے دم تک لڑتے رہنا
ہے۔۔۔

زندگی بڑی بے مروت ہے! عمر اور جنس کا لحاظ بھی نہیں کرتی
جیسے ایک مضبوط مرد کو امتحان سے دوچار کرتی ہے ویسے ہی
ایک لاچار سی صنف نازک پر بھی آزمائشوں کے پہاڑ توڑ دیتی
ہے۔۔۔ زندگی کو عمر اور جنس کا تھوڑا تقدس کرنا چاہیے۔ اس کو
لحاظ رکھنا چاہئے کہ نا سمجھ اور کمزور سی زربخت میں اس کی دی
گئی آزمائشوں کو جھیلنے کی طاقت نہیں ہے۔ سترہ سالہ زربخت

ابھی اس کے کڑے امتحانوں کیلئے تیار نہیں ہے۔ میری
مورے بیمار ہیں۔ اس پہ تھوڑا سا ترس کر لے۔۔ ہم میں اب
زندگی کے کسی بھی امتحان کو جھیلنے کی طاقت نہیں ہے۔۔۔۔۔
زر بخت بنا آواز کے روتی ہوئی سر نیچے جھکائے بولتی جا رہی تھی
اور دمیر خان اسے حیرانگی سے چپ سا دھس سن رہا تھا۔
دمیر خان کے ہاتھ زر بخت کی جھولی میں پڑے، اس کے ٹپ
ٹپ گرتے آنسوؤں سے تر ہو رہے تھے۔ یہ آنسو دمیر خان کے
ہاتھوں پہ، نہیں بلکہ دل پہ گرے رہے تھے۔ وہ حیرانگی اور
تکلیف کے ملے جلے تاثرات سے اس کے لفظوں کی گہرائی پہ
تعجب کا شکار ہوا تھا۔ معصوم اور بھولی سی زر بخت اتنے
گہرے اور تکلیف دہ الفاظ کہاں سے لاسکتی تھی؟ یہ الفاظ اسکی

سوچ اور عمر سے بہت گہرے اور بڑے تھے۔ وہ اسے آج سننا
چاہتا تھا، اس لئے وہ بنا زربخت کو ٹوکے سن رہا تھا۔

بچپن سے مورے نے مجھے اکیلا پال پوس کے بڑا کیا ہے۔ جوانی
میں بیوہ ہو جانا اور پھر ایک ننھی سی بچی کی کفالت کرنا، اپنی
عزت و آبرو کی حفاظت کر کے مجھے پروان چڑھانا، ہر مشکل کو
مجھ تک آنے سے پہلے حل کر دینا۔۔۔ سب کیا ہے مورے نے
میرے لئے۔۔۔ لیکن اب وہ جسمانی اور ذہنی طور پر تھک چکی
ہیں۔ اب اگر ہمیں زندگی ایک بھی ٹھوکر مارے گی تو ہم ٹوٹ
کے ریزہ ریزہ ہو جائیں گئی۔ ہمارے وجود بکھر۔۔۔

زربخت!!۔۔۔ دمیر خان نے اس کے ہاتھوں کو زور سے
اپنے مضبوط ہاتھوں میں دباتے ہوئے سختی سے ٹوکا تھا کیونکہ
اب اس کے الفاظ دمیر کے دل کو چیر رہے تھے۔۔۔

کیا ہو گیا ہے زربخت تمہیں؟ کیوں اپنے الفاظ اور حالت سے
مجھے تکلیف دے رہی ہو؟ رو کیوں رہی ہو اتنا آخر؟ ہوا کیا ہے
؟ اچھا میری بات سنو! زربخت ادھر میری طرف دیکھو۔۔۔
اس نے نرمی سے اس کی ٹھوڑی سے پکڑ کر جھکا چہرہ اوپر کی
طرف اٹھایا۔

میں مانتا ہوں باپ کی کمی کو کوئی پورا نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی
دوسرا انسان باپ کی جگہ لے سکتا ہے لیکن میں ہوں تمہارے
اور پھوپھو کے ساتھ، زندگی کے ہر موڑ پہ میں تم دونوں کے
ساتھ کھڑا رہوں گا، میں تم دونوں کو محفوظ سائبان بھی دوں گا،
جھلستی دھوپ سے بھی بچاؤں گا، خوشیاں خرید کے بھی دوں
گا، ہر غم اور تکلیف میں تم دونوں کے ساتھ برابر کا شریک رہوں
گا، کبھی تم دونوں کو زندگی کی سختیاں جھیلنے کی کیلئے اکیلا نہیں

چھوڑوں گا۔ ہمیشہ تم دونوں کو اپنے محفوظ حصار میں رکھوں
گا۔ زمانے کی تمام سرد اور گرم ہواؤں سے محفوظ، جہاں تم
دونوں کھل کے سانس لے سکو، زندگی کے تمام رنگوں کو جی سکو
۔ اگر تمہارے بابا نہیں ہیں تو میں ہوں، میں تمہاری زندگی میں
خوشیاں اور تمہاری طبعیت کی شوخیاں واپس لاؤں گا۔ میرے
ہوتے ہوئے تمہاری زندگی کا ہر پہلو خوشی سے شروع ہو گا اور
خوشی پہ ختم ہو گا۔ غموں کا کوئی نام و نشان نہیں ہو گا۔ ایک
ایسا جہان میسر کروں گا جہاں دکھ اور تلخ حقیقتیں ناپید ہوں گی۔
وہاں صرف خوشیاں رقص کریں گی اور وہ جہان تمہارے
ہمقہوں سے گونج اٹھے گا، زندگی نے تمہاری جو شوخی چھینی
ہے! میں سب واپس لاؤں گا، تمہاری حیات سے سارے غم
اور پریشانیاں اپنے ہاتھوں سے چن کے نکالوں گا اور ایسے

نکالوں گا کہ وہ پھر کبھی تمہاری اور پھوپھو کی طرف واپس نہیں آ
پائیں گے۔۔ میں جانتا ہوں میں تمہارے بابا کی خالی جگہ پر نہیں
کر سکتا لیکن میں تمہاری زندگی کو مکمل کر سکتا ہوں! اسے رنگ
سے بھر کے تمہاری ذات کو رنگین کر سکتا ہوں، تم نے سوچ
بھی کیسے لیا زربخت!! کہ تم اور پھوپھو اس بھرے جہان میں
اکیلی ہو؟ میں، بابا، داعیر کیا ہم سب تمہارے کچھ نہیں لگتے؟ کیا
ہمارا تم پہ اور پھوپھو پہ اتنا حق بھی نہیں کہ تم ہمیں اپنا کہہ کے
پریشانی اور دکھ شئیر کر سکو؟ تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ دمیر
خان کے ہوتے ہوئے تم زندگی سے اکیلے لڑو گی؟ میں ہر موڑ
پہ تمہاری اور پھوپھو کی ڈھال بن کے کھڑا رہوں گا۔ بس تم
ایک احسان کرو مجھ پہ! اپنی ذات کی حفاظت کی ذمہ داری مجھے
دے دو! پھر دیکھنا تمہارا یہ محافظ کیسے تمہاری حفاظت کرتا

ہے۔ وہ کیسے تمہاری حیات کا سپاہی بن کر تمہیں ہر بلاؤں سے محفوظ رکھتا ہے۔ مجھے ذمہ داری دو اپنی ذات کی، پھر میں اپنے فرائض سرانجام دیتے ہوئے تمہارے لئے اس جہان کو جنت بنا دوں گا۔ تمہاری آنکھیں ہر وقت پر امید سے چمکیں گئی۔ تمہارے لبوں پہ ہر وقت مسرت رقصاں رہے گئی، تمہارا دل خوشی سے سرشار رہے گا، تمہارا وجود سکون سے تر رہے گا، تمہارے قدموں کے نیچے میری ہتھیلیاں ہونگی، تم جہاں قدم رکھو گی تمہارے پاؤں کے ادب میں وہ جگہ پھولوں سے بھر دوں گا۔ تمہاری ذات کو قابل ستائش بنا دوں گا، تمہیں اتنا انمول کروں گا کہ تمہیں خود اپنی ذات اور وجود پہ رشک آنے لگا گا۔۔۔ وہ مسلسل اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس کی ہاتھوں پہ گرفت مضبوط کرتا بے حد سلجھے ہوئے انداز میں اسے

سمجھانے لگا تھا۔ اس کے چند الفاظ میں بہت کچھ تھا۔ وہ اپنے کچھ الفاظ سے ہی زربخت پہ اور نزہت خان پہ حق جتا گیا تھا۔

وہ اپنی محبت کا اظہار چھپے لفظوں میں اظہار کر گیا تھا۔ وہ کہہ گیا تھا زربخت کو کہ وہ اپنا وجود دمیر خان کی دسترس میں دے دے ، وہ التجا کر گیا تھا کہ اسے موقع دیا جائے محافظ بننے کا، اسے حق دیا جائے زربخت کی زندگی کو خوشیوں سے بھرنے کا، اسے اختیار دیا جائے اس کو سکون اور خوشی کے الگ جہان میں لے جانا کا، دمیر خان کو ایک بار زربخت کی ذمہ داری سونپ دے جائے پھر وہ اپنی ذمہ داری جی جاں سے نبھائے گا۔

لالہ!! آپ جو ہمارے لئے کریں گئے وہ احسان ہوگا، اور جو باپ اپنی اولاد، یا شوہر اپنی بیوی کیلئے کرتا وہ تو حق سے کرتا

ہے۔ ہمارا حق ہوتا ہے ان پر، اسلئے وہ ہم بلا جھجک لے لیتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے ہوتے ہیں۔ ہم ان پہ اور وہ ہم پہ جان سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔ مورے کہتی ہیں کسی سے احسان اور مدد نہ لینا کیونکہ:

"وقتی سہارے بعد میں مستقل طعنے بن جاتے ہیں"

آپ مجھ پہ کوئی حق نہیں رکھتے کہ مجھے خوشی کے الگ جہان میں لے جائیں، آپ حق نہیں رکھتے ہیں میری پھیکی ذات کو رنگوں سے بھرنے کا، آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ آپ مجھے اپنے حصار میں لیکر تمام پریشانیوں سے نجات دلائیں، کوئی جواز نہیں بنتا میرا آپ کے ساتھ اپنی ذات کو بنا کسی مضبوط رشتے کے جوڑنا، آپ کبھی بھی میری زندگی کی تلخیاں دور نہیں کر سکتے کیونکہ جن پہ حق نہیں ہوتا ان کو اپنی ذات نہیں سوچتے۔۔۔ میرے لئے صرف

میرے بابا کی ذات تھی جن پہ میں حق رکھتی تھی اور وہ مجھ پہ،
ان کے علاوہ اب مورے ہیں اور مورے کے سوا مجھ پہ کوئی
حق نہیں رکھتا کہ میں اس کے ساتھ زندگی کا دکھ بانٹ سکوں۔۔
باپ کا نہ ہونا اور احساسِ یتیمی بہت جان لیوا احساس ہے۔ سچ
میں آپ محرومیوں میں ڈوب کے اپنی ذات کی شناخت کھو
بیٹھتے۔۔ کبھی کسی کے بابا کسی کو چھوڑ کے نہ جائیں!! باپ کے
بنا زندگی کانٹوں کا جنگل بن جاتی ہے جس میں سے آپ کو گزر کر
اپنے زخمی پیروں اور وجود کے ساتھ اسے پار کر کے جانا ہوتا۔
صرف باپ کی ذات ہی بیٹی کیلئے زندگی پھولوں سے بھر سکتی
ہے، صرف باپ ہی اس تلخ جہان کو بیٹی کیلئے جنت بنا سکتا ہے،
صرف وہ ہی اپنی بیٹی کے قدموں کے نیچے ہتھیلیاں رکھ کے اس
کے ہر قدم کو تبرک کر سکتا، اور کوئی نہیں کر سکتا، کوئی رشتہ

بھی نہیں کر سکتا جو باپ کی ذات بیٹی کیلئے کرتی ہے۔۔۔ وہ
پھر سے نظریں جھکائے شکستہ لہجے میں مگر سمجھداری سے
جواب دے گئی تھی۔

وہ دمیر خان کی تمام باتیں سمجھ گئی تھی کیونکہ وہ رشتوں کی نزاکت
کو سمجھتی تھی۔ دمیر خان اس پہ کوئی حق نہیں رکھتا تھا۔۔ پھر
وہ کیوں ایسی باتیں کر رہا تھا جیسے زربخت کی زندگی کے سارے
اختیارات اس کے پاس ہوں؟؟ وہ اس کی باتیں سن کر صاف
لہجے میں بولتی دمیر خان کے سارے عزائم کو انکار کر گئی تھی۔
اس کا جواب سنتے ہی دمیر خان نے بے ساختہ اپنے ہاتھ اس
کے ہاتھوں سے ہٹا کے چپھے کر لئے۔ زربخت ایک منٹ میں
ہی اس کے خلوص، محبت، مان، ارادے، سچے جذبات اور
اپنائیت کے دعوے ردی کر گئی تھی۔ اس کا سادہ اور حقیقت

پہ بنی جواب دمیر خان کی زبان سے قوت گویائی چھین گیا تھا۔ وہ
چند منٹ کچھ بول نہ سکا۔ اس نے بنا پلک جھپکائے زربخت
کے معصوم چہرے کی طرف دیکھا تھا جس نے اعلیٰ درجے کی
سمجھداری دیکھاتے ہوئے جواب دے کر دمیر خان کو دنگ کر
دیا تھا۔ وہ جہاں اس کے جواب پہ اذیت سے چور ہوا تھا، وہاں
یہ جان کے اطمینان بھی ہوا تھا کہ وہ رشتوں کی حدیں جانتی
ہیں۔ وہ جانتی کہ بغیر کسی روحانی رشتے کے کوئی اس پہ حق نہیں
جتا سکتا، وہ جانتی تھی کہ صرف محرم رشتے اس کی ذات پہ اختیار
رکھتے تھے۔ اور محرم رشتے کے علاوہ وہ اپنا وجود حفاظت کیلئے
کسی کو نہیں سونپے گی۔ پھر دمیر خان کیسے بغیر کسی مضبوط رشتے
کے اس پہ حق جتانے کی بات کر رہا تھا؟

میں نے تم لوگوں پہ احسان کب کیا ہے؟ احساس اور اپنائیت کو احسان کا نام دینے والوں کو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ ہر انسان آپ کی ذات پہ احسان نہیں کرتا بلکہ وہ آپ کو اپنا سمجھ کر پیار اور خلوص بانٹتا ہے اور جہاں تک رہی میری بات تو میں حق سے ہی تمہاری ذمہ داری لوں گا نہ کہ بغیر کسی پائیدار رشتے کے تمہیں خود سے منسلک کرنے کی کوشش کروں گا۔ باقی ہر انسان کی اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ کوئی کسی کے خلوص کو بدنیتی کا نام دیتا ہے، کوئی احسان کا نام دیتا ہے تو کوئی دکھاوے پن کا، لیکن باخدا زربخت!! میرا خلوص صاف اور خالص تھا، بغیر کسی ملاوٹ کے تھا۔ نہ تو میرے خلوص میں بدنیتی تھی، نہ احسان جتانے کا انداز تھا اور نہ ہی کچھ پانے کا لالچ تھا۔ میں تو تم لوگوں کو اپنا سمجھ کر آتا ہوں لیکن تم ٹھیک

کہہ رہی ہو، میرا تم پہ کوئی حق نہیں ہے مگر میرا پھوپھو یہ پورا حق
ہے اور مجھے ان پہ حق جتانے سے کوئی روک نہیں سکتا۔۔۔
وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوتا سنجیدگی سے بولا تھا۔ اس کا چہرہ
کرب زدہ تھا۔ لہجے میں بے اعتنائی کا درد شامل تھا جو زربخت
کے الفاظ نے دیا تھا۔۔ جو بے اعتنائی اس نے حق کی بات کر
کے جتائی تھی۔۔ دمیر خان کا سارا خلوص اور محبت پانی میں
بہا کے لے گئی تھی۔ زربخت رمیز خان غیر ارادی طور پر دمیر
خان آفریدی کا دل اپنے لفظوں سے چھلنی کر گئی تھی۔۔
لالہ!! میں نے آپ کے خلوص کو ملاوٹ زدہ کب بولا؟ میں آپ
کی مخلصی اور نیت پہ شک نہیں کر رہی، آپ بہت اچھے ہیں
لالہ!! سب سے اچھے ہیں مگر مورے کہتی ہیں مجھ پہ صرف ان
کے اور بابا کے علاوہ کوئی حق نہیں رکھتا۔۔ انھوں نے مجھے

رشتوں کی تمیز بتا رکھی ہے۔ وہ کہتی ہیں بغیر حق کے اپنا وجود کسی کے حوالے نہ کرنا، کسی سے مدد طلب نہ کرنا، میں تو بس اپنی حدیں بتا رہی تھی، میرا مطلب ہر گز آپ کو تکلیف دینا یا آپ کے خلوص پہ شک کرنے کا نہیں تھا۔۔۔ وہ اس کے لہجے میں دکھ کی آمیزش محسوس کرتی معصومیت سے اپنی باتوں کی وضاحت دینے لگی۔ اسے یوں دمیر خان کا شکستہ انداز اچھا نہیں لگا تھا اور اندر ہی کہیں اپنے کہے گئے الفاظ پہ شرمندگی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔

میں جانتا ہوں زربخت!! تمہارا ہر گز میری نیت پہ شک کرنے کا مطلب نہیں تھا لیکن جو تم نے کہا، بالکل ٹھیک کہا ہے۔ میں اگلی دفعہ تم پہ حق جتانے سے پہلے یہ اختیار حاصل کروں گا کہ میں تم پہ بلا جھجھک سر سے لیکر پاؤں تک حق ملکیت کی مہریں ثبت

کر کے اپنے جذبات اور خلوص کو پاکیزہ ثابت کر سکوں۔۔۔
دمیر خان اپنی پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے پر عزم ہو کر رعب
دار لہجے بولا تھا جبکہ معصوم سی زربخت نے نا سمجھی سے اس
کے چہرے کی طرف دیکھا تھا جہاں پہ اب امید اور یقین کی
کرنیں واضح تھی۔ وہ دمیر خان کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکی
تھی کیونکہ وہ ابھی ان چیزوں اور اس کے جذبات کو سمجھنے سے
قاصر تھی۔ پہلے اس نے حق کی جتنی بھی باتیں کی تھیں، وہ
نزہت خان نے اسے رٹائی تھی اس لئے وہ کر گئی تھی ورنہ
زربخت میں ابھی اتنی سمجھداری نہیں تھی کہ وہ دمیر خان کے
خلوص کو حق کے ساتھ جوڑ سکے۔۔

اچھا چھوڑو یہ سب اداس باتیں!! تم مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے پھوپھو
کو جو تم ان کیلئے رورو کے اپنی حالت خراب کر رہی ہو؟۔۔۔

اسے الجھن میں گھڑے دیکھ کر دمیر خان سنجیدہ تاثرات زائل کرتا ہلکے بھلکے انداز میں گویا ہوا۔

مجھے نہیں پتہ ہے کیا ہوا ہے؟ میں نے پچھلے ہفتے ان کی شہزاد لالہ سے فون پہ ہوتی بات سن لی تھی۔ وہ ان کو بول رہی تھیں کہ میری بیماری کا کسی کو پتہ نہ چلے، کسی کو اس بارے میں نہیں بتانا! پھر میں نے مورے سے بہت بار پوچھنے کی کوشش کی تھی لیکن انھوں نے میری بات ٹال دی۔ وہ مجھے کچھ نہیں بتا رہی ان کو کیا ہوا ہے؟۔۔۔ وہ اضطرابی کیفیت میں بولتی چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ نیلی آنکھوں کے کنارے پھر سے نم ہوئے تھے دراصل جب سے اس نے نزہت خان اور شہزاد کی فون پہ ہوتی گفتگو سنی تھی، وہ اسی آدھی ادھوری بات کو پکڑ کر ہفتے میں چھپ کر کئی بار روچکی تھی۔ اسے بلا وجہ ہر چھوٹی

چھوٹی بات پہ رونا آرہا تھا جس طرح وہ آج تڑپ تڑپ کے رو
رہی تھی۔

زربخت!! تمہیں کس زبان میں سمجھاؤں رونا بند کرو۔ رونے
سے تمہاری آنکھوں کو تکلیف ہوگی۔۔۔ پلیز!! اب نہیں رونا۔
اور مجھے شہزاد کا نمبر دو۔۔۔ میں پھوپھو کا خود پتہ کر لیتا ہوں۔۔۔
تم بلاوجہ پریشان نہیں ہو۔۔۔ پھوپھو کو پتہ ہے نہ تم رو رو کے
اپنی حالت خراب کر لیتی ہو، اس لئے وہ تم سے بات چھپا گئی
ہوں گی۔۔۔ وہ اس کی بات پہ چونکا تھا مگر پھر زربخت کی جذباتی
کیفیت دیکھ کر بات کو ہلکے بھلکے انداز میں لیتا اس کو سختی سے
رونے سے منع کر گیا تھا۔

آج چند منٹوں میں ہی وہ اس کے دل پہ کئی وار کر چکی تھی۔
ہمت تھی دمیر خان کے دل کی جوبیک وقت اس کے آنسو، بے

اعتنائی اور کڑوے گہرے الفاظ کو برداشت کر گیا تھا۔ وگرنہ
جان تو زربخت کے آنسوؤں نے حلق میں اٹکا کے رکھ دی تھی

--

لالہ!! آپ مورے کو خود کسی ڈاکٹر کے پاس لے کے جائیں اور
مجھے بتائیں ان کو کیا ہوا ہے؟ مجھے مورے کی باتوں پہ یقین نہیں
آتا۔۔۔ وہ ساتھ والی چارپائی پہ پڑا فون اٹھا کے شہزاد کا نمبر
ڈھونڈتی ملتی ہوئی تھی۔

ہاں میں خود دیکھتا ہوں سب کچھ تم نمبر دو شہزاد کا تاکہ میں پتہ لگا
سکوں کہ وہ کس ہاسپٹل میں پھوپھو کو لیکر گیا ہے۔۔۔ دمیر
خان اپنی جیب سے فون نکال کف نمبر نوٹ کرنے لگا۔
لالہ! میں بھی آپ کے ساتھ آؤں گی۔۔۔ نمبر لکھوانے کے بعد
اس نے دمیر سے التجاء کی

نہیں زربخت تم یہی رکو!! میں جاتا ہوں۔ پھوپھو کو لیکر آتا
ہوں، بس تم میرے لئے اچھی سی چائے تیار رکھنا۔۔۔ دمیر
خان فون واپس اپنی جیب میں ڈالتا سنجیدگی سے مگر نرم لہجے میں
زربخت کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے منع کر گیا۔
جی ٹھیک ہے لالہ!۔۔۔ وہ بنا بحث کئے اس کی بات مان گئی
تھی۔

راشئی! دروازہ بند کرئی (آجاؤ! دروازہ بند کر لو)۔۔۔ وہ اس کو
آواز لگاتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر سے نکل گیا تھا جبکہ زربخت فوراً
دروازے کو کنڈی لگاتی چھپر مڑ گئی تھی۔۔۔
اہہہ!! دمیر! توں بغیر حق کے اتنی باتیں کیسے کر سکتا ہے؟۔۔۔
وہ گاڑی میں سوار ہوتے ہی غصے سے اپنے ہاتھ کا مکا بنا کر
اسٹیرنگ پہ مارنے لگا۔ وہ واقعی ہی جذباتی ہو کر وہ سب کچھ

کہہ گیا تھا جو اسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ زربخت کو وہ بھلا کس
رشتے اور کس حق کے تحت اپنے حصار میں رکھنے کی بات کر گیا
تھا؟

زربخت رمیز خان تم انشاء اللہ بہت جلد زربخت دمیر خان بن
کے میری زندگی میں آنے والی ہو اور پھر میں تمہیں اپنے حصار
کی قید میں ایسے جکڑوں گا جیسے جنموں کے بچھڑے ساتھی ملتے
ہیں۔ میرا لمس اتنا پر حدت ہو گا کہ تمہیں میری بانہوں میں آکر
اپنی پسلیاں ٹوٹی ہوئی محسوس ہوں گی۔

”زما بخت رو بنانہ ستوری“ (میرے بخت کا روشن
ستارہ)۔۔۔ دمیر خان آنکھیں موندھ کے کھولتا ایک پر امید
مسکراہٹ کے ساتھ گاڑی سٹارٹ کر کے یہاں سے نکل گیا۔

تقریباً پندرہ منٹوں میں ہی دمیر خان شہزاد کی بتائی مطلوبہ جگہ پہ پہنچ چکا تھا۔ نزہت خان کو جیسے ہی اس کی آمد کا پتہ چلا تھا، وہ ڈاکٹر کے پاس سے اٹھ کے باہر کوریڈور میں اس کا انتظار کرنے لگی تھیں۔ انہوں نے پہلے ہی شہزاد سے کہہ کر اپنی ساری رپورٹس اس کی گاڑی میں چھپا کر رکھوا دی تھی تاکہ دمیر خان کو کسی بھی طرح نہ رپورٹس دکھے اور نہ ہی وہ کوئی سوال کر پائے۔

اسلام علیکم پھوپھو!!۔۔۔۔۔ دمیر خان بیچ پہ بیٹھی نزہت خان کو دیکھ کر دور سے مخاطب کر گیا تھا۔

والعلیکم السلام!۔۔۔ وہ نرمی سے اس کو سلام کا جواب دیتی بیچ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

کیا ہوا ہے آپ کی طبیعت کو؟ ڈاکٹر سے چیک کروایا ہے؟ کیا بولتا ہے ڈاکٹر؟۔۔۔ اس نے ان کے قریب پہنچ کر فکر مندی سے استفسار کیا۔

ہاں چیک کروایا ہے۔ ڈاکٹر نے دوا دے دی ہے، کچھ خاص نہیں کہا۔۔۔ چلو اب گھر چلتے ہیں۔۔۔ ایسے ہی معمولی سی کھانے پینے میں پرہیزی نہیں کی تھی تو طبیعت بگڑ گئی، مگر اب ٹھیک ہوں بہتر ہوں، آجاؤ گھر چلتے ہیں۔۔۔ وہ نگاہیں چرا کے جواب دیتی دمیر خان کا ہاتھ پکڑے اسے اپنے ساتھ لئے باہر کی جانب لے کے بڑھی تھی۔

ایسے کیسے کھانے پینے کی وجہ سے طبیعت خراب ہو سکتی؟ آپ کچھ چھپا رہی ہیں؟ زربخت بھی بول رہی تھی آپ نے اس سے کچھ چھپایا ہے؟ جب اس نے آپ سے پوچھا تو آپ نے اس کو

اپنی صحت کے متعلق کچھ بھی بتانے سے انکار کر دیا۔۔۔ دمیر
خان نے قدم روکے اور اس کا ہاتھ پکڑے نزہت خان کے قدم
بھی تھمے تھے۔۔۔ چہرے پہ انکشافات کا تاثر آیا تھا۔ سچ کھلنے کا ڈر
وجود میں سرایت کرنے لگا تھا۔ وہ تیزی سے اپنے تاثرات
پہ قابو پاتی چھپڑ کر دمیر خان کو دیکھنے لگیں جو سوالیہ نظروں سے
نزہت خان کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔۔۔

ارے بیٹا!! وہ تو پاگل ہے، کچھ بھی بولتی رہتی ہے۔ میں
اسلئے اپنی صحت کے بارے میں اس کو نہیں بتاتی، وہ میرے
ذرا سے بخار پہ رو رو کے ہلکان ہو جاتی۔ اب تم بتاؤ ایسے نرم
دل انسان سے بندہ کیا دکھ بانٹے جس کو دکھ سنانے کے
بعد سنبھالنا مشکل ہو جائے۔ وہ اپنی طبعیت خراب کر لیتی

ہے، اس لئے میں اس کو کچھ نہیں بتاتی۔۔۔ وہ مستحکم لہجے
میں نظریں جھکائے دمیر خان کو جواب دے گئی تھی۔
جو بھی ہے پھوپھو!! میں آج آپ کے سارے ٹیسٹ کروا کے
ہی گھر لے جاؤں گا۔ اور یہ آپ کس ہاسپٹل میں آتی ہیں؟ یہاں
پہ ڈسپلن اور صاف ستھرائی کا کوئی انتظام نہیں ہے! یہاں پہ آکر
مریض نے ٹھیک ہونے کی بجائے الٹا بیمار ہونا ہے۔۔۔ آپ
چلیں میرے ساتھ میں آپ کو اپنے ایک دوست کے پاس لے
جاتا ہوں۔ وہ اس شہر کا سب سے اچھا ڈاکٹر ہے۔ آپ ان
سے دوائیں لے گی تو بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔۔۔ دمیر خان
ہاسپٹل کے ناقص انتظامات اور صفائی ستھرائی میں کوتاہی دیکھتا
جھرجھری لے کر بولتا ان کو اپنے ہمراہ لئے ہاسپٹل سے لیکر نکلا
تھا۔ یہ ہاسپٹل اس علاقے کا عام اور معمولی سا تھا۔۔۔ اور اس

ہاسپٹل میں شہزاد ہی نزہت خان کو لیکر آتا تھا۔۔ شہزاد تو دمیر خان کو دور سے دیکھتے ہی بنا سلام کئے نکل گیا تھا۔ وہ اس سے ملنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا اور وجہ بہت گہری اور حقارت زدہ تھی۔

نزہت خان کے منع کرنے کے باوجود بھی دمیر خان چند منٹوں میں ہی اسے شہر کے سب سے بہترین ہاسپٹل میں لے آیا تھا۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کرنے کے بعد سارے ٹیسٹ کئے تھے۔ ٹیسٹ کی رپورٹس ایک ہفتے بعد ملنی تھیں۔ اس لئے ڈاکٹر نے نزہت خان کو صرف دوائیں ہی دی تھیں، رپورٹس آنے سے پہلے وہ کوئی پیشن گوئی کر کے اس کو پریشان نہیں کر سکتے تھے، اس لئے رپورٹس آنے تک اپنے خدشات کو ملتوی کیا تھا ورنہ وہ نزہت خان کی نبض پکڑ کر ہی سمجھ گئے تھے کہ ان کو کونسا مرض

لاحق ہے لیکن پھر بھی انہوں نے رپورٹس کے ساتھ کچھ
انکشاف کرنا بہتر سمجھا تھا۔

کچھ بھی نہیں ہوا ہے تمہاری مورے کو!! وہ بالکل ٹھیک ہیں
۔ میں نے آج ان کے سارے ٹیسٹ کروادئے ہیں! ایک ہفتے
بعد رپورٹس مل جائے گی اور تمہارا وہم بھی دور ہو جائے گا
۔ انشاء اللہ رپورٹس ٹھیک آئیں گی۔ میں خود ایک ہفتے بعد آکر
آپ کی رپورٹس لے آؤں گا۔ ابھی تو فلحال میری آج شام کی
فلائٹ ہے۔ مجھے ایک ہفتے کیلئے آسٹریلیا جانا ہے کچھ کاروباری
معاملات کے سلسلے میں۔۔۔ دمیر خان چائے کا سپ لیتا ہوا
زر بخت کو اپنی طرف متوجہ کروانے لگا۔

لالہ!! آپ ابھی تو آئے تھے۔ پھر سے واپس جا رہے ہیں۔ وہ
اس کی بات سن کر اداسی سے بولی۔۔۔ نا جانے کیوں اس کے
جانے کا سن کے چہرہ سے مسکراہٹ غائب ہوئی تھی۔
بس ایک ہفتے کیلئے جا رہا ہوں! پھر واپس آ جانا ہے۔۔۔ اس
نے چائے کا کپ لبوں سے ہٹا کر جواب دیا۔ اس نے
زر بخت کے چہرے پہ پھیلی منٹ میں اداسی بخوبی نوٹ کی تھی
جو دمیر خان کے جانے کا سن کے آئی تھی۔ وہ دونوں ہلکی پھلکی
باتوں میں مصروف ہو گئے تھے جبکہ نزہت خان خاموشی سے
بیٹھی رپورٹس آنے کے بعد زر بخت کے رمی ایکشن کیلئے
پریشان ہو رہی تھی۔ اس وقت ان کا دماغ کئی سوچوں میں
الجھا ہوا تھا۔ ان میں سب سے سرفہرست شہزاد کی بہن کی
پرسوں کہی گئی باتوں نے دماغ کو جکڑا ہوا تھا۔۔

دیکھنا یہ تھا کہ آنے والے وقت میں وہ زربخت کی زندگی کے متعلق کیا فیصلہ لیتی ہیں؟ کیونکہ ان کی اپنی زندگی آخری باب کے حتمی صفحے پر پہنچ چکی تھی۔ اور وہ اپنی زندگی کا باب ختم ہونے سے پہلے زربخت کی زندگی کو نئی کتاب کی صورت دینا چاہتی تھی۔۔۔

نزہت آیا!! میری بات مانیں تو آپ اس رشتے کے بارے میں زیادہ نہ سوچیں! بس اللہ پہ اور میرے کئے گئے وعدوں پہ بھروسہ کر کے آئیں کہیں۔۔۔ سلطانہ بیگم پچھلے ایک گھنٹے سے نزہت خان کو زربخت کے رشتے کیلئے راضی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

سلطانہ بیگم دراصل شہزاد کی بہن تھیں۔ شہزاد کی شادی پانچ سال پہلے ہو چکی تھی مگر اس کے ہاں اولاد نہیں تھی۔ اور شہزاد کی پہلی بیوی انہی اولاد کی کمی اور بانجھ پن کے طعنوں سے تنگ آکر ایک سال پہلے ہی اس کو چھوڑ کے چلی گئی تھی۔ اب شہزاد اپنی دوسری شادی رچانا تھا تا کہ بیوی بھی مل جائے اور اولاد کی کمی بھی پوری ہو جائے۔ اسی سلسلے میں شہزاد کی کچھلے ایک سال سے زربخت پہ نظر تھی۔

اس نے آج تک زربخت کا چہرہ نہیں دیکھا ہوا تھا لیکن اس کی نیلی آنکھیں اسے ہر وقت زربخت کے حسین روپ کا پتہ دیتی تھی۔ وہ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلی تھی جتنی دفعہ بھی اسے شہزاد نے دیکھا تھا ہمیشہ نزہت خان کو گاڑی میں سوار کرنے کی غرض سے وہ گھر سے باہر نکلتی تو شہزاد اس کی آنکھیں دیکھ لیتا

تھا۔ نزہت خان نے ساری زندگی اپنے محلے میں کسی کی مدد نہیں لی تھی۔ وہ اپنی اور اپنی بیٹی کی عزت کی ہمیشہ حفاظت اور اپنے سارے کام خود کرتی آئی تھی لیکن پچھلے ایک سال سے شہزاد زبردستی ان کی مرضی کے بغیر ان کے باہر کے چھوٹے موٹے کام کرنے لگا تھا لیکن پھر بھی نزہت خان اس کا احسان مشکل سے ہی لیتی تھی ورنہ وہ ہمیشہ اس کی مدد کی آفر کو انکار کر دیتی تھی مگر پچھلے چار مہینوں سے نزہت خان مکمل طور پر شہزاد پہ انحصار کرنے لگی تھی۔

اس نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ساری ذمہ داری خود اٹھالی تھی۔ اور تو اور نزہت کی سارے ٹیسٹ اور دواؤں پہ پیسے بھی اپنی جیب سے خرچ کرنے لگا تھا لیکن انہوں نے ہمیشہ اس سے لی گئی رقم دیر سے

ہی سہی مگر واپس ضرور کی تھی۔۔ پھر بھی وہ ان پہ دیکھاوے
کے اتنے احسان تو کر چکا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ اس سے
کرنے کے بارے میں ایک بار سوچیں گی تو ضرور۔۔ اور اسی
غرض سے شہزاد آج اپنی بڑی بہن کو نزہت خان کے ہاں رشتے
کیلئے تیسری دفعہ بھیج چکا تھا اور یہ باور کروا کے بھیجا تھا۔ کہ وہ ہر
حال میں نزہت خان کو اس رشتے کیلئے منا کر آئیں۔۔

سلطانہ!! میری بچی بہت چھوٹی ہے۔ ابھی وہ صرف سترہ سال
کی ہے۔ اس کی اور شہزاد کی عمر میں بہت فرق ہے۔۔ زربخت
اسے لالہ بولتی ہے اور ویسے بھی شہزاد تو پہلے سے ہی شادی
شدہ ہے۔۔ میں ایسے کیسے اپنی معصوم سی بچی کو ایک پینتیس
سالہ شادی شدہ مرد کے ساتھ باندھ دوں؟ میں نے بہت غور
و فکر کیا ہے اس رشتے کے بارے میں، میرا دل اس رشتے کیلئے

مطمئن نہیں ہے۔۔۔ نزہت خان بغیر کسی ہچکچاہٹ کے
سلطانہ بیگم کو حقائق سے آگاہ کرتی انکار کر گئی تھی۔۔۔ ان کو
ناجانے کیوں سلطانہ بیگم کا انداز بناوٹی لگ رہا تھا جیسے وہ اس
رشتے کو پانے کیلئے سچ اور جھوٹ کا لحاظ بلائے طاق رکھے اپنے
مدعے پہ قائم تھی۔

نزہت آیا!! مرد کی عمر بھلا کون دیکھتا ہے؟ مرد تو ساری زندگی
جوان رہتا ہے اور جہاں تک رہی پہلی شادی کی بات تو وہ ہم
نے نہیں توڑی تھی بلکہ وہ بد نصیب لڑکی خود ہی چھوڑ کے چلی
گئی تھی ورنہ شہزاد کو تو اس کے بانجھ پن یا اس میں کمی سے کوئی
مطلب نہیں تھا۔ اس نے ہمیشہ اسے عزت و محبت دے کر
اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کی لیکن اس نے الٹا میرے بھائی کو
نقص زدہ قرار دے کر علیحدگی اختیار کر لی۔۔۔ میں مانتی ہوں

زربخت کی عمر کم ہے لیکن وہ بہت سمجھدار بچی ہے۔۔ اگر اس کو کسی رشتے میں باندھ دیں گے تو وہ اپنا رشتہ بخوبی نبھالے گی۔۔۔ سلطانہ بیگم سنجیدگی سے بولتی دوسری چارپائی سے اٹھ کر ان کے ساتھ آکر بیٹھ گئیں۔

نہیں! میرا دل نہیں مانتا! میری زربخت اور شہزاد کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ وہ اس کے بھائیوں کی عمر کا ہے۔۔ یہ رشتہ میں نہیں کر سکتی۔۔۔ نزہت خان بھی اپنی بات پہ قائم رہی تھی، وہ کچھلے تین دنوں سے کافی اس بات پہ سوچ چکی تھی اور یہی نتیجہ نکالا تھا کہ زربخت کیلئے شہزاد کا رشتہ دینا بے وقوفی ہے۔۔

نزہت آیا!! ہوش کریں۔ اتنا اچھا رشتہ آپ اپنے ہاتھوں سے گنوا کر نقصان کر رہی ہیں۔۔ اپنی حالت کے بارے میں سوچیں اور زربخت کو محفوظ ہاتھوں میں دے کے جائیں۔ میں

نہیں کہتی کہ آپ کو کچھ بھی ہو، اللہ تعالیٰ آپ کو صحت والی لمبی
زندگی عطا فرمائے۔ آپ کو بیماری سے شفاء دے لیکن نزہت
آپا! یہاں تک آپ کی بیماری پھیل چکی ہے۔ مجھے نہیں لگتا آپ
کو زیادہ مہلت ملے گی۔۔۔ آپ کے پاس وقت بہت کم ہے۔
ادھر آپ کی آنکھیں بند ہوئیں اور ادھر زربخت در بدر کی
ٹھو کریں کھانے کیلئے اکیلی رہ جائے گی۔ آپ کے بغیر تو اس
بچی کا جینا محال ہو جائے گا اور زمانہ اکیلی کنوڑی بچی کو نظروں
اور بری نیتوں سے نوچ کھائے گا۔ میری مانیں تو اپنے ہاتھوں
سے اپنی بچی کو کسی مضبوط مرد کے سپرد کر دیں۔ اس کا فرض
ادا کریں اور اس کی زندگی کی حفاظت اور ضروریات کی ذمہ
داری زربخت کے ہونے والے محرم کو سونپیں، تاکہ آپ کی غیر
موجودگی میں کوئی تو اس کا آسرا اور سہارا ہو۔۔۔ لالہ تمہارا وہ

ہے جو سال بھر مڑ کے تمہاری خبر بھی نہیں لیتا۔ اگر فرض کرو
تمہارے بعد وہ تمہاری بیٹی کو گھر لے بھی جاتے ہیں تو کیا
تمہاری بھابھی زربخت کو اپنے گھر میں رہنے دے گی؟ کیا اپنے
گھر میں اس کا وجود قبول کرے گی؟ جس بھابھی نے ساری
زندگی تمہارے لالہ کو تم سے دور رکھا، تمہیں سالوں پہلے گھر سے
بے عزت کر کے نکالا تھا۔ تمہاری معصوم سی پانچ سالہ بچی
اور تمہارے بیوہ ہونے کا لحاظ بھی نہ رکھتے ہوئے تمہیں اپنے
گھر میں جگہ دینے سے انکار کیا تھا۔ تو پھر کیا آج تمہاری وہی
بھابھی زربخت کو پناہ دے گی؟ وہ نہیں دے گی۔ وہ کبھی بھی
اس کے وجود کا سایہ بھی اپنے گھر پہ نہیں پڑنے دے گی۔۔۔ اگر
آپ زربخت کو طعنوں اور بے بسی سے بچانا چاہتی ہیں تو اس کو
اپنا گھر مہیا کریں۔ اس کا نکاح کر کے اپنے گھر کی مالک بنائیں۔

جہاں سے اسے کوئی نہ نکال سکے۔ کوئی اس کے وجود کو بوجھ نہ سمجھیں۔ کوئی اس پہ حکم نہ چلائے، بلکہ وہ اپنے گھر کی ہو کے اس پہ راج کرے اور پر سکون زندگی جئیے کسی کا احسان لئیے بغیر!! باپنے محرم سے اپنی ذمہ داری اور خواہشات پوری کروائے۔ نہ کہ کسی دوسرے کے طرز اور جلی کٹی باتیں سن کر زندگی سے ہی اکتا جائے۔ آپ کے پاس وقت کی قلت ہے۔۔۔ اپنے جیتے جی زربخت کی زندگی سنوار جائیں ورنہ اس بچی کی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی ذات بھی بکھر کر رہ جائے گی۔۔۔ سلطانہ بیگم اب جان بوجھ کر ان کو تلخ حقیقت بتا کر جذباتی کیفیت میں مبتلا کر کے اپنی پسند کا فیصلہ کرنے پر مجبور کر رہی تھیں۔

میں مانتی ہوں میرے پاس وقت بہت کم ہے اور میرے بچنے
کے مواقع بھی تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں اور میں یہ بھی جانتی
ہوں میرے بغیر میری بچی اس بھرے جہان میں ٹوٹ کے بکھر
جائے گی۔ میرے جانے کے بعد اسے زندگی بہت ستائے
گی۔ اسے جینے سے بہتر میرے ساتھ مرجانا آسان لگے گا۔ وہ
بہت تکلیف سے گزرے گی میرے ساتھ چھوٹنے کے بعد، مگر
میں اپنی زربخت کو جانتی ہوں! وہ سب کچھ سہہ لے گی۔ وہ
زندگی کے حالات سے کسی نہ کسی طرح سے لڑے گی۔ کچھ
عرصہ گزر جانے کے بعد وہ میرے بغیر جینا سیکھ لے گی۔ میں
اپنے مرنے کے ڈر اور اسے کے اکیلا رہ جانے کے خوف سے
بالکل بھی اسے کسی ایسے آدمی کے ساتھ نہیں باندھوں گی جس
کے ساتھ میری بیٹی کا کوئی جوڑ نہ ہو۔ ہاں میرے بغیر وہ بے

سرو سامان ہو جائے گی لیکن اس کا ہرگز مطلب نہیں ہے کہ میں
اس کو ایک ایسے رشتے کی آگ میں جھونک دوں جس سے بچنے
کیلئے اس کے پاس کوئی راہ نہ ہو۔ شہزاد کے ساتھ زربخت کا
رشتہ کرنا بالکل ایسے ہے جیسے میں اپنی بچی کو اپنے ہاتھوں سے
ایک اندھیرے کنواں میں دھکا دے رہی ہوں۔ اور اس
اندھیرے کنواں سے باہر نکلنے کیلئے اس کا قد بہت چھوٹا ہے۔۔
شہزاد کی عمر کا مرد ہے۔ میری بچی کا ذہن ابھی نشوونما کے
مراحل میں ہے! وہ نا سمجھ ہے، اسکی عمر کچی ہے وہ اس رشتے کو
کبھی نہیں نبھاسکے گی۔ زربخت کو اس رشتے میں باندھنے سے
بہتر اس کا بے آسرا ہونا ہی ٹھیک ہے۔ میں نہیں چاہتی میرے
بعد میری بیٹی زندگی کی الجھنوں کے ساتھ ساتھ رشتے کی الجھنیں
بھی پالے۔۔ باقی جن کا کوئی نہیں ہوتا ان کا اللہ ہوتا ہے۔

انسان بے شک بے سہارا اور اکیلا ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ کی
ذات کبھی اپنے بندے کو اکیلا نہیں چھوڑتی۔ میرے بعد میری
زربخت کی حفاظت میرا اللہ کرے گا۔ وہ اس سے ایک میرا
سہارا چھینے گا تو سو کوئی اور بہتر سہارے بنا دے گا۔ بس اللہ
تعالیٰ میری زربخت کیلئے آسانیاں پیدا کرے گا۔۔۔ نزہت خان
رنجیدگی سے بولتی ایک ٹھنڈی سانس ہوا میں منتشر کرتی سلطانہ
بیگم کی باتوں پہ غیر متفق نظر آئی۔۔۔ ان کی آنکھیں تکلیف سے نم
ہونے لگی تھی۔ سانس گھٹنے لگا تھا۔۔۔ وہ زربخت کو اللہ تعالیٰ
کے سپرد کر کے ایک لحاظ سے مطمئن تو تھی لیکن وہی پہ وہ اس
کیلئے فکر مند اور پریشان بھی تھیں مگر انھوں نے سب کچھ اللہ
تعالیٰ کی ذات پہ چھوڑ دیا تھا۔

جب معاملات اللہ پہ چھوڑ دئیے جائیں تو پھر اسکی ذات اقدس پہ
بھروسہ رکھنا چاہئیے۔ اللہ تعالیٰ جو بھی کرتا ہے، انسان کی بہتری
کیلئے کرتا ہے۔ وہ ایک دکھ دیتا ہے تو اس کے چھپے سو سکھ چھپے
ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی وہ
جو بھی کرتا ہے، انسان کی بھلائی کیلئے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے
نیک بندوں کو آزمائشیں اور مصیبتیں دے کے آزماتا ہے۔ جو
مصیبت اور آزمائش میں ثابت قدم رہا، اس کا انعام بھی اتنا بڑا
ہوگا۔۔۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب کا حامی و ناصر ہوتا ہے۔
لیکن نزہت آقا! اللہ تعالیٰ نے رشتے اس لئے بنائے ہیں تاکہ
انسان اکیلا نہ ہو۔ انسان کو جینے اور زندگی گزارنے کیلئے رشتوں
کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے
ساتھی بن کر دکھوں سے نکل سکیں! خوشیوں کو مل کے جی

سکیں۔ ہمیں زندگی کے ہر موڑ پہ رشتوں اور سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ زندگی رشتوں کے بغیر گزر ہی نہیں سکتی۔ خوبصورت رشتوں کے بنا تو زندگی پھیکی ہے۔ اپنوں کے ساتھ کے علاوہ تو یہ دنیا انسان کیلئے ایک قید خانہ بن جاتی ہے اور بے سہاروں کیلئے سزا کی جگہ بن جاتی ہے۔ ابھی تو آپ کہہ رہی ہیں کہ آپ کے بغیر زربخت کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ آپ اس کو اس بھرے جہان میں اللہ تعالیٰ کے سپرد کر رہی ہیں۔ بے شک اللہ بہترین تدابیر کرنے والا ہے اور اس کے حکم کے بغیر پتہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا لیکن آپ بھول رہی ہیں کہ زربخت ایک جوان کنواری لڑکی ہے۔ آپ کی آنکھیں بند ہونے سے پہلے یہ زمانے کے درندے اسے بے آسرا سمجھ کر نوچ ڈالیں گئے۔ اس کی عصمت و آبرو کو مسمار کر دیں گے۔ اس

کے جسم سے بوٹیاں نوچ کھائیں گئے۔ اکیلی لڑکی کو ہمارے
معاشرے میں لوگ زندہ نگل جاتے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے نہ زمانہ
کتنا خراب ہے۔ یہاں پہ لوگ غلیظ نظروں سے ہی عزتیں تارتا
کر کے رکھ دیتے ہیں۔

ایک مضبوط اور باہمت خاتون کو بھی اپنی نظروں اور حرکات
سے شرمندہ کر کے اس کی عزت پہ وار کر دیتے ہیں۔ زربخت
تو پھر بھی معصوم اور نازک سی لڑکی ہے وہ بھلا کیسے زمانے کی
بے لگام نظروں کو اپنے جسم پہ رینگنے سے روک پائے گی؟ اس
کو ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے جو اس کو زمانے کی
تمام تکلیفات سے بچا سکے، جو اس کو اپنے محفوظ و مضبوط
حصار میں لیکر زمانے کی تمام تلخیوں سے چھپا سکے۔ میرا بھائی
بہت اچھا ہے۔ وہ زربخت کو ہر لحاظ سے خوش رکھے

گا۔ اسے اپنی ہتھیلی کا چھالہ بنا کے رکھے گا۔ شہزاد کے پاس
اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ گھر ہے، گاڑی ہے، اچھا کاروبار چل
رہا ہے۔ زر بخت کو میرے بھائی کے گھر میں کسی چیز کی کمی
محسوس نہیں ہوگی۔۔۔ وہ زر بخت کو بے انتہا محبت بھی دے
گا اور عزت بھی دے گا۔ آپ جلدی ہی اس کی زندگی کے
بارے میں بہتر فیصلہ لیں، کہیں ایسا نہ ہو وقت گزر جائے اور
آپ کی زر بخت پھر سے بے سہارا ہو جائے۔ اپنا سہارا ٹوٹنے
سے پہلے اس کیلئے کوئی مضبوط سائبان بنائیں جس میں وہ رہ کر
اپنی زندگی بنا خوف و خطر گزار سکے۔۔۔ سلطانہ بیگم بھی اپنے
موقف پہ ڈٹی رہیں۔

وہ زر بخت کا رشتہ کسی صورت ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتی
تھی اسلئے بار بار نزہت خان کو مختلف طریقوں سے راضی

کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔۔ سلطانہ بیگم جانتی تھی کہ ان کے پاس شہزاد کے علاوہ کوئی بہتر آپشن نہیں ہے فلوقت، وہ اپنے لالہ کے ہاں کبھی زربخت کو نہیں بھیجیں گی۔ ان کے مطابق نہ ہی اس کا بھتیجا زربخت کو اپنائے گا کیونکہ ان کے اور نزہت خان کے سٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے طاور اسی بات کو سوچتے ہوئے سلطانہ بیگم نے زربخت کو حاصل کرنا آسان سمجھا۔

میری زربخت کبھی بھی بے آسرا نہیں رہے گی۔ اس کا ماموں زندہ ہے۔ میرا دمیر ہے۔ میرا دمیر دے گا میری بچی کو محفوظ سائبان، وہ دے گا اس کو عزت و مان، میں اپنی زربخت اپنے بھتیجے کی سپرد کر کے جاؤ گی۔ وہ میری زربخت کی ساری ذمہ داریاں بھی پوری کر گئے اور اسکی جان و عزت کی حفاظت بھی

کرے گا۔ میں بہت جلد زربخت کو دمیر کی ملکیت میں دے
دوں گئی۔ وہ میری بیٹی کو پھول سے بھی زیادہ ناز کی سے رکھے
گا۔۔۔ ان کے دماغ میں اچانک دمیر خان کا نام اور چہرہ کلک
ہوا تھا۔ نزہت خان کے شکستہ چہرے پہ ایک دم فتح مندی کی
لہر دوڑی تھی۔ دمیر خان کا خیال ہی ان کے چہرے اور دل کو
پر سکون کر گیا تھا۔ وہ چہرے پہ دھیمی مسکراہٹ، انکھوں میں
مان لئے فخریہ انداز میں بولی تھی۔۔۔

تو تم کیا اپنے بھتیجے سے زربخت کی شادی کرو گئی؟۔۔۔ سلطانہ
بیگم کے چہرے کے نقوش یکدم تنے تھے۔ نزہت خان کے
تنگ صحن میں نفرت کی ہوا چلی تھی۔۔۔ وہ نخوت سے ان کے
گھور کے رہ گئی۔

ہاں! میں اپنے دمیر کو اپنی زربخت کیلئے چنتی ہوں۔ میں نے
آدھے منہ سے کہنا ہے اور میرے بچے نے میری بات پہ سر خم
تسلیم کر دینا ہے۔ وہ اپنی پھوپھو کی کوئی بات کوئی خواہش نہیں
ٹالتا ہے۔۔ وہ بہت فرمانبردار بچہ ہے۔ وہ میرے حکم کی
تکمیل کرے گا۔۔ وہ آنکھوں میں چمک لئیے پر امید سے بولی
تھی۔ ان کے لہجے میں ایک مان تھا جو انہیں دمیر خان پہ تھا۔
نزدہت آیا!! مجھے آپ کی باتوں پہ ہنسی آرہی ہے۔ آپ کو کیا لگتا
ہے کہ آپ کا پڑھا لکھا بھتیجا اتنا بڑا کاروباری آدمی اس معمولی
سے محلے کی ایک معمولی سی لڑکی سے شادی کرے گا؟ اس کو باہر
کی ہوا لگی ہوئی وہ کسی اپنی جیسی سے شادی کرے گا۔۔ کوئی
بھی اتنا بڑا بزنس مین زربخت جیسی معمولی لڑکی کو نہیں اپنائے
گا پھر وہ چاہے آپ کا بھتیجا ہی کیوں نہ ہو۔۔ ہوش کے ناخن

لیں نزہت آیا!! تمہاری اور تمہارے بھتیجے کے مرتبے میں زمین
آسمان کا فرق ہے۔۔ چلو ایک لمحے کیلئے فرض کر لیا کہ وہ
زربخت کو اپناتا ہے۔ اسے اپنے نام کرتا ہے۔۔ جب وہ اسے
اپنے گھر اپنی بیوی کی حیثیت سے لے جائے گا تو کیا تمہاری
بھابھی اس کو اپنی بڑی بہو کے روپ میں تسلیم کر لے گی؟
کیا وہ زربخت کو اپنے گھر میں بڑی بہو والا مقام و مرتبہ دیں گی؟
جس عورت کو شروع سے ہی تمہارے اور تمہاری بیٹی کے
وجود سے نفرت ہو وہ بھلا کیسے تمہاری بیٹی کو اپنے پیٹے کے
ساتھ منسلک رہنے دیں گی؟ اگر تمہارا بھتیجا اپنے ماں باپ کی
مرضی کے خلاف جا کر تمہاری بات مان بھی لیتا ہے اور
زربخت کو اپنے نکاح میں لے لیتا، گھر بھی لے جاتا ہے سب
کچھ ہو جاتا ہے مگر اس کا نتیجہ پتہ ہے، کیا ہونا ہے؟ زربخت کو

تمہاری بھابھی نے طلاق دلوادینی ہے۔۔ آخر کار تمہارا بھتیجا
کتنی ہی دیر اپنی ماں کے آگے ڈٹا رہے گا؟ ایک دن وہ اپنی ماں
کی کہنے پر تمہاری زربخت کو سہارا دے کر بے سہارا کر دے
گا۔ پھر کیا کرے گی تمہاری بیٹی؟ نزہت آیا!! وہ خواب نہیں
دیکھنے چاہیے جو ہماری اوقات سے باہر ہوں یا جن کی تعبیر بھیانک
ہو۔۔۔ دمیر خان کا نام سنتے ہی سلطانہ بیگم حقارت آمیز لفظوں
کا چناؤ کرتی تیکھے لہجے میں بولی تھی۔ ان کے ہر لفظ سے دمیر
خان کیلئے نفرت چھلک رہی تھی۔ اور بالکل ایسی ہی نفرت شہزاد
کو ہوئی تھی۔ جب اس نے پہلی مرتبہ اس کو نزہت خان کے گھر
سے نکلتا دیکھتا تھا۔۔ تب سے ہی وہ شہزاد کی نظروں کو ٹھٹکا
تھا۔۔

دمیر مختلف ہے۔ وہ اپنے عہد کا پکا ہے۔ اگر اس نے زر بخت کو اپنا لیا تو کبھی نہیں چھوڑے گا۔۔۔۔۔ نزہت خان شکستہ اور مرجھائے ہوئے لہجے میں بولیں۔ کہیں نہ کہیں انہیں اب سلطانہ بیگم کی باتیں ٹھیک لگی تھی کیونکہ وہ انیسہ خان اور اس کے مزاج کو جانتی تھیں اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ انیسہ خان کو اس سے اور زر بخت سے کتنی نفرت ہے۔۔۔۔۔ نزہت خان کی آنکھوں کے سامنے ماضی کی تلخ اور اذیت سے بھرپور یادیں لہرائی تھی۔ جب انیسہ خان نے انہیں کم حثیت سمجھتے ہوئے گھر سے نکالا تھا۔۔۔

نزدہت کا دل بھاری ہوا۔ سانس لینے میں دشواری ہوئی۔ اور آنکھیں سے غموں کا لاوا پھٹ کے پگھلنے لگا۔۔ سلطانہ میں فلوقت کوئی بھی فیصلہ نہیں لے سکتی میں اپنی بچی کی رضا مندی

جانے بغیر اس کی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکتی۔۔۔ وہ جو کہے گئی میں وہ کروں گئی۔ نزہت خان اپنے آنسو دوپٹے کے پلو سے صاف کرتی بھاری آوازیں بولی تھی۔ وہ سلطانہ بیگم کی مزید تلخ سچائی پر مبنی باتیں نہیں سن سکتی تھی۔

نزہت آپا! اس میں رونے والی کیا بات ہے؟ ہمت کریں صبر سے کام لیں۔ انشاء اللہ اللہ ہماری زربخت کا نصیب نیک کرے گا۔ ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ آپ بیشک اس بات پہ تسلی سے سوچ لیں۔ زربخت کی رضامندی لے لیں۔ ہم انتظار کر سکتے ہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اور ویسے بھی میں جانتی ہوں زربخت بہت نیک بچی ہے! وہ آپ کا فیصلہ سر آنکھوں پر رکھے گی، اس کو اس رشتے سے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بس آپ نے اب فکر نہیں کرنی۔ آپ آرام کریں اور

خود کو پر سکون کریں ذہن کو ہر پریشانی اور فکر مندی سے آزاد کر دیں۔ جب تک میں اور شہزاد آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کو کسی رشتے دار کی ضرورت نہیں پیش آنے دیں گے۔۔۔ سلطانہ بیگم بناوٹی لہجے میں بولتی نزہت خان کو تسلیاں دینے کے ساتھ ساتھ زبردستی زربخت کو شہزاد کے ساتھ جوڑنے پہ مسلسل تکرار کر رہی تھی۔

زربخت کو اس بارے میں آپ مت بتائیے گا! میں خود اس سے بات کروں گی، اپنی بیماری کے بارے میں بھی اور اس رشتے کے بارے میں بھی۔۔۔ کیونکہ میں نہیں چاہتی زربخت کو یہ بات کسی تیسرے سے پتہ چلے اور وہ مجھ سے بدگمان ہو جائے۔ مرتے ہوئے اس کی بدگمانی اور بے رخی نہیں سہہ سکتی۔۔۔ نزہت خان رنجیدگی سے بولتی انکے آگے التجاء کر گئی تھی کیونکہ

وہ جانتی تھی سلطانہ کس طبعیت کی مالک تھی۔ وہ زربخت کو شادی کیلئے راضی کرنے کیلئے کسی حد تک بھی جاسکتی تھی۔۔۔ یہاں تک کہ نزہت خان کی بیماری کو آلہ کار بنا کے وہ زربخت کو جزباتی کر کے فیصلہ اپنے حق میں کروا سکتی تھی۔۔۔ اس لئے نزہت خان نے سلطانہ بیگم کو پہلے ہی ایسی حرکت کرنے سے منع کر دیا تھا۔۔۔ وہ تھوڑی دیر اور بیٹھنے کے بعد چلی گئی تھی اور اسکی کہی گئی باتوں نے نزہت خان کو ایک دفعہ پھر سے سوچ میں ڈال دیا تھا۔

دمیر اپنی ماں کی خلاف کیوں جائے گا؟ وہ اس کی نافرمانی کبھی نہیں کرے گا؟ وہ ان کی رضامندی کے بغیر بھلا زربخت کو کیوں اپنائے گا؟ اس کی ماں اس کی جنت ہے۔ وہ بھلا اپنی جنت کو کیوں ناراض کرے گا؟ انیسہ کبھی بھی زربخت کو قبول نہیں

کرے گی تو پھر دمیر اپنی ماں کی کیونکر حکم عدولی کرے گا؟ کیا پتہ
انیسہ نے دمیر کا کہیں رشتہ طے کر رکھا ہو؟ سلطانہ بیگم ان کو کئی
سوا لوں کے اکیلا جنگل میں الجھا گئی تھی اور نزہت خان ان
سوا لوں میں الجھی بیٹھی نکلنے کی راہ تلاش کر رہی تھی لیکن جیسے
وہ ایک سوال کا جواب ڈھونڈتی آگے انیسہ خان کا رویہ سوچتے
ہوئے وہ ایک جواب بھی دھندلا ہو کے کہیں گم جاتا ہے۔ کافی
دیر تک سوا لوں سے لڑنے کے بعد نزہت خان نقاہت سے
جنھجلاتے ہوئے تمام تر سوچوں اور خیالوں کو جھٹک کر اپنے
سارے آنسو پیتی زربخت کو آواز لگا گئی۔ کیونکہ صرف ایک یہی
نام اس کیلئے اندھیرے میں اجالا تھا۔ دکھ میں سکھ کا ذریعہ تھا۔
اداسی میں مسکراہٹ تھی، پھیکی زندگی کی رنگین رونق تھی۔۔۔
بے مقصد حیات کا خوبصورت مقصد تھی۔ زربخت کا چہرہ

دیکھ کر نزہت خان اپنی آدھی تکلیف بھول جاتی تھی۔۔

زر بخت ان کی آنکھوں کا نور اور دل کا سکون تھی۔

زر بخت!!۔۔۔ نزہت خان نے پھر سے تھوڑی اونچی آواز

میں صدا لگائی۔ شاید زر بخت ان کو سن نہیں رہی تھی اس لئے

ابھی تک باہر نہیں آئی تھی۔۔ زر بخت اندر فون پہ نزہت خان

کی ساری دوائیں نکال کر ان کی تفصیل اور کس بیماری کیلئے میں

استعمال کی جاتی ہیں، کھوجنے میں لگی ہوئی تھی لیکن اسے کچھ

بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کیونکہ ان میں زیادہ تر دوائیں بخار کی تھیں

اور ایک دو انجکشنز ایسے تھے جن کا استعمال وہ سمجھ نہ سکی۔

زر بخت۔۔۔ نزہت خان نے تیسری مرتبہ اس کو صدا لگائی

تھی۔

آرہی ہوں مورے۔۔۔ وہ ماں کی پکار سنتی جھجھلاتے ہوئے
ساری دوائیں اٹھا کے پرے رکھتی پیروں میں جوتا اڑیسے باہر کی
جانب بڑھی تھی۔

کیا کر رہی تھی؟ کب سے آوازیں دے رہوں۔۔۔ زربخت کو
کمرے سے باہر نکلتا دیکھ کر وہ اداسی سے بولی تھی۔
اندر تھی مورے! فون میں مصروف تھی! آپ کی آواز نہیں
سن سکی۔ آپ بتائیں کیا ہوا ہے؟ سلطانہ آنٹی چلی گئی؟۔۔۔ وہ
ماں کے قریب پہنچتی سلطانہ بیگم کی غیر موجودگی نوٹس کر کے
سوال کرنے لگیں۔

ہاں وہ چلی گئی ہے اور تم ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔ مجھ سے
دور نہ رہا کرو۔۔۔ میری آنکھوں کے سامنے رہا کرو۔ جب تم
آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہو تو میری آنکھوں کے آگے اندھیرا

چھانے لگتا ہے، اب تو ایسے لگتا ہے اگر تم سے ایک منٹ
بھی دور رہی تو مرجاؤں گی۔۔ اور آخری بار تمہارا چہرہ بھی
دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔۔ وہ زربخت کو اپنی طرف آنے کا
اشارہ کرتی افسردگی سے بولی تھی۔ ان کا لہجہ درد اور اذیت سے
چور تھا۔۔

کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ مورے!! میں نے آپ کو کتنی مرتبہ
سمجھایا ہے کہ ایسی مایوسی اور مجھے سے بچھڑنے کی باتیں مت کیا
کریں۔ اگر آپ نے آئندہ ایسی بات کی تو مورے!! آپ مجھ
سے بعد میں بچھڑیں گی، میں آپ کو پہلے چھوڑ کے چلی جاؤں گی
کیونکہ آپ کے بغیر مجھے بھی اس بے مقصد دنیا میں نہیں رہنا
ہے۔ آپ ہیں تو میں ہوں، آپ میری کل کائنات ہیں آپ کا ہونا
ہی میری کائنات کو مکمل کرتا ہے۔ آپ کے بغیر تو زربخت ایک

منٹ بھی سانس نہیں لے سکتی۔ آپ کیوں ایسی باتیں کر کے مجھے زرا زرا کر کے مار رہی ہیں؟۔۔۔ وہ تیزی سے نزہت خان کے سینے سے لپٹتی بھیگی ہوئی آوازیں شکوہ کرنے لگی تھی۔

زربخت کا دل ہر روز نزہت خان کی باتوں اور حالت سے چھلنی ہوتا تھا۔۔ اس کے پاس سوائے دعا کے اور اذیتوں کو برداشت کرنے کے علاوہ کوئی اور آپشن نہیں تھا۔۔ زربخت کی یہی جذباتی حالت دیکھ کر وہ اس کو حقیقت بتانے سے ڈرتی تھی۔

ارے پگلی!! تم بھی نہ میری باتوں کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہو۔ میں تو اس لئے کہہ رہی تھی کہ اکیلے بیٹھے بیٹھے بور ہو جاتی ہوں، تم میرے پاس رہا کرو۔ تمہارے آس پاس ہونے سے میری روح اور دل سکون میں رہتا ہے اور اللہ نہ کرے میری

بیٹی کو کچھ ہو۔ میری بیٹی کو اللہ صحت والی لمبی زندگی عطا
فرمائے۔ زمانے کی ہر خوشی تمہیں نصیب کرے۔ تمہیں محرم
کی بے پناہ محبت اور توجہ نصیب کرے، ساری زندگی تمہاری
جھولی سکھوں سے بھری رہے۔ خوشیاں تمہاری محتاج ہو،
زمانہ تمہارے نصیب پہ رشک کرے، تم اپنے محرم کیلئے اور وہ
تمہارے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بنے، تم اس کا ہمیشہ روشن
بخت بن کر اس کی زندگی کو اپنی ذات کی شوخی اور روشنی سے
جگمگائے رکھو۔۔ اس کی کائنات تم سے شروع ہو، تم پہ ختم ہو،
اس کی محبت اور توجہ کامرکز و محور ہمیشہ تمہاری ذات
رہے۔ اللہ میری زربخت کے نصیب اچھے کرے، تمہارے
حصے میں نیک اور بہترین ہمسفر لکھے آئیں! نزہت خان جابجا

زربخت کے سر پہ اپنے لب رکھتی اسے مزید اپنے سینے میں بھینچے
ڈھیروں دعاؤں سے نوازنے لگی تھی۔۔

آج نزہت خان کی دعاؤں میں ایک تڑپ تھی۔ قبولیت کی
تڑپ!! انہوں نے شدت سے آج اپنی بیٹی کیلئے نیک ہمسفر مانگا
تھا اور ناجانے کیوں یہ دعا دہراتے ہوئے نزہت خان کے ذہن
میں بار بار دمیر کا روشن وجہیہ چہرہ نمودار ہوتا تھا۔ دعا کے اس
سلسلے میں ایک بار بھی انہوں نے غلطی سے بھی شہزاد کے
بارے میں نہیں سوچا تھا۔ زربخت آج پہلی بار اپنی ماں کے منہ
سے اس کے ہمسفر کی دعا پہ دو بدو ہوئی تھی۔

تھوڑی سی پریشاں ہوئی تھی تھوڑی سی شرمائی تھی۔۔
پریشان اس لئے کہ اس کے دماغ میں ابھی شادی کا وہم و گمان
بھی نہیں تھا۔ اور شرمائی اس لئے کیونکہ نزہت خان نے اس

کے ہمسفر میں خوبیوں کو واضح کیا تھا۔۔ وہ ان کی دعاؤں پہ دل
میں آئین بولتی آنکھیں موندے ان کے سینے پہ سر رکھ کے سکون
لینے لگی تھی۔ نزہت خان ہمیشہ زربخت کے اچھے نصیب کی
دعا کرتی تھی لیکن اس کے سامنے اس کے ہمسفر کی خوبیاں
نہیں جتائی تھی اور شاید یہ سب سن کے وہ شرما گئی تھی۔
زربخت!! تم واقعی میں ہی اپنے محرم کے بخت کا روشن ستارہ
بنو گئی، انشاء اللہ!!۔۔۔ نزہت خان اس کے معصومیت
سے بھرے چہرہ پر نگاہ ڈالتی ہلکا سا مسکرا گئی۔
مورے!! مجھے آپ کو چھوڑ کے کہیں نہیں جانا۔۔۔ زربخت
ناک سکوڑ کے بولتی مزید شرم سے نزہت خان کے سینے میں منہ
چھپائی گئی تھی۔ اس کی یہ حرکت دیکھ کے نزہت خان کی ہنسی
کی آواز صحن میں گونجی تھی۔



کیا ہوا آپا!! نزہت خالہ نے کیا کہا ہے؟۔۔۔ شہزاد بے صبری
سے اپنی بہن کی واپسی کا انتظار گھر کی اندرونی سائیڈ گیٹ کے
قریب ٹہلتے ہوئے کر رہا تھا۔ سلطانہ بیگم کو گھر میں داخل ہوتا
دیکھ کر ہی وہ عجلت میں ان کی طرف بڑھتا سوال کر گیا تھا۔
ابھی کچھ نہیں کہا۔ وہ بول رہی ہیں سوچ کے بتاؤ گی اور دوسری
بات زربخت کی رضا مندی جان کر ہی وہ کوئی فیصلہ کریں گی۔
انہوں نے کہا ہے کہ جیسا زربخت کہے گی، وہ ویسا ہی کرے
گی۔۔۔ اب دیکھو کیا ہوتا ہے؟ فیصلہ تمہارے حق میں ہوتا ہے یا
تمہارے خلاف؟۔۔۔ سلطانہ بیگم خود کو چادر کی قید سے آزاد
کرتی سرسری لہجے میں شہزاد کو ساری صورتحال سے آگاہ کر گی۔

کیا مطلب میرے خلاف میں کچھ سمجھا نہیں؟۔۔۔ شہزاد نے ان کی آخری بات سن کر نا سمجھی سے سوال کیا تھا۔ اس کے چہرے پہ شکنیں واضح ہوئی تھی۔

تم ٹھیک کہہ رہے تھے۔ کہ نزہت آپا کا بھتیجا کام خراب کرے گا، وہی ہوا جس کا ڈر تھا وہ کہہ رہی تھی۔ شادی شدہ شہزاد کو اپنی بیٹی دینے سے بہتر میرے پاس میرے بھتیجے کا آپشن ہے۔ وہ زربخت کا ہاتھ اپنے بھتیجے کو دینا چاہتی ہیں۔ پہلے تو اس نے صاف صاف تمہارے لئے انکار کر دیا تھا لیکن پھر میں نے بھی باتوں باتوں میں انہیں انکی بھابھی کے رویے کا آئینہ دیکھایا اور ان کے رویے سے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ بس تم دعا کرو وہ دمیر کبھی بھی اب یہاں نہ آئے کم از کم تب تک تو بالکل بھی نہ آئے جب تک تمہارا زربخت سے نکاح نہیں ہو جاتا۔ ورنہ

دمیر سارا معاملہ خراب کر دے گا۔۔ سلطانہ بیگم ایک اندیشے
کے تحت فکر مندی سے گویا ہوئی۔

اس بڑھیا کو کیا مسئلہ ہے؟ میرے چار ماہ کے احسانات بھول
کے اس چار دن کے آئے بھتیجے کو رشتہ دے گی؟ تب کہاں تھا
وہ بھتیجا؟ جب آدھی آدھی رات کو میں ان کو ہاسپٹل لے
کے جاتا تھا۔ جب اتنے مہنگے مہنگے ٹیسٹ اپنی جیب سے کرواتا
تھا۔ تب نہ بھائی نے خبر لی نہ بھتیجے آئے۔ اب آکے زربخت پہ
کوئی حق نہیں جتا سکتا۔ وہ لڑکی صرف میری ہے، اس کو پانے
کیلئے میں نے پورا ایک سال پاڑ بیلے ہیں۔ اب تنی آسانی سے
اسے اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔ میں نے پتہ کروا لیا تھا
اس کل کے آئے دمیر کے بارے میں سارا۔۔ اس کی نیت
خراب ہو رہی ہے زربخت پہ، ان کو یہاں سے پروٹوکول کے

ساتھ شادی پہ لے جانا، پھر لاکھوں روپے کی شاپنگ کروانا، میں اس کی سب چالاکیاں سمجھ گیا تھا۔ وہ کیا چاہتا ہے؟ اب بس آیا!! آپ تیار رہیں مجھے زربخت سے اسی ہفتے دمیر کے واپس آنے سے پہلے پہلے نکاح کرنا ہے۔ وہ واپس آگیا تو سارا کام بگاڑ دے گا۔۔۔ نزہت خان کے ارادے اور دمیر کا نام سنتے ہی شہزاد غصے سے دھاڑا تھا۔ غصے کی وجہ سے اسکی گردن اور ہاتھوں کی رگیں تن گئی تھی۔۔۔ دمیر خان کو زربخت کے ساتھ سوچ کے ہی اس کے جسم میں چنگاریاں اٹھ رہی تھی۔۔۔ لیکن اتنی جلدی کیسے؟ زربخت کی مرضی کے بغیر ہم یہ نکاح نہیں کر سکتے۔۔۔ پہلے اس کو منانا ہوگا۔۔۔ خیر تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں زربخت کو منالوں گی جب اسے نزہت آپا کی بیماری کا پتہ

چلے گا تو وہ خود بخود ہی مان جائے گی۔۔ سلطانہ بیگم آگے بڑھ کر شہزاد کا ہاتھ پکڑتی اسے مطمئن کرنے لگی۔

آپ کو بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے! میں خود زربخت سے بات کر لوں گا، وہ اسی ہفتے نکاح کیلئے مان جائے گی، اور ہنسی خوشی مجھ سے نکاح کر بھی لے گی کیونکہ میں اس کیلئے انکار کا آپشن ہی نہیں چھوڑوں گا۔ آپ بس میرے نکاح کی تیاری کریں اور ہاں زربخت کیلئے کوئی اچھا سا نکاح کا جوڑا بھی خرید لیجیئے گا۔ بہت جلد وہ میری بن کر میری دسترس میں آنے والی ہے۔ اور دمیر کے سارے ارادے میں خاک میں ملنے والے ہیں۔ زربخت کا تو ایک ناخن بھی میں اسے دیکھنے کیلئے نہ دوں۔۔۔ شہزاد غصے سے پھولتی سانسوں کے درمیان انتشاری کیفیت میں بولا تھا۔

سلطانہ بیگم اس کے ارادے جان کر ٹھٹکی تھی۔۔ خیر وہ جو
بھی کرے گا سلطانہ بیگم اس کے ساتھ تھی۔۔

میں آج ابھی امام مسجد سے میرے اور زربخت کے نکاح
پڑھوانے کی بات کر کے آتا ہوں تاکہ عین وقت پہ وہ کہیں اور
نہ چلا جائے۔۔ شہزاد ایک نظر سلطانہ بیگم پہ ڈالتا تیز تیز قدم اٹھاتا
گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ اضطرابی کیفیت میں مبتلا تھا۔

زربخت کو پانا اس کا جنون تھا اور وہ اس وقت کوئی ذہنی مریض
لگ رہا تھا۔ سلطانہ بیگم اس کی اتنی پھرتیاں اور اضطرابی حالت
دیکھ کر

سر جھٹکتی اندر کی طرف بڑھی تھی۔

اب دیکھنا یہ تھا زربخت رمیز خان کس کے بخت کا روشن ستارہ
بنتی ہے۔ شہزاد کے یا دمیر خان کے؟؟

گڈ مارنگ میڈم!۔۔۔ انزش بزدار کی ایک ایمپلائی کچھ فائلز ہاتھ میں لئے آفس روم میں داخل ہوتی تابعداری سے اس کو مخاطب کرنے لگی جو کہ سربراہی چئیر پہ بیٹھی کچھ پڑھنے میں مصروف تھی۔

گڈ مارنگ! علیزے! آؤ بیٹھو۔۔ انزش بزدار نے فائل سے نگاہیں اٹھا کے اسے خندہ پیشانی سے جواب دیا تھا۔

میڈم! میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو؟۔۔۔ علیزے نے چئیر پہ بیٹھتے ہی مؤدبانہ طریقے سے ایک سوال کرنے کی اجازت طلب کی۔

ہمم! کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔۔۔ انزش نے فائل کے صفحے پلٹتے ہوئے مصروف انداز میں اجازت دی۔

میڈم! وہ میں پرانے پروجیکٹ کے بارے میں ہی بات کرنا
چاہتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے۔ ہمیں اب اور انتظار نہیں کرنا
چاہیے۔ آپ نے جو زمین فرید شیخ سے خریدی تھی، اس
پروجیکٹ پہ کام شروع کروادینا چاہیے۔ یہ قبضہ مافیا لوگ تو
پچھلے دو سال سے بس دھمکیاں دے رہے ہیں! کرتے کچھ
نہیں۔ اور ہم ان کے ڈر سے اپنے کاروبار کا کروڑوں کا نقصان
کر رہے ہیں۔ اگر وہ پروجیکٹ بروقت کمپلیٹ ہو جاتا تو آج
آپ کی تین چار ایسی اور ہاؤسنگ سوسائٹیز اب تک قائم ہو چکی
ہوتی، بلاوجہ ان کے ڈر سے آپ اپنا کام روک کے بیٹھی ہیں۔
ان کے پاس کوئی قانونی حق نہیں ہے اس زمین پہ قبضہ کرنے کا۔
وہ بلاوجہ آپ کو آپ کے حق سے صرف ڈرا دھمکا کے محروم کرنا
چاہتے ہیں۔۔۔ وہ سمجھداری سے مگر نرم لہجے میں بولی تھی۔

وہ اس پروجیکٹ کو لے کر کافی سنجیدہ تھی۔ علیزے پچھلے دو سالوں میں اس پروجیکٹ کے ہر پہلو پہ کام کر چکی تھی۔ سافٹ فارم میں پروجیکٹ کی چھوٹی سے چھوٹی چیز تیار تھی۔ مگر افسوس ان تیار شدہ خاکوں اور نقشے کو عملی جامہ پہنانے کیلئے انرش کی طرف سے کوئی مناسب اقدامات نہیں کئے جا رہے تھے اور یہ چیز علیزے کو بے چین کر رہی تھی۔ وہ صرف انرش کی ایمپلائی ہی نہیں بلکہ بہت اچھی دوست بھی تھی۔

ہاں علیزے تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے آج ہی وہاں جانا چاہیے۔ ویزٹ کر کے ساری ڈیٹیلز لے آتی ہوں اور پھر انشاء اللہ اگلے ہفتے سے کام شروع کروادوں گی۔ اب مجھ سے بھی ان لوگوں کی دھمکیاں برداشت نہیں ہوتی۔ اگر انہوں نے مجھے کوئی نقصان پہنچانا ہوتا ہے تو اب تک پہنچا چکے ہوتے لیکن دو

سال میں پر یکٹی کلی کیا تو کچھ نہیں بس ڈرا دھمکا کے واپس بھیج دیتے ہیں۔۔۔ انزش بزدار فائل بند کر کے پرے رکھتی اٹل لہجے میں گویا ہوئی، اسکی سوچ نڈر اور ارادے پختہ لگے۔

اوکے میڈم! جیسے آپ کی مرضی! میں چلو آپ کے ساتھ؟۔۔۔
علیزے خوشی سے چہک کے بولی تھی۔ اسے نہیں پتہ تھا انزش بزدار اتنی جلدی اس کی بات پہ متفق ہو جائے

گئی۔۔۔ علیزے کی گئی دو سال کی محنت عملی طور پر آخر کار اپلائی ہونے والی تھی اسے خوشی کیسے نہ ہوتی؟

ہاں فی الوقت تو میں نے اور تم نے ہی جانا ہے کیونکہ ڈرائیور کو میں گھر چھوڑ کے آئی ہوں بابا کے پاس، انکی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ اور ہمارے ساتھ کسی تیسرے کا جانا مناسب ہی

نہیں ہے۔ ابھی تو صرف ویزٹ کیلئے جا رہے ہیں۔ کل اپنی

پوری کنسٹرکشن ٹیم کے ساتھ جاؤں گی اور باقاعدہ طور پر
ہاؤسنگ سوسائٹی کا سنگ بنیاد رکھ دوں گی۔۔۔ وہ نشست سے
اٹھتی علیزے کو اگلے لائحہ عمل سے آگاہ کرتی اپنی چیزیں سمیٹنے
لگی۔

وہ دمیر خان کے ساتھ آسٹریلیا نہیں گئی تھی کیونکہ عین روانگی
کے وقت عامر بزدار کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ انرش اپنے باپ کو
بیماری کی حالت میں کہیں چھوڑ کے نہیں جاسکتی تھی۔ اسلئے
آسٹریلیا جانے کا پروگرام کینسل کرتے ہوئے پھر کسی وقت
کیلئے دمیر خان کے ساتھ گھومنے کا عہد کر لیا۔

اب انکل کی طبیعت کیسی ہے؟۔۔۔ علیزے آفس سے انرش
کے ہمراہ نکلتی چلتے ہوئے گوش نشین ہوئی تھی۔

الحمد للہ!! اب تو ٹھیک ہیں۔ بس بی بی اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے۔
باقی تو کافی بہتر ہیں۔۔۔۔۔ اس نے بے نیازی سے آگے بڑھتے
ہوئے نرم لہجے میں علیزے کو جواب دیا تھا۔

اللہ ان کو صحت والی لمبی زندگی عطا فرمائے اور ان کا سایہ پ
کے سر پہ قائم رکھے آمین۔۔۔۔۔ علیزے نرم گوئی سے بولی تھی۔
انزہ نے اس کی دعا پہ درمیانی آواز میں آمین دہرا کر گارڈ کو
پارکنگ ایریا سے گاڑی لانا کا اشارہ کیا۔

دو منٹ میں ہی گارڈ گاڑی لیکر آفس کی بلڈنگ کے سامنے آگیا
تھا۔ وہ علیزے کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کرتی خود ڈرائیونگ
سیٹ سنبھالتی گاڑی سٹارٹ کرنے لگی۔ علیزے کے بیٹھتے ہی
انزہ بزدار زن سے گاڑی بھگا کے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو
گئی۔

تقریباً تیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ دونوں اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچ چکی تھی۔ پوری جگہ ویران و سنسان پڑی تھی۔ دور کہیں ایک دو جگہوں پہ کنسٹرکشن کا کام ہو رہا تھا۔ علاقے کا یہ ایریا غیر آباد تھا۔ ہاں البتہ دور مختلف مقامات پر گھروں کی تعمیر جاری تھی۔ مطلب کچھ عرصے بعد یہ علاقہ رونقوں سے بحال ہونا تھا۔ دوپہر کے گیارہ بج رہے تھے۔ انرش اپنی گاڑی سے اترتی اپنے ذاتی خریدے گئے قطعے کی طرف بڑھنے لگی۔ یہ اراضی کئی ایکڑ پہ محیط تھی۔ اور ہر ایکڑ کی قیمت کروڑوں میں تھی۔ میڈم!! یہ لوکیشن تو بہت اچھی ہے۔ اگر آپ کا پروجیکٹ کامیاب ہوتا ہے تو یہ لوکیشن اپنے خوبصورت مناظر اور فن تعمیر سے شہر کی بیسٹ لیونگ سوسائٹیز میں شمار ہوگی۔۔۔ علیزے آس پاس کی خوبصورتی اور سامنے اونچی نیچی پہاڑوں کی ڈھلوانیں

، پر سکون ماحول اور تروتازہ فضا محسوس کر کے ستائشی انداز
میں گویائی تھی۔

انشاء اللہ ہم اٹالین طرز کے اپارٹمنٹس بنائیں گے۔ نہ صرف
ہماری سوسائٹی بلکہ ہمارے اپارٹمنٹس کی طرز تعمیر بھی شہر کی
بیسٹ لیونگ سوسائٹیز میں شمار ہوگی۔۔ انرش اپنی بھوری
آنکھوں میں چمک لئے پر امید سے بولی تھی۔ اگر وہ کہہ رہی
تھی کہ اس کی ہاؤسنگ سوسائٹی شہر کی بیسٹ ہاؤسنگ سوسائٹیز
میں شمار ہوگی تو سمجھ لو ہو گئی۔ انرش کو اپنی صلاحیتوں اور
قابلیتوں پہ بے تحاشا بھروسہ تھا۔ اور اسی بھروسے کے تحت
وہ ہر کام کو چیلنج کے طور پر ایکسیپٹ کرتی تھی اور چیلنج کو
پورا کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا تھا۔ اور اسی قابلیت
اور حاضری دماغی کی پیش نظر وہ شہر کی جانی مانی کاروباری

شخصیت تھی۔۔ بہت کم عرصے میں اس نے اپنے سے کئی
بڑی عمر کے تجربہ کاروں کو چھپے چھوڑ دیا تھا۔ کاروباری دنیا کا ہر
دوسرا بندہ اس کی پر اعتمادی اور کامیابیوں سے متاثر نظر آتا
تھا۔۔

انشاء اللہ میڈم!! اس پروجیکٹ کی کامیابی کے بعد ہم اپنے
اسی کام کی توسیع کریں گے اور اس شہر اور اس کے لوگوں کو
بہتر سے بہترین چھت مہیا کریں گے۔۔۔ عزیزے تفاخر بھری
نظروں سے انرش کو دیکھتی اس کی بات کی وضاحت کرنے لگی۔
عیزے!! تم ایریا دیکھ لو، اور گراؤنڈ بیس پہ کیسا کام کروانا ہے
سب ڈیسائیڈ کر لو، اور اپنا سارا دو سال کا کام اس پروجیکٹ
سے ریلیٹڈ مجھے میل کر دینا، میں ڈیٹیلز چیک کر کے انجنیئرز کو اپنی
سوسائٹی کا نقشہ بھیج دوں گی۔ پھر وہ ہمیں اس حساب سے

بجٹ کی تفصیل دیں گے۔۔ انزش بزدار دھوپ کی سنہری
کرنوں سے چنے کیلئے ایک ہاتھ اوپر اٹھا کے اپنی آنکھوں کے
آگے سایہ کرتی سنجیدگی سے اس سے مخاطب ہوئی تھی۔
او کے میڈم! میں آپ کو سارا ڈیٹا میل کر دوں گی۔۔۔ وہ اس
کے سامنے آتی خوشدلی سے گویا ہوئی۔

میڈم! آپ خوش ہیں اس پروجیکٹ کو سٹارٹ کرنے میں
؟۔۔۔ علیزے نے ایسے ہی عام سا سوال کیا۔
ہاں افکورس خوش ہوں لیکن خوشی تب راس آئے گی جب
قبضہ مافیا والوں سے جان چھوٹے گی۔۔۔ انزش بزدار سامنے
سے آتے موٹر بائیک پہ دو آدمیوں کو دیکھ کر سخت لہجے میں بولی
تھی۔ اس کے چہرے کی خوشی غائب ہوئی تھی۔ تیکھے نقوش
غصے سے تنے تھے۔ جسم میں حقارت کا وبال اٹھا تھا۔

میڈم جی! آپ کو کون سی زبان میں سمجھاؤں؟ اس جگہ کے خواب دیکھنا چھوڑ دیں۔ یہ جگہ کل بھی ہماری تھی اور آئندہ بھی ہماری ہی رہے گی۔ آپ کو بارہا بتا چکا ہوں، یہاں مت آیا کریں۔ کسی دن آپ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گی۔ پھر یہ زمین آپ کے کام نہیں آئے گی۔۔۔ سامنے سے آتی بائیک کچھ قدم کے فاصلے پر رکی تھی، دونوں آدمی بائیک سے نیچے اترے تھے، ان دو آدمیوں میں سے ایک آدمی خباثت بھری نگاہ انزش بزدار اور علیزے پہ ڈالتا کمینگی سی مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ اپنے چچھے کسی کی بھاری مردانہ آواز سن کر علیزے تعجب سے چچھے مڑی تھی اور اپنے بالکل قریب دو بد معاش غنڈوں کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اچھلی تھی۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پستل تھا۔ علیزے پستل کی طرف دیکھتی فوراً ڈرتے ہوئے انزش

بزدار کے چھپ چھپ گئی۔ اس کیلئے یہ سب کچھ نیا تھا۔ اس کا
ڈرنا بنتا تھا لیکن انرش بزدار بغیر کسی ڈر اور خوف کے اپنی جگہ پہ
جمی رہی، اس کی پلکوں میں ڈر سے جنبش بھی پیدا نہ ہوئی کیونکہ
وہ ان لوگوں کو مہینے میں ایک بار ضرور فیس کرتی تھی۔ اسے
اب انکی عجیب شکلوں اور دھمکیوں کی عادت ہو گئی تھی۔
میڈم! آفس چلتے ہیں۔۔۔ مجھے یہ لوگ بہت خطرناک لگ رہے
ہیں کہیں ہمیں نقصان نہ پہنچا دیں۔۔۔ آس پاس ہماری مدد کیلئے
بھی کوئی نہیں ہے۔۔۔۔۔ علیزے کی نگاہ پسٹل پہ جمی ہوئی تھی۔
وہ خوف سے تھوک نکلتی انرش بزدار کے کان میں منمنائی۔ ڈر
کی وجہ سے اس کے ہاتھ اور جسم ہلکا سا کپکپا رہا تھا۔
نہیں تم تو کہہ رہی تھی کہ یہ لوگ صرف دھمکیاں دیتے ہیں۔
کرتے کچھ نہیں ہیں تو ہم آج دیکھ کے جائیں گے، یہ آخر کچھ کر

بھی سکتے ہیں کہ نہیں؟۔۔۔ انزش بزدار کو جہاں ان غنڈوں کو دیکھ کر غصہ آرہا تھا وہی پہ عزیزے کی لرزتی آواز اور کپکپاتا جسم دیکھ کے ہنسی بھی آرہی تھی۔ جو باتیں تو اتنی بڑی بڑی کر کے اسے یہاں لے آئی تھی لیکن یہاں آکر صرف غنڈوں کو دیکھتے ہی اس کی ہوا ٹائٹ ہو گئی تھی۔

میڈم!! مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ پسٹل بھی ساتھ لے کر دھمکی دینے آتے ہیں۔ مجھے لگا تھا، یہ صرف باتوں سے ہی وارن کر کے چلے جاتے ہیں۔۔۔ وہ حالتِ اضطرابی میں انزش بزدار کے بازو پہ اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتی لڑکھڑاتے لہجے میں گویا ہوئی۔ کچھ نہیں کر سکتے یہ ہمارا!! میں بات کرتی ہوں۔۔۔ انزش اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑواتی اسے مطمئن کرتے ہوئے دو قدم ان دونوں آدمیوں کی طرف بڑھی تھی۔

ہاہا ہاہا!! اور یجنل پیپرز؟ واقعی آپ کو لگتا ہے۔ کہ ہم آپ کے
اور یجنل پیپرز کی وجہ سے آپ کو اس اراضی پہ قبضہ جمانے دیں
گے؟ میڈم!!! یہ ہمارا علاقہ ہے۔ یہاں پہ پیپرز نہیں بلکہ پوسٹل

چلتے ہیں اور اس ایک ہتھیار سے سارے پھنسنے ہوئے الٹے کام
سیدھے ہو جاتے ہیں۔ ہم دو سال سے صرف آپ کے عورت
ذات ہونے کی وجہ سے آپ کو پیار سے سمجھاتے آئے ہیں لیکن
آپ ہماری پیار کی زبان کو خاطر خواہ میں ہی نہیں لا رہی ہیں۔
ہمیں مجبور مت کریں کہ ہم آپ کو گولیوں کی زبان سمجھائیں۔
اور گولیوں کی زبان سمجھنے کے بعد شاید ہی آپ آگے کوئی بھی کام
کرنے یا سمجھنے کے قابل رہیں؟۔۔۔ ان میں سے ایک آدمی اپنی
پسٹل سے سر کھجاتا دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

چلیں آج پھر سمجھا ہی دیں یہ پسٹل والی زبان!! میں بھی تو
دیکھوں تم جیسے نامردوں میں کتنا دم ہے؟ اور دوسری بات اس
اراضی کے خواب دیکھنا تم لوگ بھی چھوڑ دو کیونکہ میں ہر حال
اور ہر صورت میں اس پروجیکٹ کو کمپلیٹ کروں گی۔ میں بھی

دیکھتی ہوں کون مائی کا لال مجھے روکتا ہے۔ میں نے کبھی اپنے
حق سے دستبردار ہونا سیکھا ہی نہیں ہے۔ ہے دم تو مجھے پھر
روک کے دیکھاؤ!۔۔۔ انزس بزدار اپنی گردن کھڑی کرتی
ٹھوس لہجے میں بولی۔ اس کے ارادے چٹانی تھے اور لہجہ پختہ
تھا۔ اس نے بنا خوف و خطر اپنے سامنے دو ہٹے کٹے غنڈے
نما آدمیوں کو چیلنج کیا تھا۔

نہیں میڈم! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ مجھے لگتا ہے ہمیں آفس
واپس چلنا چاہیے۔ پلیز میڈم! ان کو دفعہ کریں ان کو بعد میں دمیر
سر دیکھ لیں گے! ہم یہاں سے چلتے ہیں۔۔۔ علیزے اس کی
باتیں سن کر تیزی سے اسکی طرف بڑھتی بھاری ہوتی آواز میں
ملتی ہوئی تھی۔ اسے انزس بزدار کی ہمت پہ حیرت ہو رہی تھی
جو دو جوان مضبوط مردوں کو اپنے خلاف ایکشن لینے پہ اکسا رہی

تھی۔ اس پہ تضاد وہ ان کے ہاتھ میں پسٹل دیکھ کے بھی نہیں
ڈر رہی تھی۔ علیزے کو اس کی دلیری پہ استعجابیت ہو رہی
تھی۔

تمہاری اتنی ہمت کہ تم ہمیں نامردی کا طعنہ دو؟ ایک منٹ نہیں
لگے گا۔ تمہارے وجود کے ایک ایک اعضا کو ادھیڑ کے اس پہ
اپنی مردانگی کی مہریں ثبت کرنے میں۔ اور مہریں اتنی شدت
سے ثبت ہوں گی کہ سالوں تمہارا نازک وجود انکی تپش اور
نشانات نہیں بھول پائے گا۔۔۔ ان میں سے ایک آوارہ آدمی
بے حد غلاظت بھرے الفاظ کا استعمال کرتا گھٹیا پن پہ اتر آیا
جبکہ دوسرے آدمی کا یہ باتیں سن کر خباثت بھرا قہقہہ فضا میں
گو نجا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی کی پیٹھ تھکتے ہوئے اس کو سراہا
تھا۔

ان کے ارادے جان کے عزیزے کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔
آنکھیں اتنی غلیظ بات سن کے پھیلی تھی جبکہ انزس بزدار کا
نورانی مغروری چہرہ شرم اور غصے سے تانبے کی طرح دھک کے
لال ہوا تھا۔ جسم میں انتقام کے بھانہ بھڑ جلے تھے۔۔ وہ شدید
غصے میں اپنی مٹھیوں کو بھینچ گئی۔ پورے وجود میں غصے سے اور
انتشاریت میں چیونٹی رینگنے لگی۔ اور پھر اگلے ہی پل اس کا
ضبط جواب دے گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنی بند مٹھی کھولی
اور پوری قوت لگا کر ایک زناٹے دار تھپڑ اس آدمی کے منہ پر
جھڑ دیا جس نے اس کیلئے ایسے غلیظ الفاظ استعمال کئے تھے۔
انزس بزدار کے نازک ہاتھ کا تھپڑ دور تک گونجا تھا۔ بے شک
تھپڑ نازک ہاتھوں سے لگا تھا لیکن اتنی قوت سے لگا تھا کہ اس

آدمی کا منہ دوسری سائیڈ پہ لگ گیا۔ اور انزس بزدار کی لمبی
محرومی انگلیوں کے نشانات اس کے گال پہ چھپ گئے تھے۔
آئندہ کے بعد میرے وجود پہ نشانات ثبت کرنے سے پہلے اپنے
غلیظ چہرے پہ یہ نشانات ضرور دیکھ لینا۔ آج تو تھپڑ سے تمہیں
تمہاری اوقات یاد دلائی ہے۔ اگلی بار حلق میں ہاتھ ڈال کے تیری
پلید زبان کھینچ کر آوارہ کتوں کے آگے ڈال دوں گی۔۔۔ انزس
بزدار جبرے بھینچے ایک ایک لفظ چبا کر بولتی اپنی غصے سے سرخ
ہوتی آنکھوں کے ساتھ وارن کر گئی۔ علیزے ہونق بنی سارا
منظر دیکھتی اپنی جگہ پہ سٹل ہوئی تھی۔۔۔ وہ آدمی اپنے گال پہ
ہاتھ رکھے بے یقینی سے انزس کو دیکھ کے رہ گیا تھا جس نے
تھپڑ ایسا مارا تھا کہ اس سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا وہ اس لڑکی
کے بے دھڑک انداز پہ گنگ ہوا تھا۔

تمہاری جرأت کیسے ہوئی اس پہ ہاتھ اٹھانے کی؟ بد لحاظ
عورت!۔۔۔ دوسرا آدمی اپنے ساتھی پہ ہونے والے اچانک
حملے پہ آگ بگولہ ہوتا انزس کی طرف نقصان پہنچانے کے
ارادے سے بڑھاتا تھا۔ اس کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اس نے آؤ
دیکھا نہ تاؤ ایک زناٹے دار تھپڑ اسکے گال پہ بھی جھڑ دیا۔۔ وہ
آدمی تھپڑ کی شدت سے لڑکھڑایا تھا۔

ایسے جرأت ہوئی۔۔۔ انزس بزدار اس کے کالر سے پکڑ
جھنجھوڑتے ہوئے، یکے بعد دیگر کئی بھاری تھپڑ اس آدمی کے
گال پہ مارتی اپنا غصہ اترنے لگی تھی۔ وہ آدمی اس اچانک اتفادیہ
پہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر ہوا تھا۔

ایسے جرأت ہوئی!! ایسے جرأت ہوئی!!۔۔۔ وہ ساتھ ساتھ
اسے یاد دہانی کرواتی اس آدمی کا چہرہ اپنے تھپڑوں کے وار سے

لال کر گئی۔ انزش بزدار کو غصہ بہت کم آتا تھا لیکن جب آتا تھا تو وہ بنا سوچے سمجھے کسی سے بھی الجھ کر سب کچھ تباہ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

میڈم!۔۔۔۔۔ علیزے نے بے یقینی سے کانپتے ہوئے انزش کو پکارا تھا۔ جو جنونی ہوتی اس آدمی پہ وار کر رہی تھی۔ وہ آدمی کافی تھپڑ کھانے کے بعد سنبھلتا ہوا ایک چھٹکے سے انزش بزدار کو گردن سے جکڑ گیا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت اتنی سخت تھی کہ اس کا دم گھٹنے کی وجہ سے ایک منٹ میں ہی چہرہ سرخ ہونے لگا۔ دوسرا آدمی تیزی سے آگے بڑھتا انزش کو اس کے بھورے بالوں سے جکڑ کر ایک چھٹکے میں اٹھا کے چھپے زمین پہ پٹک گیا۔ یوں زور سے سڑک پہ پٹکے جانے پر انزش بزدار کی کراہ بے ساختہ تھی۔ چھپے بازو لگنے کی وجہ سے دونوں کہنیاں

زخمی ہونگی اور ان میں سے خون رسنے لگا جو کہ اس کی وائٹ
سلک کی ڈریس شرٹ سے واضح طور نظر آ رہا تھا۔

میڈم!!۔۔۔ علیزے کی چیخ بے ساختہ تھی۔ وہ اپنے منہ پہ

ہاتھ رکھے سہمتے ہوئے انزس بزدار کی طرف بڑھی لیکن ان

میں سے ایک آدمی نے اسے چھب دھکا دیتے ہوئے ہسپتال تان

کے دور رہنے کی تلقین کی۔۔۔ وہ ہسپتال کی نالی اپنی طرف ہوتی

دیکھ کر وہی زمین پہ ساکت ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے

اپنی پلکوں کی جنبش اور سانس بھی روک لی کہ وہ ذرا سی بھی

ہلی تو وہ اسے گولی مار دیں گے۔ اب خوف اور ڈر سے علیزے کا

چہرہ آنسو سے تر ہو رہا تھا۔ دل بند ہونے کے درپے تھا۔ پورا

جسم جان جانے کے ڈر سے کانپ رہا تھا۔ وہ آنسوؤں سے

بھری آنکھوں سے انزس بزدار کو دیکھ رہی تھی۔

جتنے نشانات تم نے میرے گال پہ ثبت کیے ہیں، اس سے کئی
گناہ زیادہ میں تمہارے جسم پہ ثبت کروں گا۔ اور ابھی کروں گا،
یہی پہ کروں گا، سرعام دن دھاڑے کروں گا۔۔۔ جس آدمی
کے چہرے پہ انزس بزدار نے مکوں کی برسات کی تھی، وہ نیچے
جھک کر اس کو جبرے سے جکڑ کر اس کے چہرے پہ شدید غصے
کے عالم میں دھاڑا تھا۔

آخ تھو!! تم مجھے جانتے نہیں ہو میں کون ہوں؟ میں انزس بزدار
ہوں!! تمہاری چمڑی ایسے ادھیڑوں گی کہ تم خود کو پہچاننے سے
انکار کر دو گے۔۔۔ اپنی حالت کو دیکھ کر تم دھاڑیں مار مار کر رو
گے۔۔۔ وہ اس کے منہ پہ تھوکتی ہوئی غصے سے گرجی
تھی۔ مقابل بھی کوئی عام بندی نہیں تھی بلکہ انزس بزدار تھی
جس نے آج تک ڈرنا کسی سے سیکھا ہی نہیں تھا۔ بے شک وہ

جوان مرد اس سے چار گناہ زیادہ طاقت کے مالک تھے لیکن مقابلہ کرنے کی بجائے ان کے آگے گر گڑانا انزس بزدار کیلئے اسکی ذات کی توہین تھی۔ اس کیلئے ان کے آگے رحم کی بھیگ مانگنے اور گر گڑانے سے بہتر موت تھی۔ وہ کبھی بھی ان کے آگے نہیں جھکے گی، جھکنا اس کے اصولوں کے خلاف تھا۔

چلو آجاؤ!! تمہیں آج اپنی مردانگی دیکھتا ہوں اور تمہیں بھی اچھے سے دیکھ لیتے ہیں، جان پہچان کر لیتے ہیں کہ تم کون ہو؟ لیکن مجھے لگتا ہے، اگر میں نے تم جیسی نازک گھمنڈی تتلی کو تمہارا تعارف بتایا تو پھر آئندہ تم کہیں بھی اپنا تعارف دینا تو دور منہ دیکھانے کے لائق بھی نہیں رہو گی۔۔۔ وہ آدمی اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیر کے انزس بزدار کا تھوکا گیا صاف کرتا، اس کو ایک ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے سڑک کے دوسری سائیڈ نیچے کچی زمین پہ

لے جانے لگا۔ روڈ اونچی تھی جبکہ روڈ کے ساتھ والی ساری
زمین تین چار فٹ نیچے گہرائی میں تھی۔

چھوڑو مجھے بے غیرت انسان!! تمہارا تو میں وہ حال کروں گی
کہ تمہاری سات نسلیں یاد رکھیں گی۔ مرد ہو تو مرد کی طرح مقابلہ
کر کے دیکھاؤ!! ایسے نامردوں کی طرح اوچھے ہتھکنڈے مت
اختیار کرو۔۔۔ انزس مزاحمت کرتی اپنی ٹانگ چھڑوانے کی
کوشش کرتے ہوئے غصے سے چلائی تھی۔ نیچے گھسیٹے جانے کی
وجہ سے اس کی شرٹ بے ترتیب ہو رہی تھی اور کمر چھل رہی
تھی۔

مرد ہوں تمہیں وہی تو دیکھانا ہے۔ جب تک عورت ذات کو اپنی
مردانگی نہ دیکھائی جائے تو وہ ساری زندگی نامردی کے طعنے مارتی
رہتی ہے۔ یہ عورت ذات بھی بڑی عجیب ہے جب مردانگی

دیکھاؤ تو پھر کہتی ہے کہ یہ اوجھے ہتھکنڈے ہیں۔۔۔ وہ آدمی
انزس بزدار کو گھسیٹتے ہوئے سڑک سے نیچے کچی زمین پہ دھکیلتا
غلاظت سے بولا تھا۔ جبکہ دوسرا آدمی یہ سارا منظر انجوائے کرتا
ہنوز علیزے پہ پسٹل تانے کھڑا تھا۔

پلیز!! میڈم کو چھوڑ دیں۔ پلیز ہمیں معاف کر دیں۔ ہم آئندہ
یہاں کبھی بھی نہیں آئیں گے۔ ساری اراضی آپ لوگ رکھ
لیں لیکن ہمیں جانے دیں۔۔۔ آپ لوگوں کو اللہ کا واسطہ ہے!
ہم پہ رحم کریں۔ میڈم کو چھوڑ دیں۔ ان کی طرف سے میں آپ
دونوں سے معافی مانگتی ہوں۔ پلیز ہمیں جانے دیں۔ ہمیں
معاف کر دیں۔ میڈم کی عزت کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔۔۔
انزس کو اپنی آنکھوں سے اوجھل ہوتا دیکھ کر علیزے ہچکیوں
سے روتی ہاتھ جوڑ کر اپنے سر پہ کھڑے آدمی سے التجائیں کرنے

لگی تھی۔۔ یہاں پہ آنے کا فیصلہ اس کو اپنی زندگی کا سب سے غلط فیصلہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ آدمی بنا کچھ بولے علیزے کی التجائیں انجوائے کر رہا تھا۔۔ علیزے بے بسی سے بیٹھی روتے ہوئے کسی معجزے کا انتظار کر رہی تھی جس سے ان دونوں کی جان اور عزت دونوں بچ جائیں۔۔ دوسرا آدمی چھلانگ لگا کر انزس بزدار کے پاس نیچے کچی زمین پہ اتر ا تھا۔ یہ منظر دیکھتے ہوئے علیزے نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مدد کیلئے، انزس کی طرف جانا چاہا لیکن اس کے سر پہ کھڑے آدمی نے اسے زور سے دھکا دے کے دوبارہ زمین پہ پٹکا تھا۔ دوسرے آدمی کو انزس بزدار کے پاس نیچے جھکتے ہوئے دیکھ کر علیزے اپنی آنکھوں کے آگے ہاتھ رکھے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی تھی۔

چند لمحے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ایک لڑکی کی عزت کو داغ دار کر سکتے ہیں۔ ایک زندگی کو جینے سے محروم کر سکتے ہیں۔ کسی کا وقار مجروح کر سکتے ہیں۔ کسی کی آنے والی ساری زندگی تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ عزیزے پہ سب کچھ سوچتے ہوئے بے جان ہو رہی تھی۔ سانسیں حلق میں پھنس گئی تھی لیکن وہ ان چند لمحوں کو بدلنے کی، ان کا رخ موڑنے کی استطاعت نہیں رکھتی تھی۔ وہ کمزور اور لاچار تھی۔ عزیزے نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے شدت سے اپنی بھیگی پلکوں سے اللہ تعالیٰ سے مدد کی درخواست کی تھی۔

چھوڑو مجھے!! انزس مسلسل مزاحمت کرتی ہوئی اس آدمی کو خود سے دور دھکیل رہی تھی۔۔ اس کی آوازیں عزیزے پہ کپکپی طاری کر رہی تھی۔ اس نے شکستہ ہوتے ہوئے اپنا سر جھولی

میں ڈالتے ہوئے اپنے ہاتھ کانوں پہ رکھ لئے تھے۔ وہ نہیں سن سکتی تھی انزس بزدار کی بے بسی کی آوازیں۔۔۔ علیزے نے ابھی کانوں پہ ہاتھ رکھا ہی تھا جب چھپے سے گاڑی کے ٹائروں کی چرڑ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ اس نے فوراً اپنا سر اٹھا کر چھپے مڑ کر دیکھا۔

اور گاڑی سے رائم خان کو بجلی کی تیزی سے نکلتا دیکھ کر علیزے کے آنسوؤں سے تر چہرے پہ مسکراہٹ دوڑی تھی۔ ایک امید آئی تھی، ایک معجزہ ہوا تھا۔ ایک مدد بھیجی گئی تھی۔ ایک دعا قبول کی گئی تھی۔ ایک محافظ بھیجا گیا تھا نہیں بلکہ کوئی انسانی روپ میں فرشتہ بنا کر اللہ تعالیٰ نے رائم خان کو یہاں بھیجا تھا۔ وہ امید کی کرن، وہ زخم پہ مرہم، وہ مشکل میں آسانی، وہ تکلیف میں راحت، وہ اندھیرے میں اجالا، وہ تپش میں ٹھنڈک، وہ

نکلتی سانسوں میں حیات، وہ درندوں میں رحم دل، وہ بے عصمت میں عصمت کا محافظ بن کر آیا تھا۔ وہ اس وقت کیا کچھ نہیں لگ رہا تھا۔ ایک ساتھ کتنے ہی شکرانے کے لفظ علیزے کے منہ سے ادا ہوئے تھے۔

سر!! علیزے نے ایک امید اور عزم کے تحت رائم خان کو پکارا تھا۔ وہ تن فن کرتا ایک جست میں قریب آیا اور ایک زوردار مکا علیزے پہ پسٹل تانے آدمی کی پیٹھ میں جھڑتا اس آدمی کو کچھ بھی سمجھ لگنے سے پہلے اس پہ حملہ آور ہوتے ہوئے اسے زمین بوس کر گیا تھا۔ اس آدمی کے ہاتھ سے پسٹل چھوٹ کے دور جا گرا تھا۔

رائم خان اسے گردن سے پکڑ کر سیدھا کرتا اس آدمی کے اوپر بیٹھتے ہوئے اندھا دھند اس کے چہرے پہ اپنی وزنی ہاتھوں کے

مکے برسائے شروع کئیے تھے۔ رائم خان بنار کے جنونی انداز میں اس آدمی پہ حملہ کر رہا تھا۔ علیزے کی حالت دیکھ کے ہی اس کا پارہ ساتویں آسمان کو پہنچ رہا تھا۔ رائم خان جبرے بھینچے انتشاری کیفیت میں اپنے مکوں کی برسات سے دو منٹ میں ہی اس آدمی کا چہرہ لہو لہان کرتا اس ادھ منہ کر گیا تھا جبکہ دوسرا آدمی تھوڑا سا سر اٹھا کر اوپر سڑک کی طرف کسی مرد کو اپنے ساتھی کو پیٹتا دیکھ کر تیزی سے انزس بزدار کے منہ پہ ہاتھ رکھتا اسکی آواز دبانے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ مزاحمت کرتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے منہ سے ہٹانے کی سعی کر رہی تھی۔ مس انزس کہاں ہے؟۔۔۔ رائم خان اپنی لہو چھلکتی آنکھیں ارد گرد گھوما کے، اونچی آواز میں ڈری سہمی بیٹھی علیزے سے استفسار کر رہا تھا۔ اس کے پورے جسم میں ایک عجیب سی

بے چینی دوڑ رہی تھی اور یہ بے چینی انزس بزدار کو دیکھنے کے
بعد ختم ہونی تھی۔۔

خان!۔۔۔ رائم خان کی آواز سنتے ہی انزس زور سے اس آدمی
کے ہاتھ پہ دانتوں کا وار کر کے اس کا بھاری ہاتھ اپنے منہ سے
ہٹا تھا۔

مسٹر خان!۔۔۔! انزس بزدار نے مزید ایک اونچی آواز رائم
خان کو لگائی۔

مس انزس!!۔۔۔ انجانی جگہ سے اس کی پکار سن کر وہ تڑپ
کے اٹھتا اس آدمی کے سینے پہ لات مار گیا۔ وہ آدمی کراہتا ہوا
درد سے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھے کروٹ بدل گیا۔
مس انزس!!۔۔۔ رائم خان اپنی کرسٹل گرے آنکھیں اور گرد
دوڑاتا انزس کو دیوانوں کی طرح تلاشنے لگا تھا۔

سر! میڈم۔۔ وہاں۔۔ ہے۔۔! عزیزے اپنے آنسو صاف کرتی ہچکیوں سے بولتے ہوئے انزش بزدار کی جگہ کی نشاندہی کی تھی۔

مس انزش!!۔۔ وہ اندھا دھند عزیزے کے اشارے کی سمت دوڑا تھا، مطلقہ جگہ پہ پہنچتے ہی انزش کی حالت دیکھ کر رائم خان نے اسے بے بسی سے پکارا تھا۔ اس غلیظ آدمی کو انزش بزدار کے منہ پہ ہاتھ رکھے دیکھ کر رائم خان بارکزی کے خون میں ابال اٹھے تھے۔ اس کے ہاتھ اور گردن کی رگیں طیش میں مزید پھولی تھی۔ وہ آدمی بھاگنے کی بجائے انزش کو بالوں سے جکڑتا اپنے آگے کر گیا۔

دور رہو مجھ سے ورنہ اس کی گردن مروڑ کے رکھ دوں گا۔۔۔ وہ آدمی انزش بزدار کی گردن کے گرد اپنا ہاتھ ریپ کرتا وارنگ

دینے لگا جبکہ انزس کے منہ اور گردن پر اس آدمی کے ہاتھوں کی
گرفت دیکھ کر رائم خان کے جسم میں چنگاری اٹھ رہی تھی۔
انزس کی آنکھیں خشک تھیں، لیکن اس کے چہرے پہ اب ایک
خوف واضح تھا وہ خوف موت یا کسی اور چیز کا نہیں تھا بلکہ وہ
خوف عزت داغ دار ہونے کا تھا۔

انزس کا چہرہ کھروچوں سے بھرا تھا، بھورے بال بکھرے
ہوئے تھے، سفید شرٹ ساری مٹی سے بھری ہوئی
تھی۔ انزس بزدار پر امید سے رائم خان کو دیکھ رہی تھی جو
اپنی مٹھیاں بھینچتا ایک دم سے اس آدمی کے پیٹ میں وار کر
گیا تھا اور ساتھ ہی اپنی کہنی اس آدمی کے ناک پہ دے ماری۔
پیٹ اور ناک پہ زور دار مکا لگنے کی وجہ سے اس آدمی کی گرفت
انزس پہ ڈھیلی ہوئی تھی۔ اس آدمی کی ناک سے خون فوارے کی

طرح چھوٹا تھا۔ رائم خان ایک جست میں انزس کو اپنی طرف کھینچ کر اس آدمی کی پہنچ سے دور کر گیا۔ وہ اس کو اپنے پیچھے کرتا اب اس آدمی کے حملے کیلئے تیار ہونے لگا، وہ آدمی اپنے ہاتھ کی پشت سے، ناک سے بہتا خون صاف کرتا، غصے سے جبرے بھینچ کے رائم پہ حاوی ہوا تھا۔ رائم خان اس کے ہروار کا منہ توڑ جواب دے رہا تھا۔ وہ سیدھے اس کے منہ پہ وار کر رہا تھا جبکہ وہ آدمی بھی جوابی کارروائی سے رائم خان کو اچھا خاصا زخمی کر چکا تھا۔

آپ جائیں یہاں سے مس انزس۔۔۔ رائم خان نے اس آدمی کے منہ پہ مکا جھڑتے ہوئے اپنے پیچھے پریشان کھڑی انزس بزدار کو سختی سے حکم دیا۔ خدا نخواستہ انزس کے ساتھ کچھ غلط ہو جاتا تو؟ مسلسل یہ سوچتے ہوئے رائم خان اس آدمی کو

جانوروں کی طرح پیٹ رہا تھا۔ یہ خیال ہی جان لیوا تھا۔۔ اور
اسی بھیانک خیال کے تحت رائم خان کا ہلکا سا جسم اور ہاتھ
کپکپا رہے تھے۔ محبوب کو کھونے یا زرا سی آنچ بھی آنے پر
انسان کو اپنی روح فنا ہوتی نظر آتی ہے۔۔ رائم خان کو بھی
انزس بزدار کی حالت دیکھ کر اپنی روح فنا ہوتی نظر آرہی تھی
۔۔ وہ اب ڈری ہوئی نہیں تھی۔ بلکہ اس کے چہرے پہ رائم
خان کیلئے فکر مندی دوڑ رہی تھی۔۔ وہ اپنے نازک ہاتھ اس کی
پیٹھ پہ رکھتی اسے روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

جائیں یہاں سے مس انزس! آپ کو سنائی نہیں دے رہا؟۔۔۔
انزس کو یہی جملے دیکھ کر اب کی بار وہ دھاڑا تھا۔ رائم خان کے
ہونٹوں اور بائیں گال سے خون لکیر کی صورت میں بہہ کر گردن
کی طرف سفر کر رہا تھا۔ کر سٹل گرے آنکھیں غصے اور طیش

سے لال انگارہ ہو رہی تھی۔ ڈارک براؤن بال ماتھے پہ بے ترتیب تھے۔ وہ اس کا یہ انداز دیکھ کر چونکی تھی۔ وہ کبھی بھی اتنا شدت پسند تو نہیں تھا؟ اس کی طبیعت جنونی تو نہیں تھی؟ وہ تو عام سا سادہ سہل مزاج انسان تھا۔ وہ اتنا جنونی تو نہیں تھا۔ اس کی طبیعت میں معصوم سا شوخا پن اور ٹھہراؤ تھا۔ وہ تو ہمیشہ بچوں والی حرکتیں کرتا تھا۔ وہ اس کی جنونی کیفیت دیکھ کے دو بدو ہو رہی تھی۔۔۔ علیزے موقع پاتے ہی اٹھ کے گاڑی کی طرف بھاگی تھی، وہ کانپتے ہاتھوں سے اپنا بیگ تلاشنے لگی تاکہ بروقت پولیس کو بلا کے رائم خان کی مدد کی جا سکے۔

ان دو ہٹے کٹے غنڈوں کو روکنا اکیلے رائم خان مشکل ہو جائے گا۔ اسی سوچ کے تحت علیزے تیزی سے اپنا بیگ تلاش کر کے فون نکالتی پولیس کو مدد کیلئے بلانے لگی جبکہ انزش بے یقینی سے

رائم خان کی حالت دیکھتی چھبھٹ کے گاڑی کی جانب بڑھ گئی۔ وہ ابھی تک اس آدمی سے الجھا ہوا تھا لیکن وہ رائم خان سے زیر نہیں ہو پا رہا تھا۔ رائم خان اپنے بار بار کے حملوں کو بے سود جاتا دیکھ کر اس آدمی کو ایک بازو سے پکڑ کر اس کے بازو کو چھبھکی طرف گھوما کے اپنے کندھے پہ رکھ کر ایک جست میں اسے نیچے کی طرف دبا کے بے رحمی سے توڑ گیا۔ ہڈی ٹوٹنے سے بازو دو حصوں میں تقسیم ہوا تھا۔ اس آدمی کی دلخراش کراہ فضا میں گونجی تھی۔ ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز بخوبی رائم خان کے کانوں نے سنی تھی اور ایک راحت کا ذریعہ بن کر اس آدمی کی درد بھری کراہ اس کے سینے میں اتری تھی۔

اپنے ساتھ کی کراہ سن کر سڑک پہ آدھ منہ پڑا آدمی اٹھ کے ہسپتال کی طرف بھاگا تھا۔ وہ انتقام کی آگ میں جلتا ایک چھٹکے

سے نیچے کچی زمین پہ اپنے ساتھ ہی پہ وار کرتے رائم خان کے سر
کا نشانہ باندھ گیا۔

مسٹر خان!!۔۔۔ یہ سب کچھ تھوڑے فاصلے پہ کھڑی انزش
بزدار دیکھتی چیخ اٹھی تھی۔۔۔ رائم خان اس کی چیخ پہ چھبڑ
کے دیکھتا، جب نظر سامنے آدمی کی تانی پسٹل پہ پڑی۔ وہ فوراً
اپنا بچاؤ کرتا تھوڑا سا سر چھپ کر گیا لیکن گولی پسٹل سے نکل چکی
تھی۔ اور وہ بجلی کی تیزی سے ہوا چیرتی ہوئی رائم خان کے سر کو
چھوڑ کر کندھے میں پیوست ہو گئی تھی۔ انزش کے منہ سے
اذیت ناک چیخ نکلی تھی۔۔۔ دل اچھل کے حلق میں آیا تھا۔
چہرے پہ خوف کے سائے منڈلائے تھے۔

وہ بھاگ کر اس آدمی کو دھکا دے کر نیچے گراتی اس کو مزید
گولیاں چلانے سے قاصر کر گئی تھی، اس آدمی کے نیچے گرنے کی

وجہ سے ہسپتال دور جا کے گرتا اس کی پہنچ سے باہر ہو گیا تھا۔
انزہ بزدار اس آدمی پہ لاتوں اور گھونسوں کی برسات کر کے
اسے اٹھنے سے قاصر کر گئی تھی۔ خون تیزی سے رائم خان کے
کندھے سے بہنے لگا تھا۔

مسٹر خان!! آپ ٹھیک ہیں؟۔۔۔ انزہ شکستہ لہجے اور بھاری
قدموں کے ساتھ رائم خان کی طرف بڑھی۔ اس کے کندھے
سے خون نکلتا دیکھ کے انزہ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔۔۔ وہ
اپنا درد فراموش کرتا اپنے سامنے کھڑے آدمی کے قریب ہوا جو
اپنے ٹوٹے بازو کا درد برداشت کر رہا تھا۔ رائم خان طیش کے
عالم میں اس کے دوسرے بازو سے پکڑ کر وہی عمل دوہراتے
ہوئے اس کا دوسرا بازو بھی توڑ گیا۔ اس آدمی کی پھر سے آہ و
ابکار فضا میں بکھری تھی۔ وہ آدمی دونوں ٹوٹے بازوؤں کے

ساتھ درد کی شدت سے زمین پہ ڈھ گیا تھا۔ رائم خان تیز تیز
سانسیں بھرتا اسے زہریلی نظروں سے تڑپتا دیکھ دیکھا رہا تھا۔
مسٹر خان!! آپ پاگل ہو گئے ہیں بس کریں۔۔۔ اس کو پھر
سے اس آدمی پہ وار کرتے دیکھ کر وہ بے یقینی سے بولی۔
اس کو جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی تمہیں
چھونے کی؟ تمہیں نقصان پہنچانے کا اس نے سوچا بھی
کیسے؟۔۔۔ انزس کی پہلے والی حالت یاد کرتا وہ اپنے درد کی
پرواہ کئے بغیر وحشیانہ طریقے سے اس آدمی پہ مکوں اور گھونسوں
کے وار کرنے لگا تھا۔

مجھے کچھ نہیں ہوا۔ آپ اس کو چھوڑیں، ہمیں ابھی ہاسپٹل
چلنا چاہئیے! آپ کا خون بہت تیزی سے بہہ رہا ہے۔۔۔ وہ
آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑتی اسے مزید جنونیت آمیز ہونے سے

روک گئی تھی۔۔ رائم خان اس کی بے ترتیب حالت اور
چہرے پہ کھروچوں کے نشانات دیکھتا اپنا ہاتھ چھڑواتے ہوئے
تیزی سے ہسپتال کی جانب بڑھتا تھا۔

مسٹر خان! میں کہہ رہی ہوں، رک جائیں۔۔۔ اس کو پھر سے
ہسپتال کی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ اونچی آواز میں چلائی مگر رائم
خان اس کی سنی ان سنی کرتا زمین سے ہسپتال اٹھا کر چند سیکنڈز
میں ہی دونوں آدمیوں کی ٹانگوں میں باری باری ساری ہسپتال کی
گولیاں پیوست کر گیا تھا۔۔ علیزے یہ منظر دیکھتے ہی نیچے سر
جھکائے گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ چھپی تھی۔ وہ ڈر کے مارے
پہلے ہی گاڑی میں سوار ہو گئی تھی۔ گاڑی سے نکلنے کی غلطی اس
نے دوبارہ نہیں کی تھی جبکہ رائم خان کی حرکت پہ انرش بزدار

کی بھوری آنکھیں پھیلی تھیں۔ وہ آج اسے اپنے اصل جلوے
دیکھا کے جھٹکے پہ جھٹکے دے رہا تھا۔

آج تو زندہ چھوڑ رہا ہوں۔ اگلی بار ٹانگ میں نہیں سیدھی دماغ
میں گولی مار کر تم لوگوں کو جہنم واصل کرواؤں گا۔۔۔ رائے
خان نے ان دونوں آدمیوں پہ تھوک کر اپنی لہو چھلکتی آنکھوں
سے وارن کیا۔

مسٹر خان! آپ پاگل تو نہیں ہو گئے؟۔۔۔ انزس حیرت
سے نیچی آوازیں غرائی۔

شٹ اپ مس انزس!۔۔۔ رائے خان ہنوز ان آدمیوں کو درد
سے کراہتا دیکھتا غصے سے بولا تھا۔ اسے اس وقت سب سے
زیادہ غصہ انزس پہ آرہا تھا جو سب کے منع کرنے کے باوجود
بھی یہاں اکیلی آئی تھی۔

مسٹر خان!! یہ آپ کا مسئلہ نہیں تھا۔ یہ میرا مسئلہ تھا۔ میں خود
حل کر لیتی، آپ نے ان کو گولیاں مار کے فضول میں میرا کام
بڑھا دیا ہے۔۔۔ انزش بزدار متوسط لہجے میں بولتی شکوہ کناں
نظروں سے رائم خان کی پشت کو گھورنے لگی۔

آئی سیڈ جسٹ شٹ اپ مس انزش بزدار۔۔ وہ اس کی بات
سنتا

اب کی مرتبہ حلق کے بل دھاڑا تھا۔۔ اس کی دھاڑ پہ انزش بزدار
پہلی بار سہم کی چپھے ہوئی تھی۔ بھوری آنکھوں میں ایک لمحے
کیلئے حیرت کے ساتھ خوف کی لہر دوڑی تھی۔

جب یہ غلیظ لوگ اپنی ہر حد پار کر جاتے تو کیا آپ سنبھال لیتی
سب کچھ؟ اگر خدا نخواستہ یہ آپ کی عزت کو آنچ پہنچا دیتے تب
سنبھال لیتی آپ سب کچھ؟ دو آدمیوں کا اکیلے مقابلہ کر کے

اپنی عصمت کی حفاظت کر پاتی آپ؟ سمارٹ ہونا اچھی بات ہے مس انزس لیکن اوور سمارٹ ہونا کبھی کبھی بے وقوفی کی علامت ہوتا ہے اور آپ مجھے اس وقت وہی لگ رہی ہیں۔ آپ کہیں سے بھی ایک سلیج بھی ہوئی کاروباری شخصیت نہیں لگ رہی ہیں۔ آپ وہی بار بار غلطی دہرا کر اپنی ذہانت پہ سوالیہ نشان چھوڑ رہی ہیں۔ جب آپ کو دمیر اس پروجیکٹ سے ریلیٹڈ کوئی بھی کام کرنے کو منع کر کے گیا تھا تو پھر آپ کیوں اوور سمارٹ بن کر یہاں آئی؟ جبکہ آپ کو پتہ تھا یہاں پہ آنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔۔۔ رائم خان اس کی طرف رخ موڑتا ہر لفظ پہ زور دے کے چلانے لگا۔ اس کے کندھے میں شدید درد اٹھ رہا تھا لیکن وہ جبرے بھینچ کر درد پی رہا تھا۔ یہ درد اس درد

کے آگے کچھ بھی نہیں تھا جو درد انزس بزدار کے ساتھ کچھ ہو
جانے پر اسے ملنا تھا۔

آپ میری انسٹ کر رہے ہیں مسٹر خان!!۔۔۔ وہ اس کو
سخت نظروں سے گھورنے لگی۔ ایک لمحے کیلئے وہ رائم خان کی
باتیں سن کر اس کے کندھے میں لگی گولی بھول گئی تھی۔
میں تو صرف آپکی انسٹ کر رہا ہوں لیکن یہ لوگ آپ کو کچا نگل
جاتے۔۔۔ رائم خان فوراً جواب دیتا لب بھیج گیا۔

آپ میرے ساتھ بد تمیزی نہیں کر سکتے مسٹر خان۔۔۔ انزس
بزدار کو آج نا جانے کیوں رائم خان کا انداز اور رویہ ہضم نہیں
ہو رہا تھا۔ اس نے کہاں دیکھا تھا رائم خان کا یہ جنونی روپ؟
سادہ طبعیت اور ٹھنڈا رویہ صرف انزس کیلئے تب تک تھا جب
وہ سمجھداری دیکھاتے ہوئے اس پروجیکٹ سے دور تھی۔

جیسے ہی اس نے لاپرواہی برتنا شروع کی، رائم خان اپنی سادہ سائیڈ کو ایک طرف رکھ کے اپنے اصل جنونی روپ میں آیا تھا۔ اور انزس بزدار کیلئے اس کی طبعیت میں آئی اچانک تبدیلی حیران کن تھی۔ کیونکہ اسے رائم خان کا ردِ عمل اس کی شخصیت کے برعکس لگ رہا تھا۔

آپ وزیر اعظم نہیں ہیں جن سے میں تمیز سے بات کروں اور اگر آپ وزیر اعظم ہوتی بھی تو میں آپ کی ایسی بے وقوفی دیکھ کر تمیز سے بات نہ کرتا۔۔۔ رائم خان ایک خفت بھری نگاہ اس پہ ڈالتا گاڑی کی طرف بڑھ گیا کیونکہ اب اس کے کندھے کا درد شدت اختیار کر رہا تھا۔ اس کو جلد از جلد ہاسپٹل جانا تھا۔ رائم خان کی طرف سے کرارے جواب سن کر انزس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں۔

کیا تھا یہ انسان؟ اس کے کندھے میں گولی لگی ہوئی تھی اور یہ
یہاں کھڑا ہو کے عجیب طعنہ زنی کر رہا تھا؟ وہ کلس کے سوچتی
اس کے چھپے بڑھنے لگی۔

دور ہو جائیں! میں خود ڈرائیو کر لوں گی۔ آپ کو بھی جون سینا
بننے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ انرش بزدار اس کے سوار
ہونے سے پہلے خود گاڑی میں سوار ہوتی ڈرائیونگ سیٹ
سنبھالتے ہوئے اسی کے انداز میں ناک سکڑتے ہوئے
جتانے والے انداز میں بولی۔

آپ کو میرا ڈرائیو ر بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کہیں اور جا
کر جاب تلاش کریں، لاپرواہ لوگوں کو ملازمت پہ رکھنا میرے
اصولوں کے خلاف ہے۔۔۔ رائم خان گاڑی سے باہر کھڑا اپنے
کندھے پہ ہاتھ رکھ کر خون روکنے کی کوشش کرتا، جان بوجھ کر

اب اس کو تپانے کیلئے اپنی کر سٹل گرے آنکھیں گھوما کے بولا
تھا۔

چپ کر کے بیٹھ جائیں مسٹر خان ورنہ میں بھی آپ جیسی ڈھیٹ
مخلوق کو قبرستان پہنچانے کی بجائے ہاسپٹل پہنچانے میں انٹرسٹڈ
نہیں ہوں۔۔۔ وہ بھی تپ کے بولی تھی۔ ایک کندھے میں گولی
لگی تھی، خون اچھا خاصا بہہ چکا تھا۔ اور یہ آدمی تھا کہ اس کو درد
نہیں ہو رہا تھا؟ بلکہ آگے سے بحث پہ بحث کئے جا رہا تھا۔

ضرورت نہیں ہے مجھے قبرستان پہنچانے کی، وہ آپ
اپنی لاپرواہیوں سے پہلے ہی مجھے پہنچا چکی ہے۔۔۔ رائم خان
مدہم آواز میں سنگینی سے بولتا دوسری سائیڈ سے آکر پیسنجر
سیٹ پہ سوار ہو گیا۔ اس کے بیٹھنے کے بعد انزس بزدار نے
آگے جھک کر جیسے ہی اس کی سیٹ بیلٹ باندھی، رائم خان

بارکزی کا دل کانوں میں آکر دھڑکنے لگا، اس نے ٹھہر کے اس کی طرف دیکھا جو اب ڈیش بورڈ سے تین چار ٹیشونکال کے اس کی طرف بڑھا رہی تھی تاکہ وہ اپنے گال اور ہونٹوں سے رستا خون صاف کر سکے۔

ضرورت نہیں ہے آپ کی ہمدردی کی۔ اتنی فکر ہوتی تو آپ یہ زخم دیتی ہی نہ!!۔۔۔ رائم خان اس کی شرٹ پہ کہنیوں والی جگہ پہ لگا خون دیکھتا اپنے ہاتھ سے انزش کی طرف سے دئیے گئے ٹیشو دور کرتا، سیٹ کی پشت پہ سر پھینک کر تکلیف سے آنکھیں موندھ گیا تھا۔

میں نے زخم نہیں دئیے! آپ کو خود ریسلنگ چیمپئن بننے کا شوق ہو رہا تھا۔۔۔ انزش بزدار جتانے والے انداز میں بولتی گاڑی سٹارٹ کر کے یہاں سے نکالنے لگی جبکہ علیزے پہلے ہی اس

کے اشارے پہ اسکی گاڑی سٹارٹ کرتی یہاں سے رفو چکر ہو چکی تھی۔ اب زندگی میں علیزے کبھی اس جگہ ویزٹ کرنے نہیں آئے گی۔ علیزے کی سات نسلوں کی بھی توبہ، جو آج کے واقعے کے بعد وہ اس پروجیکٹ کا نام لے جائیں۔۔۔ انزس بزدار گاڑی ڈرائیو کرتی ہوئی مسلسل وقفے وقفے سے رائم خان کے چہرے پہ نظریں ٹکا رہی تھی۔ اس کا چہرہ لہو سرخ ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ پہ کھروچوں کے نشانات چمک رہے تھے۔ ہاتھ کے جوڑوں سے مکے برسانے کی وجہ سے خون تازہ رس رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے، کپڑے خاک آلود تھے۔۔۔ دائیں کندھے والی سائیڈ سے کوٹ اور شرٹ خون سے لت پت تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر انزس بزدار کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔۔۔ یہ واقعہ اس کے ذہن پر کئی سوال چھوڑ گیا تھا۔

آخر کیوں رائم خان نے اس کیلئے اتنی تکلیف اٹھائی؟ آخر کیوں
اس نے گولی کھائی؟ آخر کیوں اس نے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر
انزش کو بچایا؟ آخر کیوں وہ آج اتنا جنونی اور شدت پسند ہوا تھا؟
کئی ایسے اور سوال انزش بزدار کے ذہن میں گردش کر رہے
تھے۔ لیکن اس کے پاس اس "کیوں" کا جواب نہیں تھا۔۔
ایک بات تو طے تو تھی یہ "کیوں" بن کے رائم خان اب چوبیس
گھنٹے انزش بزدار کے ذہن پہ راج کرنے والا تھا۔۔ وہ ایک
ٹھنڈی سانس بھرتی گاڑی کی سپیڈ تیز کر گئی تھی۔ رائم خان ہنوز
سیٹ پہ سر ٹکائے آنکھیں موندے ہوا تھا۔
دراصل رائم خان اس کی ہر چھوٹی سے چھوٹی حرکت پہ نظر رکھتا
تھا۔ آج اس نے ایک میٹنگ کے سلسلے میں انزش کی سیکرٹری
کو کال کی تھی اور وہاں سے اسے پتہ چلا تھا کہ وہ آج متنازعہ

اراضی کے ویزٹ پہ گئی ہیں۔ اور یہی بات سن کے رائم خان فوراً وہاں سے بھاگا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا، قبضہ مافیا لوگ کتنے خطرناک ہوتے ہیں اور دمیر خان نے بھی اس سے یہ مسئلہ پچھلے ہفتے ڈسکس کیا تھا کیونکہ وہ یہ پروجیکٹ انزس سے لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔

دمیر خان اس کو ان خطرناک معاملات سے دور رکھنا چاہتا تھا لیکن انزس بزدار کو خطرے مول لینے کی عادت تھی اور وہ اسی عادت کے تحت آج پھر یہاں آگئی تھی۔ وہ تو شکر تھا رائم خان بروقت پہنچ گیا تھا ورنہ وہ لوگ انزس اور علیزے کے ساتھ کچھ بھی بدتر کر سکتے تھے۔

ہاسپٹل پہنچتے ہی رائم خان کے کندھے سے گولی نکال کے پٹی کر دی گئی تھی۔ گولی اتنی گہرائی میں نہیں لگی تھی، صرف گوشت میں پیوست ہوئی تھی، کندھے کی ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔ انز ش بزدار نے اپنے زخموں کو نظر انداز کیا تھا۔ وہ سب سے پہلے رائم خان کے والدین کو اطلاع دے کر انہیں ہاسپٹل بلا چکی تھی۔ اپنے بیٹے کے ساتھ ہوئے واقعہ کے بارے میں سن کر رائم خان کے والدین کی حالت غیر ہوئی تھی۔ وہ ہانپتے ہوئے افراتفری کے عالم میں ہاسپٹل پہنچے تھے اور یہاں پہنچ کر اس کو صحیح سلامت دیکھ کے ان کی سانس میں سانس آئی تھی۔ رائم خان نے اپنے والدین کو اس متعلق مہر خان کو کچھ بھی بتانے سے سختی سے منع کر دیا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا اس کی لاڈلی بہن اپنی خوشیوں میں زرا سی بھی کوئی پریشانی دیکھے۔

انز ش بزدار پورادن رائم خان كے والدين كے ساتھ اسپٹل ركى
تھى۔ اس نے اسے كئى بار گھر جانے اور اپنے زخموں پہ
پٹى كروانے كہا تھا ليكن وہ نہيں مانى تھى اور رائم خان كو اس كى
يہ ضد پھر سے غصہ دلا رہى تھى۔

شام كے سات بج رہے تھے۔ وہ كچن ميں كھڑى كھانا بنا رہيں
تھيں جبكہ زربخت صحن ميں چار پائى بچھا رہى تھى كہ باہر
دروازے پہ دستك ہوئى تھى۔
زربخت! جاؤ دروازہ كھولو داعير آيا ہے۔۔۔ نزہت خان كچن
سے نكلتى باہر صحن ميں چار پائى پہ چادر ڈالتى زربخت سے پر
مسرت ہو كے مخاطب ہوئى تھى۔

جی مورے کھولتی ہوں۔۔۔ وہ تیزی سے چادر درست کرتی
بھاگ کے دروازے کی جانب بڑھی تھی۔ اس نے جونہی
دروازہ کھولا، سامنے داعیر خان اور مہر خان کو مسکراتے ہوئے
پایا۔۔ دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کے ایسا لگتا تھا جیسے ان کو بنایا
ہی ایک دوسرے کیلئے گیا ہو۔

مہر خان نے خوبصورت سالیونڈر کلر میں ایمبرائیڈڈ ڈریس پہنا
ہوا تھا۔ سر پہ ٹیشو کا دوپٹہ جس کے پلو اور سامنے کے باڈی پہ
کٹ ورک کے ساتھ گول چھوٹے چھوٹے موتی نسب تھے جو
ڈریس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے تھے اور اس خوبصورت
سے سوٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح حسین لگ رہی تھی جبکہ داعیر
خان آف وائٹ شلوار قمیض میں ملبوس اپنے وجہیہ اور پرتاثر

نقوش کے ساتھ مہر خان کی آنکھ کا تارا لگ رہا تھا۔۔۔ نہیں! بلکہ
چاند لگ رہا تھا اور بہت پیارا لگ رہا تھا۔۔۔
اسلام علیکم۔۔۔ زربخت ان دونوں کو دیکھ کر ہونٹوں پہ مبہم
مسکراہٹ سجائے خوشی سے گویا ہوئی۔
و علیکم السلام! کیسی ہو گڑیا!۔۔۔ داعیر خان نرمی سے اس
کے سر پہ شفقت بھرا ہاتھ رکھتا خوش دلی سے بولتے ہوئے
ڈھیروں گفٹس اور پھولوں کا گلہ ستہ زربخت کی طرف بڑھا گیا
تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے سب چیزیں پکڑتی مہر خان کے گلے لگ
گئی۔ وہ بھی جواباً پیار سے اس کے گال پہ بوسا دیتی اسے خندہ
پیشانی سے ملی تھی۔ وہ دونوں زربخت سے ملنے کے بعد صحن کی
طرف بڑھ گئے جبکہ وہ دروازہ بند کر کے گفٹس صحن میں ہی

پڑے چھوٹے سے ٹیبل پہ رکھتی خوشی سے ان کے ہمقدم

ہوئی۔۔

نزدہت خان تیزی سے اپنے گیلے ہاتھ دوپٹے کے پلو سے صاف کرتی کچن سے نکلی تھی۔ آج ان کی طبیعت کچھ بہتر تھی۔ تو اس لئے انھوں نے داعیر اور مہر کو اپنے گھر دعوت کیلئے بلایا تھا اور

اسی خوشی میں وہ سارا کھانا بھی خود بنا رہی تھی۔

اسلام علیکم کیسی ہیں میری پھوپھو؟۔۔۔ داعیر دلکش

مسکراہٹ کے ساتھ بائیں پھیلائے ان کی جانب بڑھتا انہیں اپنے سینے میں بھینچنے لگا۔

و علیکم السلام! پھوپھو بالکل ٹھیک ہیں۔ میرا بچہ کیسا ہے؟۔

میری بہو کیسی ہے؟۔۔۔ وہ محبت سے اس کے ماتھے پہ لب رکھتی مہر خان کو اپنے حصار میں آنے کا اشارہ کرنے لگیں جو دور

کھڑی ان دونوں کو دیکھ کے مسکرا رہی تھی۔ وہ ان کے
اپنائیت بھرے انداز پہ کھل کے مسکرائی اور ان کے سینے سے
لگ گئی۔

اللہ تعالیٰ تم دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے۔ خوب پھلوں پھولوں
اور ایک دوسرے کیلئے سکون کا باعث بنو آمین!!۔۔۔ نہت
خان باری باری پھر سے ان دونوں کے ماتھے پہ لب رکھتی
انہیں دعاؤں سے نواز کر الگ ہوئیں۔ انہوں نے ان کی دعاؤں
پہ زیر لب آمین دہرایا تھا۔

آپی! آئیں بیٹھیں نہ!۔۔۔ زربخت مسکرا کر مہر کو اپنی طرف
متوجہ کرواتی بیٹھنے کا اشارہ کرنے لگی۔

اور بتائیں پھوپھو آپ کی طبیعت اب ٹھیک ہے؟۔۔۔ داعیر
ایک نظر گھر کی عمارت کی طرف دوڑاتا نزنٹ کو لئے چارپائی کی
طرف بڑھا۔

ہاں اللہ کا شکر ہے!! میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ بس زرا
سا بخار ہو جاتا ہے تو طبیعت سست ہو جاتی ہے لیکن اب
جب سے دمیر نے دوا لیکر دی ہے، طبیعت بھی پہلے سے اچھی
ہو رہی ہے۔ دیکھوں اب فٹ فٹ ہوں تمہارے سامنے
ہوں۔۔۔؟ وہ چارپائی پہ بیٹھتی داعیر کو تسلی سے جواب دیتی
آخر میں مسکرا دی۔

وہ تو مجھے دکھ رہا ہے، آپ کی صحت پہلے سے ٹھیک ہے تبھی آپ
کچن میں کھانے بنانے میں مصروف تھی۔ لالہ نے اچھا کیا جو
آپ کو اپنے ایک دوست ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے ورنہ آپ

جس ڈاکٹر کے پاس جا رہی تھیں ان کی میڈیسنز تو آپ کو افاقہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ اللہ آپ کو ہمیشہ صحت مند اور صحیح سلامت رکھے، آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے آمین!!۔۔۔ وہ ان کے پہلو میں بیٹھتا عقیدت سے ان کا ہاتھ پکڑ کے چوم رہا تھا۔

ہاں دمیر مجھے بہت اچھے ڈاکٹر کے پاس لے کے گیا تھا۔۔۔ اور دوسری بات مجھے پتہ ہے میرے بچے کو میرے ہاتھ کا کھانا بہت پسند ہے۔ اس لئے سب کچھ اپنے ہاتھوں سے تمہاری پسند کا بنایا ہے۔۔۔ وہ یان بھرے لہجے میں بولتی سمجھداری سے بات کو دو حصوں میں تقسیم کر گئی تھی۔۔۔ اپنی صحت سے متعلق بات چیت نزہت خان کو پریشان کر رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی داعیر خان بہت تشویشی طبیعت کا مالک ہے۔ اگر اس

نے نزہت خان کی پرانی دوائیں دیکھ لی تو وہ ایک منٹ میں ان کی بیماری کی جرٹ تک پہنچ جائے گا۔۔ اس لئے سنجیدگی سے بات میں رد و بدل کرتی اس کا دھیان اپنی صحت سے ہٹا گئی۔

البتہ داعیر کو آج اتنے عرصے بعد اپنے گھر میں دیکھ کر نزہت خان کی آنکھوں میں بار بار خوشی سے نمی آرہی تھی۔ ایک پرسکون مسکراہٹ زربخت اور ان کے چہروں پہ بکھری ہوئی تھی۔ شاید زندگی میں پہلی بار ان کا کوئی اپنا ان کے گھر دعوت پہ آیا تھا۔۔ دمیر خان بھی آتا تھا لیکن وہ سوائے چائے کے اور کچھ نہیں لیتا تھا۔۔ اپنوں کے ہونے کے احساسات بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ انسان کی آدھی عمر اپنوں کا ساتھ بڑھا دیتا ہے۔۔

رشتے ہوں تو انسان خود کو ایک ہر ابھرا باغ تصور کرتا ہے۔ جس باغ میں ہر رنگ کے پھول کھکھلاتے ہیں، ہر طرف سکون اور خوشیوں کے نگارے بج رہے ہوتے ہیں۔ باغ ہو تو تمام پھولوں ایک دوسرے کو دیکھ کے پھلتے پھولتے ہیں اور ان کھلتے پھولوں کی حفاظت اور دیکھ بھال کیلئے مالی ہوتا ہے جو وقت پہ ان کو پانی دیتا ہے۔ ان کو سخت موسم سے محفوظ رکھتا ہے۔

ان کی تروتازگی برقرار رکھنے کیلئے مختلف محبت اور فکر سے بھرے طریقے استعمال کرتا ہے۔ تب جا کے یہ پھول اپنی خوبصورتی اور خوشبو سے معطر رہتے ہیں۔ پھر یہی پھول اپنے مختلف رنگوں اور خوشبوؤں سے باغ کو مہکاتے ہیں۔ ہر طرف پھولوں کی دلکشی آنکھوں اور دل کو راحت بخشتی ہے لیکن اگر

کوئی پھول باغ سے جدا ہو جائے تو وہ وقت اور اپنی عمر سے پہلے ہی مرجھا جاتا ہے۔ اکیلے پھول کو ماحول کی تبدیلی اور سخت آب و ہوا اس کو جرّٹک کھوکھلا کر کے اس کی ساخت کا وجود زمین سے مٹا دیتی ہے اور وہ پھول جو کبھی ہرا بھرا اور دلکش تھا، وہی عدم توجہ اور باغ سے علیحدگی پر مرجھا کے خاک میں خاک ہو جاتا ہے۔۔ کیونکہ اس کو توجہ دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔۔ وہ مرجھا رہا ہو تو اس کی تازگی برقرار رکھنے والا کوئی نہیں ہوتا اور پھر پھول اپنی آخری سانس بھرتے ہوئے زمین کو اپنے وجود اور خوشبو سے محروم کر دیتا ہے۔

بلکل اس طرح رشتے بھی ایک باغ کی مانند ہیں۔ جرّٹکے رہو گے تو ہرے بھرے لہلہاتے رہو گے۔ رشتوں کے مالی اور دیکھ بھال کرنے والے "احساسات اور جذبات" ہوتے ہیں۔ وقت

پر احساس، محبت، پیار، توجہ، فکر مندی، ہمدردی، خلوص،
اپنائیت، مان، اعتماد، تحفظ، اپنوں کا ساتھ، یہ سب کچھ
رشتوں کو ملتا رہے تو رشتے زندہ جوان رہتے ہیں۔ ایک دوسرے
سے جڑے رہو گے تو جڑوں تک مضبوط رہو گے۔ جہاں پہ کوئی
ایک بھی رشتہ مرجھانے لگے تو دوسرے رشتے فوراً اس میں
اپنے احساسات کے رنگ گھول کر نئی زندگی بخشتے ہیں، سہارا
دے کر سنبھال لیتے ہیں اس کو نئی زندگی سے آشنا کرواتے
ہیں۔ لیکن اگر بد قسمتی سے کوئی رشتہ اکیلا رہ جاتا ہے، اکیلا کر دیا
جاتا ہے، یا چھپے چھوٹ جاتا ہے۔ تو اس کا وجود اکیلے پن اور
لاواٹی میں مرجھا جاتا ہے۔ وہ رشتوں سے الگ ہوتے ہی ختم
ہو جاتا ہے۔۔۔

ہاں اپنوں سے الگ ہو کے یا الگ کئے جانے پہ وہ چند عرصہ
تک زندہ رہتا ہے لیکن اس کا اندرونی وجود کھوکھلا ہوتا ہے۔
اس کے ذہن کا سکون مرجاتا ہے۔ دل کا قرار مرجاتا ہے۔
چہرے کی خوشی مرجاتی ہے۔ طبعیت کا شوخا پن اجرٹ جاتا
ہے۔ تنہائی اس کی نس نس میں بس کر روز اسے زرا زرا سا
دیمک کی طرح کھانے لگتی ہے۔ رشتوں کا ٹھکرایا ہوا یا ان سے
بچھڑا ہوا انسان بے مقصد زندگی جیتا ہے۔ وہ اپنوں کے
احساس سے، اور رشتوں کی لذت سے محروم ہوتا
ہے۔۔۔ رشتے انسان کی روح تک بسے ہوتے ہیں۔ وہ جن کو ہم
روح تک بساتے ہیں وہ بچھڑے تو پھر جان جاتی ہے۔ جان
جائے تو انسان کا وجود بے معنی ہو جاتا ہے اور بے معنی وجود
زمین پہ بوجھ بن جاتا ہے اور بوجھ کو کوئی نہیں اٹھاتا بلکہ ہر کوئی

ٹھو کریں مار کے گزر جاتا ہے۔۔ رشتوں کے بغیر اور اپنوں کے ساتھ کے بنا انسان صرف ٹھو کروں کیلئے رہ جاتا ہے اور کچھ نہیں۔ لیکن اگر اس ٹھکرائے ہوئے انسان کو کوئی اپنا سنبھال لے تو وہ ہیروں جیسا پھر سے انمول ہو جاتا ہے۔۔

آج نزہت خان اور زربخت کی بھی، داعیر اور مہر خان نے محبت سے، مان، حق سے، خلوص سے، اپنائیت سے، اور فکر مندی جیسے احساسات سے دیکھ بھال کی تھی۔ اپنوں کی زرا سی توجہ ملنے پر ان دونوں کی روح اور چہرے خوشی سے سرشار تھے۔ نزہت خان کے چہرے سے بیماری کے آثار غائب تھے۔ زربخت کا معصوم چہرہ ہر فکر سے چند لمحوں میں رہائی پا گیا تھا۔ رشتے کیا کچھ نہیں کر سکتے؟ رشتے مردہ جسموں میں جان ڈال دیتے ہیں۔۔ بے رنگ زندگی کو رنگوں میں بدل دیتے ہیں۔ بے

مقصد حیات کو قابل مقصد بناتے ہیں۔ خوبصورت رشتے جینے
کا سہارا ہوتے ہیں۔۔۔

اچھا پھوپھو! پھر آپ نے کیا کیا بنایا ہے آج کھانے میں میرے
لئے؟ مجھے آپ کے ہاتھ کا سب کچھ کھانا ہے جو جو مجھے پسند ہے
۔ انفیکٹ اگر میں یہاں سب کچھ نہ کھا سکا تو پیک کروا کے گھر
لے جاؤں گا۔ یاد ہے پھوپھو!! جب آپ بچپن میں ہمارے
گھر کھانا بناتی تھی۔ تو میں اور لالہ کیسے آپ کے ہاتھ کا بنا
کھانا خوشی سے کھاتے تھے اور مورے کے بنائے ہوئے
کھانے کو ہمیشہ انکار کر دیتے تھے۔۔۔ داعیر خان ان کے
ہاتھوں کو پھر سے چومتا مسکراتے ہوئے بچپن کی یادیں تازہ
کرنے لگا۔

ہاں مجھے سب یاد ہے۔ اور آج بھی سارا کھانا تمہاری پسند کا بنایا ہے۔ مجھے پتہ ہے میرے بچے کو کیا کھانا پسند ہے۔۔۔ جتنا دل کرے کھا لینا اور گھر بھی لے جانا۔۔۔ وہ نرم لہجے میں محبت بھرے احساس میں بولی تھی۔۔۔ مہر خان دونوں پھوپھو بھتیجے کی محبت کو قابل ستائش نظروں سے دیکھتی زربخت کے پاس بیٹھی مسکرا رہی تھی۔۔۔ ہاں داعیر خان بھی پہلے نزہت خان کی خبر لینے نہیں آتا تھا لیکن جب سے دمیر خان نے ان دونوں باپ بیٹے کو احساس دلایا تھا وہ ان کی فکر کرنا شروع ہو گئے تھے۔۔۔

کوئی بھی انسان پرفیکٹ نہیں ہوتا ہے۔ ہر انسان کو اچھے مشورے اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ داعیر خان اور اسد اللہ خان کو بھی رہنمائی کی ضرورت تھی جو دمیر خان نے کی

تھی۔۔ ہاں البتہ دمیر خان کے رشتوں کے متعلق دلائل ایسہ
خان کو نہیں پگھلا سکتے تھے۔۔ مہر اور داعیر آج ایسہ خان کو
بتائے بغیر یہاں آئے تھے، اگر انہیں بتا دیا ہوتا تو وہ انہیں یہاں
آنے کی بجائے کسی اچھی جگہ پہ گھومنے پھرنے کے مشوروں
سے نوازتی۔

لالہ !!! بس کریں۔ جس طرح آپ مورے کے ہاتھ چوم
رہے ہیں، مجھے ڈر ہے کہ کہیں ان کی انگلیوں کے فنکر پرنٹس ہی
نہ مٹ جائیں!۔۔۔ زربخت بار بار داعیر خان کو اپنی ماں کے
ہاتھ چومتے دیکھ کر شوخ لہجے میں گویائی تھی۔۔ اس کی بات
سن کے سب کی بے ساختہ ہنسی کی آواز گونج اٹھی تھی۔ نزہت
خان کا بوسیدہ گھر، تنگ صحن، بے رنگ درودیوار اور ویران
آنگن آج رشتوں کے قہقہوں سے کھل اٹھا تھا۔۔ ان کے ساتھ

ساتھ آج اس کے گھر کی ہر چیز خوشی سے مسرور تھی۔ آج صبح اسد اللہ خان بھی نزہت خان کے گھر کا چکر لگا کے گئے تھے۔ وہ آج صبح سے بہت خوش تھیں اور اب داعیر خان اور مہر کی آمد ان کی خوشی ڈبل کر گئی تھی۔۔ کافی دیر تک ان چاروں کے قہقہے نزہت خان کے چھوٹے سے گھر میں گونجتے رہے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دیر مزید وہ دونوں نزہت خان کے گھر کے تھے۔۔ مہر خان نزہت اور زربخت سے مل کر بہت خوش ہوئی تھی۔۔ نزہت خان نے انہیں ڈھیروں دعائیں، پیار اور محبت دے کر گھر سے رخصت کیا تھا کیونکہ ان کے پاس دعا اور محبت کے علاوہ دینے کو کچھ نہیں تھا۔ داعیر خان نے نزہت خان کے اس خلوص کو سر آنکھوں پر رکھا تھا۔ زربخت

سے ملنے کے بعد وہ دونوں الوداعی کلمات کہتے اپنے گھر کیلئے نکلے
تھے۔۔۔ ان دونوں کے جاتے ہی نزہت خان نے مسکراتے
ہوئے دلی سکون کے ساتھ دروازہ بند کرتی زربخت کو اپنے
حصار میں لئے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔

داعیر!! نہیں پلیز مجھے چینج کرنا ہے۔۔۔۔۔ مہر کمرے میں آتے
ہی ڈریسنگ روم کی جانب بڑھی تھی جب چھپے سے داعیر خان
نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے ہوئے اپنے سینے میں
بھینچ لیا۔

داعیر!! سیرئسلی بہت تھک گئی ہوں۔ مجھے چینج کر کے سونا
ہے۔۔۔۔۔ وہ اس کے حصار سے نکلنے کی سعی کرتی جھنجھلاتے
ہوئے بولی۔

نور چشم! میں ہوں نہ تمہاری ساری تھکاوٹ اتارنے کیلئے اور
چینج بھی میں خود کروا لوں گا۔۔۔ وہ اس کی گردن میں منہ
گھسیڑے وہاں پہ چھوٹی چھوٹی بائٹس کرتا گھمبیر آواز میں گویا ہوا۔
نہیں میں خود چینج کر لوں گی۔ آپ کے بھروسے رہی تو پھر چینج
کرنے کے ساتھ شاور بھی لینا پڑے گا۔۔۔ وہ اس کے دائیں
گال پہ ہاتھ رکھ کر داعیر خان کا چہرہ اپنی گردن سے ہٹانے کی سعی
کرتی ناک سکڑتے ہوئے بولی تھی۔

اتنی منٹوں اور مرادوں سے تو تم مجھے یسر آئی ہو نور چشم! اب
مجھ سے دور جا کے مجھے مزید مت تڑپاؤ! تمہیں پانے کے مراحل
میرے لئے بہت کھٹن تھے۔ مجھے ہر لمحے تمہیں پانے کی جستجو
میں تڑپایا گیا ہے۔ ایک پل لگتا تھا کہ تم صرف میری ہو۔ پر
اگلے ہی پل تمہارے خاندان کی ہٹ دھرمی اور جاہلانہ رویہ

دیکھ کے یہ خوف مجھے جکڑ لیتا تھا کہ تم میری کبھی نہیں ہو
سکتی۔۔۔ مجھے لگتا تھا تمہارے خاندان کی لڑائیاں میری محبت
کو زندہ نگل جائیں گئی اور میرا وجود تمہیں پانے کی چاہ میں سسک
سسک کے ختم ہو جائے گا۔ مجھ سے دور رہنے کی باتیں اور
کوششیں مت کیا کرو۔۔۔ تم مجھے اس جہان میں ایک بار کیلئے ملی
ہو۔ مجھے یسر رہو تاکہ میں تم پہ اپنی محبتیں نچھاور کر کے ہر
جہان کیلئے تمہیں اپنی محبت اور وجود میں قید کر لوں۔۔۔ وہ اپنا
چہرہ اس کی گردن سے نکال کر اس کے چہرے پہ جا بجا لب رکھتا
شدت جذبات میں بولا تھا۔ ایک دم مزاج کا شوخا پن غائب ہوا
تھا۔ چہرے اور شہد رنگ آنکھوں میں مہر خان کو پانے کی تڑپ
اور جستجو چمکی تھی۔

بہت قیمتی ہو تم میرے لئے نور چشم! داعیر کی چلتی سانسوں کا
شور ہو تم، میری کل کائنات ہو تم، میری زندگی ہو تم، اللہ تعالیٰ
نے مجھے میری محبت سے نواز کر مجھ پہ دنیا و آخرت کی ساری
نعمتیں اور برکتیں تمام کی ہیں۔ تم انعام ہو میری حیات کا،
میری بے رنگ زندگی کی قوس قزح ہو تم۔

زندگی تو اللہ تعالیٰ سب کو بخشتا ہے پر مجھے جو زندگی تمہاری
صورت میں عنایت کی گئی ہے وہ حد درجہ کمال ہے!!

تم جو میرے روبرو ہو، شریک حیات بن کر، یہ میری محبت کا
جمال ہے!!

میرا محبوب میری بانہوں میں ہے یہ سوچ کر ہی میرا دل سکون
سے خوشحال ہے!!

یہ چہرے پہ گھلتی سرخیاں، خبر دے رہی ہیں میری محبت کا رنگ
چڑھاتم پہ لال ہے!!

تیرے ہاتھ میں میرا ہاتھ ہو، خوابوں کے اک جہان میں بس تو
میرے ساتھ ہو، باخدا! حقیقت بھی اس پہ نثار، اتنا حسین وہ
خیال ہے

توں میرے سینے پہ سر رکھے، تیرے وجود پہ بکھرے میرے
لبوں کا رنگ، وہ مہکتا میری محبت کا گلال ہے!!

توں پکارے مجھے، میں جی جان واردوں تیرا بکھرا وجود سمیٹو خود
میں، جو میری قربت سے نڈھال ہے!!

توں معجزہ ہے میری حیات کا، میری محبت کی تکمیل میں تیرا وجود
جو یا قوتِ آخر ہے وہ یا قوتِ بے مثال ہے!!

اے نورِ چشم! کیا تم مجھ خود سے سکون مہیا کروں گی؟ میری
قربت کو خود میں جذب کر کے میرے جنون کو ٹھنڈا کرو گی؟ بس
میرا تم سے آخری یہی سوال ہے!!

وہ اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں بھرتا اسکی کرسٹل گرے
آنکھوں میں جھانکتے ہوئے محبت سے لبریز لہجے میں بولتا آخر میں
پھر سے مبہم سا مسکرا کے شوخ پن پہ اتر آیا تھا۔ اس کے
الفاظ میں بہت کچھ تھا۔ اقرار تھا، اظہار تھا، مفاخر تھا،
اجازت طلبی تھی، محبت کی تکمیل کا تشکر تھا۔
بہت شکریہ اتنے خوبصورت الفاظ سے مجھے معتبر کرنے کیلئے
۔۔ مجھے سمجھ نہیں آتی آپ میرے لئے اتنے خوبصورت الفاظ
کہاں سے لاتے ہیں؟ کبھی کبھی مجھے شک ہونے لگتا ہے کہ آپ
کے لفظ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہیں۔۔ وہ آنکھوں میں تشکر
اور تفاخر لئے خوشی سے نم ہوتی آنکھوں سے گویا تھی۔

ظاہری سی بات ہے نور چشم! تم زیادہ خوبصورت ہو۔ تبھی تو تمہیں بیان کرنے کیلئے خوبصورت الفاظ کا چناؤ کرنا پڑتا ہے مجھے۔۔ تم مجھ سے کبھی دور مت جانا، ہمیشہ میرے ساتھ رہنا، میری سانس بن کر، میرے دل کی دھڑکن بن کر، میری آنکھوں کی روشنی بن کر۔۔۔ داعیر خان مخمور لہجے میں ملتجی ہوتا اس کے گال کو اپنے لبوں میں لئیے سک کرنے لگا۔

داعیر!!۔۔۔ وہ اس کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اوپر کی طرف اٹھانے لگی۔

میں آپ کی تھی، آپ کی ہوں اور ہمیشہ آپ کی ہی رہو گئی، مجھ سے سکون حاصل کرنے کیلئے آپ کو اجازت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ آپ کا حق ہے جو آپ جب چاہیں میرے وجود سے وصول کر سکتے ہیں۔ آپ کو پانے کا وہ وقت میں بھی نہیں

بھول سکتی جب پرانی دشمنیاں اور خاندانی لڑائیاں مجھ سے
میری محبت کی قربانی مانگ رہی تھی۔ میں اس وقت اپنی جان
تو دے سکتی تھی۔ لیکن آپ سے جدا ہونا ہر گز برداشت نہیں
کر سکتی تھی کیونکہ آپ اور آپ کی محبت مجھے جان سے بھی
زیادہ عزیز تھے۔ مجھے بھی ہر لمحے آپ کو اور اپنی محبت کو کھو
دینے کا ڈر کھاتا تھا۔ میں لڑکی ذات تھی، میں حدوں کو توڑ کے
رخصتی سے پہلے آپ کے پاس نہیں آسکتی تھی۔ اپنی تڑپ ختم
نہیں کر سکتی تھی۔ اپنی محبت کو دشمنی کی بھینٹ چڑھتے دیکھ
کر میں کئی راتیں بنا سوئے گزار دیتی تھی۔ آپ کو کھودینے کا
خوف اور لمحے میرے لیے بھی بہت اذیت ناک تھے۔۔۔ آپ
سے تعلق ختم کرنے کا جب سنتی تھی تو مجھے ایسا لگتا تھا جیسے
میرے زندہ وجود سے میرا سینہ چاک کر کے بے دردی سے کسی

نے خنجر گھونپ کے میرے دل کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہو۔
لیکن اب میں اللہ تعالیٰ کی ذات کا شکر ادا کرتی ہوں جس نے
ہماری پاکیزہ محبت کو امر کیا اور تمام حاسدین سے محفوظ رکھا۔
مجھے آپ کا ساتھ ملا تو میرے پچھلے سارے غموں کا کفارہ ادا ہو
گیا۔

اب میں آپ کے ساتھ جرّ کر بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ آپ
صرف مہر کے داعی ہیں، اب آپ پہ سر سے لیکر پاؤں تک
تاقیامت مہر خان کی پراپرٹی کی مہر لگ چکی ہے۔ اب آپ
کو اگلے جہان ستر حوروں سے بھی دستبردار ہونے پڑے گا۔
کیونکہ آپ صرف میرے ہیں اور میں اپنی ملکیت میں آئی محبت
میں نہ اس جہان میں شراکت داری برداشت کروں گی اور نہ
اگلے جہان میں۔۔۔ مہر خان اس کے سینے پہ دونوں ہاتھ جماتی

داعیر خان کی شہد رنگ آنکھیں چوم کر خوشی اور رنجیدگی کے
ملے جلے تاثرات سے بولتی اس کے اگلے کچھلے سارے سوالوں
کے جواب دے گئی تھی۔ جہاں محبت کے مل جانے کی خوشی
تھی، وہی محبت کو پانے کی اذیتیں بھی یاد تھی۔۔۔ مہر خان کے
لفظوں میں بہت کچھ تھا۔ حق جتانے والا انداز تھا، مان تھا،
بھرم تھا، داعیر کی محبت پہ فخر تھا، خود کے انمول ہونے کا
احساس تھا بیک وقت وہ دونوں کئی چیزوں سے چور تھے۔
جس کی ایک بیوی ستر حوروں پہ بھاری ہو، جس کا حسن دیکھ
کے کمزور دل تاب نہ لاسکے، جس کا نورانی چہرہ دیکھنے کے بعد
آنکھوں کو کوئی منظر اچھا نہ لگے، جس کو چھونے سے ہر لمس پُر
کیف لگے، جس کو پانے سے روح پر سکون ہو جائے۔ اتنی
خوبیاں اور لذتیں چھوڑ کر کون کس بخت حوروں کا سوچے گا؟ تم

حوروں سے بھی زیادہ حسین ہو، تمہاری ایک آنکھ کے صدقے
میں ستر حوروں کو تمہارے سر سے وار کے پھینک دوں، تمہاری
آواز کے آگے ان کی سریلی آوازوں کو جھٹلا دوں، تمہارے مخملی
وجود کے آگے میں ان ستر حوروں سے بنا سوچے دستبردار ہو جاؤ
۔۔۔ نورِ چشم! تم میری دونوں حیات کا کل ہو۔ میری زندگی کا
بیش بہا قیمتی اثاثہ ہو جس کو میں دونوں جہانوں میں سمیٹ کے
اپنے پاس رکھنا چاہوں گا۔۔۔ وہ نرمی سے مہر کے ماتھے پہ اپنے
لبوں کا لمس چھوڑتا اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے اوپر کی طرف
اٹھاتا ڈریسنگ روم کی طرف لے کے بڑھاتا تھا۔

وہ پیر کی ٹھوکر سے دروازہ بند کرتا مہر خان کو ڈریسنگ مرر کے
آگے بیٹھاتا لائٹ ڈم کر گیا تھا۔۔۔ داعیر خان اگلے ہی لمحے اپنی
آف وائٹ قمیض اتار کر سائیڈ پہ اچھالتا مہر کی طرف آتا اس کے

مخملی وجود کو اپنے ہاتھوں کی مدد سے لباس کے بوجھ سے آزاد کرنے لگا تھا۔ وہ اس کے کندھوں پہ ہاتھ جماتی اس کی ٹھنڈی انگلیوں کا لمس اپنے جسم پہ رینگتا محسوس کرتی شرم سے خود میں سمٹنے لگی تھی۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ اپنا حق لینے سے پہلے اپنے خوبصورت الفاظ سے اس کے وجود کو معتبر کرتا تھا۔

اپنے چند خوبصورت جملوں سے مہر خان کی ذات کو ہیرا بنا دیتا تھا۔ مہر خان کو اس کا یوں الفاظ سے معتبر کر کے حق لینے والا انداز شروع دن سے اچھا لگا تھا۔ داعیر خان خود کو اور اس کو ہر پردے کے بوجھ سے آزاد کرتا ایک ہاتھ اس کی برہنہ ٹانگ پہ جبکہ دوسرا ہاتھ اس کی پچھلی گردن پہ رکھ گیا۔

مجھ ستر حوروں سے زیادہ عزیز ہو تم!! کیا آج تم مجھے اتنی لذت
دوگی کہ میں اپنی مہر کو ان ستر حوروں کی ملکہ قرار دے سکوں
۔۔۔ داعیر خان آنکھیں موندے اپنی بیئرڈ اس کے گال پہ رب
کرتا مخمور لہجے میں پوچھنے لگا۔

قرار دے سکوں!! کیا مطلب ہے آپ کی اس بات کا؟ پہلے میں
ملکہ نہیں ہوں کیا؟۔۔۔ وہ اس کی بات سنتی تعجب سے ناک
سکوڑتے ہوئے اس کے سینے پہ مکا جھڑتی شکوہ کر گئی۔
ہا ہا ہا!! یہی تمہارا غصے والے پیارا انداز دیکھنا تھا۔ تم میری ملکہ
ہو۔ میرے دل کی ملکہ ہو، میری حیات کی ملکہ ہو اور داعیر
تمہارا غلام ہے۔۔۔ وہ اس کے یوں معصومیت سے شکوہ
کرنے کے انداز پہ کھل کے مسکرایا تھا۔ وہ اس کی چھوٹی سی
ناک اپنے لبوں میں دبا کے چھوڑتا مہر خان کے گلابی لبوں پہ جھکا

تھا۔ وہ اس کے لبوں کو اپنے لبوں اور دانتوں میں کچلتا ان کی
ساری نمی جذب کرنے لگا تھا۔

کافی دیر تک وہ مہر خان کی پنکھڑیوں کا رس نچوڑتا رہا تھا۔ کس
میں مہر خان کا ساتھ نہ پا کر وہ اس کی زبان کو اپنے دانتوں تلے دبا
کے اس کو اپنی پل میں سرخ ہوتی شہد رنگ آنکھوں سے ساتھ
دینے کا اشارہ کرنے لگا۔ چونکہ اندر مدہم روشنی تھی۔ مہر خان
اس کا اشارہ نہیں سمجھ سکی البتہ اس کی دانتوں کی سختی بھانپ
کر وہ نرمی سے اس کے گال پہ ایک ہاتھ جماتی آنکھیں موندے
اس کے لبوں کو سک کرنے لگی تھی۔ مہر کا ساتھ ملتے ہی اس
کو شے ملی تھی۔ وہ اسے ڈیپ کس کرنے کے ساتھ، اپنا دائیاں
ہاتھ سختی سے موو کرتا اس کی ٹانگ سے انر تھائی پہ لایا تھا۔

داعیر خان اپنے ہاتھ کی جان لیوا موومنٹ پہ مہر خان کو مچلنے پر
مجبور کر گیا۔ وہ اس کے ہاتھ کو روکنے کی کوشش کرتی زور سے
اس کے لبوں کو اپنے دانتوں سے کاٹنے لگی تھی۔ اس کی
اضطرابی کیفیت دیکھ کر داعیر خان مزید ہاتھ کی موومنٹ
بڑھاتے ہوئے اسے مدہوش کرنے لگا تھا۔

اہہ! دا۔۔۔ داعیر!! مہر نے اپنے لب چھڑواتے ہوئے اسے
سختی برتنے سے ٹوکا تھا۔۔

کیا ہوا؟۔۔۔۔۔ داعیر گھمبیر آوازیں بولتا اس کے دونوں
بازوؤں سے پکڑ کر اوپر کی طرف پن کرتا اس کے نازک سراپے
پہ جھکا تھا۔ جس کی نازکی بار بار اس کے سینے سے مس ہو کر
اسے اپنی نرماہٹ سے پاگل کر رہی تھی۔۔۔ داعیر خان بے خود
ہوتا بے رحمی سے اس کے سینے کی نازکی کو لبوں اور دانتوں میں

دبانے لگا تھا جبکہ اس کا دوسرا ہاتھ اس کے سینے کی ابھری
ساخت کو سہلانے کے ساتھ ساتھ مٹھی میں جکڑنے میں
مصروف تھا۔

داعیر!!۔۔۔ اس نے ہمیشہ کی طرح اس کے پاگل لمس پہ دہائی
تھی۔

نور چشم!!۔۔۔ وہ اس کے سینے سے چہرہ اٹھاتا اپنی زبان اس
کے لبوں پہ پھیرتے مخمور لہجے میں گویا ہوا۔
مجھے تڑپا یا مت کرو!! تم مجھے بہت محبوب ہو۔۔۔ وہ اس کے
ہاتھوں کو اپنی گرفت سے آزاد کرتا اس کے ماتھے پہ لب رکھ گیا
تھا۔

میرے لئے یہ اعزاز کی بات ہے کہ میں اپنے محبوب کی محبوب
ہوں۔۔۔ وہ اپنے سینے پہ جلن محسوس کرتی تھوڑا سا سسکتے
ہوئے داعیر کی ٹھوڑی پہ لب رکھ گئی تھی۔

اور میرے لئے بھی یہ کائنات کا سب سے بڑا اعزاز ہو گا کہ میں
بھی اپنے محبوب کا محبوب ہوں۔۔۔۔ وہ اس کے لبوں کی
جسارت پہ سرشار ہوتا مہر کے برہنہ کندھے پہ لب رکھتا اپنے
دونوں ہاتھ اس کی دائیں بائیں ٹانگوں پہ رکھتا ان کے درمیان
فاصلہ بنا کے خود کے کھڑے ہونے کی جگہ بنانے لگا تھا۔ مہر
خان اس کی حرکت پہ لال بھبھوکا ہوئی تھی۔ چہرہ قدرتی شرم
وحیاء سے سرخ پڑا تھا۔ داعیر خان کا لمس اپنی انر تھائی پہ
محسوس کرتی مہر خان نے ڈر کے تحت تھوک نگلا تھا۔ اس
کیلئے اس کو برداشت کرنا ہمیشہ مشکل ہو جاتا تھا۔ مہر کے جسم

میں ہلکی سی کپکپاہٹ طاری ہوئی تھی۔ ماتھا اور ہتھیلیاں پسینے سے نم ہونے لگی تھی۔۔۔ داعیر خان بے باکی سے اپنا وجود اس کی تھائیز کے درمیان پھیرتا آگے بڑھ کر اس کے لبوں کو چومنے لگا تھا۔ وہ اس کی بے باک حرکت پہ اس کو کندھوں سے تھامتی تھوڑا سا چپھے کو کھسکی تھی۔

ان لمحات میں مجھ سے دور ہونے کی کوشش مت کیا کرو مہر!!۔۔۔۔۔ داعیر خان اپنی سرخی چھلکتی آنکھوں میں سختی لے کر بولتا اس کو ٹوک گیا تھا جو چپھے ہٹ کر اسے حالت سکون میں بے سکون کر رہی تھی۔ مہر خان نے اس کے لہجے میں دھمکی کی آمیزش محسوس کرتی تھو کہ نگلتے ہوئے تھوڑا سا آگے ہو کر داعیر خان کو دونوں کندھوں سے تمام گئی۔ وہ جو کہ اس کے لبوں کو اپنے گیلے لمس سے مہکانے میں مگن تھا۔ اس کی حرکت

نوٹ کرتا، تھوڑا سا پیچھا ہوا تھا۔ وہ اس کی دونوں ٹانگوں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لیتا انہیں وسیع کرتے ہوئے خود ان میں ایڈجسٹ ہوا تھا۔ داعیر خان اس کی ایک ٹانگ کو چھوڑ کے، مہر خان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ گیا جبکہ دوسرے ہاتھ سے اس کی دائیں ٹانگ کو مضبوطی سے جکڑتا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک جھٹکے سے اس میں شامل ہوا تھا۔

ابہہ داعیر!!۔۔۔ مہر خان نے زور سے اس کے کندھے پہ ناخن پیوست کرتے ہوئے درد سے آنکھیں میچ کے کھولیں۔
نورِ چشم بس ہو گیا۔۔۔ داعیر نے محبت سے بولتے ہوئے اس کے گال پہ لب رکھے۔

آپ ہمیشہ مجھے ایسے ہی تکلیف دیتے ہیں۔۔۔ مہر خان نے اس کے کندھے پہ مکا جھڑتے ہوئے شکوہ کیا تھا۔

تکلیف دیتا ہوں تو لذت اور سکوں بھی تو دیتا ہوں۔ میرے
ساتھ پھر تم بھی مدہوش ہو جاتی ہو اور مجھے مزید پاگل کر دیتی
ہو۔۔۔ وہ جھک کر اس کی گردن یہ دانت گاڑتا ہلکی سی اپنی
موومنٹ شروع کر گیا۔۔۔ داعیر خان آہستہ سے تندو تیز ہونے
لگا تھا۔ مہر خان نے اس کی طرف سے تیزی پا کر فوراً بوکھلاتے
ہوئے اس کے کندھوں یہ اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کی
تھی۔ داعیر خان اپنی حرکت سے اس کے بے ہنگم ہوتے
نازک سراپے کو اپنے لبوں میں دباتا شدت پسند ہو رہا تھا۔ اس
کی سانسیں پھول رہی تھی۔

دونوں کی تیز سانسوں کو شور اور مہر کی سسکیاں پورے ڈریسنگ
روم میں گونجتی پرسوز ماحول بنا رہی تھی۔ داعیر اس کے
سراپے کو اپنی لبوں کی قید سے آزاد کرتا اس کی ایک ٹانگ اپنی

بازو کے گرد لپیٹ کے تھوڑی سی اوپر کی طرف اٹھاتا، دوسرا ہاتھ مہر کی گردن پہ رکھ کے اس کو مضبوطی سے جکڑتا اپنی پوری قوت لگاتے ہوئے اس میں آخری حد تک سمایا تھا۔ وہ خود کو تیز حرکت دیتا مہر کے نازک وجود کو لرزا کے رکھ گیا تھا۔

اہہ!! امم۔۔۔ داعیر!!۔۔۔ مہر خان نے سسکتے ہوئے اس کے کندھوں کو مضبوطی سے جکڑا تھا۔ وہ اپنی حرکت سے زور دار سٹروکس مہر خان کے نازک وجود میں پیوست کرتا اس کی کمر کو آئینے کے ساتھ ٹکرائے لگا تھا۔ داعیر خان کے ہر جان گداز پیش پر مہر خان کی کمر زور سے چھپے آئینے کے ساتھ جا کے ٹکراتی تھی۔

دا۔۔۔ داعیر۔۔۔ میری۔۔۔ کمر۔۔۔۔۔ چھپے۔ لگ۔۔۔
رہی۔۔۔۔۔ ہے۔۔۔۔۔ وہ اس کے سینے یہ مکا جھڑتی درد سے

روہانسی ہو کے بولی تھی۔ وہ اس کے لمس کی تپش یہ خود کو
جھلستا محسوس کرتی میٹھی اذیت میں اپنے دونوں بازو اس کی
گردن کے گرد حائل کرتی داعیر خان کی گردن میں چہرہ چھپا گئی
تھی۔ وہ اس کی پکار اور اپنی گردن پہ اس کے دانتوں کا زور
محسوس کرتا فوراً اس کو اسی حالت میں اٹھائے صوفے کی طرف
لے کے بڑھا تھا۔

وہ آرام سے اسے صوفے پہ لیٹاتا اس کے پورے پسینے سے تر
جسم کو پاس پڑے ٹیبل سے ٹیشو اٹھا کے خشک کرتا مہر خان
کے ماتھے پہ عقیدت سے لب رکھتا اس کی خوبصورت کر سٹل
گرے آنکھیں چوم گیا۔

کمفر ٹیبل ہو یہاں؟؟۔۔۔ داعیر خان اس کے سارے جسم یہ
اپنے ہاتھوں اور لبوں کا لمس چھوڑتا فکر مندی سے استفسار
کرنے لگا۔

ہمم!!۔۔۔ مہر نے تھکی ہوئی آواز میں ہنکارا بھرا تھا۔ داعیر
اس کے ہاتھوں کو چوم کر ایک دفعہ پھر سے اس کی ٹانگوں کے
درمیان میں آتا بے تابی سے اس میں شامل ہوا تھا۔ وہ اس کو
پھر سے خودیہ حاوی ہوتا دیکھ کر اس کے سینے پہ ہاتھ
جماتی، اس کی جان لیوا قربت سے لطف اٹھاتی لذت میں میٹھی
سسکاریاں بھرنے لگی تھی، اپنے لمس کی شدت یہ اس کے منہ
سے نکلتی سسکیاں اس کو راحت بخشتی اسے مزید گزرتی رات
کے ساتھ جنونی کر رہی تھی۔۔۔

میرے۔۔۔ سینے۔۔۔ یہ نام۔۔۔ لکھو۔۔۔ اپنا۔۔۔ فارغ
۔۔۔ نہ۔۔۔ رہو۔۔۔ داعیر خان گھٹنوں کے بل ہو کے اٹھتا مہر خان
میں آخری حد تک سماتے ہوئے اپنی پھولی سانسوں سے اس کو
حکم دینے لگا جو اس کے سینے پہ ہاتھ جمائے میٹھے درد سے سسک
رہی تھی۔

فارغ۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں۔۔۔ آپ۔۔۔ جیسے۔۔۔ باڈی بلڈر۔۔۔ کو
برداشت۔۔۔ کر رہی۔۔۔ ہوں کیا۔۔۔ اتنا کافی نہیں ہے
؟۔۔۔ وہ اس کی بات سن کر خفگی سے داعیر خان کے سینے کے
بالوں کو اپنی مٹھیوں میں جکڑ کر نوچنے لگی۔

ہاہا! نور چشم! مجھے۔۔۔ پسند ہے۔۔۔ جب۔۔۔ قربت۔۔۔ کے
۔۔۔ لمحات۔۔۔ میں۔۔۔ تم میرے۔۔۔ سینے پہ۔۔۔ اپنا۔۔۔
نام۔۔۔ لکھتی ہو۔۔۔ داعیر خان غیر ساکت وجود کے ساتھ بولتا

اپنی بیوی کی خفگی پہ کھل کے مسکرایا تھا۔ وہ اس کے نازک
وجود پر مکمل طور پر قابض ہوتا اپنی شدتوں میں وحشیانہ حد تک
اضافہ کرتے ہوئے اس کو اپنے لذت بخش لمس اور حصار کی
قید میں لے گیا تھا۔

رات کا ایک بج رہا تھا۔ اسلام آباد کا یہ پورا سفید پوش علاقہ
خوابِ خرگوش تھا۔۔ ایسے میں زربخت کے ساتھ دوسری چار
پائی پہ سوئی نزہت خان کی طبیعت ناساز ہو رہی تھی۔ وہ کچھلے
کئی منٹوں سے اپنے منہ سے کچھ لفظ نکالنے کی کوشش کرتی لیکن
آگے زبان ساتھ دینے سے انکار کر دیتی۔ آخر کار ہمت کرتے
ہوئے انہوں نے تھوڑا سا سر اٹھا کے زربخت کو آواز لگائی
تھی۔

زر بخت!! پانی!۔۔۔ انہوں نے مدہم آواز میں اس کو پکارا
تھا۔

جی مورے!! کیا ہوا ہے؟۔۔۔ وہ ماں کی زرا سی پکار سنتی
فوراً نیند سے بیدار ہوئی تھی۔
پانی چاہیے؟۔۔۔ وہ بوکھلا کر اٹھ کے بیٹھتی استفسار کرنے
لگی۔

ہمم!!۔۔۔ انہوں نے نقاہت سے ہنکارا بھرا تھا۔
اچھا ابھی دیتی ہوں۔۔۔ وہ ان کا جواب سن کر اٹھی اور پاس
پڑے چھوٹے سے ٹیبل سے پانی کا جگ اٹھاتے ہی اس کو
معلوم ہوا کہ وہ خالی تھا۔ وہ چارپائی سے اترتی اپنے پیروں میں
جوٹا اڑیسے گلاس پکڑے کمرے سے باہر نکلتی کچن میں پانی لینے

گئی اور دو منٹ میں ہی پانی کا گلاس لے کے واپس کمرے میں آ گئی۔

مورے! یہ لیں پانی۔۔۔ زربخت ہاتھ میں پانی کا گلاس لئیے
نزدہت خان کے سر پہ کھڑی ہوتی اپنی آنکھیں مسل کر انہیں صدا
لگا گئی۔۔۔

مورے! پانی پی لیں۔۔۔ اس نے ان کی طرف سے جواب نہ
پاکر دوبارہ صدا لگائی تھی۔۔۔ وہ نیند میں جھول رہی تھی۔ نیند
سے بھری نیلی آنکھوں میں سرخی چھائی ہوئی تھی۔ بال بے
ترتیب تھے۔۔۔

مورے! سو گئیں ہیں آپ؟۔۔۔ وہ اپنے منہ پہ ہاتھ رکھ کے
جمائی روکتی نیچے جھک کر لیٹی ہوئی نزدہت خان کو مخاطب
کرنے لگی۔ وہ تین چار دفعہ اپنی ماں کو آوازیں لگا چکی تھی لیکن

انہوں نے اس کی کسی بھی پکار کا جواب نہیں دیا تھا۔ کمرے
میں نائٹ بلب کی مدہم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ زربخت
اپنی پوری آنکھیں ٹھیک سے کھولتی پانی کا گلاس سائیڈ پر رکھتی پھر
سے ان کی طرف جھکی تھی۔

مورے! آپ کو پانی نہیں پینا؟ اٹھ جائیں پانی پی لیں! میں لے
آئی ہوں پانی آپ کیلئے۔۔۔ وہ نرمی سے مدہم روشنی میں ان کے
گال پہ اپنا نازک ہاتھ رکھتی انہیں جاگنے کی کوشش کرنے لگی
تھی۔ نزہت خان کی آنکھیں بند تھی۔ زربخت کی پکار پہ ان کے
وجود میں زرا سی بھی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی ماں کی
طرف سے جواب نہ پا کر اب فکر مندی میں مبتلا ہوئی تھی۔

مورے!!۔۔۔ زربخت اپنی ماں کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیتی
اونچی آوازیں انہیں جگانے لگی تھی۔۔۔ نزہت خان کا ساکت

وجود دیکھ کر اس کی نیند بھک سے اڑی تھی۔ دل تیزی سے
دھڑکا تھا۔۔۔ چہرے پہ ایک عجیب سا خوف سایہ کر گیا۔ وہ فوراً
ان کا چہرہ چھوڑتی اٹھ کے سوچ بورڈ کی طرف بڑھی اور لائٹ
آن کرتی نزہت خان کے پاس بھاگ کے واپس آئی تھی۔
مورے!!۔۔۔ سامنے کا منظر دیکھ کے اس کے حلق
سے چیخ بلند ہوئی تھی۔ وہ اپنے منہ پہ ہاتھ رکھے ایک لمحے کیلئے
اچھل کے پیچھے ہوئی تھی۔۔۔

مورے!! آپ کو کیا ہوا ہے؟۔۔۔ وہ برق رفتاری سے نزہت
خان کی طرف بڑھتی ان کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے
ہوئے اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔۔۔ ان کے منہ سے خون
رواں تھا۔ خون سے ان کی گردن اور چادر لہو لہان ہو چکی

تھی۔۔ شاید ان کو خون کی الٹی آئی تھی اور اسی وجہ سے بے
ہوش ہو چکی تھی۔

مورے!! اٹھیں۔۔۔ وہ اب روتے ہوئے ان کے چہرے پہ
ہاتھ پھیرتی انہیں صدائیں لگانے لگی۔۔ زربخت کی آنکھوں سے
آنسو زار و قطار بہنے لگے۔ لب اور ہاتھ کپکپانے لگے
۔۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ سارے منظر
دھندلے ہو گئے۔ ایک ڈرپورے جسم میں داخل ہو کر اس کے
ذہن اور وجود کو مفلوج کرنے لگا۔۔

مورے!! آپ کو اللہ کا واسطہ ہے اٹھ جائیں۔ اگر آپ نہ اٹھی
تو میری جان چلی جائے گی۔۔ وہ نرمی سے ان کے منہ سے
نکلتا خون اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کرتی روتے ہوئے بولی

تھی مگر نہ تو نزہت خان کے جسم میں کوئی حرکت ہوئی اور نہ
پلکوں میں جنبش آئی۔

مورے!! آپ میری بات سن کیوں نہیں رہی؟۔۔۔ وہ پاگلوں
کی طرح اب چلاتی نزہت خان کی گردن کے چھپہ ہاتھ رکھ کے
اوپر اٹھانے کی کوشش کرتی دھاڑیں مار مار کے رونے لگی تھی
۔ ان کا بے حس و حرکت، بے جان وجود زربخت کی گرفت
سے نکل کر پھر سے چھپے تکیے پہ لڑھک گیا۔۔ وہ اپنی ماں کو بے
جان ہوتا دیکھ کر تیزی سے چھپے مڑتی اپنی چارپائی سے فون تلاش
لگی تھی۔۔ اس کا پورا جسم کپکپا رہا تھا۔ ہاتھ پیر نزہت خان
کو کچھ ہونے کے ڈر سے ٹھنڈے برف ہو رہے تھے۔ فون ملتے
ہی وہ اپنے کانپتے ہاتھوں سے سب سے پہلے دمیر خان کا نمبر

ڈائل کرنے لگی۔۔ بل جا رہی تھی لیکن آگے سے کوئی پک نہیں
کر رہا تھا۔

لالہ!! فون اٹھائیں۔۔ وہ اپنے آنسو رگڑ کے صاف کرتی
اضطرابی کیفیت میں جنھجلا تے ہوئے بولی تھی۔ دو تین بار دمیر
خان کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد اس کی طرف سے جواب نہ پا کر
اس نے فون سے نگاہیں ہٹا کے اپنی ماں پہ دوڑائی تو نزہت خان
کے منہ سے رستا خون دیکھ کر پھر سے زربخت کی چیخ
نکلی تھی۔ پورا جسم یخ بستہ دہشت کی لپیٹ میں تھا۔ فون
اس کے کانپتے ہاتھوں سے چھوٹ کے فرش پہ گرا تھا۔ وہ فون
اٹھانے کی بجائے ان کی طرف لپکی تھی۔

مورے!!! آنکھیں کھولیں نہ! آپ کی زربخت آپ کی خاموشی پہ
مر جائے گئی۔۔ وہ بچوں کی طرح روتی دیوانوں کے جیسے ان

کے چہرے کو چومتی کانپتی آوازیں اپنی ماں سے ملتی ہوئی تھی
لیکن نزہت خان کو آج اس کی نہ تڑپ دکھ رہی تھی اور نہ ہی
اس کے آنسوؤں کی اذیت۔۔۔ وہ نزہت خان کے وجود کو
ہنوز ساکت دیکھ کر پھر سے فون کی طرف بڑھتی اسے زمین سے
اٹھاتے ہوئے آن کر گئی۔۔۔ کانٹیکٹ لسٹ کھولتے ہی تیسرا
نمبر یہ شہزاد کا نمبر جلمگایا تھا۔

اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بنا شہزاد کا نمبر ڈائل کیا کیونکہ ان کے
گھر کے سب زیادہ نزدیک وہی تھا، اور ان کی بروقت مدد کر سکتا
تھا۔ اس لئے زربخت نے اسے ہی بلانے کا فیصلہ کیا تھا۔ بیل
جارہی تھی۔ وہ بے صبری سے دوسری سائیڈ سے فون اٹھانے
کا انتظار کر رہی تھی اور اگلے ہی پل دوسری بل پہ فون اٹھا لیا گیا
تھا۔

ہیلو!! لالا۔۔ میں۔۔ زربخت۔۔ بول۔۔ رہی۔۔ ہوں۔۔
وہ۔۔ مورے۔۔ وہ دوسری سائیڈ سے شہزاد کی آواز سنتی
ہی ہچکیوں کے ساتھ روتے ہوئے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں
بولی تھی۔

کیا ہوا ہے خالہ کو؟ زربخت تم رو کیوں رہی ہو؟ شہزاد زربخت
کی آدھی بات سنتا، فوراً بیڈ سے اترتا ننگے پاؤں کمرے سے باہر
نکلتا تھا۔ زربخت کا رونا ایک لمحے کیلئے اس کی نیند اور سکون برباد
کر گیا تھا۔

لالا!! آپ۔۔ جلدی۔۔ سے۔۔ ہمارے۔۔ گھر۔۔
آجائیں۔۔ مورے۔۔ اٹھ۔۔ نہیں۔۔ رہی ہیں۔۔ ان
کے۔۔ منہ۔۔ سے۔۔ خون۔۔ آ رہا۔۔ ہے۔۔ وہ آنسو سے
بھگے چہرے کے ساتھ پھر سے آدھے ادھورے لفظوں میں

بولتی شہزاد کو اپنی بات سمجھانے لگی تھی۔ نزہت خان کی طرف دیکھتے اس کے الفاظ منہ سے نکلنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی روح اپنی ماں کو بے جان ہوتا دیکھ کر پرواز ہو رہی تھی۔۔

زربخت!! رونا بند کرو۔ میں دو منٹ تمہارے پاس آیا، خالہ کو کچھ نہیں ہوگا۔ تم ہمت رکھو۔ شہزاد زربخت کا رونا سن کے مصنوعی فکر مندی سے بولا تھا۔ وہ تیزی سے چھپرٹا سائیڈ ٹیبل سے اپنا وولٹ، گاڑی کی چابی اٹھاتا پیروں میں چپل اڑیے پورچ کی طرف بھاگنے والے انداز میں بڑھا تھا۔ شاید اس کو نزہت خان کے ذریعے زربخت تک رسائی حاصل کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ اس لئے وہ اتنی پھرتیاں دیکھا رہا تھا۔ وہ دو منٹ میں ہی گاڑی نکال کے زربخت کے گھر کے سامنے کھڑی کرتا، گاڑی

سے اتر کر دروازہ کی طرف لپکا تھا۔۔ ہر طرف گلی میں سناٹا چھا
ہوا تھا۔۔ اور رات کے اس پہر شہزاد نے دروازے پہ دستک
دینے کی بجائے زربخت کو دوبارہ کال ملائی۔۔

ہیلو! زربخت دروازہ کھولو!! میں باہر آگیا ہوں۔ شہزاد سنجیدگی
سے بولتا ارد گرد نگاہیں دوڑا گیا۔ بے شک اس کو زربخت نے
اپنے گھر رات کے اس پہر ایمر جنسی میں بلایا تھا۔ لیکن دیکھنے
والی آنکھوں نے اس کو کوئی اور ہی رنگ دینا تھا۔۔

لاالا! زربخت تیزی سے دروازہ کھولتی شہزاد سے مخاطب ہوئی
تھی۔ زربخت نے اپنا چہرہ دوپٹے سے چھپا رکھا تھا۔ صرف نیلی
آنکھیں آنسوؤں سے بھری اپنی جھلک دکھلا رہی تھیں۔ اس کا
پورا وجود رونے کی وجہ سے ہچکولے کھا رہا تھا۔

لالا! مورے اٹھ نہیں رہی ہیں۔ ان کے منہ سے بہت زیادہ
خون بہہ رہا ہے۔ زربخت شہزاد کے ہمراہ ہوتی اسے اپنی ماں کی
حالت بتا گئی۔

کچھ نہیں ہوگا خالہ کو! میں آ رہا ہوں۔ شہزاد نے اس کی غیر
ہوتی حالت دیکھ کر اپنائیت بھرے احساس میں تسلی دی
تھی۔ اس کی ساری تسلیاں فریب تھی۔ وہ عجلت میں لمبے
لمبے ڈگ بھرتا نزہت خان کے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔
رونا بند کرو زربخت اور خالہ کی چادر لے آؤ۔۔۔ وہ کمرے میں
پہنچتے ہی نزہت خان کی پچھلی گردن میں ہاتھ گزار کے انہیں
سیدھا کرتا پریشانی سے بولا۔ وہ اس کی بات سنتی تیزی سے ان
کی چادر لا کے اوڑھانے لگی۔ نزہت خان کا بے جان وجود
شہزاد کے ہاتھوں میں کبھی ادھر تو کبھی اُدھر ڈول رہا تھا۔

زربخت اپنی ماں کا یوں بے جان اور ساکت وجود کو دیکھ کر
دکھی انداز میں روئے جارہی تھی۔ اس کی سانسیں حلق میں اٹکی
ہوئی تھی۔ نہ بحال ہو کے اس کو جان دار کر رہی تھی اور نہ
نکل کر اسے بے جان۔۔۔ یوں سانسوں کی ڈوری کے درمیان
میں کہیں الجھ گئی تھیں اور جب سانسوں کی ڈوریاں الجھ جائیں
تو وہ موت سے بھی زیادہ تکلیف دیتی ہیں۔ بالکل ایسی ہی
تکلیف وہ سہہ رہی تھی۔۔۔

تم بھی چادر لو اور جلدی سے باہر آؤ۔۔۔ وہ ایک جست میں ان
کو اپنی بانہوں میں بھرتا بنا وقت ضائع کئے اس کو حکم دیتا نزہت
خان کو اٹھائے باہر گاڑی کی طرف بڑھاتا تھا۔

وہ ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ اپنی چادر اور چند ہزار کے نوٹ
ایک چھوٹے سے صندوق سے نکالتی بے جان پیروں کے ساتھ

باہر کی جانب کی بڑھی تھی۔ گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے اپنے چہروں کو چادر میں اچھی طرح لپیٹا۔ نیلی آنکھیں سے ہنوز نمکین گرم پانی کی فروانی جاری رکھی ہوئی تھی۔ وہ افراتفری میں گھر کو لاک لگاتی چھپے نزہت خان کے پاس گاڑی میں سوار ہوئی تھی۔

لاالا!! جلدی کریں۔۔۔ وہ احتیاط سے اپنی ماں کا سر سیٹ سے اٹھا کے اپنی گود میں رکھتی اضطرابی کیفیت میں بولی۔
حوصلہ رکھو زربخت!! کچھ نہیں ہوا خالہ کو، بس بیماری کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی ہیں۔۔۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتا یاسیت سے بولا۔ زربخت نے اس کی بات غور سے نہیں سنی تھی۔ وہ تو صرف آنسو بہاتی ماں کے چہرے پہ جھکی ہوئی انہیں اٹھانے کی ناکام کوششیں کر رہی تھی۔ تقریباً پندرہ منٹوں میں ہی

وہ لوگ ہاسپٹل پہنچ چکے تھے۔ نزہت خان کو فوراً ایمر جنسی وارڈ میں منتقل کیا تھا۔ رات کے اس پہر سینئر ڈاکٹرزیہاں موجود نہیں تھے۔ ایک دو جونیئر ڈاکٹرز اور باقی عملہ موجود تھا۔ ان کو اندر لے جائے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا اور زربخت نے یہ ایک گھنٹہ انگاروں پہ کھڑے ہو کے گزارا تھا۔ وہ بار بار کوریڈور میں یہاں سے وہاں چکر لگاتی پریشانی میں اپنی ہتھیلیاں مسل رہی تھی۔ شہزاد دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اپنے سینے پہ ہاتھ باندھے اندر سے ڈاکٹر کے نکلنے کے انتظار میں تھا۔ وہ اس کو بارہا صبر اور حوصلے کی تلقین کر چکا تھا لیکن زربخت کو صبر کہاں آتا تھا۔ اس کو صبر اور حوصلہ تب آتا تھا جب اس نے اپنی ماں کو صحیح سلامت اپنی آنکھوں سے دیکھنا تھا۔ اس پہلے ساری تسلیاں اور دلا سے بیکار تھے۔۔ وہ ہنوز

پریشانی میں ٹہل رہی تھی اور شہزاد اسکی طرف دیکھ رہا تھا جب
اچانک ایمر جنسی وارڈ سے ایک جونیئر ڈاکٹر باہر نکلا۔ وہ دونوں
اسے دیکھتے ہی تیزی سے اس کی طرف لپکے تھے۔

میری مورے ٹھیک ہیں؟ ان کو ہوش آگیا؟ وہ کہاں ہیں؟ کیا میں
ان سے مل سکتی ہوں؟۔۔۔ اس نے ناجانے کتنے ہی سوال
بھگی آواز میں ڈاکٹر سے کر ڈالے۔

دیکھیں شہزاد! ہم آپ کو پچھلے چار مہینوں سے بتا رہے ہیں۔ ان
کا علاج اب دواؤں سے ناممکن ہے۔ ٹیومر پورے جگر میں پھیل
چکا ہے۔ ٹیومر خون کے خلیات کو تباہ کر گیا ہے، اب جگر میں
خون بننے کی بجائے پانی بن رہا ہے اور یہ لاسٹ سٹیج ہے اس
بیماری کی۔۔۔ ان کے پاس وقت بہت کم ہے۔ اگر آپ اب
بھی سرجری کی طرف نہ گئے تو ایک ماہ یا اس سے بھی کم عرصے

میں ان کی ڈیٹھ ہو جائے گی۔۔ آپ کو جلد از جلد کوئی فیصلہ لینا
ہوگا۔۔ ڈاکٹر زربخت کو جواب دینے کی بجائے شہزاد سے
پروفیشنلی انداز میں مخاطب ہوا۔

کیا مطلب ان کے پاس وقت بہت کم ہے؟۔۔ زربخت ڈاکٹر
کی بات سنتی نا فہمی سے بولی تھی۔ وہ شاید ڈاکٹر کی بات سمجھ
نہیں سکی تھی۔

زربخت میں تمہیں بتاتا ہوں۔۔۔ شہزاد اس کے چہرے پہ
استعجابیت دیکھ کے حوصلہ دینے والے انداز میں بولا تھا۔
مطلب یہ کہ آپ کے مریض کو جگر کا کینسر ہے اور ان کا ٹیومر
آخری اسٹیج پہ پہنچ چکا ہے۔ ان کا جگر ناکارہ ہو گیا ہے۔ وہ خون
کی بجائے اب پانی بنا رہا ہے، اسی وجہ سے ایک ہفتے میں ہی ان
کا پیٹ بھی پھولنا شروع ہو جائے گا اور پھر وہ پانی ان کے

پیٹ سے ٹائم پہ ریمو کرنا ہوگا اور یہ آخری حد ہے اس بیماری کی۔۔۔ اسلئے پہلے ہی ہم کئی بار ان سے کہہ چکے ہیں، اگر مریض کی زندگی پیاری ہے تو ان کو کسی اسپیشلسٹ کے پاس لے جائیں اور سرجری کا سارا پروسس کمپلیٹ کروا کے ان کا جگر ٹرانسپلانٹ کروائیں لیکن یہ ہماری بات سن ہی نہیں رہے۔ پچھلے چار مہینوں سے صرف وقتی دواؤں پہ مریض کو رکھا ہوا ہے، یہ بیماری جتنا مریض کی صحت کا نقصان کر چکی ہے مجھے نہیں لگتا یہ سرجری کے دوران survive کر پائیں گی؟ وقت پہ ہو جاتی تو ان کے بچنے کے چانسز زیادہ تھے۔ لیکن اب تو سو میں سے صرف بیس فیصد چانسز ہیں ان کے بچنے کے۔۔۔ باقی ہم تو بس دوا ہی کر سکتے ہیں۔ زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر اللہ نے زندگی بخشی تو شاید آپ کا مریض سرجری کے

بعد بچ جائے۔ ورنہ ہمیں تو اب کوئی امید نظر نہیں آرہی مریض
کے بچنے کی۔۔۔ اور حالیہ صورتحال مریض کی بہتر ہے۔ انجکشنز
لگا دیئے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں ان کو ہوش آجائے گا پھر آپ ان
کو لے کے گھر جاسکتے ہیں اب یہاں یہ مریض کو رکھنے کا فائدہ
نہیں ہے کیونکہ ہمارے پاس ان کا علاج ہی نہیں ہے۔۔۔
ڈاکٹر زربخت کے چہرے پہ نا سمجھی کا تاثر دیکھتا ٹھہرے لہجے میں
نزدہت خان کی بیماری اور ان کی حالت کی وضاحت کر گیا تھا۔
ڈاکٹر نے انتہائی سادہ اور آسان لفظوں میں اپنی بات سمجھائی
تھی۔ زربخت ان کی ساری بات سنتی اپنی جگہ پہ پتھر ہوئی
تھی۔ آنکھیں ساکت ہوئی تھی۔۔۔ لفظوں کے وار نے دل کو
بے دردی سے کاٹ ڈالا تھا۔۔۔ ڈاکٹر کے الفاظ ایسے تھے جیسے
کانوں میں کسی نے پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو۔۔

میری مورے کو کچھ نہیں ہو سکتا، وہ بالکل ٹھیک ہیں۔۔۔
زربخت بے یقینی اور حیرت کے عالم میں حالتِ غم میں چلائی
تھی۔

میری بات سنو زربخت!!۔۔۔ شہزاد نے اسے دلاسا اپنی
طرف متوجہ کروانا چاہا۔۔

مورے کو کچھ نہیں ہو سکتا یہ سب جھوٹ ہے۔۔ اگر ایسی
کوئی بھی بیماری ان کو ہوتی تو وہ مجھے ضرور بتاتی۔۔۔ وہ اپنی
گھٹتی سانسوں اور بند ہوتے دل کے ساتھ رنجیدگی سے بولی
تھی۔ وہ کسی صورت ڈاکٹر کی بات پہ یقین نہیں کر سکتی
تھی۔۔

یہ بالکل سچ ہے! آپ ان سے پوچھ لیں، یہ کچھلے چار مہینوں
سے مریض کو لیکر یہاں آرہے ہیں۔ یہ سب جانتے ہیں آپ ان

سے تصدیق کر سکتی ہیں اور مریض کی حالت خود انکی بیماری کا
پتہ دے رہی ہے۔۔۔ ڈاکٹر سنجیدگی سے شہزاد کی طرف اشارہ
کرتا زربخت کو وضاحت دیتا چھپڑا تھا۔۔

زربخت نے ایک امید!! ایک آخری امید کی تحت بھیگی پلکیں
اٹھا کے شہزاد کی طرف دیکھا تھا۔ اس احساس کے تحت وہ
بولے گا کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے! ڈاکٹر کی بات میں سچ رتی
برابر بھی نہیں ہے۔۔

زربخت!! یہ سب کچھ سچ ہے۔ جو بھی ڈاکٹر بول کے گیا ہے۔
خالہ کو جگر کا کینسر ہے اور مجھے یہ بات پچھلے چار ماہ سے پتہ
ہے۔۔۔ شہزاد نظریں چرا کے بولتا اس کے سر پہ ہاسپٹل کی
چھت گرا گیا۔

زربخت کا نازک وجود غمِ مرگ کی لپیٹ میں آیا تھا۔ سارا زمانہ
اپنے خلاف لگا۔ لمحے ظالم ہوئے۔ الفاظ خنجر نکلے، بھروسے
مند و غاباز نکلے، مضبوط سہارے بے بنیاد نکلے، رشتوں کے
دعوے کھوکھلے نکلے، زندگی کے سفر میں ساتھ چلنے والے موت
کے مسافر نکلے، اپنا، وہ جان سے پیارا اپنا!! وہ نزہت خان کا
معتبر ماں کا عہدہ، مقدس رشتے کی چادر اوڑھ کر اجنبی
نکلا۔ اس کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ماں اسے اجنبی بنا کے
اپنی بیماری چھپائیں گئی۔ زربخت کا دل کیا جا کے ڈاکٹر کا منہ
نوچ لے جس نے اس کی ماں کیلئے ایسے الفاظ منہ سے نکالے
تھے لیکن کہیں نہ کہیں اس کا دماغ ان لفظوں پہ یقین بھی کر رہا
تھا اور یہی یقین زربخت کی جان چھلنی کر رہا تھا اور پھر شہزاد کی
گواہی نے اس کی امیدوں اور توقعات پہ پانی پھیرا تھا۔

زر بخت!!۔۔۔ شہزاد اسے سنبھالنے کیلئے آگے بڑھا لیکن وہ
فوراً چھپے ہٹ گئی۔

لاالا!! آپ کو تو سب پتہ تھا، پھر آپ نے مجھے کیوں نہ بتایا؟
مورے نے مجھ سے یہ سب کیوں چھپایا؟ کیا میں ان کی سگی بیٹی
نہیں تھی؟ میرے ساتھ آپ دونوں نے مل کے دھوکا کیا ہے۔
مجھے اندھیرے میں رکھا۔ میں جن اجالوں کی آس پہ اندھیروں میں
بے خوف و خطر اتری تھی، وہ اجالے فریب نکلے۔۔۔ جو وجود
میرے لئے تحفظ کا سامان کا تھا، میرے لئے مضبوط سائبان
تھا۔ وہی وجود نقب زن نکلا۔۔۔ وہ زندگی کی نقب زنی کر کے
جان نکال کے لے گیا۔۔۔ اس کی آنکھوں سے بہتا شفاف نمکین
مائع چادر میں جذب ہو رہا تھا۔۔۔ وہ بے اعتنائی سے بولتی حالت
اندوہ گیس میں لڑکھڑا گئی۔ نزہت خان کی بیماری اور اس پہ تضاد

ان کا زربخت پہ عدم اعتمادی ظاہر کرتے ہوئے اپنی بیماری کے بارے میں سب کچھ چھپانا اس کو مار گیا تھا۔۔ وہ بے جان ہوتے وجود کے ساتھ اپنے قدموں پہ کھڑی نہ رہ پائی، رگوں میں خون منجمد ہونے لگا تھا۔۔

زربخت۔۔۔ شہزاد نے اسے سہارا دینے کیلئے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے ہی تھے جب وہ اسے اشارے سے دور رہنے کی تلقین کرتی دیوار کا سہارا لیکر خود کو گرنے سے بچا گئی۔۔
مجھے اب کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ سارے سہارے جھوٹ ہیں۔۔۔ وہ مضبوطی سے دیوار پہ ہاتھ جماتی رند ہی ہوئی آوازیں گویا ہوئی۔

زربخت!! میری بات سنو! اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔
مجھے خالہ نے سختی سے منع کیا تھا کہ تمہیں کچھ نہ بتاؤں۔ وہ نہیں

چاہتی تھی کہ تم ان کی وجہ سے پریشان ہو۔۔۔ شہزاد دو قدم آگے لیتا مصلحانہ انداز میں گویا تھا۔ اسے یوں زربخت کا خود سے بدگمان ہونا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

پریشان؟ پریشان نہیں کیا انہوں نے مجھے بلکہ مجھ پہ بے اعتنائی دیکھا کے مجھے زندہ قبر میں اتار دیا ہے۔۔۔ ان پہ تو مجھے مان تھا۔ مجھے بھروسہ تھا کہ وہ اپنا ہر دکھ سکھ مجھے سے بانٹتی ہیں لیکن میں غلط تھی، وہ تو مجھے اپنا ہی نہیں سمجھتی تھی۔ انہوں نے میرے وجود کو پل میں پرایا کر دیا۔ مجھ پہ بھروسہ تو کرتی مجھے اپنا دکھ بتاتی تو۔ میں نے ان کی بیماری کا سن کے مر تو نہیں جانا تھا۔ ابھی کوئی مری ہوں؟ بہت ڈھیٹ ہوں۔ اتنی آسانی سے نہیں مروں گی۔ مورے مجھے اپنا دکھ بتاتی تو میں ان کی تکلیف بانٹ لیتی۔ میں ان کی اذیتوں کو خود میں جذب کر لیتی۔ وہ کتنی

راتیں اکیلی تکلیف میں گزار دیتی تھی۔ میں پوچھتی رہی لیکن مجھے
خبر نہیں لگنے دی۔۔۔ خود سب کچھ سہتی رہی۔۔۔ مجھے دھوکے
میں رکھ کر میرے ساتھ زیادتی کی ہے مورے نے۔۔۔
زر بخت دیوار کے ساتھ لگتی شکستہ لہجے میں نیچے بیٹھتی چلی
گئی۔۔۔ اس کا لہجہ دکھ اور غم سے چور تھا۔۔۔

زر بخت!! سنبھالو خود کو! نزہت خالہ کا بھی اس میں کوئی قصور
نہیں ہے۔ ان کی طرف سے بدگمان مت ہو۔ اگر انھوں نے
تم سے اپنی بیماری چھپائی ہے تو اس کے چھپے وجہ ہے۔۔۔ وہ
نہیں چاہتی تھی ان کی بیماری تمہارے لئے کسی پریشانی کا
باعث بنے۔۔۔ وہ نہیں چاہتی تھی اپنے علاج کیلئے کسی کے
آگے ہاتھ پھیلانیں۔ کسی کے درجا کے بھیک مانگے کیونکہ وہ
جانتی تھی اس بیماری کے علاج کیلئے ان کے پاس رقم نہیں

ہے۔۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ تم یا وہ صرف پیسوں کیلئے نام نہاد
اپنوں کے سامنے گر گڑائیں۔۔ شہزاد نیچے جھک کر پنچوں کے
بل ہو کے بیٹھتا اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔
تو نہ مانگتی کسی سے پیسے!! نہ ہاتھ پھیلاتی لیکن مجھے بتاتی تو۔ مجھے
بتاتی کہ زربخت سنبھل جاؤ، میں نے تمہیں چھوڑ کے چلے جانا
ہے۔ تمہیں میرے بغیر جینا ہے۔۔ بھرے جہان میں اکیلا
چھوڑ کے خود یہاں سے جانے کی تیاری کر رہی تھی اور مجھے خبر
بھی نہ لگنے دی۔ انھوں نے مجھے اعتبار میں رکھ کے بے اعتبار
کی موت مارا ہے۔۔ کوئی روح سے جڑا اپنا چھوڑ کے جا رہا ہو تو
وہ بتا کے جاتا ہے کہ میں جا رہا ہوں تاکہ یوں اچانک اس کی روانگی
ہمیں مضطرب نہ کر دے لیکن مورے تو مجھے بغیر بتائے مجھے
سے جان چھڑانے کے منصوبے بنا چکی تھی۔۔ اتنی تنگ آئی

ہوئی تھیں مجھ سے جویوں چپکے سے چھوڑ کے جا رہی
تھی؟۔۔۔ زربخت اذیت ناک الفاظ کا چناؤ کرتی شدتِ غم
میں بولی تھی کیونکہ یہ بات تو وہ بھی اچھے سے جانتی تھی کہ
بیماری کے علاج کیلئے پیسے ان کے پاس نہیں ہیں تو وہ کس وثوق
سے کہتی کہ اس کی ماں کو کچھ نہیں ہوگا؟ کس ڈھارس کے
بھروسے یہ امید لگاتی کہ اس کی ماں بچ جائے گی یا وہ زندہ رہے
گی؟

ہر طرف تو قسمت اور معاشی حالات کا اندھیرا ہی اندھیرا تھا،
امید کی کرن تو کوئی نہ تھا۔ کسی کا وجود مددگار ثابت نہیں ہونے
والا تھا جو زربخت اور اس کی ماں کو موت کے اندھیروں سے
نکال کر زندگی کے اجالوں میں لائے؟

زربخت! ایسے الفاظ کا استعمال کر کے خود کو تکلیف مت
دو۔۔ تمہارے یوں تڑپ کے رونے سے سب کچھ ٹھیک نہیں
ہو جائے گا۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب رونے کی بجائے ہمیں
اگلا لائحہ عمل سوچنا ہو گا۔ نزہت خالہ کی جان بچانے کے
بارے میں۔۔۔ دیکھو! ڈاکٹر بول کے گیا ہے نہ! کہ اگر ہم ان کا
جگر ٹرانسپلانٹ کرواتے ہیں تو وہ بچ جائے گی۔ میں خالہ کا جگر
ٹرانسپلانٹ کرواؤں گا۔ ان کو امریکہ لے کے جاؤں گا۔ یہ عام سا
ڈاکٹر ایسے ہی بلو اس کرتا ہے کہ ان کے بچنے کے بیس فیصد
چانسز ہیں۔ میں ان کو اچھے سے اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا
۔ ان کا علاج کروائیں، وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی اور ہمیشہ
تمہارے ساتھ رہیں گی۔ میں سب کچھ ٹھیک کر دوں گا، بس
تمہیں نزہت خالہ کی جان بچانے میں میرا ساتھ دینا ہو گا۔

میں جو کہوں گا تمہیں وہ کرنا ہوگا۔ تم دوگی نہ میرا ساتھ؟ تم
میری بات مان کر نزہت خالہ کو نئی زندگی دوگی نہ؟۔۔ وہ اس کی
نیلی آنکھوں میں جھانکتا باہم اپنے دونوں ہاتھ آپس میں پھنسائے
شاطرانہ انداز اور ذہن سے بولا تھا۔ شہزاد نے موقع کی نزاکت
کو دیکھتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔ وہ زربخت کی حالت دیکھ کے
جان چکا تھا کہ لوہا گرم ہے، یہی صحیح وقت ہے موقع پہ وار
کرنے کا۔۔ شہزاد چالاکی سے لفظوں کا جال بنتا زربخت کو اس
میں پھنسانے کیلئے اس کے علاج کا دانہ ڈال گیا۔ اس کو اپنے
ساتھ نکاح کرنے کے لئے راضی کرنے کیلئے اس سے زیادہ اچھا
وقت اور موقع شہزاد کو پھر کبھی نہیں مل سکتا تھا اور وہ اس
موقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو بھی اس رشتے کیلئے
منا سکتا تھا۔

تو کیا مورے بچ جائیں گی؟ ان کو کچھ نہیں ہوگا؟ لیکن ڈاکٹر تو کہہ
کے گئے ہیں ان کے بچنے کے مواقع کم ہیں۔۔۔ زربخت اپنی
بھگی ہوئی پلکیں اٹھا کے ایک یقین کے ساتھ شہزاد کو دیکھتی
حیرت سے بولی تھی۔

ہاں وہ بالکل پہلے جیسی ٹھیک ہو جائیں گی، جگر ٹرانسپلانٹ
کروانے کے بعد وہ نارمل صحت مند زندگی گزاریں گی۔۔۔ یہ ڈاکٹر
ایسے ہی بولتے ہیں۔۔۔ وہ اس کو ہنوز دیکھتا یقین دہانی کروانے
کی کوشش کرنے لگا۔

سچ لالا؟۔۔۔ اس نے بے یقینی سے پھر سے شکستہ لہجے میں
رندھی ہوئی آواز میں استفسار کیا جیسے وہ شہزاد کی بات کی
تصدیق چاہ رہی ہو۔

ہمم!! سو فیصد سچ کہہ رہا ہوں اور اس سچ کو حقیقت میں بدلنے
اور عملی جامہ پہنانے کیلئے تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔۔۔ میری
بات ماننا پڑے گی۔۔۔ وہ تصدیق کرنے والے انداز میں بولتا
پھر سے اپنے مطلب کی بات پہ زور دے گیا۔

لالا!! میں آپ کی ہر بات مانو گی، بس میری مورے کی زندگی دراز
ہو جائے اور مجھے ہمیشہ کیلئے تاحیات ان کا ساتھ میسر رہے
۔۔۔ میں ان کا ساتھ پانے کیلئے آپ کی ہر بات ماننے کو تیار ہوں
۔۔۔ آپ جو بولیں گے میں وہ کروں گی۔۔۔ آپ بتائیں مجھے کیا کرنا
ہوگا؟۔۔۔ وہ اپنے آنسو رگڑ کے صاف کرتی اپنی ماں کی زندگی
کیلئے ہر حد تک جانے کو تیار ہوئی۔۔۔ اس وقت شہزاد کی طرف
سے دی گئی امید اسے صحرا میں ٹھنڈے پانی کا کنواں لگ رہی

تھی جو اس کی شدت غم کو بھی مٹائے گا اور اس کی ماں کو زندگی
سے سیراب بھی کرے گا۔۔

اچھا بتاتا ہوں!! پہلے نیچے سے تو اٹھو۔۔ وہ اٹھ کے کھڑا ہوتا
اس کو بیچ پہ بیٹھنے کا اشارہ کرنے لگا۔ وہ فوراً اٹھ کے بیچ پہ
بیٹھی۔ شہزاد بھی اس کے ساتھ زرا فاصلے پہ ہو کے بیٹھتا ایک
گہری سانس اندر کی طرف کھینچتے ہوئے بازی جیتنے والے
الفاظوں کا ذخیرہ دماغ میں جمع کرنے لگا۔

دیکھو زربخت میری بات غور سے اور ٹھنڈے دماغ سے سننا!!
کیونکہ میری بات سننے کے بعد تمہارا ردِ عمل نزہت خالہ کی زندگی
کا فیصلہ کرے گا۔۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے خالہ کا علاج اپنے
پیسوں سے کروانے میں۔۔ نزہت خالہ نے مجھے بیٹا بولا تھا اور
اس رشتے کو نبھانے اور اس کا خالص پن ثابت کرنے کیلئے میں

ہنسی خوشی اپنا سارا سرمایہ لگانے کو تیار ہوں مگر مسئلہ یہ ہے کہ
میں تو پرایا ہوں۔ نزہت خالہ کا منہ بولا بیٹا ہوں، ان کا اپنا سگا
بیٹا تو نہیں ہوں اور یہی ایک بڑی وجہ ہے نزہت خالہ کا مجھ
سے علاج کیلئے پیسے نہ لینے کی کیونکہ وہ بغیر کسی مضبوط رشتے کے
مجھ سے کوئی احسان نہیں لیں گی۔۔۔ وہ کہتی تھی کہ وقتی احسان
مستقل طعن بن جاتے ہیں۔۔۔ اور انہیں طعنوں کے ڈر سے
انہوں نے اپنی بیماری سب سے چھپائی۔۔۔ یہاں تک کہ اپنے
لالا اور بھتیجیوں کو بھی خبر نہ لگنے دی۔۔۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ
اپنوں کے وقتی احسان لے کے تمہاری اور اپنی عزت نفس
مجروح کریں۔ پتہ ہے نہ تمہاری ممانی کا کیسا سلوک رہا ہے
شروع دن سے تم لوگوں کے ساتھ؟ وہ تمہارے ماموں یا کسی کو
بھی تمہاری ماں کے علاج کیلئے پیسے نہیں خرچ کرنے دیں گی اور

اگر تمہارے ماموں یا کزن ان کے خلاف جا کر نزہت خالہ کا
علاج کروا تے بھی ہیں تو بقیہ کی ساری زندگی نزہت خالہ کو
احسان مندی میں اور اپنوں کی مقروض ہو کے گزارنے پڑی گی
اور اسی وجہ سے نزہت خالہ نے اپنی بیماری سب سے مخفی
رکھی۔۔۔ وہ بغیر کسی کے احسان لئیے اور مقروض ہوئے بنا اس
بیماری سے لڑنا چاہتی ہیں۔ نزہت خالہ مرتے دم تک اپنا اور
اپنی ذات کا بھرم قائم رکھنا چاہتی ہیں۔۔۔ بنا کسی کا احسان لئے
۔۔۔ شہزاد چہرے پہ مصنوعی افسردگی سجائے الفاظ سمجھداری
سے کسی تیر کی طرح منہ سے نکال رہا تھا، تاکہ اس کا ہر لفظ ٹھیک
نشانے پہ جا لگے اور ہر لفظ کا وار کار آمد ثابت ہو۔۔۔

ہمم!! مجھے پتہ ہے۔ مورے مجھے ہر وقت یہی سمجھاتی رہتی ہیں
بغیر کسی روحانی رشتے کے کسی سے احسان نہیں لینا اور مجھے یہ

بھی پتہ ہے مورے کبھی بھی ماموں لوگوں سے اپنے علاج کیلئے
پیسے نہیں لیں گی۔ کیونکہ ممانی جان کو میں اور مورے بالکل بھی
پسند نہیں ہیں لیکن لالا! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ میں آپ کی بات
سمجھ ہی نہیں۔۔۔ زر بخت رنجیدگی سے ماں کی نصیحتیں یاد
کرتی شہزاد سے اس کا مدعا جاننے کے بارے میں استفسار کر
گئی۔۔

دیکھو زر بخت!! ابھی تم نے کہا کہ نزہت خالہ کہتی ہیں بغیر کسی
روحانی رشتے کے کسی سے بھی احسان نہ لو!! میں بنا شرط کے
ان کا علاج کروادوں گا لیکن میں کس حیثیت سے کرواؤں؟ میرا
تمہارا یا نزہت خالہ کا آپس میں کوئی رشتہ تو نہیں ہے۔۔ اگر میں
اتنی بھاری رقم لگاؤں گا تو زمانہ میرے نیکی کرنے کے خلوص کو
چھوڑ کر میری نیت اور کردار پہ شک کرے گا۔ لوگ بولیں گے

کہ کس رشتے کے تحت میں نے اتنی رقم نزہت خالہ پہ خرچ کی؟
وک تو میری ماں کی عمر کی ہے۔۔۔ وہ ان پہ بات نہیں کریں
گے۔ لوگ تمہارے کردار کو مشکوک نگاہوں سے دیکھیں گے
۔ میرا کردار بھی سوالیہ نشان بن جائے گا، نزہت خالہ کو
بچانے کی میری کی گئی زرا سی کوشش میرے اور تمہارے
کردار پہ کیچڑ اچھالنے کی وجہ بن جائے گی۔۔۔ وہ اس کی طرف
دیکھے بنا ذہن میں لفظوں کے جال بننا معصوم سی زربخت پہ
لفظوں کا شکنجہ سخت کرنے لگا۔

میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔ میں مضبوط کردار کی مالک ہوں، میرا
کردار آئینے کی طرح شفاف ہے۔۔۔ وہ اپنے کردار پہ بات
سنتی دے دے غصے میں پھنکاری۔ نیلی آنکھوں میں غم کی سرخی
کے ساتھ اشتعال اور غصے کی سرخی بھی چھائی تھی۔ کوئی بھی

اپنے کردار پہ ایک حرف نہیں برداشت کر سکتا تو زربخت کیسے
کرتی بھلا؟؟

یہ بات مجھے پتہ ہے کہ تم با کردار لڑکی ہو لیکن لوگوں کی زبانیں کون
روکے؟ اس لئے ہر کسی کے سوال کا جواب میں نے سوچا ہے
اور مجھے نہیں لگتا، اس سے بہتر جواب یا جواز کوئی اور ہو سکتا
ہے لوگوں کے منہ بند کروانے کیلئے۔۔۔ وہ تھوڑا سا زربخت
کی طرف کھسکتا اپنا رخ ترچھا کئے اس کی نیلی آنکھوں میں جھانکنے
لگا جو اسے ہی پریشانی سے دیکھ رہی تھی۔

کیسا جواز؟۔۔۔ شہزاد کو خاموش ہوتے دیکھ کر اس نے بے
چینی سے پوچھا۔ وہ ساری بات سننا چاہتی تھی۔ آخر وہ کہنا کیا
چاہتا ہے؟۔

تمہارا اور میرا نکاح!!۔۔۔ وہ اس کے چہرے پہ نظریں ٹکائے
ایک دم سے ٹھوس لہجے میں بولتا زربخت کو جھٹکا لگا گیا۔۔ وہ
چند لمحے اس کے چہرہ کو تکتی رہی پھر تنفر سے نگاہیں پھیر گئی۔۔
چہرے پہ استعجابیت پھیلی تھی، آنکھوں میں اشتعال برپا ہوا۔
انداز حیرت زدہ تھا۔۔

میں آپ سے کیسے نکاح کر سکتی ہوں؟ آپ میرے لالا ہیں۔
آپ مجھ سے بڑے ہیں۔ میں آپ سے نکاح نہیں کر سکتی۔۔۔
اس نے فوراً مضبوط لہجے میں انکار کیا تھا۔ وہ حیرت زدہ تھی
شہزاد کی یوں ڈائریکٹ پیش کش اور ہمت پہ۔۔۔ وہ بیچ سے
اٹھ کھڑی ہوئی کیونکہ اب اسے اس کی آنکھوں میں ہمدردی کے
بجائے وہشت، بدنیتی، غلاظت اور حوس دکھی تھی۔۔

میری پوری بات سن لو پھر بے شک میری آفر کو ٹھکرا دینا! مجھے
کوئی مسئلہ نہیں ہے اور نہ میں تمہیں اپنے ساتھ جوڑنے میں
زبردستی کروں گا۔ اگر تم مجھ سے نکاح کرتی ہوں تو میں
تمہارا محرم بن کر سارے فرائض پورے کروں گا اور وہ فرائض
احسانات میں نہیں آئیں گے بلکہ وہ تمہارا اور نزہت خالہ کا مجھ
پر حق ہوگا۔ تم لوگ صرف اس مقدس رشتے کا حق مجھ سے
وصول کرو گی نہ کہ میرا تم لوگوں پر احسان ہوگا۔ صرف باپ
اور شوہر سے ہی حق لیا جاتا ہے، باقی سب رشتوں کی ہمدردیاں
احسان میں آتی ہیں۔ تمہارا نام مجھ سے جڑنے کے بعد نزہت
خالہ کو میرے پیسوں سے علاج کروانے میں کوئی مسئلہ نہیں
ہوگا۔ وہ ہنسی خوشی حق سے میرے خلوص کو قبول کریں
گئی۔ تم اپنی ذات کو چھوڑ کے اپنی ماں کی زندگی کے بارے میں

سوچوں کیونکہ ان کی زندگی کی ڈور اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔
تمہارا فیصلہ ہی ان کو نئی زندگی بخش سکتا ہے تو اگر تم چاہتی ہو
کہ تمہاری ماں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں تمہیں بنا وقت ضائع
کئے، اپنی ذات کو نچھاور کر کے ان کو بچا سکتی ہو۔۔ جہاں
تک میری بات رہی تو میں وعدہ کرتا ہوں میری طرف سے تمہیں
کبھی کوئی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ تمہاری ذات کی حفاظت
و نگہداشت اور نزہت خالہ کی صحت میری اولین ترجیح ہو گئی۔
تم کل شام تک مجھ سے نکاح کی حامی بھر لو۔۔ میں اسی ہفتے
ہی نزہت خالہ کو علاج کیلئے امریکہ لے کے چلا جاؤں گا۔ کیونکہ
ان کے پاس وقت بہت کم ہے۔ ایک ایک منٹ کی دیری ان
کو موت کے قریب لے جا رہی ہے۔ سارے اختیارات
تمہارے ہاتھ میں ہیں۔ مجھ سے نکاح سے انکار کر کے نزہت

خالہ کو ترپتے ہوئے مرنا دیکھنا چاہتی ہو یا اپنے وجود کو ان پہ
نچھاور کرتے ہوئے، تحفتاً زندگی دینا چاہتی ہو؟۔۔۔ شہزاد
بینچ سے اٹھ کھڑا ہوتا اپنی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بناوٹی
لہجے میں بولتا زربخت کو الجھا گیا تھا یا یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ وہ
اپنے لفظوں کے جال میں پھنسا کے زربخت کا شکار کر کے اس
کے ہاتھ پاؤں کاٹ گیا تھا۔

وہ حالتِ غم کوشی میں مبتلا ہوئی۔ وہ ایک ایسی جگہ آ کے پھنس
چکی تھی یہاں سے نکلے گی تو بھی جان جائے گی نہ نکلی تو بھی جان
جائے گی۔۔۔ وہ اپنے سن ہوتے دماغ کے ساتھ دو قدم چھپے
لیتی بینچ پہ ڈھ جانے والے انداز میں بیٹھتی اپنا سر ہتھیلیوں پہ
گرا لے عجیب کشمش میں مبتلا ہوئی۔۔۔ زربخت کا وجود اپنی ماں
کی زندگی سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہے؟ اگر اس کے وجود کا سودا کر

کے اس کی ماں کی زندگی بچ سکتی ہے تو وہ ایسے ہزار دفعہ اپنی
ماں پہ قربان ہو سکتی ہے۔ اس کے غیر پختہ ذہن کو کئی باتوں
نے جکڑا تھا اور ان باتوں میں سب سے مضبوط جڑیں اس کے
دماغ میں شہزاد کی باتیں چھوڑ چکی تھیں اور یہ جڑیں کسی اور رشتے
کی ٹہنی کو اب زربخت کے دماغ پنپنے نہیں دیں گی۔۔۔ اس کو
یوں شکست خوردہ ہوتے دیکھ کے شہزاد کے لبوں پہ ایک کمینگی
سے مسکراہٹ پھیلی تھی۔ کیونکہ وہ جان چکا تھا اس کا الجھا ہوا
دماغ، اس کے حق میں فیصلہ کر کے اس کی مشکل سلجھا دے
گا۔۔۔

زربخت مسلسل سر ہتھیلیوں پہ رکھے آنسو بہاتی خود میں فیصلہ
لینے کی ہمت جمع کر رہی تھی کیونکہ اس فیصلے کے علاوہ اور کوئی
دوسری راہ اس کے پاس بچی نہیں تھی۔ شہزاد بے تابی سے

اب اس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا تاکہ وہ کل کا سورج
غروب ہونے سے پہلے ہی اس کو اپنے نکاح میں لے سکیں۔
شہزاد جیسے فریبی بندے کو نزہت خان کی زندگی سے کوئی غرض
نہیں تھا اور نہ ہی وہ انہیں علاج کیلئے امریکہ لے کر جانے والا تھا
۔ اس کا مین مقصد صرف زربخت کو پانا تھا۔ اس کے بعد تو
اس نے نزہت خان کو دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال باہر
کرنا تھا۔

کیسا علاج؟ کیا جگر ٹرانسپلانٹ کروانا؟ کیا امریکہ جانا؟ یہ سب
چیزیں بس شہزاد کی چال کا حصہ تھی اور انہی کو استعمال کرتے
ہوئے وہ اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

فجر کے وقت جا کے نزہت خان کو ہوش آیا تھا۔ ان کے ہوش
میں آتے ہی زربخت نے ان سے کتنے شکوے کر ڈالے
تھے۔ صبح کے سات ہو رہے تھے۔ وہ ان کے پاس بیٹھی
ابھی تک روتے ہوئے شکوہ کناں نظروں سے ان کو دیکھ رہی
تھی۔

زربخت میری بچی!! بس کرو رونا بند کرو، تمہارا رونا میرا دل
چیر دیتا ہے۔۔۔ اس کایوں شدت سے رونا اور غیر ہوتی
حالت دیکھ کر وہ تڑپ کے بولی تھی۔ نزہت خان کو اپنے کیے
پہ افسوس ہونے لگا تھا۔ وہ جانے انجانے میں اپنی بیٹی کو اپنی
بیماری کی تکلیف سے زیادہ بے اعتباری کی تکلیف میں مبتلا کر گئی
تھی۔

اور جو آپ نے میرا سینہ بے دردی سے چیر کے میرا دل کچلا
ہے! اس کا کیا؟ کیا میرا وجود اتنا غیر ضروری تھا آپ کیلئے کہ آپ
کو اپنا دکھ بھی مجھ سے بانٹنا مناسب نہ لگا؟۔۔۔ وہ غم کوشی
میں اپنی لہو رنگ ہوتی آنکھیں اٹھا کے بولتی ان سے سوال
کرنے لگی۔

یہاں میرے پاس آؤ زربخت۔ اپنی ماں سے یوں ناراض نہیں
ہوتے ہیں۔ تمہارے سوا تو میرا کوئی نہیں ہے۔ میں تمہیں
پریشان نہیں دیکھ سکتی تھی، اس لئے تم سے حقیقت چھپائی۔
میں تمہیں اپنی بیماری کا بتا کے تمہاری چہرے کی خوشی اور ذہن
کا سکون برباد نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنی تکلیف فراموش کرتی
نم آنکھوں کے ساتھ ممتا بھرے لہجے میں زربخت کو اپنی آغوش
میں لینے کی صدا کر گئیں۔

آپ کے پاس کیسے آؤں؟ مجھے آپ کے قریب ہونے سے اب
ڈر لگتا ہے۔ اب اگر آپ کے قریب ہوئی تو آپ پھر سے مجھے
پرایا کر کے مار دیں گی مورے!! دنیا کا کوئی دکھ، کوئی زخم اتنی
تکلیف نہیں دیتا جتنی تکلیف بے اعتباری کا واردیتا ہے اور پھر
وار بھی اگر روح سے جڑے رشتے کریں تو موت واجب ہو
جاتی ہے۔۔۔ وہ اپنی ماں سے بدگمان ہو چکی تھی۔ وہ نزہت
خان کی ساری وضاحتیں اور تسلیاں اذیت سے روتے ہوئے
ٹھکرا رہی تھی۔

ایسے مت بولوں زربخت!! تمہاری مورے! تمہاری بدگمانی
نہیں برداشت کر سکتی، تمہاری بے رخی مجھے وقت سے پہلے مار
دے گی۔۔۔ نزہت خان اپنی ہتھیلیاں بیڈپہ جماتی اوپر اٹھ کر
بیٹھنے کی کوشش کرتی اذیت سے چور لہجے میں بولی تھیں۔

مورے!! آپ میرے صبر اور ہمت کا امتحان مت لیں
- میرے اس کمزور سے وجود میں آپ سے ہچھڑنے کی سکت
نہیں ہے۔ آپ کو زرا سی بھی آنچ آئی تو آپ کی زربخت آپ
سے پہلے مر جائے گی۔۔۔ وہ بے سدھ ہوتی بے قراری سے
اپنے ماں کے سینے سے جا کے لپٹی تھی۔ نزہت خان نے
آنکھوں سے رواں آنسوؤں کے ساتھ جا بجا اس کے چہرے پہ
لب رکھتے ہوئے اسے مزید اپنے سینے میں بھینچے حوصلہ دینے
لگی۔

مورے!! میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ آپ کی بیٹی اپنی
ذات کا سودا کر کے آپ کی زندگی خریدے گی۔۔۔ آپ ہمیشہ
میرے ساتھ رہیں گی، مجھے سے کبھی دور نہیں ہونگی۔۔۔ میں
آپ کو خود سے دور جانے ہی نہیں دوں گی۔۔۔ آپ کا علاج ہوگا

آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔۔۔ وہ ان کے سینے میں منہ

گھسیڑے نم آوازیں بولتی جا رہی تھی۔۔

میرا علاج اور میرا بچنا ناممکن ہے۔۔۔ وہ جواباً ہارے لہجے میں

بولتی تکلیف سے آنکھیں میچ گئی۔۔

ممکن ہے!! میں ممکن کروں گی مورے! میں نے ایک فیصلہ لیا

ہے اور میرا یہ فیصلہ آپ کو نئی زندگی بخشتے گا۔۔ وہ ان کے سینے

سے چہرہ نکال کر آنسو سے بھری آنکھوں میں ایک امید کی چمک

لئے بولی تھی۔

کیسا فیصلہ؟۔۔ انہوں نے اچھنبے سے سوال کیا۔ زربخت کی

آنکھیں ان کو کچھ غلط ہونے کی گواہی دے رہی تھی۔

میں نے شہزاد لالا سے نکاح کا فیصلہ کیا ہے اور وہ پھر حق سے

آپ کا علاج کروائیں گے۔۔ میرے ان سے نکاح ہو جانے

کے بعد آپ کے سارے مدد نہ لینے کے خدشات دور جائیں گے
، پھر آپ کو کسی کا احسان نہیں لینا پڑے گا۔ کسی کا مقروض
نہیں ہونا پڑا گا۔ جو بھی ہوگا، حق سے وصول ہوگا۔۔۔ وہ ان
کے سینے سے ہٹتی چھبے سیدھی ہو کر بیٹھتی اٹل لہجے میں گویا
ہوئی۔ اس کا فیصلہ سنتے ہی نزہت خان کی آنکھیں حیرت سے
پھیلی، لب ساکت ہوئے۔ وہ چند لمحے زربخت کی ہمت کو دیکھ
کے رہ گئی جس نے اتنی سی عمر میں زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کسی
سے پوچھے بنا ہی کر لیا تھا؟

زربخت!! تم پاگل ہو گئی ہو؟ یہ کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟ اور
کس کی اجازت سے کیا ہے؟ وہ تم سے بڑا ہے! تمہارا لالہ
ہے۔۔۔ انہوں نے سخت لہجے میں زربخت کو ڈپٹا۔ انہیں اس کا
فیصلہ ناگوار گزرا تھا۔

میں نے خود کیا ہے! جب آپ اپنی بیماری چھپانے کے فیصلے خود کر سکتی ہیں تو میں بھی آپ کو بچانے کے فیصلے بھی خود کر سکتی ہوں۔ میرا کام آپ کو آگاہ کرنا تھا جو میں نے کر دیا۔ آج شام کو ہی میرا شہزاد سے نکاح ہے اور اسی ہفتے کے آخر یہ وہ آپ کو علاج کیلئے امریکہ لے کے چلے جائیں گے۔۔ میں نے سب کچھ بہت سوچ سمجھ کے کیا ہے اور یہ میرا آخری اور حتمی فیصلہ ہے۔ میں اپنی بات سے ہرگز نہیں پھروں گی۔۔ وہ اپنے آنسو حلق میں اتارتی نزہت خان سے نظریں ملائے بغیر مستحکم لہجے میں بولی۔

تم ایسا کچھ نہیں کرو گی، میں تمہاری ماں ہوں میری مرضی کے بغیر تم ایک قدم آگے نہیں لو گی۔۔ ہوش کے ناخن لو زربخت!! مجھے بچانے کیلئے تم اپنی زندگی کا سودا نہیں کر سکتی۔ وہ ادھیڑ عمر

کا شادی شدہ شخص تمہارے لائق نہیں ہے۔۔۔ نزہت خان
اس کا ہاتھ پکڑ کر جھجھوڑتے ہوئے ہوش دلانے کی کوشش
کرنے لگی۔ وہ خود کو بے بس پارہی تھیں۔

وہ میرے نہیں بلکہ میں کنگال ان کے لائق نہیں ہوں، وہ تو ان
کا احسان ہے کہ وہ مشکل وقت میں مجھے عزت سے اپنا کے
ہمارا اس بیماری سے لڑنے میں ساتھ دے رہے ہیں۔۔۔ وہ
رخ دوسری طرف کرتی سپاٹ لہجے میں بے پرواہی سے بولی۔
اس نے بہت مشکل سے یہ فیصلہ لیا تھا، اب نزہت خان کا
تکلیف اور حیرت زدہ چہرہ دیکھ کے وہ اپنے فیصلے میں کمزور نہیں
ہونا چاہتی تھی، اسلئے رخ بدل گئی۔

کس نے تمہارے کان بھرے ہیں؟ کس نے تمہیں سیکھائی ہیں
اتنی بڑی بڑی باتیں؟ کس نے دی ہے تمہیں اتنی ہمت؟ کس کی

زبان بول رہی ہو تم؟ میں بے ہوش کیا ہوئی، تم چند گھنٹوں میں
اتنی بڑی ہو گئی ہو کہ اپنے فیصلے مجھ سے پوچھے بنا لے سکو؟ تم
سلطانہ سے ملی ہو؟ اسی نے تمہارے کان بھرے ہیں نہ؟۔۔۔
ان کو زربخت اس وقت کوئی باغی لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ
اتنا تو سمجھ چکی تھی کہ وہ جو بول رہی ہے، یہ اس کے اپنے
الفاظ نہیں ہیں۔ وہ بیڈ کی ٹیک چھوڑ کے سیدھی ہو کے بیٹھتی
سخت لہجے میں استفسار کرنے لگیں۔ نزہت خان کا انداز
تشویشی تھا۔

کسی نے میرے کان نہیں بھرے۔ مجھ میں بھی عقل ہے۔
اگر آپ اس فیصلے کو ٹھکراتی ہیں تو آپ کا علاج ممکن نہیں ہو
سکے گا۔ آپ کا علاج نہ ہوا تو پھر آپ مجھے اکیلا چھوڑ کے چلی
جائیں گی۔ میں اس بھرے جہان میں اکیلی کہاں جاؤ گی؟ میں کس

کے سہارے رہو گی؟ کون مجھے سہارا دے گا؟ کون میری عزت
کی حفاظت کرے گا؟ میں کس کے در پہ بھیگ جا کے مانگوں گی؟
آپ کے بغیر تو زمانہ میری بوٹیاں بھی نوچ کھائے گا۔ اگر آپ
نہیں چاہتی کہ یہ سب کچھ میرے ساتھ ہو تو میری بات پہ متفق
ہو جائیں ورنہ میں قسم کھا رہی ہوں مورے!! میں آپ سے پہلے
قبر میں اتروں گی۔ مجھے آپ کے بعد درد کی ٹھوکریں نہیں
کھانی۔۔۔ وہ بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوتی اونچی آواز میں اذیت سے
بولی۔ جب اپنی ماں کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھا تو برداشت کی حد ختم
ہونے پر باہر کو ریڈور کی طرف آنسو بہاتے ہوئے بھاگ گئی۔
زربخت کے الفاظ ان کو لا جواب کر گئے تھے۔ نزہت خان کا
وجود برف ہوا۔ الفاظ منہ میں منجمد ہوئے۔

سلطانہ بیگم کی کہی گئی ساری باتیں دماغ میں گردش کرنے لگی۔
زربخت کی ساری باتیں حقیقت پہ بنی لگی۔ سلطانہ بیگم اور
زربخت کی باتیں ان کو اس نکاح کو روکنے سے لاغر کر گئی۔۔
ان کا بچنا یا نہ بچنا ایک غیر منطقی امر تھا لیکن نزہت خان اتنا
جانتی تھی کہ اس کے بعد زربخت کا بے سہارا ہونا منطقی
ہے۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اب انکار کرنے کی وجہ ان کے
پاس بچی ہی نہیں تھی۔ انکار کرتی تو خود کے مرنے کے بعد اس
جہان میں زربخت کو بھی بے سہارا زندہ لاش بن کے رہ جاتی
اور وہ اپنی معصوم کم عمر بیٹی کو بے سہارا ہوتے نہیں دیکھ
سکتی تھی۔

شام کے چھ بج رہے تھے۔ نزہت خان کے گھر کے چھوٹے
سے صحن میں تین چارپائیاں بچھی ہوئی تھی۔ ایک پہ مولوی
صاحب کے ساتھ سفید شلوار قمیض میں ملبوس شہزاد سجا سنورا
بیٹھا تھا، دوسری چارپائی پہ تین گواہان موجود تھے جبکہ تیسری
چارپائی پہ محلے کے دو بزرگ بیٹھے تھے۔ درمیان میں پڑا ٹیبل
گفٹس اور مٹھائیوں کی ٹوکریوں سے بھرا ہوا تھا جو کہ شہزاد اپنے
نکاح کی خوشی میں بانٹنے کیلئے لایا تھا۔

زر بخت اندر کمرے میں نزہت خان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ
عام میرون کلر کا سادہ سا شلوار قمیض پہنے سر پہ میرون ہی
بھاری کام دار عروسی دوپٹہ اوڑھے گھونگھٹ نکال کے بیٹھی
تھی جبکہ سامنے والی چارپائی پہ سلطانہ بیگم اور اسکی چھوٹی بہن
اپنے دو سالہ بچے کے ساتھ بیٹھی خوشی سے پھولے نہیں سما

رہی تھی۔ وہ دونوں بہنیں فل میک اپ کے ساتھ تیار ہو کے
آئی تھیں۔

ان کے چہرے خوشی سے کھلکھلا رہے تھے اور وہ کیوں خوش نہ
ہوتی؟ آخر کو سلطانہ بیگم اپنے شادی شدہ، اکھڑ مزاج بھائی کو
دوبارہ ایک کنواری خوبصورت سترہ سالہ لڑکی سے بیہانے میں
کامیاب جو چکی تھی۔۔۔ وہ زربخت کیلئے بھی عروسی جوڑا لیکر
آئی تھی مگر اس نے حالات اور اپنی ماں کی صحت کو دیکھتے ہوئے
سجے سنورنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس نے کپڑے بھی اپنے پہن رکھے تھے۔ صرف سر پہ دوپٹہ
سلطانہ بیگم نے اپنی طرف سے زبردستی کروایا تھا ورنہ اس کا وہ
بھی لینے کا دل نہیں تھا۔ زربخت اور نزہت خان کے چہرے ہر
احساس سے عاری تھے۔ دونوں کے دل اس رشتے کو لیکر

مطمئن نہیں تھے مگر مجبوری میں کوئی نہ کوئی فیصلہ لینا تھا اور یہی سوچ کے زربخت اپنے فیصلے پہ ڈٹی ہوئی تھی ورنہ اس کی ماں نے تو کئی دفعہ سمجھانے کی ناکام کوششیں کر ڈالی تھیں۔

شہزاد احمد ولد سرفراز احمد تمام گواہان کی موجودگی میں آپ کا نکاح زربخت خان ولد رمیز خان سے سکہ رائج الوقت بعوض پچاس ہزار روپے حق مہر طے کیا جاتا ہے، کیا آپ کو یہ نکاح قبول ہے؟۔۔۔ مولوی صاحب نے اپنے الفاظ مکمل کرتے ہوئے جواب کیلئے شہزاد کی طرف آبرو اچکا کر دیکھا۔

کیا ہو رہا ہے یہ؟۔۔۔ شہزاد ابھی اپنے منہ سے کوئی لفظ ادا کرتا جب گھر کا مین دروازہ ایک دھاڑ سے کسی نے زور سے پٹکا تھا اور اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی اپنی بھاری بارعب آواز میں تعجب سے سوال کیا۔ اتنے غیر مردوں کو نزہت خان کے گھر

میں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں استعجابیت کی لہر دوڑی تھی۔
جسم کو ایک خوف نے آن گھیرا تھا۔

دھاڑ کی آواز سن کر شہزاد اور باقی سب نے فوراً گردنیں موڑ کر
دروازے پہ کھڑی ہستی کو دیکھا اور سامنے لمبے چوڑے وجود
کے مالک دمیر خان کو دیکھ کر باقی سب نا آشنا نظر آئے جبکہ اس
کو دیکھتے ہی شہزاد کے اوسان خطا ہو گئے۔ چہرہ اضطراب میں
ڈوب گیا اور دل میں ہول اٹھنے لگے۔ دمیر خان کے چہرے پہ
تعجب اور غصہ بیک وقت تھا۔ سیلیو کہنیوں تک فولڈ تھی۔
ہاتھوں اور گردن کی رگیں تنی ہوئی تھی۔۔۔

کیا ہو رہا ہے یہ سب یہاں؟ کیوں رش لگا ہوا ہے؟ کون ہیں آپ
لوگ؟۔۔۔ دمیر خان تیزی سے آگے بڑھتا صحن میں موجود تمام
افراد سے کرخٹ لہجے میں مخاطب ہوا تھا۔ قریب پہنچتے

ہی مولوی، نکاح نامے کا رجسٹرڈ، گواہان، اور ان کے ساتھ
کھڑے شہزاد کو دیکھ کر وہ اتنا تو سمجھ چکا تھا کہ کسی کا نکاح
ہو رہا ہے۔۔۔ لیکن کس کا؟۔۔۔ دمیر خان کے دماغ نے تانے
بانے بننے شروع کئے جبکہ اس کی باہر صحن سے آتی گرجدار آواز
سن کر نزہت خان اور زربخت کے چہرے پہ حیرت در آئی۔ یہ
حیرت خوش گوار تھی۔۔۔ یا تعجب زدہ تھی؟ وہ سمجھ نہ پائی۔
مورے!! دمیر لالہ آئے ہیں؟۔۔۔ زربخت نے فوراً اپنے
چہرے سے گھونگھٹ ہٹا کر متحیر زدہ انداز میں پوچھا۔ وہ اپنی
نیلی آنکھوں میں دیے کے جیسی کبھی مدہم تو کبھی تیز چمک لئے
نزہت خان کی طرف دیکھ کر بولی تھی۔ نزہت خان کے چہرہ پہ
پہلے سے کم آسودگی کے آثار دکھے تھے۔ مطلب دمیر خان کا آنا
ان کے مزاج اور تاثرات میں بدلاؤ کا سبب بنا تھا لیکن ان کی

بیماری کی گھٹا اور اس کا خوف یکساں طور پر دونوں ماں بیٹی کے

ذہن پہ طاری تھا۔

زر بخت!! گھونگھٹ نیچے کرو! نکاح سے پہلے اپنا چہرہ کسی کو
نہیں دیکھاتے ہیں۔۔۔۔۔ سلطانہ بیگم نے اس کے یوں اچانک
سے گھونگھٹ اٹھانے پر اور دمیر خان کی باہر آواز سن کر بے
چینی سے اس کو ہدایت دی تھی۔ دمیر خان کی اچانک آمد سے
ان کو شہزاد اور زر بخت کا نکاح کینسل ہوتا دیکھائی دیا تھا۔ ان
کے چہرے پہ واضح پریشانی دوڑی تھی۔ وہ اپنے پریشان
تاثرات پہ قابو پاتی اٹھ کے پھر سے زر بخت کے چہرے پہ
گھونگھٹ ڈال گئی۔ وہ دمیر خان سے پہلے مل چکی تھی اور اس
کی طبیعت سے باخوبی واقف تھی کہ وہ کس مزاج کا مالک ہے۔

نرہمت خان اور زر بخت کو لیکر وہ کس قدر سنجیدہ ہے۔ یہ اندازہ سلطانہ بیگم کو اس کی باتوں سے ہی ہو گیا تھا۔۔ وہ دل میں اب کسی معجزے کی دعا کر رہی تھی کیونکہ دمیر خان کی موجودگی میں اب شہزاد کا نکاح زر بخت سے تقریباً نا ممکن ہو چکا تھا۔

نکاح ہو رہا ہے؟۔۔۔ ایک بزرگ نے یاسیت سے جواب دیا۔

کس کا نکاح ہو رہا ہے؟ کس کے ساتھ ہو رہا ہے؟ کون ہو تم؟ اور کس سے پوچھ کر یہاں جمع ہوئے ہو؟۔۔۔ دمیر خان یکے بعد دیگر کئی سوال کرتا آخر میں شہزاد کو مخاطب کرنے لگا۔ وہ تو آسٹریلیا سے نرہمت خان کی پریشانی میں آیا تھا لیکن آگے کا منظر تو الٹا اسے پریشانی میں دھکیل کے ہوش اڑا گیا تھا۔

نزدہت بہن کی بیٹی کا نکاح ہو رہا ہے۔ شہزاد کے ساتھ۔۔
جواب مولوی صاحب نے ٹھہرے لہجے میں دیا تھا۔۔ جتنے غصے
اور وثوق میں وہ پوچھ رہا تھا تو اس حساب سے مولوی صاحب
کو اسے جواب دینا پڑا تھا۔

کیا بکو اس ہے یہ؟ کس کی اجازت سے ہو رہا ہے اور تمہاری
ہمت کیسے ہوئی اس گھر میں گھسنے کی؟ جواب سنتے ہی دمیر خان
حیرت اور غصے کے ملے جلے تاثرات سے دھاڑا تھا۔ اس کا
دماغ بھک سے اڑا۔ وہ غصے میں ادھیڑ عمر شہزاد کا گریبان پکڑے
سختی سے استفسار کرنے لگا۔۔ زربخت کے نکاح کا سنتے ہی
دمیر خان کے جسم میں چیونٹیاں دوڑی تھی۔

ارے!! ارے بر خودار، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟۔۔۔ ایک
بزرگ دمیر خان کو یوں شہزاد کا گریبان پکڑتے دیکھ کر بوکھلاتے
ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔۔

میں نے پوچھا کس کی اجازت سے اس گھر میں قدم رکھا ہے
؟۔۔۔ وہ سنی ان سنی کرتا شہزاد کے کالر پہ اپنے ہاتھ کی گرفت
مضبوط کرتے ہوئے شدید غصے کے عالم میں اس کے چہرے پہ
پھنکارا۔ زربخت کا اس کے ساتھ نکاح کا سنتے ہی دمیر خان کا
دل چاہا، اس ادھیڑ عمر شہزاد کی چمڑی ادھیڑ کے رکھ دے جس
نے اس کے بخت کی روشنی کو چرانا چاہا۔ شہزاد اس کے
اچانک حملے پہ کچھ بھی بولنے سے قاصر ہوا، اور بولتا بھی تو آخر کیا
بولتا؟ کیا اس کے پاس اپنی بدنیتی کی وضاحت تھی؟

آپ کون ہیں؟ آپ یوں شہزادہ چڑھائی نہیں کر سکتے۔ ہم نزہت بہن کی رضا مندی سے آئیں ہیں۔ یہ نکاح ان کی اجازت اور مرضی سے ہو رہا ہے۔ ہم اس گھر میں ان کی طرف سے دعوت دینے پہ آئے ہیں۔ نزہت بہن نے ہمیں اپنی بیٹی کے نکاح میں شریک ہونے کیلئے بلایا ہے۔۔ ایک گواہ اب کی بار سنجیدگی سے بولتا دمیر خان کا تعارف پوچھنے لگا۔

میرے گھر میں کھڑے ہو کے مجھ سے میرا ہی تعارف پوچھتے ہو؟ یہ میرا گھر ہے۔ میری پھوپھو کا گھر ہے۔ کوئی نکاح نہیں ہو رہا یہاں! تم لوگوں کو اگر اپنی عزت پیاری ہے تو جہاں سے آئے ہو، چپ چاپ الٹے پیر واپسی کا راستہ پاؤ ورنہ مجھے بد لحاظ ہونے میں ایک منٹ نہیں لگے گا۔ اور اگر میں بد لحاظ ہو گیا تو تم لوگوں کو اٹھا کے باہر پٹک دوں گا۔۔ دمیر خان شہد رنگ

آنکھوں میں طیش کی لالی لئے ایک زوردار جھٹکے سے شہزاد کو چھپے
دھکیلتا، وارنگ دینے والے انداز میں اس کا کالر چھوڑتا ایک
ایک لفظ چبا کے بولا تھا۔ اسکے یوں چھپدھکیلنے پر شہزاد کے قدم
لڑکھڑائے تھے۔

ایسے کیسے جاؤں؟ میرا آج نکاح ہونا ہے!! ہمارے درمیان
تمام معاملات طے ہیں۔ پہلے جا کے تم نزہت خاں اور زرر۔۔۔
نام مت لو اس کا اپنی گندی زبان سے!!!۔۔۔ شہزاد نے
ابھی اپنا جملہ مکمل ہی نہیں کیا تھا جب دمیر خان بھوکے شیر کی
مانند دھاڑتا ہوا سختی سے اس کا جبراً اپنے ہاتھ کی گرفت میں دبوچ
گیا۔ نزہت خان اور زرر بخت باہر معاملہ خراب ہوتا سن کر بے
چین ہوئی تھیں۔ نزہت خان چارپائی سے اٹھنے سے قاصر تھی
ورنہ وہ خود دمیر خان کو جا کے ساری بات سمجھاتی۔۔۔

نزہت آیا! اپنے بھتیجے کو سمجھائیں! یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا؟ وہ شہزاد کو جبرے سے پکڑ کر گریبان میں ہاتھ ڈالے کھڑا ہے۔۔۔ سلطانہ بیگم نے باہر دمیر خان کی اونچی آواز سن کر، دروازے کی اوٹ میں چھپ کر باہر جھانکا تھا اور باہر دمیر خان کو شہزاد پہ حاوی ہوتا دیکھ کر وہ تلملاتی ہوئی چھپڑ کر نزہت خان کو ساری صورتحال سے آگاہ کرنے لگیں۔

دمیر کو اندر بلاؤ! نزہت خان نے مدہم آواز میں سلطانہ بیگم کو حکم دیا کیونکہ ان کے جسم میں اب آواز نکالنے کی طاقت بھی نہیں بچی تھی۔۔۔ کچھ بیماری کمزور کر گئی تھی اور رہی سہی کسر زربخت کے فیصلے نے نکال دی تھی۔ دمیر خان آفریدی کی اس قدر بلند آوازیں سن کر زربخت کو آج پہلی دفعہ اس سے خوف

محسوس ہوا، دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ حلق میں گھٹی بھر کے
معدوم ہوئی۔

آپ کو اندر نزہت آیا بلا رہی ہیں۔۔۔ دمیر خان اور شہزاد میں
سے

ابھی کوئی کچھ بھی بولتا یا کرتا جب نزہت خان کے کہنے پر کمرے
سے نکلتی سلطانہ کڑوے لہجے میں دمیر خان کو اپنی طرف متوجہ
کرنے لگیں۔

دمیر!! لالا!!۔۔۔ اسد اللہ خان اور داعیر خان جو ابھی گھر میں
داخل ہوئے تھے، دمیر خان کو شہزاد کا جبراً دبوچے اور اس پہ
تضاد یہاں اتنے لوگوں کا رش دیکھ کر وہ دونوں حیرت سے
بیک وقت بول اٹھے تھے۔

دمیر! چھوڑو اسے، یہاں کیا ہو رہا ہے؟ کیوں اتنے لوگ جمع ہیں؟۔۔۔ اسد اللہ خان تیزی سے آگے بڑھ کر دمیر خان کو شہزاد کا جبر اچھوڑنے کا حکم دینے لگے۔

ہمیں نزہت بہن نے نکاح میں شرکت کرنے کیلئے بلایا ہے اس لئے ہم یہاں موجود ہیں۔۔۔ جواب دمیر خان کی بجائے دوسرے بزرگ نے معاملہ سنگین ہوتے دیکھ کر سرعت سے دیا تھا۔

نکاح تو آج اس کا نہیں پڑھا جائے گا، البتہ اس کا نماز جنازہ پڑھانے کا وقت میں ضرور مقرر کروں گا۔۔۔ باپ کا حکم ملتے ہی دمیر خان ایک چھٹکے سے شہزاد کا جبر اچھوڑتا اسے چارپائی پہ دھکا دیتے ہوئے جاندار وارننگ دینے والے انداز میں غرایا۔ شہزاد اب اسد اللہ خان اور داعیر خان کو دیکھتا مزید اضطرابی

کیفیت میں مبتلا ہوا تھا۔ ڈر کے مارے حلق میں کانٹے چھنے لگے۔۔ وہ چوروں کی طرح تینوں باپ بیٹوں کو دیکھتا اپنا کالر درست کرتے ہوئے پھر سے چارپائی سے اٹھ کر سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ اس کیلئے ان تینوں کی آمد غیر متوقع تھی جبکہ باقی تمام افراد بھی ان دونوں کی آمد سے غیر متزلزل نظر آرہے تھے۔

واٹ؟ کس کا نکاح؟۔۔۔ داعیر خان جو پہلے ہی پریشانی میں سارا معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، اس بزرگ کا جواب سن کر تعجب سے چلایا جبکہ اسد اللہ خان کا بھی یہی ری ایکشن تھا۔۔ وہ دونوں اب جواب جاننے کیلئے دمیر خان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ ان دونوں کو کوئی بھی جواب دینے کی بجائے قہر برساتی نظروں سے شہزاد کو گھورتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر کمرے کی جانب بڑھ گیا تاکہ ساری بات کی تحقیق کر سکے کہ کیوں باہر یہ

سارا تماشا لگایا ہوا ہے؟ اسد اللہ خان اور داعیہ خان شش و پنج میں مبتلا باہر صحن میں ہی کھڑے رہ گئے۔

آپ دوسرے کمرے میں جائیں! مجھے اپنی پھوپھو سے بات کرنی
ہیں۔۔۔۔۔ دمیر خان کمرے میں داخل ہوتے ہی سامنے سلطانہ
بیگم اور ان کی چھوٹی بہن کو دیکھ کر فوراً نظروں کا زاویہ بدل کر
دو قدم دروازے سے چھپھٹتا ان کو سپاٹ لہجے میں حکم دینے
لگا۔ اس کا حکم سنتے ہی نزہت خان نے ان دونوں بہنوں کو
دوسرے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔ سلطانہ بیگم ایک تنفر
بھری نگاہ دمیر خان پہ ڈالتی اپنی چھوٹی بہن کو لئے دوسرے
کمرے میں چلی گئی کیونکہ باہر صحن میں سب مرد تھے، اسلئے دمیر
خان نے انہیں دوسرے کمرے میں جانے کیلئے کہا تھا۔ بے
شک وہ شہزاد کی بہنیں تھیں جس کو دیکھ کر ہی دمیر خان کو کوفت

ہو رہی تھی لیکن وہ عورت کی عزت اور اس کا وقار ہمیشہ تمام حالات میں سرفہرست رکھتا ہے۔

سلطانہ بیگم اور اسکی بہن کے کمرے سے نکلتے ہی دمیر خان اندر داخل ہوا تھا۔ زربخت ہنوز گھونگٹ کے چھپے چھپی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ ہر احساس سے عاری تھا جیسے کسی جسم سے روح نکال لو تو وہ ساکت ہو جاتا ہے، ہر جذبات سے محروم ہو جاتا ہے بلکل ایسے ہی زربخت کا وجود اس وقت ہو رہا تھا۔

دمیر خان کی پہلی نظر نزہت خان پہ پڑی وہ ان کے چہرے پہ بیماری کے تاثرات دیکھتا، تکلیف سے نگاہیں پھیر کے ان کے پہلو میں بیٹھی گھونگٹ کے چھپے چھپی زربخت پہ مرکوز کر گیا اور زربخت کو عروسی دوپٹے میں دیکھتے ہی دمیر خان کے دل پہ کسی نے خنجر سے وار کیا تھا اور ایسی کاری ضرب لگائی تھی کہ اس کا

دل دو ٹکڑوں میں بٹ گیا تو پھر کیا باہر جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ
تماشا نہیں حقیقت تھا؟ زربخت کا واقعی میں نکاح ہو رہا تھا؟
اسکی محبت کسی اور کی دسترس میں جانے والی تھی؟ اگر وہ
وقت یہاں پر نہ پہنچتا تو کیا ہوتا؟ کیا دمیر خان کی اپنی پھوپھو کی
زندگی میں اتنی اہمیت نہیں تھی بلکہ کہ وہ ان سے اپنا دکھ شئیر کر
سکیں؟ کیا دمیر خان اتنا بھی بھروسے کے لائق نہیں تھا کہ وہ
زربخت کا نکاح کرنے سے پہلے ان سے مشورہ ہی مانگ لیتی؟ کیا
اپنے سگے رشتے اتنے بیکار اور بوسیدہ تھے کہ وہ بغیر کسی کو بتائے
اپنی بیٹی ایک پرائے ادھیڑ عمر شخص کے پلے باندھ رہی تھی؟
اہہ!!۔۔۔ دمیر خان سب سوالات اپنے ذہن میں دہراتا ہزیانی
انداز میں اپنی کنپٹی مسلتے ہوئے چلایا تھا۔ اسے زربخت کسی
اور کے نام کا گھونگھٹ اوڑھ کے بیٹھی بہت تکلیف دے گئی

تھی، اتنی تکلیف جیسے روح کو کانٹوں پہ گھسیٹا جائے۔۔ اور پھر
گھسیٹنے سے جو روح پہ زخم آئیں ان پر نمک چھڑکا کر مزید تکلیف
کو دو گناہ کیا جائے اتنی تکلیف ہوئی تھی اس کو، یا شاید اس بھی
زیادہ ہوئی تھی۔۔

وہ گھونگھٹ اوڑھ کے بیٹھی دمیر خان کی روح چھلنی کر گئی تھی
۔۔ شہد رنگ آنکھیں تکلیف کی شدت سے لہو لال ہوئی تھی۔
بہت جان لیوا ہوتا ہے اپنی محبت کو خیال میں بھی کسی اور کے
ساتھ منسوب کرنا اور یہاں تو وہ عروسی دوپٹہ لئے اس کے کبھی
نہ سوچے جانے والے جان لیوا خیال کو حقیقت بنائے بیٹھی
تھی۔۔ اس کے پورے جسم سے جان سمٹ کے حلق میں
اٹک گئی تھی۔۔ وہ مزید ایک بھی قدم آگے لینے سے قاصر ہوا۔

کیا ہے پھوپھو یہ سب؟۔۔۔ وہ بے یقینی سے زربخت کی طرف دیکھتا تکلیف سے بھاری ہوتی آوازیں غرایا۔ نزہت خان اور زربخت جو دمیر خان کے کراہنے پہ فکر مندی میں مبتلا تھی۔ اس کا سوال سن کے نزہت خان نے نگاہیں جھکائی تھی جبکہ زربخت نے پریشانی سے انگلیاں مروڑی تھی۔ اس نے گھونگھٹ نہیں اٹھایا تھا۔ شاید وہ دمیر خان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی؟ یا شاید وہ اپنے چہرے کا غم چھپانا چاہتی تھی؟۔۔۔ دمیر خان کے چچھے اسد اللہ خان اور داعیر خان بھی تشویشی انداز میں کمرے میں داخل ہوئے تھے۔۔۔

نزہت!! یہ سب کیا چل رہا ہے؟۔۔۔ اسد اللہ خان ان کی طرف بڑھتے زربخت کو دیکھ کر تعجب سے سوال کرنے لگے۔۔۔ شکوے ان کو بھی نزہت خان سے بہت تھے لیکن وہ

ابھی کچھ بھی بولنے کی بجائے ان کی شکستہ حالت دیکھ کر ان
شکووں کو دل میں ہی دبا گئے۔

وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ زربخت!!۔۔۔

پھوپھو!! ہم سچ سننا چاہتے ہیں۔ پہلے بھی آپ نے ہمیں پرایا
کر کے جو بے موت مارا ہے نہ وہی بہت تکلیف دہ تھا۔ اب
مزید آپ کی کوئی بے اعتباری نہیں برداشت کر سکتے۔۔۔ اپنا جو
دکھ اور تکلیف آپ نے ہم سے چھپائی، وہ سب ہم جان چکے
ہیں۔ اس لئے پلیز!! اب مزید کچھ مت چھپائیں اور ہمیں سچ
بتائیں آپ نے یہ قدم کیوں اٹھایا؟ کیوں زربخت کا نکاح اس
ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ کر رہی تھی؟۔۔۔ وہ تکلیف سے
سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ انتہائی ضبط کرتے ہوئے

ٹھہرے لہجے میں بولا۔ اس کی بات سن کر نزہت خان اور
زر بخت کی آنکھوں میں حیرت در آئی۔
تو کیا وہ سب کچھ جان چکے تھے؟ ان کو نزہت خان کی بیماری کا
پتہ چل گیا تھا؟ مگر کیسے پتہ چلا؟ دونوں ماں بیٹی کے دماغ میں ایک
جیسے ہی سوال گھومنے لگے تھے۔۔

ہاں ہمیں سب پتہ ہے!! جو نہیں پتہ وہ ہمیں سچ بتاؤ بنا کوئی چیز
مخفی رکھے۔۔۔ اب کی بار اسد اللہ خان بھاری دل کے ساتھ
سوالیہ انداز میں گویا ہوئے۔ انہیں اور داعیر کو دمیر خان نے
ہی فون کر کے جلد از جلد نزہت خان کے گھر پہنچنے کا حکم دیا
تھا۔ دراصل زر بخت کی طرف سے کل رات آئی ہوئی کئی فون
کالز دیکھ کر دمیر خان پریشان ہوا تھا جنہیں وہ وقت پہ نہیں اٹھا
سکا تھا۔

رات کو وہ زربخت کو کال بیک کرتا اور وجہ جاننے کی کوشش کرتا
جب اس کے فون کی سکرین پہ ڈاکٹر صالح حیات کا نمبر جلمگایا تھا
۔۔ یہ وہی ڈاکٹر تھا جس سے اس نے نزہت خان کے سارے
ٹیسٹ کروائے تھے۔ وہ تیزی سے فون یس کر کے کان کو لگا
گیا۔ ڈاکٹر صالح حیات کی بات سن کے اس کی آنکھیں حیرت اور
بے یقینی سے پھیلی تھیں۔ وہ ان کے منہ سے نزہت خان کی
بیماری کا سچ سننے کے بعد ایک لمحہ ضائع کئے بنا اپنی ٹکٹ کرواتا
پاکستان کیلئے روانہ ہو گیا۔ دمیر خان نے آسٹریلیا سے روانہ
ہوتے ہی داعیر خان سے رابطے کی کوشش کی تھی لیکن اس
وقت اس کی طرف کوئی جواب موصول نہیں ہوا تھا، پھر دمیر
خان فلائٹ میں کسی سے رابطہ نہیں کر پایا تھا۔

زر بخت کی رات کو ایک بچے کی گئی کالز اور نزہت خان کی
بیماری دمیر خان کے ذہن کو شل کر گئی تھی۔ وہ ان کے ساتھ
کچھ بھی برانہ ہونے کی امید لئے پاکستان واپس آیا تھا۔ لینڈ
کرتے ہی دمیر خان نے پھر سے داعیر خان سے رابطہ کر کے
اس کو ساری حقیقت سے آگاہ کیا تھا تاکہ وہ اس کے پہنچنے سے
پہلے ان کا حال احوال دریافت کریں لیکن دمیر خان ان دونوں
باپ بیٹے کے پہنچنے سے پہلے ہی اضطرابی حالت میں یہاں پہنچ
چکا تھا اور پھر آگے کا منظر اسے مزید حیران کن کر گیا تھا۔

نزہت! کچھ بولو! مجھے سب سچ سچ بتاؤ! تم اور زر بخت اب سے
میری ذمہ داری ہو، بلا جھجک اپنا دکھ بیان کرو تمہارا لالا سب کچھ
سنبھال لے گا۔ میں تم دونوں کو مزید تنہا نہیں چھوڑوں گا۔

وعدہ کرتا ہوں، تم دونوں کو ہر تکلیف سے محفوظ کر لوں گا، مجھ
پہ آخری بار بھروسہ کرو۔۔ وہ اپنی بہن کے تکلیف سے
مرجھائے چہرے پہ نظریں ٹکائے پھر سے اپنا سوال دہرانے
لگے۔ نزہت خان کی تکلیف کا اندازہ وہ باخوبی ان کے چہرے
سے لگایا جاسکتا تھا۔

داعیر خان خاموشی سے اپنی پھوپھو اور زربخت کو دیکھ رہا تھا۔
اس کی بھی تکلیف اسد اللہ خان اور دمیر خان سے کم نہ تھی۔
شاید تینوں باپ بیٹے پہلی دفعہ پرایا ہونے کی اذیت سے گزرے
رہے تھے، اس لئے ان کی تکلیف زیادہ تھی لیکن نزہت خان
اور زربخت کا کیا جن کو ساری زندگی پرایا کر کے ایک ہی تکلیف
سے بار بار گزارا گیا تھا؟ انھوں نے کب اپنی خوشیاں اور دکھ
ان کے ساتھ شیئر کئیے تھے جو نزہت خان اب اپنا دکھ ان کو

بتاتی؟ کافی دیر بعد نزہت خان سب کو سوالیہ نظروں سے خود کو دیکھتا پا کر ہمت کرتے ہوئے تمام پرانی یادیں، دکھ، دھتکار، بیگانہ کیا جانے کا غم، سب بلائے طاق رکھتی آج پہلی دفعہ اپنے لالا کے اصرار پہ اپنا دکھ بتانے جارہی تھی۔

اگر زندگی میں اسد اللہ خان نے پہلی دفعہ ان کا دکھ جاننا چاہا تھا تو انہوں نے مان بھرے لہجے، تحفظ اور اپنائیت کے احساس کے ساتھ بتانا شروع کر دیا تھا۔ وہ بنا رکے اپنی بیماری سے لیکر زربخت کے آج نکاح تک کی ساری باتیں چند منٹوں میں ہی بتا گئی تھی۔ ان باتوں میں شہزاد اور سلطانہ بیگم کی طرف سے کئے گئے علاج کے وعدے، شرطیں، دلا سے، تلخ حقائق سب کچھ شامل تھے۔ نزہت خان نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے خود کو آج ہر راز اور دکھ سے آزاد کیا تھا۔ آج انہوں نے زندگی اور بیماری

سے تھک ہار کے اپنی اور اپنی بیٹی کی ذمہ داری پہلی بار اپنے لالا
کے سپرد کی تھی کیونکہ وہ اب ذمہ داریاں اٹھا اٹھا کر تھک چکی
تھی۔

آج زندگی میں پہلی بار اسد اللہ خان نے انہیں اپنی نگہبانی میں لینے
کی بات کی تھی۔۔۔ انہیں تحفظ دینے کا احساس دلایا تھا۔
زربخت اپنی ماں کی درد بھری داستان سنتی بے آواز شدت سے
رونے لگی تھی۔۔۔ داعیر اور دمیر خان نے اذیت سے آنکھیں
میچ کے کھولیں۔۔۔ شہزاد اور سلطانہ بیگم کے جھوٹے دلا سے اور
جھانسنے سن کر دمیر آگ بگولہ ہوا تھا۔ اس کے جسم میں
اشتعال کے وبال اٹھے تھے۔ غصے سے گردن کی رگیں تنی تھی۔
ابھی وہ باہر جاتا، جب اسد اللہ خان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بات

پوری سننے کا اشارہ کیا۔ اسلئے وہ شہزاد کی بعد میں طبعیت سیٹ
کرنے کا پکا ارادہ کرتا ضبط سے مٹھیاں بھینچ گیا۔

مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے نزہت!! تم نے مجھے اپنا نہیں
سمجھا، اپنا دکھ نہیں بتایا کیونکہ ساری زندگی میں بھی تو تمہارے
ساتھ یہی کچھ کرتا رہا، تمہیں پرایا کرنے کی پہل میری طرف سے
ہوئی تھی۔ اب تم نے مجھے پرایا کر کے میرے اعمال کی سزا
دی ہے۔ یہ مکافات عمل ہے میرے لئے۔۔۔ میں اپنی سگی
بہن کو تحفظ نہ دے سکا۔ اس کے دکھ سکھ میں اس کے ساتھ
کھڑا نہ ہو سکا۔ مجھ پہ بھروسہ نہ کر کے مجھے میرے کئے گئے
اعمال واپس ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ اسد اللہ خان اپنے ماضی
میں کئیے گئے اعمال پر پشیمان ہوئے۔ وہ گہری سانس بھرتے
اپنی بات میں وقفہ لے گئے۔

جو ساری زندگی تمہاری ذمہ داری لینے کے قابل نہ ہو سکا، وہ
اب کیا خاک تمہاری اور تمہاری بیٹی کی ذمہ داری اٹھائے گا؟
میں اب تم دونوں کی ذمہ داری کیا لوں گا؟ سچ بتاؤں تو میری
بوڑھی ہڈیاں خود سہارے کی متلاشی ہیں۔ اس لئے تم دونوں
کی ذمہ داری آج سے میرا بیٹا اٹھائے گا۔ میں تم دونوں کے
بھروسے کے قابل نہیں ہوں لیکن میرا بیٹا بہت ذمہ
دار، بھروسے مند، نرم دل اور رشتوں کو اہمیت دینے والا
ہے۔ یہ اپنی آخری سانس تک تم دونوں کی ذمہ داری اٹھائے گا
۔ مجھے میرے دمیر پہ بھروسہ ہے۔۔ وہ تم دونوں کو کبھی مایوس
نہیں کرے گا۔۔ اسد اللہ خان اپنی بہن کی تمام باتیں سن کر
نم آنکھوں کے ساتھ شکستہ لہجے میں بولتے دمیر خان کا ہاتھ
پکڑے دو قدم نزہت خان کی طرف بڑھے تھے۔

ایسی باتیں مت کریں لالا! مجھے آج بھی آپ پہ بھروسہ ہے،
آپ آج بھی میرے لئے بابا جان کی جگہ ہیں۔ مجھے آپ سے کوئی
شکایت نہیں ہے۔ نہ مجھے کوئی لالچ ہے اور نہ مجھے آپ سے کچھ
چاہیے۔ آپ میری ذمہ داری بے شک نہ لیں، بس میری
زربخت کی ذمہ داری سنبھال لے لیں۔ اس کو محفوظ پناہ گاہ
دے دیں، اس کو کبھی تنہا مت چھوڑے گا۔ ہمیشہ اس کیلئے
محفوظ سائبان بن کر اس کا تحفظ کیجئے گا۔۔۔ وہ روتے ہوئے
ان سے آج پہلی دفعہ اپنی بیٹی کی عزت و جان کی حفاظت کیلئے
ملتجی ہوئی تھیں، زربخت ہنوز رو رہی تھی۔ نزہت خان کے
الفاظ ہر بار اس کے دل پہ وار کر کے نیاز خم دے جاتے تھے۔
ایسا مت بولیں پھوپھو!! آپ کو اب التجا کرنے کی ضرورت
نہیں ہے، آپ اب ہم تینوں پہ حکم کریں۔ ہم اب آپ کی حکم

کی تعمیل کیلئے اپنی جان بھی دے دیں گے مگر اپنے عہد اور زمہ
داری سے نہ چھپے ہٹیں گے اور نہ ہی کوئی کوتاہی کریں گے
۔۔۔ اب کی مرتبہ داعیر خان تکلیف سے آنکھیں میچ کر اپنائیت
بھرے لہجے میں بولا۔ وہ ہمیشہ بڑوں کے معاملات میں کم بولتا تھا
لیکن جب بولتا تھا تو اپنے الفاظ سے سب کو حیران کر دیتا تھا۔
اس کے الفاظ ہمیشہ گہرے اور خوبصورت ہوتے تھے۔
اسد اللہ خان نے مبہم سا مسکراتے ہوئے داعیر کو دیکھا تھا جو
ہمیشہ باپ سے بڑی باتیں کر کے انہیں حیران کر دیتا تھا جبکہ دمیر
خان کے دماغ پہ شہزاد کی درگت بنانے کا بھوت سوار تھا۔ وہ
بس جلد از جلد باہر نکلنا چاہتا تھا لیکن اسد اللہ خان نے اس کا
ہاتھ پکڑ کے اسے باہر جانے سے روکا ہوا تھا۔

مجھے لگتا ہے۔ صرف خون کے رشتوں کو نبھانے میں ہم کوتاہی
کر جاتے ہیں۔ خونی رشتے میں ہم دھوکے بازی، بیگانہ پن،
بیزاریت اختیار کر جاتے ہیں۔ کئی رشتوں کو مضبوط سے
مضبوط تر کرنے کیلئے اس کو روح سے جوڑنا ضرور ہوتا ہے اور
جو رشتے روح سے جڑ جاتے ہیں، وہ پھر اس جہان میں بھی جدا
نہیں ہوتے اور اگلے جہان میں بھی اپنے روح کے ساتھی کے
ساتھ جنت میں داخل ہوتے ہیں۔ میں اپنی زربخت کو خونی
رشتے کی حیثیت سے نہیں بلکہ روحانی رشتے کی حیثیت سے اس
کی ذمہ داری ایسے ہاتھوں میں سونپنا چاہتا ہوں جو اس کو دونوں
جہان کا سکون، تحفظ، پیار و محبت، خوشی اور اطمینان دے
سکے۔ میں زربخت کی ذمہ داری ایسے ہاتھوں میں دینا چاہتا ہوں
جو اس کیلئے دونوں جہان میں خوشی اور سکون کا باعث بنے۔

میں تمہاری پھولوں سے نازک، پیروں سے حسین، نیک اور
فرمانبردار، معصوم اور نایاب پیاری سی گڑیا زربخت کا ہاتھ
اپنے سادہ اور عام سے بیٹے دیر کیلئے مانگتا ہوں۔ کیا تمہیں اپنی
ہیروں جیسی بیٹی کیلئے میرا عام سا بیٹا قبول ہے؟ کیا تم زربخت
کا ہاتھ میرے دیر کے ہاتھ میں دو گی؟ میں وعدہ کرتا ہوں میرا
دیر تمہاری بیٹی کو اپنی ہتھیلی کا چھالہ بنا کے رکھے گا۔ کبھی
تمہیں یا تمہاری بیٹی کو شکایت کا موقع نہیں دے گا۔ کیا تم
میرے دیر پر بھروسہ کرو گی؟ اسد اللہ خان مان بھرے لہجے میں
بولتے زربخت کا ہاتھ اپنے بیٹے کیلئے مانگنے لگے۔ باپ کی بات
سننے ہی دیر خان کا دل اچھل کر حلق میں آیا تھا۔
تو کیا اس کا باپ اس کی خاموش محبت کو نام دے رہا تھا؟ کیا
اس کی سترہ سال کی پالی گئی محبت اس کو ملنے والی تھی؟ کیا

خوبصورت رشتے میں ڈھل کر اس کی محبت امر ہونے والی
تھی؟ کیا اللہ تعالیٰ اس پہ مہربان ہو رہا تھا؟ کیا وہ محبت کے
معاملے میں خوش قسمت نکلا تھا؟ کئی احساسات اور سوالات
دمیر خان کے ذہن میں زیرِ گردش ہوئے۔ وہ دھڑکتے دل کے
ساتھ اپنے باپ کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں دبا گیا۔
کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ لالا!! میرا دمیر کوئی عام نہیں ہے
بلکہ یہ تو ہیرا ہے۔ اور ہیرے کو کون ٹھکراتا ہے بھلا؟ مجھے اپنی
بیٹی کیلئے دمیر خان آفریدی سو بار قبول ہے۔۔۔ میں بلا جھجک اپنی
بیٹی کا ہاتھ اپنے دمیر کے ہاتھ میں دیتی ہوں۔۔۔ اسد اللہ خان
نے نزہت خان کے دل کی بات کی تھی پھر وہ بھلا کیسے اپنے لالا
کے خلوص کو ٹھکراتی؟

ان پہ آنکھ بند کر کے بھروسہ کرتے ہوئے نزہت خان اس
رشتے کیلئے مان گئی تھی۔ اب نزہت خان کو ایسہ خان کے
ردِ عمل کا کوئی ڈر نہیں تھا کہ وہ اس رشتے سے متعلق کیا ری
ایکشن دے گی کیونکہ وہ جانتی تھیں، اب نہ اس کے لالا اپنے
وعدوں سے چھپے ہٹیں گے اور نہ ان کا بھتیجا اپنی ذمہ داری میں
کوئی کوتاہی کرے گا۔

ماں کی اس رشتے پہ آئین سنتے ہی زربخت کا چہرہ عجیب کیفیت
سے دوچار ہوا، دل بوجھل ہوا، آنکھوں میں حیرت در آئی۔ وہ
یوں اچانک اس فیصلہ پہ دو بدو نظر آئی لیکن وہ بہت جلد اپنے
تاثرات پہ قابو پاتی سب کچھ اپنی ماں پہ چھوڑ گئی تھی۔ نزہت
خان جو بھی کریں گی، وہ زربخت اب سر آنکھوں پہ رکھے گی۔۔

اپنی پھوپھو کا جواب سنتے ہی دمیر خان کے جسم میں ایک سکون
کی لہر دوڑی تھی۔

اللہ تعالیٰ اس پہ مہربان ہو گیا تھا۔ اس کی محبت خوبصورت
رشتے میں بدلنے والی تھی۔ اس کی محبت امر ہونے والی تھی۔
دمیر خان محبت کے معاملے میں خوش قسمت نکلا تھا۔ وہ اپنی
محبت کی یوں تکمیل پہ خوش تھا لیکن کیسے خوشی مناتا؟ نزہت
خان کی جان لیوا بیماری اس خوشی کو پھیکا کر گئی تھی۔

بہت شکریہ! میرے عام سے بیٹے کو اپنی پھولوں جیسی بیٹی
دینے کیلئے۔۔۔ نزہت!! میں ابھی اور اسی وقت دمیر اور
زربخت کا نکاح کروانا چاہتا ہوں، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں
ہے؟ زربخت بیٹا تمہیں تو کوئی اعتراض تو نہیں ہے اس نکاح
سے؟۔۔۔ اسد اللہ خان اٹل لہجے میں بولتے آخر میں ان

دونوں کی رضامندی پوچھنے لگے۔ دمیر خان کا دل صحیح معنوں میں اب سینے سے نکل کر باہر آیا تھا۔ اس کا باپ آج اس پہ بیک وقت دو جہان کی نعمتیں اور خوشیاں تمام کر رہا تھا۔ اس کے دل اور آنکھوں میں خوشی کی لہر دوڑاٹھی تھی۔ یہ کیسی خوشی تھی جس پہ وہ کھل کے مسکرا بھی نہیں سکتا تھا۔

مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لالا اور زربخت کو بھی اعتراض نہیں ہے! ہے نہ زربخت؟۔۔۔ نزہت خان اپنی بیٹی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتی پر امید سے بولی تھی۔

مورے!! جیسے آپ کی مرضی ہے آپ وہ کریں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔۔۔ زربخت مضبوطی سے اپنی ماں کا ہاتھ تھامتی بنا ہچکچائے رضامندی دے گئی تھی۔ جب اس کے ماموں اس کی حفاظت اور نگہداشت کی ذمہ داری ایک

خوبصورت رشتے سے جوڑ کر دینا چاہ رہے تھے تو پھر وہ کیونکر
انکار کرتی؟ دمیر خان ہر لحاظ سے پرفیکٹ تھا جبکہ شہزاد کی
آنکھوں میں اس کو صرف حوس دکھی تھی۔ وہ بس اپنی ماں کی
جان بچانے کے لئے اس سے نکاح کر رہی تھی ورنہ کبھی راضی
نہ ہوتی۔

داعیر خان مبہم سا مسکرایا تھا، اگر حالات مختلف ہوتے تو وہ
اپنے لالا کے نکاح کی خوشی میں جھوم اٹھتا لیکن یہ وقت مناسب
نہیں تھا۔

ان تینوں باپ بیٹوں کے دماغ پہ فی الوقت نزہت خان کی جلد
از جلد صحت یابی سوار تھی۔۔۔ دمیر خان اپنے باپ کے ہاتھ سے
اپنا ہاتھ چھڑواتا ایک چھٹکے سے ان گلے میں لی گئی آف وائٹ
شال نکال کر زربخت کی طرف بڑھتا اس کے سر سے عروسی

دوپٹہ اتار کے زمین بوس کرتا، اس کا سر اور نازک وجود شال میں چھپا گیا تھا کیونکہ دمیر خان کو سب سے زیادہ زہریلی چیز زربخت کے وجود پہ یہ عروسی دوپٹہ ہی لگ رہا تھا جو اس نے کسی اور کے نام کا اوڑھا تھا۔ اس نے اور داعیر نے جینز شرٹ پہن رکھی تھی، شال صرف اسد اللہ خان نے لے رکھی تھی جو اب وہ زربخت پہ بذاتِ خود اوڑھا چکا تھا۔ اس کے حق جتانے والے انداز پہ وہ خود میں سمٹی۔

داعیر!! جاؤ مولوی صاحب کو نکاح پڑھوانے کیلئے اندر بلاؤ!۔۔۔ اسد اللہ خان نے نرمی سے اس کو حکم دیا۔

نزہت بہن!! ہم جائیں یا نکاح پڑھوانا ہے؟۔۔۔ داعیر خان ابھی باہر نکلتا جب مولوی صاحب نے باہر سے ہانک لگائی تھی۔

وہ اور تمام گواہان کب کے انتظار میں بیٹھ بیٹھ کے اب تھک چکے تھے۔

ایسے کیسے جانا ہے؟ تجھے میں نے ایڈوانس دیا ہوا ہے۔ میرا نکاح پڑھوانے سے پہلے تو یہاں سے نہیں جاسکتا۔۔۔ شہزاد زہریلی نظروں سے مولوی صاحب کو گھورتا ہوا اسے بیٹھنے کا حکم دے رہا تھا جو اب رجسٹرڈ اٹھائے یہاں سے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

جی مولوی صاحب! آپ نے نکاح پڑھوانے کے بعد ہی جانا ہے، لیکن اس نلے کا نہیں بلکہ میرے لالا کا۔۔۔ داعیر خان کمرے سے نکل کر صحن کی طرف بڑھتا، شہزاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولوی صاحب کو نئے نکاح سے متعلق آگاہ کرنے

تمہارے لالا کی تو ایسی کی تھی!! میں بھی دیکھتا ہوں، آج کون
میرے حق پہ ڈاکا ڈالتا ہے، میں نکاح کیلئے آیا تھا تو نکاح میرا ہی
ہوگا اور ہر صورت ہوگا۔ چاہے اس کیلئے مجھے کسی کی جان ہی
کیوں نہ لیننی پڑے۔۔۔ زربخت کا نکاح دمیر خان کے ساتھ
سننے کی پلاننگ سن کے شہزاد غصے کی حالت میں دھاڑا تھا۔
اسے اپنی ایک سال کی محنت رائیگاں ہوتی نظر آئی، اس نے
زربخت کو پانے کیلئے بڑے پاڑے بیلے تھے۔ وہ اتنی آسانی سے
چھپے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ وہ وحشی قسم کا انسان زربخت کو ہر
حالت میں پانے کا جنون رکھتا تھا۔ وہ دمیر خان کے ساتھ
زربخت کا نکاح ہرگز نہیں ہونے دے سکتا تھا۔

اور میں تیری ایسی درگت بناؤں گا کہ کتے کی نسل بھی تجھ سے
بہتر لگے گی! اب شرافت سے یہاں سے دفعہ ہونے کی تیاری پکڑ

ورنہ تجھے ایسا دھنکوں گا کہ تیری سات نسلیں یاد رکھیں گی۔۔۔
داعیر خان نفرت انگیز نظروں سے اس کو وارن کرتا اسی کے
انداز میں غرایا۔

دمیر خان جو باپ کے سمجھانے پہ شہزاد کی پہلے والی ساری
حرکتیں اور باتیں درگزر کرنے کا سوچ رہا تھا، باہر صحن میں اس
کی دھاڑ اور الفاظ سن کر بجلی کی تیزی سے کمرے سے نکلا۔
نزہت خان نے فکر مندی سے اسد اللہ خان کو باہر سب کچھ
سنبھالنے کیلئے اس کے چپھے بھیجا تھا کیونکہ وہ دمیر خان کے غصے
سے واقف تھی کہ وہ غصے میں کس حد تک جا سکتا ہے جبکہ
زربخت کا دل سو کھے پتے کی مانند لرز نے لگا تھا۔

میری ایسی کی تیری کرنے سے پہلے یہ تو سوچ لیتا کہ تیری اوقات
اور قد میرے برابر ہے بھی کہ نہیں؟ ابھی بھی وقت ہے یہاں

سے شکل گم کر ورنہ میرا میٹر گھوم گیا اور سرکٹ شارٹ ہو گیا تو
کوئی بعید نہیں، میں تیرے سارے پرزے جلا کے راکھ کر
دوں۔۔۔ دمیر خان اس کے قریب پہنچتا ہر لفظ پہ زور ڈالتے
ہوئے اسے آنے والے اذیت ناک وقت سے آگاہ کرنے لگا۔
میں نہیں جاؤں گا! نکاح کئے بغیر تو ہر گز نہیں جاؤں گا۔۔ تم اتنی
آسانی سے یوں زربخت پہ آ کے حق نہیں جتا سکتے، وہ صرف
میری ہے۔ اور میں اسے ہر قیمت پہ حاصل کر کے رہوں گا۔۔
شہزاد بھی لب بھینچے ڈھٹائی کی انتہا پہ اترتا اٹل لہجے میں گویا
ہوا۔۔ اسے پہلے دمیر خان سے خطرہ لاحق ہو رہا تھا کہ وہ اس کا
نکاح کینسل کروادے گا لیکن جب سے اس نے اسی کا نکاح
زربخت سے سنا تھا، اس کی رگ رگ میں حسد اور نفرت کے
بھانہ بھر جل اٹھے۔

تیری اتنی جرات کہ تو اپنی غلیظ زبان سے اس کا نام لے؟ اس پہ حق جتانے کی اوقات ہے تیری؟۔۔۔ دمیر خان غصے سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ اپنے مضبوط ہاتھ کی گرفت اس کے کالر پہ جما کے کھینچتا تھوڑی سی فورس لگاتے ہوئے شہزاد کو ایک فٹ زیں سے اوپر اٹھا کے ہوا میں معلق کر گیا۔ لمبے چوڑے وجود کے مالک دمیر خان کے سامنے شہزاد کا وجود کچھ بھی نہیں تھا۔ شہزاد کا قد مشکل سے دمیر خان کے کندھوں سے بھی نیچے تک آتا تھا۔

دمیر خان ابھی تک اپنے غصے پہ بہت ضبط کئے ہوئے تھے کیونکہ وہ اپنے جلالی روپ سے خود بھی ڈرتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شہزاد اس کے غصے کا نشانہ بن کے جان سے جائے، مگر اس کی زبان اور حرکتیں اسے انتہا پہ پہنچنے پر اکسا رہی تھی۔ ان

سب آوازوں کو سن کر چھپ کے دروازے کی اوٹ سے یہ
سارا منظر دیکھتی زربخت کے اوسان خطا ہوئے۔

میں تمہارا نکاح تو کم از کم زربخت سے کسی صورت نہیں ہونے
دوں گا۔۔۔ تم میری بنی بنائی گیم نہیں بگاڑ سکتے۔۔۔ وہ دمیر کے
ہاتھ سے اپنا کالر چھڑوا کے زمین پہ پیر لگانے کی کوشش کرتا
اس کے منہ پہ پھنکارا تھا۔ شہزاد کی سانسیں پھول رہی تھی۔۔۔
وہ اس وقت کوئی باغی معلوم ہو رہا تھا جو پاگل پن کا مظاہرہ
کرتے ہوئے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر دمیر خان جیسے بندے
سے الجھ کر سنگین غلطی کر رہا تھا۔

تجھے کس زبان میں سمجھاؤ کہ اپنی گندی بدبودار زبان سے اس کا
نام مت لے۔۔۔۔۔ دمیر خان پھر سے اسے کے منہ سے
زربخت کا نام سنتا ایک زوردار مکا اس کے چہرے پہ رسید

کرتے ہوئے اسے کالر سے جھٹک کر چھبے زمین پہ پٹک گیا۔
داعیر اور اسد اللہ خان خاموشی سے کھڑے تھے کیونکہ دمیر خان
بلکل صحیح بات پہ شہزاد کی درگت بنا رہا تھا۔ باقی تمام افراد ادھیڑ
بن میں مبتلا ہوتے ایک طرف سہم کر بیٹھ گئے۔ داعیر خان
کے دھمکی آمیز اشارے پہ مولوی صاحب بھی اپنا رجسٹر ڈگود
میں لئے خاموشی سے چارپائی پہ جا کے بیٹھا تھا جو معاملہ ہاتھ پائی
پہ آتا دیکھ کر یہاں سے نکلنے کی تیاری پکڑ رہا تھا۔ سلطانہ بیگم
اور اس کی بہن فکر مندی سے شہزاد کی جان کی سلامتی مانگ رہی
تھی جو بلا وجہ اپنی جان جو کھم میں ڈالے دمیر خان جیسے بندے
سے پنگالے بیٹھا تھا۔

نکالو اس احسان فراموش بڑھیا کو باہر جو پورا سال میرا استعمال
کرتی رہی۔۔۔ چار ماہ سے میری کمائی کھاتی رہی۔ دن میں دو

دو دفعہ مجھے اپنی خدمت کیلئے بلاتی رہی۔ اس کی بیٹی آدھی رات کو مجھے اپنے گھر بلا کے ماں کے تیمار داریاں کرواتی رہی۔۔ میں نے کیا ہے سب کچھ! میں چار ماہ خوار ہوا ہوں اس بڑھیا کی بیماری میں۔ میں نے اپنی راتوں کی نیند حرام کر کے ان ماں بیٹی کے ساتھ وفا نبھائی ہے۔۔ اب تم اتنی آسانی سے یوں بیچ میں آکر مجھ سے میرا حق نہیں چھین سکتے؟ اس وقت کہاں تھے جب اس بیمار بڑھیا کو میں ہسپتال لے کے جاتا تھا؟ تب کہاں تھے جب اس کو میں اپنے پیسوں کی دوائیں لے کر دیتا تھا۔ تب تم کہاں تھے جب میں اس کے ساتھ ساری ساری رات ہسپتال میں دھکے کھاتا تھا؟ تب پھوپھو یاد نہیں آئی تھی؟ اب پھوپھو کی جوان حسین بیٹی دیکھ کر تجھے پھوپھو کی یاد آگئی؟ تب کہاں تھے تم تینوں جب ان کی ہر پریشانی میں حل کرتا تھا؟

مجھے میری وصولی چاہئیے۔ باہر نکلو! احسان فراموش بڑھیا! بتاؤ
اپنے اس کل کے آئے پیارے بھتیجے کو کون کرتا رہا ہے تمہاری
خدمتیں؟ مجھے میرا حق چاہئیے میں نکاح ہر صورت کروں
گا۔۔۔ شہزاد زین پہ ہاتھ جما کے اٹھتا، گھٹیا پن کا مظاہرہ
کرتے ہوئے زربخت اور نزہت خان کے وقار کی توہین کرنے
لگا۔ وہ غصے میں پاگل ہو رہا تھا، اس کی حالت اس وقت کسی
پاگل جانور جیسی لگ رہی۔ غصے سے چہرہ گرم ہو ہے کی طرح
لال تھا۔ اس کے توہین آمیز الفاظ سن کر زربخت کی آنکھوں
سے آنسو تیرنے لگے۔

گھٹیا آدمی!! تو اس قابل ہے کہ تجھ جیسے کتے سے احسانات لئے
جاسکیں؟ یہ احسانات نہیں تھے بلکہ یہ تیری گندی نیت اور
بدیانتی تھی۔ تیرے حصول کامرکز و محور بھی تیری طرح غلیظ

تھا۔ تو نے ایک معصوم لڑکی کو ورغلا کے اپنے ساتھ نکاح میں
باندھنا چاہا، اس کو ایموشنل بلیک کیا، اس کو اپنے جھانسنے میں
پھنسا کے اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل چاہی۔۔۔ تجھے تو میں آج
ہی زندہ زمین میں گاڑ ہوں گا۔ تیری غلیظ زبان کی اتنی اوقات
کیسے ہوئی، میری پھوپھو کے خلاف کچھ بھی بکنے کی؟۔۔۔ دمیر
خان اس کی بکو اس سن کر طیش کے عالم میں شہزاد کے چہرے
پر جنونیت سے مکے رسید کرتا حلق کے بل دھاڑا تھا۔ اس کی
باتیں اس کے تن بدن میں آگ لگا گئی تھی جبکہ داعیر اور اسد
اللہ خان کے چہرے بھی شہزاد کی گھٹیاں باتیں سن کر غصے سے
سرخ انگارہ ہوئے تھے لیکن وہ اس کو جواب دینے کیلئے آگے
نہیں بڑھے تھے کیونکہ اس گھٹیا بدنیت آدمی کی چمڑی ادھیرنے
کیلئے دمیر خان کافی تھا۔

زربخت اور نزہت خان شہزاد کی اونچی آوازیں کی گئی ساری
بکو اس سنتی اذیت سے آنکھیں میچ گئیں۔ وہ پہلے شہزاد کیلئے
تھوڑی بہت فکر دیکھا رہی تھی لیکن اب اس کا اصلی روپ
سامنے آنے کے بعد وہ اس پل کا شکر ادا کر رہی تھیں جب دمیر
خان ان کے گھر وقت پہ پہنچا تھا ورنہ خدا نخواستہ زربخت تو اس
دوغلے معیار کے آدمی کے ساتھ بندھ جاتی۔۔۔ یہ سوچ کے ہی
نزہت خان کی روح کانپ اٹھی۔ انہیں شہزاد کے اصلی روپ پہ
ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا لیکن جو بکو اس وہ باہر کر رہا تھا، وہ
اس کی اصلیت تھی لیکن اس کی کہی گئی باتیں سچ نہیں تھیں۔
سوائے کل رات کے وہ کبھی بھی نزہت خان کی بیماری کی وجہ
سے ان کے گھر کی دہلیز پار نہیں کی تھی اور نہ ہی اس نے ایک
روپیہ ان کی دواؤں پہ لگایا تھا۔ ہاں وہ ضرورت کے وقت پیسے

دیتا تھا لیکن نزہت خان اس کے سارے پیسے تھوڑے عرصے
بعد واپس لوٹا دیتی تھی۔

شہزاد کی کمائی کا ایک روپیہ بھی ان پہ اور زربخت پہ حرام ہو جو
اگر انھوں نے کھایا ہو۔۔ اپنی اور اپنی بیٹی کی ذات پہ نزہت
خان نے ہمیشہ اپنے شوہر کی پینشن لگائی تھی۔ کسی سے بھیگ
نہیں مانگی تھی، کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا یا تھا، روکھی سوکھی
اپنے پیسوں کی کھائی تھی نہ کہ کسی اور کے پیسوں کی۔۔

زربخت جس کا دل اور دماغ دمیر خان کے ساتھ نکاح کیلئے دھندلا
اور گرد آلود ہو رہا تھا۔

اب شہزاد کی اصلیت، اپنوں اور غیروں کا فرق دیکھ کر، سب
کچھ شفاف ہوا تھا۔ دل تمام تر خیالات اور تفکرات سے آزاد
ہوا۔ دمیر خان کا وجہیہ چہرہ سب منظر صاف اور خالص کر گیا

تھا۔ زربخت کا دل مطمئن ہوا تھا۔ وہ خالص اور سچے جذبے سے دمیر خان کی دسترس میں جانے کو تیار ہوئی کیونکہ صرف وہی زربخت جیسی پاکیزہ، معصوم اور بھولے دل کی مالک لڑکی کو پانے کے قابل تھا۔

دمیر خان شدید غصے میں شہزاد کی درگت بنا رہا تھا۔ وہ اس کے چہرہ پہ براہ راست مکے جھڑتا چند لمحوں میں ہی اس کا چہرہ خون سے لال کر گیا تھا۔

تیرا میں خون پی جاؤں گا۔ میں تیرا نکاح کبھی بھی زربخت کے ساتھ نہیں ہونے دوں گا۔ وہ میری ہے!! وہ میری ہے اور میں اس کو تیری جان لیکر بھی حاصل کر لوں گا۔۔۔ شہزاد سنبھلتا، دمیر خان پہ حملہ کرنے کی کوشش کرتا اشتعال انگیزی میں چیخا تھا۔

تیرے جیسا گندی نالی کا کیرا ایسے نہیں سمجھے گا۔ میں آج تیری
چمڑی ادھیڑ کے تیرے جسم کے ہر اعضاء کو اپاہج کر کے تجھے
بھیک مانگنے کے قابل بھی نہیں چھوڑوں گا۔۔۔ دمیر خان اس
کے حملے سے بچتا، اپنے بھاری ہاتھ کے زوردار مکے سے وار کر
کے ایک پل میں اس کی ناک کی ہڈی توڑ گیا تھا۔ ہڈی ٹوٹنے پر
شہزاد کراہتے ہوئے بلبلا کے چھپے ہوا تھا۔ خون سے اس کا پورا
منہ اور سفید قمیض رنگ گئی۔۔۔ دمیر خان کا غصیلا انداز دیکھ کر
صحن میں موجود تمام افراد پہ سکتہ طاری ہوا تھا۔ کوئی بھی اسے
بچانے کی غلطی کرنے کے لئے آگے نہیں بڑھا تھا جبکہ داعیر
خان دلچسپی سے یہ منظر دیکھتا اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔
وہ اپنے لالا کی اگر نرم طبیعت سے واقف تھا تو اس کی سفاک
سائیڈ کا بھی بہت اچھے سے اندازہ تھا۔

سلطانہ بیگم اور اس کی بہن اپنے بھائی کی حالت پہ تڑپ اٹھی
تھیں، وہ کمرے کی کھڑکی سے چھپ کر صحن کا سارا منظر دیکھ
رہی تھیں۔۔۔ شہزاد کے ناک سے بہتا خون دیکھ کے ان کے
جسم میں پریشانی اور فکر مندی دوڑی تھی۔۔۔ دمیر خان ایک
جست میں اپنی پینٹ سے بیلٹ نکالتا، اس کو تھوڑا سا اپنے
ہاتھ کے گرد لپیٹتے ہوئے حالتِ طیش میں آکر شہزاد کے جسم پہ
بیلٹ کے نشانات ثبت کرنے لگا۔ وہ اپنے جلالی روپ میں آتا
بنار کے شہزاد کے جسم پہ پے در پے سخت بیلٹ کے وار کر
کے اسے کراہنے پر مجبور کر گیا تھا۔ شہزاد اپنے ہاتھ پھیلانے
بیلٹ کے وار سے بچنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ زربخت نے
ہونٹوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بمشکل اپنی چیخ دبائی۔

دمیر خان لب بھینچے غصے کے عالم میں بنا سانس لئے شہزاد کے
ٹخنوں پہ بیلٹ مارتا اسے کبھی ایک تو کبھی دوسری ٹانگ پہ اچھلنے
پہ مجبور کر گیا۔ شہزاد کراہتے ہوئے اس کے وار سے بچنے کی
کوشش کرتا چھپھٹنے لگا تھا لیکن دمیر خان اسے اپنے ہاتھ اور وار
کی پہنچ سے دور ہونے ہی نہیں دے رہا تھا۔ شہزاد اس کے
بے رحم وار سے خود کو بچانے کیلئے اچھل اچھل کر باقاعدہ ناچتے
ہوئے اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔ شہزاد کو یوں بندروں کی طرح اچھلتا
دیکھ کے داعیر خان کی اتنی سیریس سیچویشن میں بھی ہلکی سی
ہنسی نکلی تھی جس پہ وہ تیزی سے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر
تاثرات کو سنجیدہ کرنے لگا۔

دمیر خان کا چہرہ غصے سے تانبے کی طرح لال ہوا۔ شہد رنگ
آنکھیں سرخ لہو چھلکنے لگی۔ بال بے ترتیب ہو کے ماتھے پہ

بکھرے گئے۔ شہزاد کی موٹی چمڑی پہ ان گنت بیلٹ مار کے دمیر
خان کی سانسیں پھول چکی تھی لیکن اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو رہا
تھا۔۔۔ دمیر خان کا غیض و غضب دیکھ کے اب صحیح معنوں
میں شہزاد کی جان ہوا ہوئی تھی۔۔۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر
دیکھ کر اس کی حالت اب غیر ہوئی تھی جبکہ اس کی بہنیں الگ
واویدا کرتی شہزاد کی جان بخشی کی فریادیں کر رہی تھیں جو غصے
کی کیفیت میں داعیر سننے سے قاصر تھا۔

تجھے میں آج سارے حق دوں گا۔ تیری چار ماہ کی ساری بدنیتی
تجھے سود سمیت واپس کروں گا۔۔۔ تو نے اپنی زندگی کی سب
سے بڑی غلطی مجھے للکارنے کی ہے۔ اب میں تیری اسی غلطی کو
عبرت ناک سزا بناؤں گا۔۔۔ تیری جو زبان بار بار حق مانگ رہی
ہے نہ اسے میں آج حق دوں گا۔ اور ایسا دوں گا کہ پھر یہ حق

مانگنے کے قابل نہیں رہے گی۔۔۔ دمیر خان آگے بڑھ کر شہزاد
کو بالوں سے جکڑتا اس کی ٹانگ پہ اپنی زوردار لات رسید کرتا
ایک جھٹکے میں اسے گھٹنے کے بل گرا گیا تھا۔

وہ اس کے بالوں کو زور سے جکڑ اس کا منہ اوپر کی طرف کرنے
لگا۔ شہزاد کی آنکھوں میں خوف کی لہر دوڑی تھی۔۔۔ موت کے
ڈر سے گلے کی ہڈی میں کانٹے چبھے تھے۔ دمیر خان اس کے
جبرے پہ تین چار مکے برساتا اسے منہ کھولنے پہ مجبور کر گیا۔
شہزاد کی جان اچھل کے حلق میں آئی۔ وہ پہلے ہی ناک کی ہڈی
ٹوٹنے اور بیلٹوں کے وار سے آدھ منہ ہو چکا تھا۔ اب اس میں
مزا حمت کی ہمت نہیں بچی تھی۔ دمیر خان نے اسے گدھوں کی
طرح پیٹا تھا۔

وہ سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شہزاد کے منہ میں ہاتھ ڈال کر
اس کی پوری زبان باہر نکال گیا تھا۔ شہزاد اس کے ظالمانہ انداز
پہ ترپا تھا۔ صحن میں موجود تمام غیر افراد کی آنکھیں یہ منظر دیکھ
کر حیرت اور خوف سے پھیلی تھی۔ سلطانہ بیگم اور ان کی بہن
کی چیخ بے ساختہ تھی۔

چھوڑو!! مجھے۔۔۔ میں۔۔۔ تمہیں۔۔۔ جان سے۔۔۔ مار۔۔۔ دوں
گا۔۔۔ شہزاد اپنی زبان چھڑانے کی کوشش کرتا آخری بار ٹوٹے
پھوٹے لفظوں میں پھر سے دمیر خان کو دھمکی لگا گیا۔
کتے کی ٹیڑھی دم مجھے سیدھی کرنی آتی ہے۔ تو میرے
ہاتھوں سے بچے گا تو مجھے مارے گا نہ!!۔۔۔ دمیر خان بولتے
ساتھ ہی اس کی پوری زبان کو اپنا ہاتھ ڈال کے پھر سے حلق سے
کھینچ کے باہر نکالتا ایک ہاتھ سے جکڑ کر اس کے گرد اپنا بیلٹ

لپیٹنے لگا۔ بیلٹ بگل سے اسکی زبان منہ سے باہر ہی پن کر کے
باقی کا بیلٹ وہ اس کی گردن کے گرد لپیٹ گیا تھا، اسے چھپے
زمین پر دھکا دیتے ہوئے ایک دفعہ پھر سے دمیر خان اس پہ حملہ
آور ہوا تھا۔۔

یہ لے حق، یہ لے تیری وصولی، تو نے زبان حلق سے نکال کے
گردن کے گرد لپیٹنے کا سنا ضرور ہو گا لیکن دمیر خان سناتا نہیں
ہے بلکہ لائیو کر کے دیکھاتا ہے۔ یہ لائیو فلم دیکھنے کے بعد تو آج
کے بعد اچھے پن، رحم دل ہونے اور دو غلے پن کے سارے
ڈرامے بند کر دے گا۔۔۔ دمیر خان اسکو زمین پہ منہ کے بل
گراتا اس کی پیٹھ پہ مکوں اور گھونسوں کے وار کرنے لگا۔ اس کا
غصہ ٹھنڈا ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا جبکہ زبان بیلٹ سے
باندھ کر گردن کے گرد لپیٹے جانے پر، شدت تکلیف میں شہزاد کی

آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے تھے۔ وہ درد سے کراہتا ہوا بن
آب مچھلی کی طرح زمین پہ تڑپنے لگا تھا۔ دمیر خان غصے سے
سرخ چہرے کے ساتھ اندھا دھند اسے پیٹ رہا تھا۔ اس کا یہ
جلالی روپ دیکھ کے نازک سی زربخت کا وجود تھر تھرانے
لگا۔

شہزاد کے الفاظ بار بار دمیر کے کانوں میں گونجتے اسے وحشی بننے
پر مجبور کر رہے تھے۔ مولوی صاحب اور گواہان کے خوف سے
رونگٹے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ہونق بنے سارا سفاکیت سے
بھرا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتے بنا آواز کئے گھٹتی سانسیں بحال
کرنے لگے تھے۔

دمیر!! بس کرو۔۔۔ دیر ہو رہی ہے! ہمیں نکاح کر کے گھر بھی
جانا ہے۔۔۔۔۔ اسد اللہ خان تسلی سے شہزاد کی درگت بنتے

دیکھنے کے بعد دمیر خان کو رکنے کا اشارہ کرنے لگے۔ باپ کا حکم ملتے ہی وہ شہزاد کے اوپر سے اٹھ کھڑا ہوتا اس کے پیٹ میں اپنے بھاری بوٹ کا ٹھڈا مارتا اسد اللہ خان کی طرف بڑھ گیا۔ زبان بندھے ہونے کی وجہ سے شہزاد کراہنے سے بھی قاصر تھا۔۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی زبان کسی نے حلق تک کاٹ دی ہو۔ وہ بے بسی سے زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔

مولوی صاحب!! نکاح شروع کیا جائے۔۔۔ اسد اللہ خان اس کو لئے چار پائی کی طرف بڑھتے مولوی صاحب کو نکاح پڑھانے کا حکم کرنے لگے۔ داعیر خان نے اپنی جیب سے تین چار ٹیشو نکال کے اپنے لالا کی طرف بڑھائے تھے تاکہ وہ اپنے چہرے پہ آیا پسینہ صاف کر سکے جو شہزاد کی درگت بناتے ہوئے بہا تھا۔

دمیر پسینہ صاف کرنے کے بعد ایک ٹھنڈی سانس ہوا میں خارج

کرتا اپنا غصہ کنٹرول کرنے کی کوشش کرتا، مولوی صاحب کو
نکاح کے شرائط و ضوابط لکھوا گیا تھا۔ یہ ضروری تھا تاکہ
زربخت کے حقوق نہ صرف زبانی بلکہ کاغذی اور قانونی طور پر
بھی ہر جگہ محفوظ ہو۔

سب لکھنے کے بعد، مولوی صاحب اسد اللہ خان اور داعیر خان
کے ساتھ اندر کمرے کی جانب بڑھا تھا تاکہ پہلے زربخت کی رضا
مندی لی جاسکے۔ کمرے میں آتے ہی داعیر خان نے لرزتی
زربخت کو ریلکس کر کے اس کا چہرہ اچھی طرح سے شال میں
چھپایا اور مولوی صاحب کو نکاح شروع کرنے کا حکم دینے لگا۔
زربخت خان ولد رمیز خان کیا آپ کو تمام گواہان کی موجودگی میں
دمیر خان آفریدی ولد اسد اللہ خان آفریدی کو سکے رائج الوقت
دس کروڑ روپے بعوض حق مہر کے اپنے نکاح میں قبول کرتی

ہیں؟۔۔۔ مولوی صاحب نے نرمی سے زربخت سے سوال کیا۔

ق۔۔۔ قبول ہے۔ (مجھے وہ اپنوں کے لئے نرم دل اور دشمنوں کے لئے سفاک انسان قبول ہے)
قبول ہے۔ (مجھے وہ پر خلوص اور بے لوث محبت کرنے والا قبول ہے)

قبول ہے۔ (مجھے وہ اپنا محفوظ سائبان قبول ہے) مولوی صاحب نے اپنے الفاظ تین بار دہرائے تھے اور زربخت نے دھڑکتے دل کے ساتھ دمیر خان کو آج اپنے وجود کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔

وہ اپنے کانپتے ہاتھوں سے نکاح کے پیپر زپہ سائن کرتی پین داعیر خان کو واپس پکڑا گئی تھی۔ نزہت خان کی آنکھیں خوشی سے نم

ہوئی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کو سینے میں بھینچتی اس کے ماتھے پہ لب
رکھنے لگیں جبکہ اسد اللہ خان اور داعیر نے بھی شفقت اور
محبت بھرا ہاتھ زربخت کے سر پہ رکھا تھا اور اسے ڈھیروں
دعائیں دیتے ہوئے باہر کی جانب بڑھ گئے۔ باہر آ کے اب
مولوی صاحب نے باقاعدہ سب کو اپنی طرف متوجہ کرواتے
ہوئے دمیر خان کی رضا مندی جاننا چاہی۔۔

دمیر خان آفریدی ولد اسد اللہ خان آفریدی تمام گواہان کی
موجودگی میں زربخت خان ولد رمیز خان کو سکے رائج الوقت دس
کروڑ حق مہر کے عوض اپنے نکاح میں قبول ہے؟۔۔۔ مولوی
صاحب نے اونچی اور صاف آواز میں ٹھہرے انداز سے سوال
کیا۔

قبول ہے (مجھے میری بچپن کی محبت قبول ہے)

دمیر خان بچپن کی ساری یادیں ذہن میں دہراتا خوشی سے سرشار
ہو کے زربخت کو قبول کرنے لگا۔

کیا آپ کو یہ نکاح قبول ہے؟۔۔۔ مولوی صاحب نے اپنا
سوال دہرایا۔۔

قبول ہے (مجھے میری نیلی آنکھوں والی معصوم اور حسین پری
جی جان سے قبول ہے) دمیر خان نے آنکھوں میں چمک لئے
اپنی گہری آوازیں اقرار کیا۔

کیا آپ کو یہ نکاح قبول ہے؟ مولوی صاحب نے آخری بار
پوچھا۔

قبول ہے۔ (مجھے میرے بخت کا روشن ستارہ قبول ہے، مجھے
میری بخت دو جہانوں کیلئے قبول ہے)

دمیر خان دل میں اپنی محبت کی تکمیل پر اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مبارکہ کا شکر ادا کرتا مکمل طور پر زربخت کو اپنی دسترس میں لے گیا تھا۔ دمیر خان کی رضا جاننے کے بعد مولوی صاحب نے دستخط کیلئے پیپر آگے کئے تھے۔۔ دستخط ہونے کے بعد سب نے دعا کیلئے ہاتھ اوپر اٹھائے۔۔ اسد اللہ خان آج زربخت کو اپنے بیٹے کی دسترس میں دے کے کچھ مطمئن ہوئے تھے۔ کچھ اپنی کوتاہیوں کا بوجھ کم لگا تھا، جو کوتاہیاں انھوں نے ساری زندگی نزہت خان اور اس کی بیٹی کو خود سے دور رکھ کے کی تھیں۔ بہت بہت مبارک ہو لالا!!۔۔۔ داعیر خان اٹھ کے دمیر خان کے گلے لگتا رسماً گویا ہوا۔

تھینک یو لالا کی جان!۔۔۔ دمیر خان سنجیدہ تاثرات کے ساتھ داعیر خان کے گرد اپنی بانہوں کا گھیر اتنگ کر گیا۔ وہ خوش بہت

تھا لیکن شاید وقت خوشی منانے کا نہیں تھا۔ یہ خوشی نزہت خان کی جان لیوا بیماری غارت کر گئی تھی۔ ان تینوں کے دماغ میں اب صرف نزہت خان کا خیال اور ان کو اس موذی مرض سے چھٹکارا دلوانے کا عزم تھا۔

خوش رہو۔ اللہ میرے بیٹے کو یہ نکاح مبارک کرے۔ تم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کیلئے سکون کا ذریعہ بنو!۔۔۔

اسد اللہ خان نے دمیر خان کے ماتھے پہ لب رکھتے ہوئے اسے دعاؤں سے نوازا۔ نکاح ہوتے ہی مولوی صاحب اور باقی تمام افراد پل میں ہی گھر سے رفو چکر ہوئے تھے۔ شہزاد ابھی تک زمین پہ پڑا کراہ رہا تھا۔

یہ لے!! کھا میرے نکاح کا لڈو۔۔۔ دمیر خان اس کی ہی لائی ہوئی مٹھائی کی ٹوکریاں اٹھا کے اس کے سر اور منہ پہ پوری الٹا

سلگانے والے انداز میں بولا تھا۔ شہزاد کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ مسلسل زبان منہ سے باہر رہنے کی وجہ سے اس کا پورا جبراً اور منہ شل ہو گیا تھا۔ وہ آدھ منہ ہو کے زمین پہ پڑا عبرت اور بے بسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

بابا! آپ پھوپھو کو لیں جائیں۔ میں اس کو پولیس کے حوالے کر آؤں گا۔ پولیس آرہی ہے، میں نے کال کر دی ہے۔۔۔ دمیر خان اپنا پیر شہزاد کے منہ پہ رکھ کے مسلتا سپاٹ لہجے میں گویا تھا۔ اس کی بات سنتے ہی وہ دونوں نزہت کو اپنے ساتھ لئے گھر کی طرف روانہ ہو گئے جبکہ پولیس کا سنتے ہی شہزاد کی بہنیں بنا اس کی خبر لئے گھر کو بھاگی تھیں کیونکہ اس کی بدنیتی اور فراڈ کی وجہ سے ایک دو بار سلطانہ بیگم بھی اس کے ساتھ شریک ہونے کی وجہ سے حوالات کی سیر کر چکی تھی اور زربخت کو بلیک میل

اور بہلانے پھسلانے میں ان کا برابر کا ہاتھ تھا۔ اس لئے وہ خود
کو بچاتی شہزاد کو اس سیچویشن میں اکیلا چھوڑ کے فرار ہو گئی
تھیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد پولیس شہزاد کو گرفتار کر کے لے گئی تھی۔
اس پہ دمیر خان نے بلیک میل کرنے کے علاوہ اور بہت سی
دفعات درج کروائی تھی۔ وہ اتنی آسانی سے جیل سے نکلنے والا
نہیں تھا۔ سارا پھیلا یا گیا راتہ سمیٹنے کے بعد دمیر ایک ٹھنڈی
سانس ہوا میں منتشر کرتا، اپنے بالوں میں ہاتھ پھیر کر انہیں
ترتیب دیتا بے تابی سے اندر کمرے کی طرف بڑھتا تھا جہاں اس
کی متاعِ من اس کے انتظار میں بیٹھی تھی تاکہ وہ جلدی سے
آئے اور اسے اس کی مورے کے پاس لے کے جائے۔

اسد اللہ خان نے تو زربخت کو اپنے ساتھ آنے کا کہا تھا مگر
نرہت خان نے اسے اپنے محرم کے ساتھ آنے کی تلقین کرتے
ہوئے اس کو واپس بیٹھا دیا تھا اور زربخت ماں کی بات مانتے
ہوئے خاموشی سے بیٹھ گئی تھی۔ اس نے ہنوز چہرے پہ
اجرک کا گھونگھٹ ڈال ہوا تھا۔

وہ پریشانی سے انگلیاں مروڑنے میں مصروف تھی جب دمیر خان
کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس کے بھاری قدموں کی چاپ پہ
اس کا ننھا سادل اچھل کے حلق میں آیا تھا۔ ایک عجیب سے
احساس نے آن گھیرا تھا۔ وہ متوسط قدم اٹھاتا انکھوں میں
تشکر کی نمی لئے زربخت کے پہلو میں جا کے بیٹھا۔ وہ نرمی اور
استحقاق سے اس کا ہاتھ اپنا مضبوط ہاتھ میں لیتا اپنے دل کے
مقام کے پہ رکھ گیا تھا۔ ایک خوبصورت احساس اور جذبے

نے دمیر خان کے پورے وجود کو جکڑ کر پہلی بار سکون سے
متعارف کروایا تھا۔ زربخت کا دل کانوں میں دھڑکا۔ وہ کنفیوز
سی ہوتی اپنا ہاتھ چھپھٹانے کی کوشش کرنے لگی کیونکہ دمیر خان
کا دل زوروں سے دھڑکتا اس کے ہتھیلی پہ سرپیٹ رہا تھا۔ اتنی
شدت سے اس کے دل کی دھڑکن اپنی ہتھیلی پہ محسوس کر کے
وہ پریشان ہو گئی تھی۔

تم میرے دل کی حالت آج محسوس کر رہی ہو اور اس کی
دھڑکن کی شدت تم سے برداشت نہیں ہو رہی تو پھر سوچوں میں
نے تو اس دل کا شور، پاگل پن، اس کا شدت سے دھڑکنا،
تمہاری چاہ میں تڑپنا، تمہیں پانے کی خواہش، اس کی تمہیں
چھونے کی طلب سب صبر سے برداشت کیا ہے۔ دنیا کا سب
سے مشکل کام محبت میں بتلا دل کو سنبھالنا ہے۔ یہ وضاحتیں

نہیں مانتا، یہ دلا سے نہیں مانتا، یہ مجبوریاں نہیں دیکھتا، یہ کسی چیز کا لحاظ نہیں کرتا، اس کو بس اپنا من پسند محبوب ہر حال اور ہر قیمت میں اپنے پاس چاہیئے ہوتا ہے۔۔۔ بغاوت پہ بھی اتر آتا ہے۔ کبھی کبھی تو جس کے سینے میں دھڑک رہا ہوتا ہے، محبوب کی عدم دستیابی پر دھڑکنا چھوڑ کے اس کی ہی جان لے لیتا ہے۔۔۔۔۔ دمیر خان بوجھل لہجے میں بولتا اس کے ہاتھ کی پشت چوم کر دوسرے ہاتھ سے شال اس کے چہرے سے ہٹا گیا تھا۔

زربخت نے اس کی کسی بھی بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔ وہ تو اس کی اتنی نزدیکی اور لمس یہ دہو رہی تھی۔ اجرک چہرے سے ہٹے ہی اس نے نا سمجھی سے اپنی بھیگی پلکیں اٹھا کے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں اوپر اٹھنے کی دیر

تھی جب اس کی لہو رنگ ہوتی آنکھیں دمیر خان کا دل مٹھی میں
جکڑ گئی تھیں۔ مسلسل کل رات سے رونے کی وجہ سے
زر بخت کی نیلی آنکھیں سوجن زدہ تھی۔ وہ اپنا نیلا رنگ کھو چکی
تھی۔ ہر طرف غم اور اذیت کی سرخی چھائی ہوئی تھی۔۔۔ دمیر
خان تکلیف سے آنکھیں میچ کے کھولتا، آگے جھک کر اس کی
دونوں آنکھیں نرمی سے چومتا عقیدت سے اس کے ماتھے پہ لب
رکھ گیا تھا۔

"نکاح مبارک میرے بخت کا روشن ستارہ"۔۔۔ وہ اس کے
دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر چومتے ہوئے اپنی آنکھوں سے لگا گیا
تھا۔ محرم کا پہلا پر حدت بوسہ اور لمس زر بخت کے جسم میں
سنسنی دوڑا گیا۔

زربخت نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا وہ شرم سے سرخ ہوتی
اچنبھے سے چپھے ہٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کا دل زور سے
الگ لے رہا تھا۔

آج کے بعد تمہاری ان پیاری آنکھوں میں آنسو نہ آئیں۔۔۔ یہ
تمہاری زندگی کی آخری غم اور پریشانی کی شام تھی۔ کل کا
سورج تمہاری زندگی کے حسین ترین اور خوشنما سفر کا آغاز
کرے گا۔۔۔ لوگوں کو جنت میں جانے کیلئے اس جہاں کو چھوڑنا
پڑتا ہے، ان کو موت کا راستہ طے کر کے جنت ملتی ہے مگر میں
تمہارے لئے اس جہان کو جنت بناؤں گا۔ تمہاری زندگی
خوشیوں سے بھر دوں گا، مسکراہٹ تمہارے پر نور چہرے سے
کبھی جدا نہیں ہوگی، تمہاری زندگی کو قابل رشک بناؤں گا تاکہ ہر
کوئی میری بخت کے بخت پہ رشک کرے، دکھ اور تکالیف سے

تمہارا کبھی واسطہ نہیں پڑنے دوں گا، تمہارا ہر دکھ درد خود میں
جذب کر لوں گا کیونکہ اب میں تم پہ سر سے لیکر پاؤں تک حق رکھتا
ہوں زر بخت دمیر خان!! تم میرا روشن بخت ہو!!۔۔۔۔۔ وہ
محبت سے لبریز لہجے میں بولتا ایک جست میں اسے اپنے ہاتھوں
میں بھرتا ہوا باہر کی جانب بڑھا جبکہ وہ بوکھلا کر اس میں سمٹنے
لگی۔ وہ کمرے سے لیکر باہر گیٹ سے نکلنے تک زر بخت کا چہرہ
چومتا جا رہا تھا، ایسے جیسے کوئی صدیوں کا بچھڑا اپنے محبوب سے
ملا ہو یا جس کو اپنی زندگی کا کھویا سکون مل ہو۔ زر بخت اس کے
لمس پہ ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔ وہ احتیاط سے اس کو پسینہ
سیٹ پہ بٹھاتا، گھر کا مین گیٹ لاک کر کے واپس گاڑی میں آ کے
بیٹھا تھا۔

چلیں؟۔۔۔ دمیر خان ایک محبت بھری نظر اپنی اجرک میں
لپٹی زربخت پہ ڈالتا، نرمی سے پوچھنے لگا۔ اس کی بات
پہ زربخت نے نظریں جھکائے بس اثبات میں سر ہلایا تھا۔ دمیر
خان اس کی ہچکچاہٹ پہ مبہم سا مسکراتا گاڑی سٹارٹ کر کے
گھر کی جانب رواں ہوا۔ وہ اس کی ساری ہچکچاہٹ دور کرنے
اور اس سے تفصیلی پرسکون ملاقات گھر جا کے کرنے کا ارادہ
رکھتا تھا کیونکہ فی الحال زربخت کو اپنی ماں کے پاس پہنچنے کی
جلدی تھی۔

خالہ جان! دمیر کب آئے گا؟ مجھے اس سے مل کے پھر گھر بھی
جانا ہے۔ آج بہت تھک چکی ہوں۔ بہت کام تھا آفس
میں۔۔۔ انزس بزدار کافی کا خالی مگ ٹیبل پہ رکھتی انیسہ خان سے

تھکے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگی۔ وہ اپنی خالہ سے کافی دنوں بعد ملنے آئی تھی، انیسہ خان سے دمیر خان کی آمد کا سن کے وہ اسے ملنے کی غرض سے رک گئی تھی۔ وہ پچھلے ایک گھنٹے سے یہاں پہ بیٹھی دمیر کی گھر واپسی کا انتظار کر رہی تھی لیکن اس کی واپسی کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

آ رہا ہوگا۔ راستے میں ہوگا۔ بس تھوڑی دیر اور ویٹ کر لو۔ داعیر اور اس کے بابا اس کو ایئرپورٹ سے لینے گئے ہیں۔۔۔ انیسہ خان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ان کا چہرہ فکر مندی میں ڈوبا ہوا تھا۔

خیریت! آج سے پہلے تو انکل اسے کبھی ایئرپورٹ لینے نہیں گئے اور وہ تو ایک ہفتے کیلئے گیا تھا نہ آسٹریلیا؟ پھر تین دنوں میں واپس کیوں آ رہا ہے؟ سب ٹھیک تو ہے نہ خالہ جان! کوئی

مسئلہ تو نہیں ہے؟۔۔۔ انرش بزدار کو یوں دمیر خان کو ائیر پورٹ سے لینے کیلئے داعیر خان اور اس کے باپ کا جانا ٹھٹکا تھا۔ اس نے کھوجتی نگاہوں سے سوال کیا۔

مجھے خود بھی کچھ پتہ نہیں ہے۔ میں نے داعیر سے پوچھا تھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ اس نے افراتفری میں نکلتے ہوئے بتایا کہ لالا نے بلایا ہے۔ میں خود پریشان ہوں۔ دمیر نے اسے باہر کیوں بلایا ہے؟ آخر ہوا کیا ہے؟ یوں دونوں باپ بیٹے کو باہر ہی بلایا لیا؟ وہ گھر بھی تو آ کے مسئلہ ڈسکس کر سکتا تھا۔۔۔ ایسہ خان کب سے داعیر سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن جواب موصول نہیں ہو رہا تھا اور یہ چیز انہیں تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔

کوئی ایمر جنسی ہو گئی ہوگی، اس لئے باہر بلایا ہوگا؟ یا کوئی آفس کا ضروری کام ہوگا؟ رکیں میں دمیر کو کال کرتی ہوں۔۔۔ انزس اپنا فون اٹھا کے ابھی دمیر کو کال کرتی کہ سامنے سے آتے اسد اللہ خان، داعیر اور نزہت خان کو اپنے ساتھ لئے لاؤنج میں داخل ہوئے تھے۔۔

کہاں تھے آپ لوگ؟ میں کب سے کالز کر رہی تھی؟۔۔۔ انیسہ خان صوفے سے اٹھتی اپنے شوہر سے عجلت میں مخاطب ہوئی تھی۔۔۔ نزہت خان کا ان کے ہمراہ ہونا اسے حیران کن لگا تھا۔

اسلام علیکم بھا بھی!!۔۔۔ نزہت خان نے ان کا خود کو ناگواریت سے دیکھنا بخوبی نوٹ کیا تھا۔ وہ اپنی بھا بھی کا خود کو

نظر انداز کرنا ایک سائیڈ پہ رکھتی پہل کرتے ہوئے ناتواں آواز
میں بولی تھی۔

وعلیکم السلام! خیریت؟ نزہت تم یہاں کیا کرنے آئی
ہو؟۔۔۔ انیسہ خان نے آبرو اکھٹے کئیے تشویشی انداز میں
سوال کیا تھا۔ انہیں ان کی حالت دیکھ کے لگ رہا تھا کہ وہ بیمار
ہیں لیکن ان کو نزہت خان کے بیمار ہونے یا نہ ہونے سے کوئی
غرض نہیں تھا، ان کو بس اپنے گھر میں ان کا وجود پھر سے چھ
رہا تھا۔

نزہت آج سے میرے ساتھ رہے گی میرے گھر میں۔ کیونکہ وہ
جگہ اس کے رہنے کے قابل نہیں ہے۔۔۔ اسد اللہ خان کڑی
نظروں سے انیسہ خان کو اپنا انداز درست کرنے کا اشارہ کرتے
متوازن لہجے میں بولے تھے۔ نزہت خان کو دیکھتے ہی وہ اپنی بیگم

کی بیزاری نوٹ کر چکے تھے۔ جو ہمیشہ ان کے چہرے پہ نزہت
کو دیکھ کے یا ان کا ذکر سن کے آجاتی تھی۔

کیوں؟ پہلے تو وہ گھر ان کے قابل تھا۔ یہ ساری زندگی وہاں رہی
ہیں۔ اب اس گھر میں ایسا کیا ہو گیا ہے جو یہ وہاں نہیں رہ
سکتی؟۔۔۔ انیسہ خان ماتھے پہ تیوری چڑھائے سخت لہجے میں
اس سے استفسار کرنے لگیں۔

وہ گھر کبھی بھی پھوپھو کے رہنے کے قابل نہیں تھا۔ یہ پھوپھو
کی ہمت ہے جو انھوں نے اتنے سال اس عام سے محلے میں
دو غلے لوگوں کے ساتھ گزارے، وہ جگہ پھوپھو اور زربخت
کے رہنے کے قابل کبھی بھی نہیں تھی۔ یہ تو ہماری کوتاہیوں
کی وجہ سے پھوپھو کو اتنے سال بوسیدہ اور گھٹن بھری زندگی
گزارنی پڑی لیکن آج سے یہ ہمارے پاس رہیں گیں ہمارے گھر

میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے، کیونکہ میری پھوپھو اور گرٹیا یہی پہ رہنے
کے قابل ہیں۔۔۔ داعیر خان مضبوطی سے نزہت خان کے
کندھے پہ اپنے بازو کا گھیر اتنگ کرتا ٹھوس لہجے میں فیصلہ سنانے
لگا۔ اس کے لہجے میں شرمندگی اور درد کی رمق بھی شامل تھی۔
یہ درد اور شرمندگی نزہت خان کو خود سے لاتعلق رکھنے کی تھی۔
داعیر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ نزہت کے لالا کا گھر ہے۔ میں اپنی
بہن اور جوان بھانجی کو اس غیر معمولی اور غیر محفوظ جگہ پہ مزید
نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ بھی ایسی حالت میں جب اسے میرے
ساتھ اور میرے کندھے کی ضرورت ہو۔۔۔ اسد اللہ خان نے
بیٹے کی بات کو طول دیا تھا۔ ان کے لہجے میں بھی تکلیف کا عنصر
واضح تھا۔

اسلام علیکم آنتی!! کیسی ہیں آپ؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟۔۔۔ ان سب کو بحث و تکرار میں مگن دیکھ کر انزس آگے بڑھتی خوشدلی سے نزہت خان کو مخاطب کر گئی۔ نزہت کا چہرہ دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ بیمار ہیں۔۔۔ اسلئے داعیر لوگ انہیں اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔

وعلیکم السلام!! میں بالکل ٹھیک ہوں میری بیٹی! تم سناؤ! کیسی ہو؟۔۔۔ نزہت جبراً مسکراہٹ چہرے پہ لاتی انزس کو جواب دینے لگیں۔ وہ انیسہ خان کی سخت مزاجی شدت سے نوٹ کر رہی تھیں لیکن انہیں اپنے لالا پہ بھروسہ تھا۔ اگر وہ انہیں اپنے گھر لائے تھے تو پھر در بدر کی ٹھو کریں کھانے کیلئے یہاں سے نہیں نکالے گے۔

میں بھی ٹھیک ہوں۔۔۔ انرش اپنی خالہ کی نظروں کی تپش خود
پہ محسوس کرتی مختصراً گویا ہوئی۔ انیسہ خان کو یوں سب کا
نزدہت خان کی طرف ہونا زہر لگ رہا تھا۔
تو ٹھیک ہے۔ اگر یہ لوگ وہاں نہیں رہ سکتے تو ان کو کوئی نیا
اپارٹمنٹ لے دیں! یہ وہاں رہ لیں گی اپنی بیٹی کے ساتھ۔۔۔
وہ سپاٹ لہجے میں بولتی نزدہت خان کو کڑی نظروں سے دیکھنے
لگی۔

اپارٹمنٹ کیوں؟ جب اتنا بڑا گھر ہے تو پھر اپارٹمنٹ کی کیا
ضرورت ہے؟ میں نزدہت کو اس بیماری کی حالت میں اپنے
ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔ نہ صرف صحت یاب ہونے تک بلکہ اب
تاحیات اب یہ دونوں میرے ساتھ اسی گھر میں رہیں گئی۔۔۔

جاؤ داعیر! پھوپھو کو ان کے کمرے میں لے جاؤ۔ یہ اتنی دیر
کھڑی نہیں رہ سکتی۔۔۔ اسد اللہ خان ہر لفظ پہ زور ڈالتے ہوئے
اپنی بیگم کو آگاہ کرتے بیٹے کو نزہت خان کو اندر کمرے میں لے
جانے کا حکم دینے لگے۔ داعیر خان احتیاط سے ان کو سہارا
دئے ان کے کمرے کی طرف بڑھتا ملازمہ کو کھانا لانے کا آرڈر کر
گیا تاکہ وہ اپنی پھوپھو کو کھانا کھلا کے وقت پہ دوائیں دے سکے۔
نزہت خان کی طبیعت خرابی کی وجہ سے وہ کل رات سے ہی
بے آرام تھی۔ اس لئے داعیر خان نے سب سے پہلے ان کے
آرام کا سوچتے ہوئے کمرے کا رخ کیا تھا۔

یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ آپ کو پتہ ہے نہ، میں ان دونوں
ماں بیٹی کو اپنے گھر برداشت نہیں کر سکتی!۔۔۔ نزہت خان

کے یہاں سے جاتے ہی انیسہ خان دبے دبے غصے میں
غرائی۔ لہجہ حقارت سے بھرپور تھا۔
نہیں کر سکتی تو آج سے برداشت کرنا سیکھ لو کیونکہ میں اپنا فیصلہ
ہرگز نہیں بدلنے والا۔۔۔ اسد اللہ خان بھی جواباً اسی کے
انداز میں بولے تھے۔

دمیر کہاں ہے؟ میرا بیٹا کہاں ہے؟۔۔۔ انیسہ خان ان کا
کرخت رویہ ہضم کرنے کی ناکام کوشش کرتی غصے سے سرخ
ہوتے چہرے کے ساتھ دمیر کے متعلق پوچھنے لگی۔ زندگی میں
پہلی بار انیسہ خان نے اپنے شوہر کے رویے میں ہٹ دھرمی
دیکھی تھی اور یہی بات اسے کھٹک رہی تھی۔

آجاؤ! آرام سے۔۔۔ وہ ابھی کچھ بھی بولتے جب لاونج میں
داخل ہوتے دمیر کی آواز سن کر انزس سمیت تینوں نے پلٹ

کر چھپ دیکھا تھا۔ زربخت کو دیکھتے ہی اسد اللہ خان مبہم سا
مسکرائے جبکہ انزش بزدار اور انیسہ خان کی آنکھیں الجھن کا
شکار ہوئی تھی۔ دمیر خان اس کے گرد اپنے بازو کا حصار
باندھے اپنا ایک ہاتھ اس کے ہاتھ میں الجھائے اپنے ساتھ لگا کر
سب کی طرف بڑھ رہا تھا۔

کیا ہے یہ سب؟۔۔۔ انیسہ خان نے یہ سارا منظر دیکھتے ہی
حیرت سے سوال کیا۔ انہیں زربخت کی دمیر خان کے ساتھ اتنی
نزدیکی آگ لگا گئی تھی۔

زربخت!! تم میرے کمرے میں جاؤ! میں ابھی آتا ہوں۔۔۔
دمیر ماں کو جواب دینے کی بجائے نرمی سے زربخت کے سر پہ
اجرک درست کرتا اسے اپنے کمرے میں جانے کا حکم دینے
لگا۔ انزش ابھی تک الجھن کا شکار تھی، وہ دمیر خان کا زربخت

کے اتنا نزدیک ہونا سمجھ نہیں پا رہی تھیں۔ وہ کبھی کسی کے ساتھ اتنا بے تکلف نہیں ہوتا تھا، جتنا آج اسے انرش اس کے ساتھ نظر آرہی تھی اور اس کی طبعیت میں یہی بدلاؤ اس کو اضطرابی کیفیت میں مبتلا کر رہا تھا۔

تمہارے کمرے میں کیوں جائے گی یہ؟۔۔۔ انیسہ خان نے اچھنبے سے سوال کیا۔ ان کا دل کسی انہونی کی گواہی دے رہا تھا۔۔۔

کیونکہ میرا کمرہ اب اس کا ہے۔ میرا سب کچھ آج سے اس کا ہے۔ میرا اب کچھ بھی نہیں بچا، اپنی روح تک اس کے نام سے وار چکا ہوں۔ اب سے میں اس کی ملکیت ہوں۔۔۔ سر سے لیکر پاؤں تک خود کو اپنی محرم کیلئے نیلام کر دیا ہے میں نے۔۔۔ دمیر خان محبت بھری نگاہ زربخت کے آسودگی سے

دو چار چہرے پہ ڈالتا شدتِ جذبات میں بولا۔ اس کے لہجے کا
خالص پن اور آنکھوں کی چمک دمک انرش کی دنیا اجاڑ گئی
تھی۔۔ وہ ایک پل میں اس کی آنکھوں کی چمک میں زربخت کا
لکھنا نام پڑھ چکی تھی۔ دل کو اچانک دھچکا لگا تھا۔ دماغ سب
کچھ سمجھ چکا تھا۔

"اہہ!! زیادہ سمجھدار ہونا بھی نقصان دہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی
سمجھداری ہمیں وقت سے پہلے ہی غم اور اذیت سے دوچار کر
دیتی ہے۔ اگرنا سمجھ ہوتے تو کم از کم غم اور اذیت چند منٹ
بعد ہی ہم پہ حملہ آور ہوتے" انرش بزدار کی سمجھداری وقت
سے پہلے اس پہ اذیت کی صورت میں حملہ آور ہوئی تھی۔۔ وہ
اس کے الفاظ سن کے سب سمجھ چکی تھی کہ اس کی خاموش
محبت خاموشی سے قتل ہو گئی ہے۔

وہ محبت جو اظہار کی سانسیں مانگتی رہی آج بغیر اظہار کے اپنی
موت آپ گھٹ گھٹ کے مر چکی تھی؟ وہ بے ساختہ دو قدم چھپے
ہٹی تھی۔ اگر چھپنے ہٹی تو کوئی بعید نہیں تھی کہ اس کی دم توڑتی
محبت اس کی بھی سانسیں حلق سے کھینچ لیتی لیکن ایک امید
کے تحت وہ ابھی بھی اپنے قدموں پہ مضبوطی سے جمی کھڑی
تھی۔ وہ دمیر خان کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔ ہاں وہ
سمجھدار لڑکی آج اپنی سمجھداری کو سوالیہ نشان بنا رہی تھی۔۔
وہ اپنی سمجھداری پہ آج بھروسہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ
نا سمجھی کا مظاہرہ کرنا چاہتی تھی، کم از کم تب تک جب تک دمیر
خان خود اقرار نہیں کرتا کہ وہ اس کی محبت کا قتل کر چکا ہے اور
بے دردی سے کر چکا ہے۔

کس حق سے جائے گی یہ تمہارے کمرے میں؟۔۔۔ انیسہ خان
بھی دمیر کے لہجے میں کچھ عجیب سا محسوس کرتی سخت لہجے میں
استفسار کرتے ہوئے زربخت کو زہریلی نظروں سے گھورنے
لگیں۔

میرے نکاح میں ہونے کے حق سے، میری بیوی ہونے کے حق
سے، میری شریک حیات ہونے کے حق سے، میری سانسوں
کی ملکہ ہونے کے حق سے، میری محبت کی خوبصورت
تکمیل ہونے کے حق سے، میرے دل کی اکلوتی مالک ہونے
کے حق سے، میری روح کا سکون ہونے کے حق سے، میری
آنکھوں کا نور ہونے کے حق سے، میری حیات کے حسین
خواب کی حسین تعبیر ہونے کے حق سے، میرے بخت کا روشن
ستارہ ہونے کے حق سے۔۔۔ وہ انیسہ خان کی نظروں کی تپش

سے سہم کر کھڑی زربخت کے گرد گرفت مضبوط کرتا اعلانیہ
انداز میں بولتے ہوئے اپنا اور اس کا تعلق واضح کر گیا تھا۔
اس کے الفاظ انیسہ اور انزش بزدار کے سینے میں تیر کی طرح
پیوست ہوئے تھے۔ انیسہ خان شاکڈ کیفیت میں مبتلا ہوئیں جبکہ
انزش کے جسم سے جان نکل کر لبوں پہ آئی تھی۔ آنکھیں
حیرت سے پھیلی تھیں۔ آج اس کے سامنے پہلے والا دمیر خان
نہیں کھڑا تھا۔ بلکہ یہ تو کوئی بٹا اور پرایا ہوا شخص کھڑا تھا۔ دمیر
کے الفاظ نہیں تھے بلکہ وہ انزش بزدار کی محبت کیلئے موت کا
پروانہ تھے۔۔ ایک لمحہ لگا تھا دمیر خان کو انزش کیلئے غیر ہونے
میں۔۔ ایک لمحے میں ہی انزش بزدار کی نظر دمیر خان کیلئے بدل
گئی تھی لیکن یہ محبت کے قتل سے وجود میں آنے والا اتنا بڑا
بدلاؤ انزش کیلئے بہت اذیت ناک تھا۔ موت سے بھی زیادہ بدتر

تھا۔۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں اپنی محبت کے سرے راہ قتل
ہونے پہ ٹھنڈے برف ہو رہے تھے۔ زندہ جسم نے قبر میں جا
کے چھلانگ لگائی تھی، آنکھیں تعجب کا شکار تھیں۔ لب ساکت
تھے۔ اور دل!! خیر دل تو پہلے ہی اپنی آخری سانسیں لے رہا
تھا۔

ت۔۔ تم۔۔ نے۔۔ میرے۔۔ ساتھ۔۔ اچھا۔۔ نہیں۔۔
کیا۔۔ دمیر!!۔۔ انزس اپنی لڑکھڑاتی زبان اور بے جان
ہوتے وجود کے ساتھ صدمے کی حالت میں گویا ہوئی۔ وہ بے
جان قدم چھپے لیتی اپنا بیگ اور فون ٹیبل سے اٹھا کر بھاگنے کے
انداز میں یہاں سے نکلی تھی کیونکہ یہاں مزید کھڑے رہنے کا کوئی
جواز نہیں تھا۔

دمیر خان اپنے صاف لفظوں میں زربخت کے ساتھ تعلق ظاہر کر چکا تھا۔ پھر وہ بھلا کیسے اس حقیقت کو جھٹلاتی؟ کیسے واویلا مچاتی؟ جب دل کا قاتل ہی اپنا نکلا تھا تو پھر وضاحتیں کیسی؟ جہاں پہ دل کا قتل ہو وہاں ٹھہرتے نہیں ہیں ورنہ جان سے پیارے دل کے قاتل سے نفرت ہونے لگ جاتی ہے۔ باہر نکلنے تک اس کا ضبط ٹوٹا تھا اور آنسو بھوری آنکھوں سے نکل کر عارضوں پہ پھسلنے لگے تھے۔ وہ انرش بزدار جو ہوش سنبھالنے کے بعد آج تک کبھی روئی نہیں تھی، جس کی آنکھیں آنسوؤں کے نمکین پانی سے نا آشنا تھی۔ آج محبت نے ایسا وار کیا تھا کہ کبھی نہ نم ہونی والی آنکھیں آج آنسوؤں سے تر تھیں۔ وہ ہزیانی انداز میں روتی آج خود کو دمیر خان کے گھر آکر اپنی محبت کو قتل کروا کے جارہی تھی۔

وہ اذیت سے روتی اپنی گاڑی میں بیٹھتی ماؤف ہوتے دماغ کے
ساتھ یہاں سے نکل گئی۔ ابھی تو غم تازہ تھا۔ انزس بزدار کا
وجود اتنی اذیت سے آشنا نہیں ہوا تھا۔ محبت کے غم تو بعد میں
اپنا اثر دیکھاتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کو
زندہ لاش بنا دیتے ہیں۔۔۔ انزس بزدار بھی تازہ محبت کے قتل
ہونے کے غم سے دوچار تھی۔ وقت کے ساتھ یہ غم روگ
بننے والا تھا اور روگ تو زندگی بھر ساتھ چلتے ہیں لیکن ان روگوں
پہ کوئی مرہم رکھنے والا مل جائے تو پھر شاید یہ وقت کے ساتھ
مندمل ہو جائیں ورنہ تو یہ محبت کے روگ قبر تک ساتھ نبھاتے
ہیں۔ انزس بزدار کے جاتے ہی انیسہ خان پہ صدمے کا طاری
سکتہ ٹوٹا تھا۔

یہ لڑکی تمہاری بیوی نہیں ہو سکتی! میں کبھی بھی اس کا وجود
تمہارے ساتھ برداشت نہیں کروں گی۔ کس کی اجازت سے تم
نے اسکو اپنے نکاح میں لیا ہے؟ اس کو نکالو گھر سے ابھی اور
اسی وقت!!۔۔۔ انیسہ خان بیٹے کے سینے سے لپٹی زربخت کو
کھینچ کر اس سے الگ کرتے ہوئے دور جھٹکتی ہذیانی انداز میں
چلائی تھیں، غصے سے ان کی آنکھیں لہو چھلکنے لگی تھیں۔ ان کی
نس نس میں زربخت کیلئے نفرت کے لہر دوڑی تھی۔
اہہ!! یوں زور سے جھٹکے جانے پر زربخت کی چھوٹی سی کراہ
بے ساختہ تھی۔ وہ پہلے ہی غم سے ندھال تھی اور اوپر سے
انیسہ خان کی ستم ظریفی اس کیلئے تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔
انیسہ!! ہوش کرو! اپنا رویہ درست کرو، یہ نکاح میں نے اپنی
مرضی سے کروایا ہے۔ میں اپنے بیٹے کی زندگی کا فیصلہ لینے کا

اختیار رکھتا ہوں۔ مجھے کسی کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ اسد اللہ خان اپنی بیگم کا رویہ دیکھ کے غصے سے گرجے تھے۔ انہیں اپنی بیگم کو کایوں زربخت کو بے رحمی سے جھٹکنا بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔۔۔ دمیر خان جو انزش بزدار کے ری ایکشن پہ حیران پریشان کھڑا معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کیوں اسے اس طرح سے بول کے گئی ہے؟ اپنی ماں کو زربخت پہ حملہ آور ہوتا دیکھ کے تڑپ کے اس کی طرف بڑھتا پھر سے زربخت کو اپنے حصار میں لے گیا۔

کیا ہو گیا ہے مورے آپ کو؟ ایسے کیسے گھر سے نکال دوں!! یہ بیوی ہے میری!! آپ نے آج تو یہ بات کر دی ہے، آئندہ مت کیجئے گا۔ یہ مالک ہے اس گھر کی اور مالک گھر چھوڑ کے نہیں

جاتے۔۔۔ دمیر خان ٹھوس لہجے میں گویا تھا۔ آنکھوں میں اپنی
متاعِ من کیلئے فکر مندی تھی۔۔۔ اندازِ پختہ اور حتمی تھا۔
دمیر!! میں تمہیں آخری بار کہہ رہی ہو۔۔۔ اس معمولی اور
منخوس لڑکی کو نکالو یہاں سے، یہ کبھی تمہاری بیوی نہیں ہو
سکتی، یہ تمہاری بیوی ہونے کے لائق ہی نہیں ہے۔ میں نہیں
مانتی اس نکاح کو۔۔۔ تم اس کو ابھی اور اسی وقت طلاق دو!۔
انیسہ خان غصے سے سرخ ہوتے چہرے کے چلائی تھی۔۔۔
زربخت کو دمیر کے پہلو میں دیکھ کے ان کے جسم میں نفرت
کے وبال اٹھ رہے تھے اور اس پہ تضادِ انزس کا یوں شکستہ
ہو کے یہاں سے جانا انہیں مزید غصے دلا رہا تھا۔۔۔
مورے!! پلیز! ایسے الفاظ استعمال مت کریں جن کے وار
آپ کے بیٹے کے سینے کو چھلنی کر دیں۔ یہ معمولی ہرگز نہیں

ہے۔ یہ منحوس بھی نہیں ہے یہ بخت ہے میرا۔۔۔ یہ میرے
نہیں بلکہ میں اس کے قابل نہیں ہوں۔۔۔ جو تعلق میں نے اس
کے ساتھ قائم کیا ہے، وہ دو جہانوں تک میرے ساتھ جائے گا
۔۔۔ مجھے اس کے ساتھ جنت تک جانا ہے۔ خود کو اس سے دور
کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب یہ میری روح بن چکی ہے
، اب اس کو مجھ سے الگ کرنے کیلئے آپ کو میرے جسم سے
روح نکالنی پڑے گی!! میرے جسم سے روح نکال سکتی ہیں تو
نکال لیں۔۔۔ دمیر خان انتہائی ضبط کرتے ہوئے ایک ایک لفظ
پہ زور دے کر بولا تھا۔ آواز نیچی رکھی تھی کیونکہ سامنے اس کی
ماں، اسکی جنت تھی۔ نہ وہ اپنی ماں سے اونچی آواز میں بات کر
سکتا تھا اور نہ ہی بد تمیزی کر سکتا تھا۔ بس پیار سے سمجھا سکتا تھا

میں ہرگز اس کو تمہاری بیوی نہیں مانوں گی!! میرے جیتے جی یہ
تم سے منسوب نہیں رہے گی۔۔ اس کو تو میں نکال باہر پھینکو
گی۔۔۔ انیسہ خان طیش میں آتی زربخت کو بازو سے پکڑ کر اپنی
طرف کھینچتی غیض و غضب سے دھاڑی تھیں۔ اس کی آنکھوں
سے آنسو رواں ہوئے تھے۔ اس نے فوراً دمیر کی شرٹ کو
مٹھیوں میں جکڑ کر اس کے محفوظ حصار میں رہنے کی تمنا کی
تھی۔۔۔

دمیر خان اس کو مضبوطی سے خود میں بھینچے بے یقینی سے اپنی
ماں کا رویہ دیکھ رہا تھا جو ٹیپیکل عورتوں کی طرح ری ایکٹ کر
رہی تھی۔ اس کو یہ تو پتہ تھا کہ اس کی ماں اس نکاح پہ واویلا
مچائے گی لیکن یہ نہیں پتہ تھا کہ اتنا سخت اور نفرت انگیز ردِ عمل

دے کر زربخت کو نوچیں گی اور جھٹکیں گی؟ اپنی ماں کا رویہ دمیر
خان کیلئے ناقابل یقین اور حیران کن تھا۔

اہہ!! انیسہ خانہ مسلسل زربخت کو ایک بازو سے پکڑ کر اپنی
طرف زور سے کھینچتی اسے تکلیف دینے کا باعث بن رہی
تھیں۔ اپنے بازو پہ انیسہ خان کی سخت گرفت محسوس کر کے
زربخت درد سے کراہی تھی۔ دمیر خان اس کی درد بھری کراہ
سنتا فوراً اپنی ماں کے ہاتھ سے اس کا بازو سے چھڑوا کے اسے
اپنے سینے سے نکال کے چھپے کر گیا تھا۔۔۔ ڈری سہمی زربخت
نے دمیر خان کی پشت پہ ہاتھ جماتے ہوئے اس میں چھپنا چاہا
تھا۔

لالا!! کیا ہوا ہے؟۔۔۔ سیرٹھیاں اترتی مہروالنسا اس کا اور
انیسہ خان کا غصے سے سرخ ہوتا چہرہ دیکھ کے الجھن کا شکار ہوئی

تھی۔ وہ جو نیچے کافی بنانے کیلئے آئی تھی، ان کی اونچی آوازیں
سن کے پریشانی سے دمیر خان کو مخاطب کر گئی۔

مہرو! زربخت کو میرے کمرے میں لے جاؤ۔۔۔ دمیر خان اس
کو دیکھتے ہی حکمیہ لہجے میں گویا تھا۔

نہیں جائے گی یہ تمہارے کمرے میں!!۔۔۔ انیسہ خان پھر سے
شدید غصے کی حالت میں دھاڑی تھی۔

انیسہ!! بس بہت ہو گیا! تم چلو میرے ساتھ کمرے میں،
زربخت اب سے دمیر کی بیوی ہے اور اس کی گھر کی بڑی بہو
ہے۔ تم جتنی جلدی اس بات کو تسلیم کر لو، تمہارے لئے بہتر
ہوگا۔۔۔ وہ جو کب سے ضبط کئے انیسہ خان کا رویہ برداشت
کر رہے تھے، اب اس کو حد سے بڑھتا دیکھ کر انہیں بازو سے
پکڑ کر کمرے کی جانب لے کے بڑھے تھے۔

چھوڑیں مجھے! میں اس لڑکی کو اپنی بڑی بہو کے عہدے پہ ہرگز
فائز نہیں ہونے دوں گی۔۔۔ وہ خود کو ان کی گرفت سے
چھڑوانے کی کوشش کرتی مسلسل زربخت کو قہر برساتی نظروں
سے ہی فنا کر دینے کا ارادہ رکھتی تھیں۔۔ اسد اللہ خان ان کی
ساری مزاحمتیں ردی کرتے اس کو زبردستی کمرے میں لے
جاتے ہی اندر سے دروازہ لاک کر دیا تھا۔ انیسہ خان کے چپخنے
چلانے کی آوازیں باہر صاف سنائی دے رہی تھی۔۔

مہر خان اپنے دماغ میں کئی اڈتے سوالوں کو دباتی، چہرے اور
آنکھوں میں الجھن لئے دمیر خان سے بنا اس سارے معاملے کی
وضاحت جانے، زربخت کو اپنے ساتھ لگائے اوپر دمیر خان
کے کمرے کی طرف لے کے بڑھ گئی۔ وہ سارا معاملہ بعد میں
داعیر سے جاننے کا ارادہ رکھتی تھی۔ زربخت کی حالت دیکھ کر

وہ سمجھ چکی تھی کہ یہ رشتہ کسی ایمر جنسی میں قائم ہوا ہے جبکہ
دمیر خان اپنے بالوں میں ہاتھ پھیر کر ایک ٹھنڈی سانس اندر کی
طرف کھینچتا نزہت خان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

مہر خان اس کو دمیر خان کے کمرے میں بیٹھانے کے بعد اس
کیلئے کھانا لیکر آئی تھی لیکن زربخت بعد میں کھانے کا بہانہ کرتی
شکستہ قدموں کے ساتھ واشروم کی طرف بڑھ گئی۔ وہ بنا آواز
کے رو رو کے تھک چکی تھی۔ وہ کھل کے رونا چاہتی تھی۔
اسلئے اٹھ کے واشروم میں بند ہو گئی تاکہ اس کی ہچکیوں کی آواز
کوئی سن نہ سکے۔ زربخت کو واشروم میں بند ہوتا دیکھ کر مہر خان
نیچے داعیر خان کا پتہ کرنے چلی گئی۔

وہ اس ساری صورتحال سے پریشان ہو رہی تھی، وہ داعیر خان سے جلد از جلد اس معاملے کی تفصیل لینا چاہتی تھی کہ آخر ہوا کیا تھا جو یوں اچانک دمیر خان کا نکاح زربخت سے ہو گیا تھا؟ زربخت کی حالت رو رو کے اتنی کیوں خراب ہو رہی تھی؟ مہر خان سارے سوالات ذہن میں لئے نیچے کی طرف سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔

رات کے نو بج رہے تھے۔ جب دمیر خان اپنے کمرے میں کھانے کی ٹرے لئے داخل ہوا تھا۔ اور سامنے نیچے کارپٹ پہ زربخت کو بیٹھا دیکھ کے چونکا۔ وہ مسلسل گھٹنوں میں سر دئے بیڈ کے ساتھ ٹیک لگائے نیچے کارپٹ پہ بیٹھی ابھی تک رو رہی تھی۔ مہر خان جو کھانا دے گئی تھی، وہ زربخت کے سامنے پڑا

ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ دمیر خان اس کی حالت دیکھتا پیر کی ٹھوکر سے
دروازے بند کر کے بے قراری سے اس کی طرف بڑھا تھا۔
بخت!!۔۔۔ دمیر خان نے کھانے کی ٹرے سائیڈ پہ رکھتے اسے
فکر مندی سے مخاطب کیا۔ اس کا رونا ہر بار اس کے دل پہ
بھاری گزرتا تھا۔ زربخت نے آنسو سے بھیگی پلکیں اٹھا کے
اوپر اس کی طرف دیکھا جس کے چہرے پہ اس کیلئے فکر اور
تکلیف واضح تھی۔ وہ اس کی نیلی آنکھوں سے نکلتے تازہ آنسو
دیکھ کے ضبط سے لب بھینچتا نیچے جھک کر اپنی ایک ہتھیلی
کا ریٹ پہ جماتا اس کے پاس بیٹھ گیا۔

متاعِ من! ادھر میری طرف دیکھو! رونا بند کرو۔ ایسے کون
مسلسل رو کے اپنی آنکھوں کا نقصان کرتا ہے؟۔۔۔ دمیر خان

نرمی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے خود کے ساتھ لگاتا
زر بخت کے سر پہ لب رکھ گیا تھا۔

تمہارے آنسو نہ صرف تمہاری آنکھوں کو تکلیف دیتے ہیں بلکہ
میرے دل کو بھی اذیت سے دوچار کر کے تکلیف کا باعث بنتے
ہیں۔۔۔ وہ اپنے انگوٹھے کے پورے سے باری باری اس کے
دونوں عارضوں پہ ٹکے آنسو صاف کرتا تا فیف سے بولا تھا۔
کیا میری مورے ٹھیک ہو جائیں گی؟۔۔۔ زر بخت نے آنکھوں
میں جلتے دئیے کی مانند چمک لے کے اس سے سوال کیا تھا۔
چہرے پہ ہر طرف مایوسی کے بادل چھائے تھے لیکن آنکھوں میں
امید کے دئیے جل رہے تھے۔ تب تک جل رہے جب تک
ایک طوفانی جھونکا ان سے دور تھا۔ جیسے ہی جھونکا آئے گا،
دئیے کی روشنی گل کر جائے۔۔۔

انشاء اللہ! بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ کل رات کو ہی ان کی
سرجری ہے۔۔ میں نے سب کچھ اریج کر لیا ہے۔ ہمیں صبح
ہی لاہور کیلئے نکلنا ہو گا تاکہ اب کسی کام میں کوئی تاخیر نہ ہو۔ پہلے
ہی پھوپھو کی بیماری بہت بڑھ چکی ہے اگر وقت پہ مجھے پتہ چل
جاتا تو اب تک پھوپھو صحت یاب بھی ہو چکی ہوتی لیکن دیر
اب بھی نہیں ہوئی، اس سرجری کے بعد ان کا جگر ٹرانسپلانٹ
ہو جائے گا اور وہ بالکل صحت مند نارمل زندگی گزاریں گی۔۔۔
دمیر خان تھوڑا سا اس کی طرف کھسکتا اسے پیار سے مطمئن
کرنے لگا۔

لیکن ڈاکٹر تو بول رہا تھا کہ صرف سو میں سے بیس فیصد چانسز ہیں
ٹھیک ہونے کے، ٹیومر ان کے پورے جگر میں پھیل گیا ہے۔
میں مورے کو نہیں کھو سکتی، اگر ان کو کچھ ہوا تو میں مر جاؤں

گی، میرا وجود ان کے بغیر مردہ ہے۔۔۔ وہ پھر سے رونا شروع کرتی نظریں جھکائے انجانے خوف کے زیر اثر لرزتی آوازیں بولی تھی۔

شش!! اب تمہاری آنکھوں سے ایک آنسو نہ نکلے ورنہ میں تمہیں ڈانٹوں گا اور دوسری بات ڈاکٹر کے پاس زندگی اور موت کا فیصلہ نہیں ہے۔ زندگی تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور مجھے اپنے اللہ پہ پورا بھروسہ ہے! وہ پھوپھو کو ایک نئی صحت والی زندگی بخشیں گی انشاء اللہ، آمین! چلو اب آنسو صاف کرو اور کھانا کھاؤ! تمہیں اپنی زندگی میں رونے کیلئے شامل نہیں کیا۔ تمہارے چہرے پہ خوشیاں اور سکون کی کھلکھلاہٹیں بکھیرنے کیلئے تمہیں اپنی دسترس میں لیا ہے۔۔۔ وہ اس کا چہرہ اپنے

دونوں ہاتھوں میں بھر کے یقین دہانی کرواتا اس کے آنسو پھر
سے صاف کر کے کھانا کھانے کی ہدایت کرنے لگا۔

بخت!!۔۔۔ اسے خاموشی سے نظریں چراتے دیکھ کر دمیر
خان مسلسل اس کے نورانی چہرے پہ نگاہیں جمائے مخمور لہجے
میں بولا تھا۔۔۔

ہمم! زر بخت نے بنا نظریں اوپر اٹھائیں ہنکارا بھرا تھا۔ کہیں نہ
کہیں دکھ میں بھی اسے اس کی اتنی نزدیکی ہچکچاہٹ میں مبتلا کر
رہی تھی۔ اس کی جسم سے اٹھتی تیز کلون کی خوشبو زر بخت کے
نتھنوں کو بھلی محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ دمیر خان کے اتنے
قریب ہونے پہ ہچکچاہٹ کا شکار بھی تھی۔

ایک گزارش ہے! پلیز رویا نہیں کرو! تمہارا رونا مجھے تکلیف میں
مبتلا کر دیتا ہے، تمہارے گرم آنسوؤں کا لاوا میرے دل پہ

تیزاب کی صورت میں پڑتا ہے اور پھر تمہارے آنسوؤں کے
لاوے سے میرا دل سارا زخموں سے چور ہو کے چھلنی ہو جاتا
ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، پھوپھو کی ساری تکلیفیں دور کر
دوں گا! سب کچھ ٹھیک کر دوں گا۔ تم مجھ پہ بھروسہ رکھو، خود
کو اور مجھے اذیت سے مت گزارو میری بخت!! مجھے پہ
بھروسہ ہے نہ تمہیں؟۔۔۔ وہ اس کے ماتھے پہ لب رکھتا اس
کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے التجائیہ انداز میں گویا تھا۔
دمیر! مجھے آپ پہ پورا بھروسہ ہے آپ سب کچھ ٹھیک کر دیں
گے۔ آپ سب کچھ ٹھیک کر سکتے ہیں۔۔۔ زربخت اپنی بھیگی
پلکیں اٹھا کے اپنی خم پیاری آواز میں بولتی دمیر کے دل کی تار
ہلا گئی تھی۔ وہ ان گلابی کٹاؤ دار لبوں سے اپنے نام کی ہوتی
جنش سننا وہی ساکت ہوا تھا۔ نظروں کا مرکز گلابی ہونٹ بنے

تھے۔ جن سے زندگی میں پہلی بار دمیر خان کا نام ادا ہوا تھا اور
اسے اپنا نام زندگی میں پہلی بار اتنا پیارا لگا تھا۔

دمیر کا روشن بخت!! میں تمہارا یہ بھروسہ کبھی نہیں ٹوٹنے دوں
گا۔۔۔ وہ آنکھوں میں چمک لئے محبت سے لبریز لہجے میں بولتا،
ایک دم سے زر بخت کے چہرے پہ جھک کر اس کے گلابی لبوں
کو اپنے عنابی لبوں کی گرفت میں لیتا بے صبری سے سک کرنے
لگا تھا۔ اس کی اچانک حرکت پر زر بخت کی گہری نیلی آنکھیں
ساکت ہوئی تھی۔ وہ اس کے لمس پہ ہڑبڑاتی ہوتی اس کی شرٹ
کو کالر سے جکڑ گئی۔ فطری شرم و حیاء سے چہرہ سرخ گلاب ہوا
تھا۔ پورے جسم میں ایک سنسنی دوڑی تھی۔

دمیر خان ایک ہاتھ اس کے گال پہ جماتا جبکہ دوسرا ہاتھ اس کی
پچھلی گردن پہ رکھتے اس کے لبوں کو اپنے ہونٹوں میں مزید

پیوست کر گیا تھا۔ وہ بے قراری سے از کے نچلے ہونٹ کو اپنے دانتوں تلے کچل کے سک کرتا جنونی ہو رہا تھا۔ وہ اس کے دانتوں کی سختی اپنے لبوں پہ محسوس کرتی، اس کے سینے پہ ہاتھ جما کے چھپھٹنے کی سعی کرنے لگی تھی لیکن دمیر خان بے باکی سے اس کی زبان کے ساتھ اپنی زبان الجھاتا اس کی ساری نمی اپنے حلق میں اترنے لگا تھا۔

اس کی اتنی بے باک حرکت پہ زربخت کے شرم کے مارے کانوں کی لوتک سرخ ہوئی تھی۔ وہ اپنا غم اور رونا بھول چکی تھی۔۔۔ دمیر خان شدت سے اس کے لبوں کو چومتا، ایک جست میں زربخت کی کمر میں ہاتھ ڈالے اٹھا کے اپنی گود میں بیٹھا گیا تھا۔ وہ مسلسل اس کے لبوں سے لپٹا اس کی سانسیں روکنے کا باعث بن رہا تھا۔ دمیر خان اس کا منہ وا کئے اپنے

لبوں میں دبا کے اس کی زبان باہر کی جانب کھینچتے ہوئے سک
کرنے لگا تھا۔ زربخت اس کے بڑھتے لمس کی شدت پہ بے
حال ہوئی تھی۔۔ سانسیں رکنے کی وجہ سے آنکھوں میں نمی آئی
تھی۔

چہرہ دم گھٹنے اور شرم سے سرخ انار ہو رہا تھا۔ دمیر خان کی شہد
رنگ آنکھوں میں خمار کی سرخی چھلکی تھی۔۔ پورا وجود طلب
میں تڑپنے لگا تھا۔ وہ گھونٹ گھونٹ بھر اس کے لبوں کی نمی
سک کرتا اپنی سالوں کے تشنہ لبوں کو محبوب کے لبوں کے جام
سے سیراب کرنے لگا تھا۔ وہ بے خود ہوتا اپنا ایک ہاتھ اس کی
شرٹ میں سرکاتا براہ راست اس کے پھول سے بھی نازک
سراپے کو اپنی ہاتھ کی مٹھی میں بھرنے لگا تھا، زربخت اس کا
سخت ہاتھ اپنے سینے کی نازکی پہ محسوس کرتی اس کی گود میں

اچھلی تھی، وہ اس کے سینے پہ دونوں ہاتھ جمائے اپنے لب
چھڑوانے کی کوشش کرتی دمیر خان کے ہاتھ کی گستاخی پہ مچل
اٹھی تھی۔

سانسیں رکنے کی وجہ سے زربخت کی سانسوں کا شور مدہم ہوا
تھا اور اس نے بے جان ہوتے ہوئے ساری مزاحمت ترک کی
تھی۔ دمیر خان اس کی سانسوں کی رفتار مدہم ہوتی دیکھ کر فوراً
اس کا نچلہ لب زور سے چومتا رہائی بخش گیا تھا۔ لبوں کو رہائی
ملتے ہی وہ ایک لمبی سانس اندر کی طرف کھینچتی اپنی منتشر
سانسیں ہموار کرنے لگی تھی۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں دمیر
خان کے سینے پہ سرٹکا گئی۔ دمیر خان کا ہاتھ ابھی تک اس کی
شرٹ کے اندر اسکے سینے کی ناز کی کو اپنے ہاتھ میں بھرے ہوئے
تھا۔ وہ شرم سے لال بھبھوکا ہوتی اس کے سینے میں چہرہ

چھپائے اپنے سراپے کی ناز کی کو اس کے ہاتھ کی گرفت سے آزاد
کروانے لگی۔ دمیر خان جھک کر اس کے کندھے پہ ہلکی سی
بائٹ کرتا مزید اپنے ہاتھ کی سختی اس کے سراپے پہ دیکھانے لگا
تھا۔

اہہ! دمیر! مجھے بہت درد ہو رہی ہے۔۔۔ زربخت نے فوراً
سکتے ہوئے معصومیت سے بچوں کی طرح دہائی دی تھی۔۔
وہ اس کی زرا سی بھی سختی برداشت نہیں کر پارہی تو پھر جب
دمیر خان نے اسے مکمل طور پر اپنا ناتھاتب تو زربخت کی روح
اس کی جان لیوا قربت پہ فنا ہو جانی تھی۔۔

یہ درد میٹھا درد ہے!! عادت ڈال لو اس کی، کیونکہ اس درد میں جو
لذت ہے۔۔ وہ دنیا کی کسی چیز میں نہیں ہے اور یہ میٹھا درد
تمہیں دنیا کی تمام اذیتوں سے دور لے جائے گا۔۔ وہ بھاری

گھمبیر آوازیں بولتا اس کے سر پہ لب رکھتے ہوئے اس کا چہرہ
اپنے سینے سے نکال کے ایک دفعہ پھر سے پیاسوں کی طرح اس
کے چاشنی سے بھرے لبوں پہ جھکتا انہیں اپنی زبان کی گرفت
میں لے گیا تھا۔ پھر سے اپنے لبوں کو سخت گرفت میں دیکھ کے
زربخت جھپٹائی تھی۔ ابھی تو اس نے سانسیں بحال ہی نہیں
کی تھی کہ وہ پھر سے اس کی سانسیں روکنے کے درپے ہوا
تھا۔ زربخت معصومیت سے دل میں خود سے مخاطب ہوئی
تھی۔۔۔

دمیر خان حدت جذبات میں آکر تیزی سے اپنی زبان اور لبوں کو
اس کے منہ میں موو کرتے ہوئے اس زبان کو اپنے دانتوں میں
کچلنے لگا تھا۔ ساتھ ساتھ اب اس کے دونوں ہاتھ زربخت کے
سینے کی نازکی پہ گردش کر رہے تھے۔ اس کی بے باک جسارتوں

پہ زربخت کو شرم اور چپانے آن گھیرا تھا۔ وہ کبھی اس کے
لمس پہ نڈھال ہو جاتی تو کبھی اس کے شدت سے چھونے پر
مچل اٹھتی تھی۔۔ کافی دیر بعد وہ اس کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر

بے دلی سے اس کے لبوں کو چومتے ہوئے انہیں آزادی
دے گیا تھا۔۔ دونوں اپنی پھولی سانسوں کے ساتھ آج پہلی بار
ایک دوسرے کے لمس سے آشنا ہوئے تھے۔ اپنے محرم کا پہلا
جنوں سے بھرا لمس زربخت کو سارے غم بھلایا گیا تھا۔۔ وہ
چند لمحوں میں سب کچھ پس منظر ڈال کے اپنے محرم کی بانہوں
میں شرم و حیا سے سمٹ رہی تھی۔

تمہارے لب بہت میٹھے ہیں بخت! دل کرتا ہے، ان کی مٹھاس
خود میں اتارتا رہوں۔۔۔ وہ پھولتی سانسوں کے درمیان بولتا
اس کو مزید اپنے سینے میں بھینچے اپنے تشنہ وجود اور لبوں کیلئے

راحت کا سامان مہیا کرنے لگا تھا۔ اس کا انداز بہکا ہوا تھا۔
لہجہ گھمبیر بھاری ہو رہا تھا اور جسم جذبات کیفیت میں مبتلا آگ
کی طرح گرم ہو کے ہیٹ چھوڑنے لگا تھا۔ اس کے جسم کی
گرمی زربخت کے وجود کو جھلسا رہی تھی۔ وہ اس کی رانوں
سے ہٹنے کی کوشش کرتی جھنجھلاتے ہوئے اس کے وجود کی
گرمابٹ اور دمیر خان کی ہاتھوں کی بے رحم گستاخیوں پہ
زربخت مچل اٹھی تھی۔۔ کافی دیر تک زربخت کے نازک
لبوں اور وجود پہ اپنے ہاتھوں اور پیاسے لبوں کی من مانیوں
کرنے کے بعد وہ اپنے جذبات کو لگام ڈالتا اپنا دھیان زربخت
کے کھانے کی طرف مرکوز کر گیا تھا۔

اس نے زبردستی اس کو دو چار نوالے کھانے کے کھلائے تھے۔
کھانا کے بعد دمیر اس کو ایسے ہی اپنی گود میں لے کے اٹھتا صوفہ

پہ آ کے لیٹا تھا۔ وہ زربخت کو اپنے سینے پہ منتقل کرتا نرمی سے
اس کی کنپٹی پہ لب رکھ کے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتا اسے
سلا نے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ آج پہلی بار زربخت کو کوئی اتنی
محبت سے سلا رہا تھا۔ وہ تکلیف اور غم سے تھکی ہوئی تھی۔
اس نے دمیر خان کے لمس اور سلا نے کے انداز پہ کوئی
مزاحمت نہیں کی تھی۔ وہ چند منٹوں میں ہی اس کی انگلیوں کے
میٹھے لمس پہ نیند کی آغوش میں چلی گئی تھی۔۔۔
وہ پچھلی رات سے بے سکونی اور اضطرابی کیفیت میں مبتلا
تھی۔ دمیر خان کے یوں محبت سے سلا نے پر وہ تمام غم اور
خدشات بلائے طاق رکھے نیند کی وادیوں میں کھو گئی تھی۔ اس
کو سوتا دیکھتے ہی وہ اپنا چہرہ تھوڑا سا زربخت کے چہرے پہ
جھکائے اس کے نازک گالوں پہ چھوٹی چھوٹی کسز کرنے لگا تھا۔

اپنی محبت کو اپنی بانہوں میں سوتا دیکھ کے دمیر خان کی خوشی
سے نیند اڑ چکی تھی۔ اس کے پورے وجود کو سکون نے اپنی
لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اب پوری رات زربخت کا چہرہ ہونا تھا
اور دمیر خان کے تشنہ لب اس کے چہرے پہ رینگتے ہوئے اپنی
پیاس بجھائیں گے۔ محبت کی تکمیل کا احساس ہی اتنا
خوبصورت تھا۔

دمیر خان کو ہر لمحہ زربخت سے محبت ہو رہی تھی اور بے پناہ
ہو رہی تھی، بے انتہا ہو رہی تھی، بے تحاشہ ہو رہی تھی اور
بے حد ہو رہی تھی۔

صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ سورج کی روشنی کھڑکی سے ہوتی
زربخت کے حسین چہرے پہ پڑی رہی تھی۔ سورج کی کرنوں کی

وجہ سے اس کا نوارنی چہرہ مزید چمک رہا تھا۔ سنہری کرنیں اس کے چہرے کو مزید سنہرا کر رہی تھی۔ چہرے پہ روشنی پڑنے سے زربخت نیند میں کسمساتی اپنا چہرہ دمیر خان کے سینے میں گھسیڑے روشنی کی تیز کرنوں سے اپنی آنکھوں کو بچانے لگی تھی

-

اس کے یوں کسمسانے پر دمیر خان چہرے پہ مبہم سی مسکراہٹ لئیے اس کا اپنے سینے میں چھپنا اور نیند میں کسمسا کے بچوں کی طرح منہ کے زاویے بنانے بخوبی نوٹ کر رہا تھا۔ دمیر خان پوری رات ایک منٹ کیلئے بھی نہیں سویا تھا۔ وہ پوری رات اس کا دیدار کرتے ہوئے اپنے لبوں سے اس کے مومی گال چھوتا رہا تھا۔ سترہ سال بعد اس کی محبت نے حلال ہو کے اس کی پرحدت آغوش میں پناہ لی تھی، دمیر خان کی محبت کی

توہین ہوتی اگر وہ اپنی متاعِ من کے مکھڑے سے ایک لمحہ کیلئے
بھی غفلت برتتا، پوری رات ایک خوبصورت احساس نے اس
کے وجود کو جکڑے رکھا تھا۔

زر بخت کا پھول سے نازک وجود اور اس کی سراپے کی نازکی
اپنے سینے پہ محسوس کرتے ہوئے بار بار دمیر خان کا دل بے
ایمان ہو کے اسکے جسم کو نازکی کو چھونے کی ضد کر رہا تھا لیکن
وہ اپنے جذبات کو قابو کرتا زر بخت کے آرام کو اپنے دل کی
خواہش پہ ترجیح دے گیا تھا۔

متاعِ من !!! دمیر خان بوجھل آوازیں زر بخت کے بالوں کی
خوشبو اپنے نتھنوں سے محسوس کرتا سرگوشی نما آوازیں اس
کے کان کے قریب میٹھے لہجے میں بولا تھا۔۔ کیونکہ اب وہ
زر بخت کو مزید سونے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا، انھوں

نے آج دوپہر میں ہی لاہور کیلئے نکلنا تھا اس لئے زربخت کو اٹھانا ضروری تھا۔۔۔ زربخت اس کی پکار پہ ذرا سا کسمپاتی پھر سے اس کے سینے پہ سر ادھر ادھر موو کرنے لگی تھی، ابھی وہ اور سونا چاہتی تھی۔ اس لئے تو آنکھیں نہیں کھول رہی تھی۔۔۔ متاعِ من!! اس کی طرف سے جواب نہ پا کر دمیر خان بے خود ہوتا تھوڑا سا اوپر اٹھ کر اپنا چہرہ اس کے چہرے پہ جھکائے زربخت کے نازک لبوں کو اپنے عنابی لبوں کی حراست میں لئے تیزی سے انہیں سک کرنے لگا تھا۔

اپنے لبوں کو کسی کی گرفت میں محسوس کرتے ہوئے زربخت نے فوراً بوکھلاتے ہوئے آنکھیں پٹ سے کھولی تھی، آنکھیں کھولتے ہی دمیر خان کو دیوانہ کی طرح آنکھیں موندے اپنے لبوں اور زبان کے ساتھ کھلواڑ کرتے دیکھ کر اس کی ساری نیند بھک

سے اڑی تھی۔ چہرہ شرم سے پانی پانی ہوا تھا، رات کا سارا
منظر آنکھوں کے سامنے لہرایا تھا۔ رات کو وہ خود بھی غم کی
شدت میں تھی، اس لئے دمیر خان کے لمس پہ اتنی ہچکچائی نہیں
تھی لیکن اب وہ حالت غم سے باہر تھی اور رات کا سارا منظر
سوچتے ہوئے وہ شرم سے دوہری ہوتی دمیر خان کے لبوں سے
اپنے لب چھڑوانے کی سعی کرتی حیا سے خود میں سمٹ رہی
تھی۔۔۔

وہ اس کی مزاحمت دیکھتا نرمی سے اسکے بالوں میں انگلیاں
الجھائے اس کا سر نیچے کرتا، زربخت کا چہرہ مکمل طور پر خود پہ
جھکائے بنا سانس لئے اس کے رسیلے لبوں کی چاشنی سے اپنی
تشنگی مٹانے لگا تھا۔ خمار اور نیند سے دمیر خان کی آنکھیں لہو

لال ہو رہی تھی۔۔۔ جوان جذبات کی دوش پہ اس کا گیلد لمس
لبوں سے بہتا زربخت کے حلق تک سفر کر رہا تھا۔۔۔
زربخت اس کی زبان اور لبوں کا گیلد لمس اپنے حلق میں اترتا
محسوس کرتی شرم آگیاں ہوئی تھی۔۔۔ وہ جھنجھلاتے ہوئے اس
کے لبوں سے اپنے لب آزاد کروانے کی ناکام کوشش کرتی دمیر
خان کے سینے پہ غیر ارادی طور پر اپنے نازک ہاتھ کا مکا جھڑ گئی
تھی۔ دونوں کی سانسیں پھول چکی تھی لیکن دمیر خان چھپہٹنے
کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس نے پوری رات جو اپنے جذبات پہ
بند باندھے رکھا تھا، وہ ٹوٹ گیا تھا۔ دمیر خان کے طوفانی جذبات
کی شدت سے زربخت کا نازک سا وجود پھڑپھڑا رہا تھا۔
وہ سانس حلق میں اٹکنے پر تھوڑی دیر کیلئے زربخت کے لبوں کو
آزادی بخشتا، احتیاط سے اس کو خود کے ساتھ لپیٹ کے کروٹ

بدلتا خود اس کے اوپر آیا تھا۔ خود پہ دمیر خان کا دیو ہیکل وجود
سایہ فگن ہوتا دیکھ کے زربخت کی جان اب صحیح معنوں میں ہوا
ہوئی تھی۔ دمیر خان اپنے نچلے وجود کا دباؤ بے باکی سے اسکی
تھائیز پہ ڈالتا، ایک ہاتھ صوفے کی پشت پہ جمائے اس پہ اپنا سارا
وزن ڈالنے سے گریز کر رہا تھا۔ زربخت بخوبی اس کے جسم
کی پیش اپنی تھائیز کے درمیان محسوس کرتی ڈر سے آنکھیں میچ
گئی تھی۔

دمیر خان کی خمار سے بھری آنکھیں دیکھ کر زربخت کے گلے میں
گلی بھر کے معدوم ہوئی تھی۔ دمیر خان بار بار زربخت کو خود
کے اتنے قریب دیکھ کے بہک رہا تھا۔ ایک تو اس کی محبت
تھی دوسرا اس پہ حلال تھی، پھر وہ کیونکر اپنے جذبات کو لگام

ڈالتا؟ کیوں نہ اپنے جوان جذبات کی تسکین کر کے خود کو سکون
نہ پہنچاتا؟

مرد بہت شدت پسند ذات ہے۔ اگر اس کی بانہوں میں اس کی
پسندیدہ عورت آئے تو وہ ایک لمحہ بھی اس پہ اپنا لمس نہ چھاور
کئے بنا نہیں رہ سکتا۔ یہ مرد کی پسندیدہ عورت کے وجود اور
حسن کی بھی توہین ہوتی ہے کہ وہ اپنے وجود اور روح

کے چاہنے والے مرد کی پناہوں میں ہو اور وہ اسے اپنے لمس
سے مہکا کے معتبر نہ کرے۔۔۔ دمیر خان بے قراری سے اپنا
نچلا وجود زربخت کے وجود سے مس کرتا اس کے لبوں کو نرمی
سے چومنے لگا تھا۔

د۔۔۔ دمیر! زما ساہ تنگ شوې ده (میری سانس بند ہو رہی

ہے)۔۔۔ وہ اپنی تھائیز پہ اس کے سخت لمس کی تاب نہ لاتے
ہوئے لرزتی آوازیں بولی تھی۔ شرم سے چہرہ اور جسم بھاپ
چھوڑ رہا تھا۔

زما خزانہ!! داخو لایو ازی دبان دی احساس دی، کہ چہرہ ستا پہ زیرہ
کی سفر پیل کرم، نوبیا بہ دی ساہ پہ ستونی کی بندہ شی، تہ یو ازی خان
تیار و ساتہ چہ ماوز غمی، پاتی شوہ ستا پر ی شو ی ساہ، نو ہغہ بہ زہ
خپلہ ساہ در کرم او بہر تہ بہ دی ژوندی کرم (میری متاع من!!
ابھی تو صرف باہر سے محسوس کروا رہا ہوں، جب تمہارے اندر
سفر کروں گا پھر تو تمہاری جان حلق میں ہی اٹک جائے گی۔ تم
بس مجھے برداشت کرنے کیلئے خود کو تیار رکھو، باقی تمہاری اکھڑتی
سانسوں کو میں اپنی سانسیں دے کے بحال کر لوں گا)۔۔۔ دیر

خان گھمبیر آوازیں بے باکی سے بولتی اس کے لبوں پہ اپنی گیلی
زبان پھیرنے لگا تھا۔

دمیر خان پرسوں رات سے مسلسل نزہت خان کے بارے میں
سوچ سوچ کے نجل ہو رہا تھا۔ اس کا دل و دماغ ان کی
بیماری میں آسودگی کا شکار تھا۔ وہ بس خود اور زربخت کو چند
لمحوں کیلئے اس آسودگی اور پریشانی سے نکال کے خود کو اس کو
سکون مہیا کرنا چاہتا تھا۔۔ بے شک زربخت ابھی اس کی
شدتیں سہنے کیلئے چھوٹی تھی مگر وہ اس کو اپنے رشتے کی حقیقت
اور روحانی تعلق سے شروع دن سے آگاہ رکھنا چاہتا تھا تاکہ بعد
میں زربخت کم عقلی اور نا سمجھی میں اس کے لمس کو ٹھکرا نہ

دے۔۔

دمیر!! مورے کیسی ہیں؟ مجھے مورے کے پاس جانا ہے؟۔۔۔ زربخت اس کی بے باک جسارتوں اور باتوں کی تاب نہ لاتے ہوئے سنجیدگی سے اس کا دھیان خود سے ہٹانے کی کوشش کرتی نزہت خان کے متعلق استفسار کرنے لگی۔ پھوپھو بالکل ٹھیک ہیں۔ اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہیں۔۔۔ دمیر خان اس کی دھڑکنوں کو پردے کے اوپر سے ہی اپنے لبوں اور دانتوں سے چھوتا مطمئن کرنے والے انداز میں بولا تھا۔ وہ زربخت کو اپنے لمس سے روشناس کروا کے اس کی خجالت اور ہچکچاہٹ مٹانا چاہتا تھا۔ اس کی آواز کا بھاری پن زربخت کو مزید خوف میں مبتلا کر رہا تھا۔۔۔

سس! وہ اس کے دانتوں کا دباؤ اپنے سینے پہ محسوس کرتی سسکی تھی۔۔۔ دمیر اس کی سسکاری سننا مزید بہکا تھا۔ وہ سختی سے

اس کی سینے کی ناز کی کو اپنی مٹھی میں بھر کے جنونی انداز میں اپنے
لبوں میں لینے لگا تھا۔

اہہ! دمیر۔۔۔ مجھے۔۔۔ مورے۔۔۔ کے
۔۔۔ پاس۔۔۔ جانا ہے۔۔۔ زربخت اس کے پاگل لمس پہ سسکتے
ہوئے شرمیلیں ہوتی، اپنی ماں کے پاس جانے کی ضد کر گئی
تھی۔۔۔

بخت! تم نے مجھے نکاح کی مبارک بھی نہیں دی اور کس بھی
نہیں کیا۔ رات سے میں ہی تمہیں پیار کر رہا ہوں۔ دمیر خان
اس کے سینے سے چہرہ اٹھا کے خمر آلود نگاہوں سے شکوہ کر گیا
تھا۔۔۔ زربخت نے اسکی فرمائش اور شکوے پہ نگاہیں جھکائی
تھی۔ البتہ اس کے منہ سے رات کے بعد پھر سے اپنا نام اتنے
پیارے انداز میں سن کر دل زوروں سے دھڑکا تھا۔۔۔

اچھا کس نہ کرو صرف نکاح کی مبارکباد دو، پھر چلی جانا پھوپھو
کے پاس۔۔۔ دمیر خان اس کو نگاہیں چوراتا دیکھ کر مفاہمتی
انداز میں بولا تھا۔۔

نکاح مبارک ہو آپ کو! زربخت اس کی بات سنتی فوراً بول کے
اپنی آنکھوں کے آگے شرم سے دونوں ہاتھ رکھ گئی تھی۔۔۔ وہ
اپنی تھائیز پہ ابھی تک دمیر خان کا سخت لمس محسوس کرتی، شرم
سے دوہری ہو رہی تھی۔ وہ بس کسی طریقے سے دمیر خان کے
حصار سے نکلنا چاہتی تھی۔۔۔ اس لئیے تیزی سے بول کے نکاح
کی مبارکباد دے گئی تھی۔

ہا ہا ہا! متاعِ من! خیر مبارک، تمہیں بھی میرا لمس اور ساتھ
مبارک ہو۔ اور مجھے تو پھر تم معجزے کی صورت میں ملی ہو،
تمہارے ملنے کا شکریہ ادا میں روز اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھک کر

کروں گا۔ آخر کار وہ ذات اقدس مجھ پر مہربان ہوئی اور مجھے
تمہارا ساتھ دے کر دنیا کی ساری لذتیں اور خوشیاں مجھ پہ تمام
کر دی۔ دمیر خان اس کے یوں شرمانے پر کھل کے مسکراتا
، زربخت کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اس کے چہرے سے ہٹاتا باری
باری اس کی گہری نیلی آنکھیں چومنے کے بعد عقیدت سے اس
کے ماتھے پہ لب رکھتا، زربخت کے وجود کو اللہ تعالیٰ کا کوئی
خوبصورت معجزہ قرار دے گیا تھا۔

او کے جاؤ! پھوپھو کے پاس، اپنی اور ان کی تیاری مکمل کرو،
ہمیں گیارہ بجے لاہور کیلئے نکلنا ہے۔ زربخت کو شرم اور
ہچکچاہٹ سے نجل ہوتے دیکھ کر وہ نرمی سے اس کا گال چوم
کر اوپر اٹھتا زربخت کو اپنے وجود کے بوجھ اور لمس سے آزاد کر
گیا تھا۔ دمیر خان کے چھپہٹتے ہی زربخت فوراً اٹھ کے اپنی

دو پٹا درست کرتی، دمیر خان کی بنا کسی بات کا جواب دئے
بھاگنے والے انداز میں کمرے سے نکلی تھی۔ اس کی یوں
پھرتیاں دیکھ کر دمیر خان کا دلکش قہقہہ کمرے کی زینت بنا تھا۔
وہ دونوں ایک دوسرے کی زندگی میں خزاں میں بہار بن کے آئے
تھے۔ تکلیف میں مرہم بن کے آئے تھے۔ بے سکونی میں سکون
بن کے آئے تھے۔ مایوسی اور اذیت کے لمحوں میں ایک
دوسرے کی قربت میں گزارے گئے یہ لمحے بہت قیمتی اور پر اثر
تھے۔ محرم کا لمس زربخت کے ذہن سے کچھ لمحوں کیلئے غم کو
مٹا گیا تھا۔ اور یہی چند لمحے ہی اصل ازدواجی تعلق کی خوبصورتی
تھے۔۔۔

میری بخت! تم بہت حسین ہو۔ اور تمہارے اس حسن کو میں
فرصت سے اپنے لبوں سے ماپ کے سراہوں گا۔ دمیر خان

چہرے پہ مسکراہٹ لئیے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیر کے دماغ میں
زر بخت سے مخاطب ہوتا واشروم کی طرف بڑھ گیا۔

انزش!!! دروازہ کھولو! میرا بیٹا اپنے بابا کو تکلیف مت دو۔
میری بوڑھی ہڈیوں میں اب غم اور تکلیف سہنے کی طاقت نہیں
ہے۔۔۔ عامر بزدار کل رات سے ہی وقفے وقفے سے انزش
بزدار کے کمرے کا دروازہ پیٹتے اسے باہر آنے کی التجائیں کر رہے
تھے۔ لیکن انزش بزدار نے ان کی ایک نہیں سنی تھی۔ وہ
حالت غم اور شاکہ کیفیت میں مبتلا تھی۔

اس کیلئے دمیر خان کو یوں کسی اور کا ہوتے دیکھنا سب سے زیادہ
تکلیف دہ تھا۔ وہ چاہ کر بھی دمیر خان کی آنکھوں میں زر بخت
کیلئے محبت کو نہیں جھٹلا پارہی تھی۔۔۔ دمیر خان کا یوں کسی اور

کے ساتھ منسوب ہونا اس کے دل و دماغ کو مفلوج کر کے رکھ
گیا تھا۔ وہ رات سے نیچے زمین پہ بیٹھی دیوار کے ساتھ لگا کے
اپنی مردہ ہو جانے والی ایک محبت پہ آنسو بہا رہی تھی۔ پوری
رات اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر رہی تھی۔ مسلسل رونے
کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہوتی سوجن کا شکار تھی۔
اس کی آنکھیں اتنی سوجن زدہ تھی کہ وہ تکلیف کی شدت سے
پھٹنے کو تیار تھی۔۔ وہ مغروری اور نفیس لڑکی کسی کو اپنی نگاہ
کے قابل بھی نہ سمجھے، محبت نے ایسا وار کیا تھا۔ کہ وہ
مغروری آنکھیں آج رورو کے اپنا برا حال کئیے بیٹھی تھی۔
انزس بزدار کی حالت بے ترتیب تھی۔ آنکھوں سے نکلتے آنسو
اپنے ساتھ کاجل بھی بہا کے اس کے گالوں کو لکیر کی صورت
میں سیاہ کر چکے تھے۔ بال بے ترتیب تھے۔ دل خون کے آنسو

رو رہا تھا۔ اس نفاست پسند لڑکی کو محبت نے اپنے ایک ہی وار سے ایسا پٹخ کر مارا تھا کہ وہ شہر کی معروف و مشہور لڑکی اپنی شناخت بھی کھو بیٹھی تھی۔

وہ فرش پہ اب لیٹی آنسو بہاتی دمیر خان کا چہرہ یاد کرنے لگی تھی جس نے اسے دکھ دیا تھا۔ جس نے اسکی محبت کو بے مول کیا تھا۔ اس کے آنسو پیاری بھوری آنکھوں سے نکل کر ٹپ ٹپ فرش پہ گرتے بے مول ہو رہے تھے۔

انز ش میری گڑیا! دروازہ کھولوں میرا بچہ! میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ تمہارا یہ کمزور دل کا باپ تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا میں مرجاؤں گا، تمہیں خدا کا واسطہ ہے دروازہ کھولوں! عامر بزدار نم آواز میں ملتجی ہوئے تھے۔ انز ش کی تکلیف انکے دل میں درد کا باعث بن رہی تھی۔ وہ اپنی فولاد جیسی مضبوط بیٹی

کو ٹوٹا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ عام بزدار نے رات کو سارا معاملہ اسد اللہ خان سے کال پہ معلوم کر لیا تھا۔ کیونکہ جس حالت میں انز ش بزدار واپس گھر آئی تھی وہ انہیں کچھ بھی بتانے سے قاصر تھی۔ اور پھر انز ش آتے ساتھ ہی کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

عام بزدار کے بار بار اصرار کرنے کے باوجود نہ اس نے کچھ بتایا تھا اور نہ ہی دروازہ کھولا تھا۔ پھر مجبوراً عام بزدار نے ساری بات جاننے کیلئے اسد اللہ خان کو کال کی تھی اور ان کی بات سن کے پیروں تلے سے زمین نکلی تھی۔ اور انز ش کی تکلیف کا اندازہ ہوا تھا۔ عام بزدار اسد اللہ خان کو کچھ بھی بولے بنا خاموشی سے کال کٹ کر گئے تھے۔ اب وہ ان کو کیا کہتے کہ میری بیٹی

تمہارے بیٹے سے خاموش محبت کرتی تھی؟ میری بیٹی سالوں
سے تمہارے بیٹے کو دل میں بسا کے بیٹھی تھی؟
وہ اس کے بیٹے کے ساتھ زندگی گزارنے کے سونے سجا کے بیٹھی
تھی؟ جن کو تمہارے بیٹے نے حقیقت میں بدلنے سے پہلے ہی
چور کر دیا؟ نہیں! وہ ایسا کچھ نہیں بول سکتے تھے، کیونکہ وہ بیٹی
کے باپ تھے۔ اور بیٹی کے باپ کا بھی ایک وقار اور بھرم ہوتا
ہے۔ وہ یوں سرعام اپنی بیٹی کی محبت کے قصے زیر بحث نہیں
لاتا۔ وہ اپنی بیٹی کی محبت کو سرعام زمانے میں ہر کسی کے ساتھ
ڈسکس نہیں کر سکتا۔ باپ کی بھی ایک عزت اور پہچان ہوتی
ہے۔ اور باپ کبھی اپنی بیٹی کی ایسی محبت پہ لڑ نہیں سکتا جو
حلال رشتے سے محروم ہو۔

انزہ اور دمیر خان کے درمیان تو کوئی حلال رشتہ قائم ہی نہیں
تھا پھر وہ کس بیس پہ اسد اللہ خان سے جھگڑتے؟ کیا کہہ کر ان
سے اپنی بیٹی کی تکلیف کا ازالہ مانگتے؟ بے نام اور بغیر حلال
رشتے کے محبتیں ایسے ہی تذلیل کا شکار ہوتی ہیں۔ جیسے آج
انزہ بزدار کی ہوئی تھی۔۔۔ لیکن انزہ بزدار اپنی محبت کو حلال
کرنے کی بنیاد پہ ہی اس کی پہلے زینے پر قدم رکھا تھا۔ لیکن
محبت کے زینے پہ قدم رکھنے سے پہلے اس کو آگاہ نہیں کیا تھا۔
جس کیلئے ساری زینے اس نے عبور کرنے تھے۔ اگر وہ اسے
آگاہ کرتی اس سے اظہار کرتی تو شاید وہ اس کا منتظر ہوتا،
لیکن انزہ بزدار نے یہ سفریک طرفہ شروع کیا تھا۔ اور یک
طرفہ محبت کے سفر سوائے تھکن اور اذیت کے کچھ نہیں
دیتے۔۔۔

انزش !! دروازہ کھولوں۔ اب کی بار عامر بزدار کی آواز میں التجا کی بجائے زرا سی سختی تھی۔۔ وہ رات سے اس کی منتیں کر کے رہے تھے۔ لیکن انزش بزدار ان کی کسی بھیئ منت سماجت کو سنے بنا اپنے غم میں ڈوبی ہوئی تھی۔۔ باپ کی آواز میں لرزش اور حکم کا عنصر محسوس کر کے انزش دونوں ہاتھ فرش پہ جما کے اوپر اٹھتی، بے جان قدموں کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھتی دروازہ کھول گئی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی عامر بزدار بے تاب ہو کے اندر داخل ہوئے تھے۔۔

انزش !! وہ انزش کی بکھری ہوئی حالت دیکھ کر تڑپ کے اسے پکار اٹھے تھے۔

بابا !! انزش بزدار باپ کی پکار سنتی روتے ہوئے ان کے سینے سے لپٹی تھی، آنسوؤں پہ ضبط پھر سے ٹوٹا تھا۔ وہ اپنے باپ

کے سینے میں منہ چھپائے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔۔
باپ کو دیکھتے ہی اپنا غم ہلکے کرنے کی غرض سے وہ ان کے سینے
میں چھپی چند لمحے روتی رہی تھی۔

شش!! رونا نہیں ہے۔۔ میری بیٹی کبھی رو نہیں سکتی، وہ
بہت مضبوط اور ہمت والی ہے۔ عام بزدار اسے اپنے سینے
سے نکال کر اس آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھرتے
، سمجھانے والے انداز میں بولے تھے۔۔ وہ ابھی اپنی بیٹی کو
صرف اس کی مضبوط سائیڈ دیکھا کے سمجھا ہی سکتے تھے کوئی
جھوٹی تسلی یا دلاسہ دے کر اس کی امید نہیں بڑھا سکتے تھے۔
اور امید بڑھاتے بھی تو کیا بڑھاتے؟ ایک بڑے ہوئے شخص
سے اپنی بیٹی کو اب عام بزدار کبھی منسوب نہیں کر سکتے تھے۔۔
یہ اس کی بیٹی کا معیار ہی نہیں تھا۔ کہ وہ ایک ایسے شخص سے

منسوب جو پہلے ہی کسی اور سے منسوب ہو کے اس کے نام کا ہو
چکا تھا۔۔

بابا!! کیسے مضبوط بنوں؟ میں کیسے ہمت کروں؟ میں نے اپنے
دل اور دماغ پہ برسوں حکومت کرنے والے شخص کو کسی اور
کی جاگیر میں جاتے دیکھا ہے۔ جو میرے دل پہ حکومت کر رہا
تھا۔ اس کو میں نے اپنے دل کے ساتھ دغا کرتے کسی دوسرے
کا خوابوں کا جہاں بنتے دیکھا ہے۔۔ میرا دکھ بہت بڑا ہے بابا!
جس کو میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے دل کا بادشاہ بنایا تھا وہ آج
میرے ساتھ ہی بے وفائی کر کے میری محبت کو میرے مقام
کو کنیز سے بھی بدتر بنا گیا ہے۔۔ میں کیسے ہمت کروں؟ تخت
سے زمین پر پٹخی گئی ہوں۔ محبت ہمیشہ مجھ پہ ہی کیوں وار
کرتی ہے؟۔

کیا بابا!! میں اتنی بری ہوں، میں جن سے بھی محبت کرتی ہوں
وہ مجھ سے چھن جاتے ہیں۔ پہلے ماما مجھے چھوڑ کے چلی گئی،
انہوں نے میری کم عمری کا لحاظ بھی نہیں کیا تھا۔ اور اب دمیر
بھی مجھ سے جان چھڑوا گیا ہے۔ میں ہی بد قسمت کیوں ہوں؟
ہر دفعہ مجھ سے ہی محبت کیوں چھینی جاتی؟ انرش بزدار صدے
کی حالت میں اذیت سے چلائی تھی۔ اس کے وجود کا پور پور
زخمی تھا۔ اور ہر زخم سے محبت کے چھن جانے کا خون ٹپک رہا
تھا۔۔

بس کرو!! میری بیٹی نہ تو بد قسمت ہے اور نہ ہی کمزور ہے۔ تم
کسی ایسے شخص کیلئے اپنی قیمتی آنسو نہیں کر سکتی جس سے اب
تمہارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔۔ اور دوسری بات خود کو کبھی بھی
کمزور نہ سمجھنا، تم میری باہمت بیٹی ہو۔ جس کو ہر طرح کے

حالات میں لڑکے زندگی کو سبق سیکھانا آتا ہے۔۔ عام بزدار
اپنے ہاتھ کے پوروں سے انزس کے آنسو صاف کرتے صبر اور
ہمت سے مضبوط رہنے کی تلقین کر گئے تھے۔

بابا!! نہیں ہوں میں ہمت والی۔۔ محبت کے تین نقطے ہمت
کے دو نقطوں پہ بھاری ہیں۔۔ یہ تین نقطے زندگی اور موت کے
دو نقطوں سے بھی جیت جاتے ہیں۔ محبت زندگی جینے کی وجہ
چھین لیتی ہے۔ محبت موت کو بھی مات دے دیتی ہے۔
محبت نہ زندگی جینے کے قابل چھوڑتی ہے اور نہ موت کو گلا لگا کر
مردہ ہو چکے جسم کو سکون مہیا کرنے دیتی ہے۔ زندگی اور
موت دونوں دور کھڑی محبت کی سازش پہ بے بسی سے تڑپ کر
تماشا دیکھتی رہ جاتی ہیں۔۔ محبت بہت بری چیز ہے بابا! اللہ
تعالیٰ دشمن کو بھی محبت میں مبتلا نہ کرے۔ محبت بہت بے

رحم ہے۔ محبت بے مروت اور بد لحاظ ہے۔ انزس بزدار
اذیت ناک الفاظ کا چناؤ کرتی غم کوشی میں بولی تھی۔۔ اس کے
لہجے میں ٹوٹاپن عام بزدار بخوبی نوٹ کر سکتے تھے۔۔

لیکن تم کوئی عام لڑکی نہیں ہو۔ تم انزس بزدار ہو، عام بزدار کی
بیٹی! جس کو شطرنج کے مہروں کی طرح چال بدل کے محبت
جیسے تکلیف دہ جزبے کو مات دینا آتی ہے۔۔ عام بزدار ہمیشہ کی
طرح اب اپنی بیٹی کو اس کی خوبیاں گنوانے لگے تاکہ وہ اس
صدے کی حالت سے باہر نکل آئے۔ وہ جب بھی دکھی ہوتی
تھی عام بزدار یونہی اسے کی خوبیاں گنوا کے اسے دکھ اور تکلیف
سے لڑنے میں مدد دیتے تھے۔۔ وہ اپنی بیٹی کو ٹوٹا ہوا ہرگز نہیں
دیکھ سکتے تھے۔

بابا!! "محبت کو مات ہرگز نہیں دی جاسکتی، محبت تو ہمارا لاڈ
سے پالا روگ ہوتا ہے۔ اور جو چیزیں لاڈ سے پالی جاتی ہیں وہ
بھلا زندگی سے اور دلوں سے کیسے نکالی جاسکتیں؟ بھلا لاڈلی چیزیں
کو بھی کبھی کوئی بھولا ہے؟ لاڈلی چیزوں کے ساتھ بھی کوئی جنگ
کرتا ہے؟۔۔ لاڈلے جڑے ہو یا انسان ان کی طرف سے دئیے
گئے لاڈلے دکھ برداشت کئیے جاتے ہیں ان کے خلاف چالیں
نہیں چلی جاتی!!۔" انرش بزدار ہچکیوں سے روتی،
کمال سمجھداری سے بولی تھی۔ عامر بزدار اپنی بیٹی کے جوابوں پہ
حیران ہو رہے تھے۔

وہ حالت غم میں بھی کمال سمجھداری اور پرتاثر الفاظ کا چناؤ
کرتے ہوئے اپنی ذہانت کا ثبوت دے رہی تھی۔ اب بس!
اب تمہاری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں نکلنا چاہیے۔ تم جیسی

سمجھدار لڑکی کا رونا بنتا ہی نہیں ہے۔ محبت کے تین نقطے زندگی اور موت کے دو نقطوں پہ بھاری ہو سکتے ہیں، مگر محبت کے تین نقطے صبر کے ایک نقطے کو مات نہیں دے سکتے۔ صبر کا ایک نقطہ ہر چیز پہ بھاری ہے۔ مجھے پورا بھروسہ ہے اپنے اللہ کی ذات پہ وہ تمہیں اس صبر کا بہت بڑا اجر دے گا اور وہ اجر اتنا بڑا اور خوبصورت ہو گا کہ تم اپنے سابقہ سارے غم بھول جاؤ گئی۔

اللہ تعالیٰ تمہارے صبر کے بدلے تمہیں بے لوث چاہنے والا ہمسفر نصیب کرے گا، جس کی دنیا تم سے شروع ہو کر تم پہ ہی تمام ہوگی۔ تمہاری ذات اسے پوری کائنات لگے گی۔۔۔ اللہ تعالیٰ اس صبر کے بدلے میری بیٹی کا نصیب بلند کرے گا آمین! عامر بزدل پیار سے انزس کو اپنے سینے سے لگاتے اسے کے غم کی

شدتوں کو اپنی پرتاثر باتوں سے کم کرنے لگے تھے۔ باپ کی باتیں اور اس کا شفقت بھرا لمس محسوس کر کے انزش بزدار کافی حد تک سنبھل گئی تھی لیکن اتنا نہیں کہ دمیر خان سے کی گئی محبت کو اتنی آسانی بھولا دے۔

وقت بہت بڑا مرہم ہوتا ہے۔ انزش بزدار کا یہ محبت کا زخم بھی وقت کے ساتھ بھرنا تھا۔ یا شاید کوئی محبت کرنے والا ہی بھرے گا؟۔۔ محبت کے روگ کو محبت سے ہی شفا میں بدل کر دکھ سے سکھ میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔

زربخت پچھلے دو گھنٹوں سے نزہت خان کے سینے سے لپٹی ان کے ساتھ چھوٹی موٹی باتیں اور شرارتیں کرتی مسکرا رہی تھی اور

نرہت خان مسلسل اسے نصحتیں کرتی اپنی ازدواجی زندگی
خوشگوار بنانے کی تلقین کر رہی تھی۔

مورے بس کریں مجھے پتہ ہے۔ مجھے کیا کرنا ہے۔ آپ مجھے
نصحتیں نہ کریں، بلکہ میرے سے پیار بھری باتیں کریں۔
زر بخت اپنی ماں کے سینے سے منہ نکال کر ناک سکوڑتے ہوئے
بولی تھی۔ وہ کافی دیر سے صرف اپنی ماں کی نصحتیں سن کے
تھک چکی تھی۔ وہ اب اپنی ماں سے ہلکی پھلکی باتیں کر کے انہیں
سر جری سے پہلے نارمل رکھنا چاہتی تھی۔۔۔

مجھے تو پیار بھری باتیں نہیں کرنی آتی وہ تو تمہارا شوہر کرے گا تم
سے! نرہت خان اپنی ہنسی ضبط کرتی شرارت سے بولی تھی۔
وہ زر بخت کا چہرہ اپنے سینے سے نکال کر اس کے چہرے پہ
بکھرے شرم و حیا کے رنگ دیکھنا چاہتی تھی۔

ہاہاہا!!۔ میری معصوم زربخت!!۔۔ زربخت کا شرم سے سرخ
ہوتا چہرہ دیکھ کر نزہت خان کا قہقہہ بلند ہوا تھا۔

مورے! زربخت اپنا حیا سے سرخ ہوتا چہرہ پھر سے نزہت
خان کے سینے میں چھپاتی مصنوعی خفگی سے بولی تھی۔۔۔ اسے
اپنی ماں سے اتنی کھلے جواب کی بالکل بھی امید نہیں تھی۔ وہ
دونوں ماں بیٹی ہنسنے میں مصروف تھی جب دمیر خان کمرے میں
داخل ہوتا ان کو ہنستے دیکھ کر دل میں ماشاء اللہ بولتا، زربخت کو
معنی خیز نظروں سے دیکھ گیا تھا۔

بخت!! تم جا کے تیار ہو جاؤ! ہمیں آدھے گھنٹے تک لاہور کیلئے
نکلنا ہے۔ دمیر خان صوفی کی طرف بڑھتا نرمی سے زر بخت کو
حکم دے گیا تھا۔ اس کے منہ سے پھر سے اپنا نام محبت سے
لبریز انداز میں سنتے ہی زر بخت کا دل کانوں میں دھڑکا تھا۔ وہ

خاموشی سے نزہت خان سے الگ ہوتی دمیر خان سے نظریں
ملائے بغیر تیزی سے کمرے سے نکلی تھیں۔ دمیر خان اس کا خود
سے شرمانا بخوبی نوٹ کر رہا تھا۔۔۔ دمیر خان ابھی تھوڑی دیر
پہلے ہی زربخت کے کپڑوں کی اپنی الماری میں کمی محسوس کر
تے ہوئے وہ بنا ناشتہ کئے سب سے پہلے اس کیلئے ڈھیروں نئے
ڈریسز خرید لایا تھا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا اس کی زربخت کسی
بھی چیز پر ذرا سا بھی سوچے یا پریشان ہو۔۔۔

وہ اس کو کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ زربخت
کی ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا دھیان رکھنا اب دمیر خان کی ذمہ
داری تھی۔۔۔ آدھے گھنٹے بعد ہی وہ چاروں تیار ہو کے ایئر پورٹ
کیلئے نکلے تھے۔ ان کے ساتھ داعیر خان نہیں گیا تھا کیونکہ دمیر
خان نے اسے گھر پر رہنے کی ہدایت کی تھی۔ کسی مرد کا گھر رہنا

بھی ضروری تھا۔ اس لئی وہ اسے مہر اور اپنی ماں کے پاس
چھوڑ کے گیا تھا۔۔۔

شام کے پانچ بج رہے تھے۔ کوریڈور میں اس وقت دمیر اور
اسد اللہ خان بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔۔۔ ان کے چہروں پہ
ایک عجیب قسم کا خوف اور ڈر رقصاں تھا۔ جبکہ زربخت بھی
بینچ پہ بیٹھی منہ میں کچھ آیات کریمہ پڑھتی اضطرابی کیفیت میں
بتلا تھی۔۔۔ وہ تینوں بار بار آپریشن تھیٹر کی طرف پر امید
سے دیکھ رہے تھے۔۔۔ یہاں پہ نزہت خان کی سرجری ہو رہی
تھی۔ وہ پچھلے تین گھنٹوں سے باہر ایک پاؤں پہ کھڑے آپریشن
تھیٹر سے ڈاکٹر کے نکلنے کے انتظار میں تھے۔

اس امید کے تحت کہ ڈاکٹر کوئی خیر کی خبر سنائے گا۔ زربخت کا
چہرہ اپنی ماں کی تکلیف سوچ کے خوف سے زرد ہو رہا تھا۔ دل

میں عجیب ہول اٹھ رہے تھے، دماغ وسوسوں سے بھر رہا تھا۔
وہ اپنی تمام تر سوچیں ترک کرتی تیزی سے آیت کریمہ کا ورد
کرتی اپنی ماں کی صحت والی لمبی زندگی کی دعائیں اللہ تعالیٰ سے
مانگنے لگی تھی۔۔۔ دمیر خان زربخت نے چہرے پہ پھیلی
اضطرابی بخوبی نوٹ کر رہا تھا۔ وہ خوف سے اس کا رنگ زرد
ہوتا دیکھ کر متوسط چال چلتا اس کے قریب آ کے بیٹھا تھا۔
بخت!! پریشان مت ہو۔ انشا اللہ سب بہتر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی
ذاتِ اقدس پر بھروسہ رکھو۔ وہ پھوپھو کو اس بیماری سے
لڑنے کی طاقت بھی دے گا، اور مستقل طور پر اس موذی
بیماری سے نجات بھی دے گا۔ دمیر خان نرمی سے زربخت کا
پسینہ سے بھگا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں لیتا اپنائیت
بھرے لہجے میں بولتا اسے حوصلہ دے گیا تھا۔

آمین! زربخت نے مدہم آواز میں جواب دیا تھا۔۔۔ ابھی دمیر
خان یا زربخت میں سے مزید کوئی کچھ بولتا جب دو ڈاکٹر آپریشن
تھیٹر سے نکلے تھے۔ ان میں سے ایک دمیر خان کا دوست ڈاکٹر
صلاح حیات تھے۔ جبکہ دوسرا ڈاکٹر بھی ڈاکٹر صلاح حیات کا
دوست تھا۔ ڈاکٹر زکو باہر نکلتے دیکھ کر زربخت نے سختی سے
دمیر خان کا ہاتھ اپنی مٹھی میں دبایا تھا۔۔۔

سرجری کامیاب رہی؟۔ میری پھوپھو کیسی ہیں؟ وہ ٹھیک
ہیں؟۔ دمیر خان زربخت کا ہاتھ چھوڑے بنا اس کو اپنے ساتھ
لئے بیچ سے اٹھتا ڈاکٹر صلاح حیات کی طرف بڑھتا کئی سوال کر
گیا تھا۔۔۔ ڈاکٹر صلاح کا سنجیدہ سپاٹ اتر ا ہوا چہرہ کسی انہونی کی
گواہی دے رہا تھا۔۔۔

صالح!! بولو! میری پھوپھو کیسی ہیں؟ جگر ٹرانسپلانٹ ہو گیا؟
دمیر خان ڈاکٹر صالح حیات کو خاموش دیکھ کے اضطرابی کیفیت
میں گویا تھا۔ وہ جلد از جلد اس کے منہ سے کوئی اچھی خبر سننا
چاہتا تھا۔ اسد اللہ خان بھی آگے بڑھتے ڈاکٹر کے جواب سننے
کیلئے بے چین ہو رہے تھے۔

دمیر! آئی ایم سوری! میں تمہاری پھوپھو کو نہیں بچا سکا۔ وہ
سرجری کے دوران survive ہی نہیں کر پائیں۔۔۔ ان کی بیماری
آخری حد تک پھیل چکی تھی۔۔۔ عمر اور بیماری کہ وجہ سے ان کا
کمزور جسم نہیں لڑ پایا اس بیماری کے خلاف۔۔۔ ڈاکٹر صالح
حیات رنجیدگی سے بولتے دمیر خان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے
حوصلہ دیتے آگے کی طرف بڑھ گئے تھے یہ سوچے بنا کہ وہ
کتنے اذیت ناک الفاظ کا استعمال کر کے گئے تھے۔

ان کے الفاظ زربخت کی جسم سے ایک چھٹکے میں روح نکال کے
لے گئے تھے۔ وہ ڈاکٹر کے الفاظ پہ جامد ہوئی تھی۔۔۔ دل اور
دماغ نے ڈاکٹر کی بات ماننے سے انکار کیا تھا۔۔۔ دمیر خان اور
اسد اللہ خان کی آنکھیں اور کان حیرت زدہ تھے۔ وہ شش و پنج
میں مبتلا ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ کے رہ گئے تھے وہ ڈاکٹر کے
الفاظ نہیں تھے۔ بلکہ خنجر کے وار تھے۔ جس نے ان تینوں کو
بری طرح کاٹ کے رکھ دیا تھا۔۔۔ زربخت کا ہاتھ بے ساختہ
دمیر خان کی مضبوط گرفت سے چھوٹا تھا۔ وہ ڈاکٹر کے الفاظ
سن کے اپنی جگہ پہ پتھر ہوئی تھی کسی نے پیروں تلے سے زمین
کھینچ لی، سر سے آسمان چھین لیا تھا۔ زربخت کی دنیا اجر گئی
تھی۔۔۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میری مورے تو ٹھیک تھی وہ مجھے اکیلا
کبھی بھی نہیں چھوڑ کے جاسکتی۔ میں نہیں مانتی یہ سب
جھوٹ ہے۔ یہ سچ نہیں ہے۔ زربخت بے یقینی سے دو قدم
چھپے لیتی ہزیانی انداز میں چلائی تھی۔ نیلی گہری آنکھوں سے آنسو
پانی کی طرح رواں ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ زربخت کو
اسکی ماں کی موت کی خبر دے کر کسی نے اس کے کانوں میں
پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو۔۔۔ دل پھٹنے لگا، رگوں میں خون منجمد
ہوا، ہاتھ اور پاؤں ٹھنڈے برف ہوئے۔

دماغ کی نسیمیں بار بار ڈاکٹر کے الفاظ یاد کر کے اذیت سے
پھر پھر اٹانے لگی تھی۔۔۔ زربخت کی حالت اس وقت ایسی تھی
جیسے کوئی گردن پوری کاٹ دے لیکن شہہ رگ نہ کاٹ کر کسی
زندہ وجود کو تڑپنے کیلئے چھوڑ دے ایسے ہی زربخت کا

وجود زندگی اور موت کے درمیان پھر پھر ا رہا تھا۔۔ وہ روتے ہوئے اپنے بے جان قدموں سے زمیں پہ ڈھ گئی تھی۔ اور اتنی بری طرح سے گری تھی کہ اس کا سر چھبہ بیچ کے ساتھ جا کے لگتا زخمی ہو گیا تھا۔ جب جان سے پیارے اپنے جاتے ہیں تو چھپرہ جانے والوں کے وجود بھی مردہ کر کے جاتے ہیں۔

زربخت مردہ ہو گئی تھی۔۔ اور مردہ جسم اپنے پیروں پہ کھڑے نہیں رہ سکتے۔۔ زربخت کے زنجیر قدم پھر کتنی دیر اسکے مردہ وجود کا بوجھ اٹھاتے۔؟ پیروں میں بے جان وجود کو اٹھانے کی سکت ہی نہیں تھی۔ بخت!! دمیر خان جو کہ شاکڈ کیفیت میں مبتلا کھڑا ڈاکٹر کے اذیت ناک الفاظ کو سچ میں بدلنے سے انکاری تھا، زربخت کی گرنے کی آواز سن کر تڑپ کے اسے پکارتا، نیچے جھک کر اسے اپنی بانہوں میں بھر کے بیچ پہ بیٹھا گیا تھا۔۔ اس

کے سر کے پھلے حصے سے خون رستا دیکھ کر دمیر خان کا دل
اچھل کے حلق میں آیا تھا۔۔۔ چوٹ بالکل معمولی سی تھی۔ لیکن
یہ چوٹ دمیر خان کے پہلے ہی زخمی دل پر کاری ضرب ثابت
ہوئی تھی۔۔۔

دمیر!! میری مورے زندہ ہے نہ! وہ مجھے ایسے اکیلا کبھی نہیں
چھوڑتی ان کو پتہ ہے میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میری
مورے زندہ سلامت ہیں۔ آپ میری مورے کو باہر لے آئیں۔
ہمیں کوئی سرجری نہیں کروانی، یہ ڈاکٹر اس قابل ہی نہیں ہے کہ
میری مورے کا علاج کر سکیں۔ آپ جائیں میری مورے کو
لے آئیں ہمیں گھر جانا ہے۔ یہ ہاسپٹل والے بہت برے ہیں
میری مورے کو مجھ سے چھیننا چاہتے ہیں۔ زربخت ہنوز روتی

ہوئی اپنی ماں کی موت کی حقیقت کو ماننے سے انکار کرتی دمیر
خان کو ملتجی انداز میں مخاطب کر گئی تھی۔

بخت!! سنبھالو خود کو، یہ صدمہ تمہاری حیات میں لکھا جا چکا
ہے پھوپھو ہمیں یہ صدمہ دیں گئی ہیں۔ وہ ہمیں چھوڑ کے چلی
گئی ہیں۔ کبھی نہ واپس آنے کیلئے چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔ دمیر
خان نرمی سے اس کے سر سے رستا خون ٹیشو سے صاف کرتا
، اسے زور سے اپنے سینے میں بھینچے زخمی دل اور روح کے ساتھ
اس کو تلخ اور اذیت ناک حقیقت سے آگاہ کر گیا تھا۔۔۔ وہ
زر بخت کو کوئی جھوٹے دلا سے نہیں دینا چاہتا تھا۔ کوئی ایسی
امید نہیں دلا سکتا تھا۔ جو حقیقت پہ بنی نہ ہو۔۔۔ اس وقت سچ
کی تکلیف زر بخت کو جھوٹی امید دلانے سے بہتر تھی۔۔۔ وہ چاہتا
تھا کہ وہ اپنی ماں کا خسارہ مضبوط دل کے ساتھ برداشت

کرے۔۔۔ دمیر خان کا اپنا دل اس خسارے پہ پھٹا جا رہا تھا لیکن وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ وہ مرد تھا وہ صبر اور ضبط سے کام لے رہا تھا۔ لیکن نزہت خان کے جانے کا غم اس کی بھی آواز اور آنکھیں نم کر رہا تھا۔۔۔ اسد اللہ ہونق بنے اپنی جگہ پہ سٹل تھے۔ وہ تو اب زربخت کو دلا سے دینے سے بھی ڈر رہے تھے کہیں نہ کہیں وہ نزہت خان کی موت کا زمہ دار خود کو سمجھ رہے تھے۔

آپ بھی ڈاکٹر کی طرح مجھ سے جھوٹ بول رہے ہیں؟ آپ کو خدا کا واسطہ ہے مجھے ایسی باتیں مت بتائیں جن کو برداشت کرنے کی میرے کمزور وجود میں طاقت نہیں۔۔۔ زربخت دمیر خان کے سینے سے چہرہ نکالتی غم کوشی میں بولی تھی۔ زربخت کے شفاف آنسو بے مول ہو کے آنکھوں سے بہتے سیاہ چادر

میں جذب ہو رہے تھے۔۔ ہاتھ ٹھنڈے برف تھے۔ دمیر خان نے اسے سنبھالنے کیلئے اس کا ٹھنڈا یخ ہاتھ اپنی مٹھی میں دبایا تھا۔ وہ ابھی کچھ بھی بولتا، جب آپریشن تھیٹر سے نزہت خان کو سٹریچر پہ باہر لایا گیا تھا۔ سٹریچر کے پہیوں کی آواز سن کر تینوں نے گردنیں موڑ کر پیچھا دیکھا اور پھر تیزی سے سٹریچر کی جانب لپکے تھے۔ زربخت دمیر خان کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑواتی دوڑنے کے انداز میں سٹریچر کی طرف بڑھی تھی۔۔۔ مورے!! اٹھیں۔ مورے دیکھیں کون آیا ہے۔ آپ کی زربخت آئی ہے۔ ہم نے کوئی سرجری نہیں کروانی یہ سب گندے ہیں۔ یہ سب ہم دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا چاہتے ہیں لیکن میں ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی میں آپ کو خود سے الگ نہیں ہونے دوں گی۔۔ زربخت بچوں کی طرح روتی

نزہت خان کے مردہ ہو چکے وجود کو پاگلوں کی طرح پکارتی انہیں
اٹھانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔۔

مورے اٹھیں نہ آپ اپنی زربخت کو ایسے بھرے جہان میں اکیلا
چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ نزہت خان کے مردہ وجود سے جواب نہ
پا کر زربخت ان کے سینے سے لپٹ کر روتے ہوئے ہزیانی
انداز میں چلائی تھی۔ زربخت! پھوپھو نہیں اٹھیں گی۔ دمیر
خان نے اسے بازو سے پکڑ کر چھپھٹانا چاہا لیکن وہ اس کی
گرفت سے اپنا بازو چھڑواتی پھر سے اپنی ماں کے سینے سے لپٹی
تھی۔ اپنی ماں کے بے جان وجود کو دیکھ کر اس کا دم گھٹ رہا
تھا۔ سانسیں لینے میں دشواری آرہی تھی۔

وہ اذیت سے دھاڑیں مار مار کے روتی، غم سے چلا اٹھی تھی۔
اس کی درد بھری چینخوں پہ کوریڈور میں موجود ہر ذی روح کانپ

اٹھی تھی۔۔ اسد اللہ خان نزہت خان کو دیکھتے ہوئے صدمے سے دوچار تھے۔ زربخت کی اذیت ناک چینیخیں سن کے شدت غم میں ان کی آنکھ سے بھی ایک آنسو ٹپکا تھا۔ وہ دمیر خان کو زربخت کو چھبھٹانے کا اشارہ کرتے اپنے کانپتے ہاتھوں سے نزہت خان کے منہ پہ چادر دے گئے تھے۔ دمیر خان زور سے زربخت کو اپنے سینے سے لپیٹے اس کے سر پہ لب رکھتا اسے حوصلہ دینے لگا تھا۔ زربخت کا پورا وجود ہچکولوں کی زد میں تھا۔ رونے سے اسکی ٹھوڑی اور لب کپکپا رہے تھے۔۔

غم بہت بڑا تھا اور زربخت کو اس غم سے نکالنا دمیر خان کی ذمہ داری تھی۔ اور دمیر خان بہت جلد اپنی متاع من کو سنبھال کر اس غم سے باہر لے آئے گا۔۔۔ آدھے گھنٹے میں ہی سب ہاسپٹل سے کلئیر ہونے کے بعد وہ بائے ائیر نزہت خان

کی میت کو لئیے لاہور سے اسلام آباد کیلئے روانہ ہوئے تھے وہ زندہ سلامت نزہت خان کو لیکر آئے تھے لیکن جا اس کے مردہ وجود کے ساتھ رہے تھے۔ اور یہ تکلیف بہت جون لیوا تھی۔۔۔۔۔

رات کے نو بج رہے تھے۔ نزہت خان کی میت کو غسل دے کے آخری دیدار کیلئے لاؤنج میں لایا گیا تھا۔ زربخت کی وہی پہلے والی حالت تھی وہ پاگلوں کی طرح اپنی ماں سے لپٹ لپٹ کے رو رہی تھی۔ اور ان سے رکنے کی التجائیں کر رہی تھی۔ لیکن نزہت خان کو نہیں رکنا تھا وہ اپنا قبر کا سفر باندھ چکی تھی۔۔ جس میں وہ ابھی تھوڑی دیر بعد اترنے والی تھی۔ اپنی ماں کا پر نور شفا جیسا چہرہ اسکی نظروں سے ہمیشہ کیلئے اوجھل ہو رہا تھا۔

اپنی ماں کے دیدار کی عدم دستیابی سوچ کے ہی زربخت مرجانا
تھی لیکن موت اسے نہیں آرہی تھی۔ وہ غم سے نڈھال ہو کے
بار بار غش کھاتی چھپے گر رہی تھی اس کو مہر خان نے بڑی مشکل
سے سنبھالا ہوا تھا۔۔۔ انیسہ خان ایک سائڈ پر بیٹھی صدے
سے دوچار تھی۔ نزہت خان کی یوں اچانک موت اس کیلئے
دھچکا ثابت ہوئی تھی اس کے پتھر دل میں نزہت خان کیلئے آج
نرم شاخ پھوٹی تھی آنکھوں سے آنسو بہے تھے اور دماغ نے
اس کے کئیے گئے سارے نزہت خان کے ساتھ برے سلوک
یاد کروا کے پشیمان کیا تھا۔

مورے!! آج تو پھوپھو کو خوش اخلاقی سے مل لیں۔ آج تو وہ
آپ کی مرضی کے مطابق ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آپ کے گھر اور زندگی
سے جا رہی ہیں۔ اب آپ کو میری پھوپھو کا وجود کوئی تکلیف

نہیں دے گا۔ وہ اب آپ کے گھر کبھی نہیں آئیں گی۔ آپ کو اچھا نہیں لگتا تھا نہ ان کا وجود! وہ تو آپ کو اور آپ کے گھر کو چھوڑ کے ایسے گئی ہیں کہ آپ کو اپنی کی گئی ساری زندگی کی بدسلوکیوں کی معافی مانگنے کی بھی مہلت نہیں دی۔ آپ روز محشر اللہ کے حضور کیسے پیش ہونگی کہ آپ نے ساری زندگی ان کی کمزور اور لاچار بندی کی توہین کی ہے؟۔

ان کی دل آزاری کر کے ہر بار اپنے گھر سے دھتکار کے نکال دیتی تھی۔ کیسے کریں گی روز محشر پھوپھو کا سامنا؟ کیا جواب دیں گئی آپ اپنے اعمال کا اللہ کو؟۔ لیکن آپ فکر نہ کریں میری پھوپھو آپ کو کبھی بھی روز محشر رسوا نہیں کرے گی۔ وہ کبھی بھی آپ کو اپنی اذیتوں کا ذمہ دار نہیں ٹھہرائیں گی۔ کیونکہ میری پھوپھو سچے اور خالص دل کی مالک تھی وہ آپ کی ہر تلخ

بات اور اذیت کو ہنس کے دل سے معاف کر دیتی تھی۔ وہ آپ کو آپ کی ہر غلطی اور دھتکار پہ معاف کر دیتی تھی۔ کیونکہ وہ میری اچھی اور سچی نیت کی مالک پھوپھو تھی۔ ان کیلئے رشتے اہم تھے۔ وہ آپ کی طرح دل میں بعض نہیں رکھتی تھی۔ وہ کسی سے نفرت نہیں کرتی تھی جیسے کہ آپ ان سے ساری زندگی کرتی رہی۔ وہ آپ کی طرح حاسد اور انا پرست نہیں تھی۔۔۔ داعیر خان انیسہ خان کی طرف بڑھتا ان کے قریب ہوتا نیچے جھک کر صدمے سے چور لہجے میں اپنی ماں کو اس کے اعمال کا آئینہ دیکھا کے بولتا انیسہ کی رگوں میں خون منجمد کر گیا تھا۔ وہ کبھی بھی اپنی ماں کو ایسے الفاظ نہ بولتا لیکن انیسہ خان کو رشتوں کی اہمیت اور ان کے تقدس کا احساس دلانا ابھی ضروری تھا۔ اس لئے داعیر خان اپنے زخمی دل کے ساتھ بولتا

زربخت کی غیر ہوتی حالت نہ برداشت کرتے ہوئے لاؤنج سے نکل کر باہر لان کی طرف بڑھا تھا۔ کیونکہ زربخت کا تڑپ کے رونا اس کیلئے ناقابل برداشت تھا۔ داعیر خان کی باتیں سن کر انیسہ خان کا چہرہ سفید پڑا تھا۔ جسم کے رونگٹے کھڑے ہوئے تھے۔ دل کسی آہنی طوفان کی لیٹ میں آیا تھا۔

وہ داعیر خان کے الفاظ نہیں تھے بلکہ انیسہ خان کے منہ پہ اپنے کئیے گئے اعمال کا تماچہ تھا۔ انیسہ خان داعیر خان کے تلخ الفاظ پر ضبط ٹوٹا تھا وہ شدت سے رو دی۔۔ زندگی میں وہ کبھی کسی کے الفاظ اور میت پہ اتنا روئی تھی جتنا انیسہ خان آج رو رہی تھی۔۔ یہ رونا نزہت خان کی موت کا نہیں تھا بلکہ یہ رونا تو انہیں اپنے اعمال پہ آ رہا تھا۔۔ انزس اور عامر بزدار بھی نزہت خان کی میت پہ آئے تھے۔ انزس کا دکھ اپنی طرف تھا مگر

زربخت کا دکھ اس سے بڑا تھا۔ اس لئے وہ سب کچھ بلائے
طاق رکھے اس کے دکھ میں شریک ہوئی تھی۔۔۔ تھوڑی ہی دیر
میں نزہت خان کی میت کو دفنانے کیلئے اٹھا لیا گیا تھا۔ اپنی ماں
کو ہمیشہ کیلئے خود سے دور جاتے دیکھ کے زربخت غش کھا کے
گر گئی تھی۔

مہر خان اور انزش اسے سنبھالتے ہوئے کمرے میں لے گئی
تھی۔ کیونکہ دمیر خان اس وقت اپنی پھوپھو کو آخری منزل پر
پہنچانے کے لئے نکل گیا تھا۔ نزہت خان آج ہمیشہ کیلئے
زربخت کو چھوڑ کر من و مٹی تلے دفن ہو رہی تھی۔ وہ زربخت
کو اپنے سائے سے محروم کر گئی تھی۔ زربخت نے اب ساری
زندگی ان کی جدائی پہ رونا تھا۔ نزہت خان عمر بھر کا رونا اپنی بیٹی
کی نصیب میں لکھ گئی تھی۔۔۔ جتنے بھی رشتے میسر آجائیں

والدین کی کمی کوئی رشتہ پوری نہیں کر سکتا، والدین کے چھوڑ جانے کے غم دائمی اور ابدی ہوتے ہیں۔

(دو مہینے بعد)

اب تو تم خوش ہو! میری بہن سے تمہاری جان جو چھوٹ گئی۔ تم ساری زندگی اس سے خار کھاتی رہی، ہمیشہ اس کو خود سے کم تر سمجھا، اس کی ذات کو حقیر سمجھ کر اپنے گھر سے دھتکار کے نکالتی رہی اور میری کم عقلی دیکھو۔۔ میں اس سب میں تمہارا ساتھ دیتا رہا، تمہاری غلطیوں پہ تمہیں ٹوکنے کی بجائے خاموشی اختیار کر کے تمہیں شے دیتا رہا اور تم میری خاموشی کو کمزوری سمجھ کر اپنی من مانیوں کرتی رہی، یہ سوچے بنا کہ تمہاری یہ من مانیوں گناہوں کے زمرے میں آرہی ہیں۔ میری بہن سے نفرت

نبھانے کے چکر میں تمہاری کی گئی کوتاہیاں گناہِ صغیرہ سے ہو
کے گناہ کبیرہ میں بدلنے لگیں، تم نے ساری زندگی میری بیوہ بہن
اور یتیم بھانجی کا دل دکھایا ہے۔ ان کو ہر بار ان کے کم حثیت
ہونے کا طعنہ دے کر انکی عزت نفس کو مجروح کیا ہے۔ ایسہ
بیگم! کسی کا اتنا بھی دل نہ دکھاؤ کہ اس کی آپس تمہاری زندگی کا
چین و سکون چھین لیں۔ ابھی تو تم خوش قسمت ہو! اللہ تعالیٰ
نے تمہیں تمہارے گناہوں کی سزائیں جکڑا نہیں ہے اور اس کی
بڑی وجہ نزہت کا تمہیں ہر بار معاف کر دینا تھا۔ تمہاری طرف
سے جتنے بھی اس کو دکھ اور روحانی اذیتیں ملیں، اس نے دل
میں نفرت رکھے بنا تمہیں کھلے دل سے معاف کیا تھا لیکن پھر
بھی انسان کو مظلوم کی خاموش آہ مار دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے ڈرو کہ وہ تمہیں نزہت کی کسی خاموش آہ سے
بچالے ورنہ تم اس جہان میں اور اگلے جہان میں بھی رسوا ہو
کے رہ جاؤ گی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان سب چیزوں میں صرف
تم قصور وار تھی، نزہت کو ساری زندگی خود سے دور رکھنے میں
اسکی ذات کو نظر انداز کرنے میں، میں بھی برابر کا قصور وار
تھا۔۔

میں اتنا بے بس اور کمزور تھا کہ اپنی بہن اور یتیم بھانجی کا سہارا
بھی نہ بن سکا۔ ان کو عزت و احترام، تحفظ، مان، اپنائیت
کے احساس سے معتبر بھی نہ کر سکا۔ لالا ہونے کا فرض بھی نہ
نبھا سکا، میری بہن مجھے خدمت کا موقع دئے بنا اس دنیا سے چلی
گئی۔

وہ اپنے بھرم اور وقار کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوئی ہے
۔ اس نے سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے کسی بشر سے امید نہیں
لگائی تھی۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا یا تھا۔ اپنی ذات کا مان
برقرار رکھا لیکن پھر بھی مجھے خود اس کو سہارا دینا چاہیے تھا۔
حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد بھی فرض ہیں۔ ہم حقوق اللہ
تو ادا کرتے رہے مگر حقوق العباد سے غفلت برتی، اپنوں کا حق
سلب کیا۔۔۔ اسد اللہ خان پچھلے ایک گھنٹے سے نزہت خان کا
سارا ماضی یاد کرتے ایسہ خان کو ان کی گئی ساری غلطیوں کا
احساس دلواتے ہوئے رنجیدگی سے بولے تھے۔

وہ خاموشی سے ان کی ساری باتیں سن رہی تھی۔ ان کا چہرہ
شرمندگی سے جھکا ہوا تھا۔ شوہر کی حقیقت پہ بنی باتیں ان کے
پتھر دل کو پگھلا رہی تھی۔ اسد اللہ خان کا ہر لفظ ان کے جسم پہ

چابک کی طرح پڑ رہا تھا مگر وہ کچھ بولنے کی بجائے چپ سا دھے
ساری باتیں سن رہی تھی۔

انا پرست لوگ کہاں اتنی جلدی اپنی غلطی تسلیم کرتے ہیں؟ وہ
کبھی بھی کسی کے آگے جھکتے نہیں ہیں۔ ان کو صرف اپنی ذات
افضل اور پرفیکٹ لگتی ہے۔ مگر انیسہ خان بے شک اپنی غلطی
منہ سے تسلیم نہیں کر رہی تھی لیکن پچھلے دو ہفتوں سے اسد
اللہ خان اور داعیر کی عبرت ناک باتیں ان کے دل کو شرمندگی
اور احساس جرم کے مارے دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی۔۔۔
انیسہ! تمہارے پاس ابھی بھی وقت ہے سنبھل جاؤ، نزہت کو
تم نے کوئی سکون نہیں دیا مگر اس کی بیٹی کو سچے دل سے اپناؤ لو،
اس کا سہارا بنو، اس کو دکھ کی اس گھڑی میں دلا سہ دو، اس کو
احساس دلاؤ کہ تم اس کے ساتھ ہو، تمہارا وجود اس کیلئے باعثِ

سکون بنے، وہ بلا جھجھک تمہاری گود میں سر رکھ کے اپنا درد بانٹ سکے۔ اس کو محبت سے گوندھو، اس بکھری ہوئی بچی کو ماں کی طرح بن کے سنبھال لو۔۔ اگر تم نے یہ سب کچھ کیا تو اللہ تعالیٰ کی ذات بھی تم سے راضی ہو جائے گی اور نزہت کی روح بھی تم سے خوش ہو جائے گی۔۔ تمہارے سارے گناہ ایسے دھلیں گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔۔

کبھی اللہ کے کسی بندے کو غم میں سہارا دے کے تو دیکھو! تمہیں اتنا سکون ملے گا کہ تم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتی، خود کو نرم دل کرو، اپنی ذات کو دوسروں کیلئے باعثِ مسرت بناؤ، باعثِ سکون بناؤ، اسد اللہ خان اب سمجھانے والے انداز میں بولے تھے۔۔ وہ سچے دل سے انیسہ خان کی اصلاح چاہتے تھے۔

وہ چاہتے تھے کہ ان کی بیوی اب خود کو بدلے، جو ماضی میں
نزدہت کے ساتھ ہوا وہ اب زربخت کے ساتھ ہرگز نہ ہو۔ وہ
اپنی بیگم کا دل زربخت کیلئے موم کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ جانتے
تھے کہ کمزور سی زربخت میں انیسہ خان کی نفرت برداشت
کرنے کی ہمت نہیں ہے۔

میں کوشش کروں گی خود کو بدلنے کی! لیکن کچھ زخم آپ دونوں
باپ بیٹے نے مجھے بھی دیئے ہیں۔۔۔ دمیر میرا بڑا اور لاڈلا بیٹا
تھا، اس کا نکاح آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر کر دیا اور تو اور مجھے
نکاح کی اطلاع بھی نہیں دی۔۔۔ کیا میں اس قابل بھی نہیں تھی
کہ اپنے بیٹے کے نکاح میں شرکت کر سکتی؟ میرا وجود آپ
سب کیلئے اتنا بے معنی تھا کہ میری موجودگی یا غیر موجودگی سے
کسی کو فرق ہی نہیں پڑا تھا؟۔۔۔ کیا میں ماں کہلانے کے بھی

لائق نہیں تھی؟ جو آپ نے مجھے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کے باہر پھنک دیا تھا۔ میرے بیٹے کی زندگی کا فیصلہ لینے کا مجھے کوئی حق نہیں تھا؟۔۔۔ وہ بوجھل آوازیں شکوے کرتیں اپنی جگہ سے اٹھ کے باہر کی جانب بڑھ گئیں۔ وہ ان کی مزید تلخ حقائق پہ بنی باتیں نہیں سہہ سکتی تھی۔ دمیر خان کا نکاح اپنی مرضی کے بغیر کروانا انیسہ خان کو گہرا دکھ دے گیا تھا۔ ان کا انداز شکستہ تھا۔

مورے!!۔۔۔ انیسہ خان ابھی کمرے کے دروازے تک ہی پہنچی تھی جب دمیر خان ان کی بات سنتا بغیر نوک کئے کمرے میں داخل ہوتا اپنی ماں کو سینے سے لگا گیا تھا۔ وہ آج دو ہفتے بعد آفس گیا تھا کیونکہ پہلے زربخت کی حالت کے پیش نظر وہ آفس نہیں جا پایا تھا۔

مورے! ناراض ہیں آپ مجھ سے؟۔۔۔ دمیر خان نرمی سے
اپنی ماں کے سر پہ بوسہ دیتا فکر مندی سے سوال کرنے لگا۔ وہ
اپنی ماں کی ساری باتیں سن چکا تھا، وہ انیسہ خان کا افسردہ اور
شکستہ لہجہ نہیں برداشت کر سکتا تھا۔

نہیں! میں نے کیوں ناراض ہونا ہے؟ میرا کون سا تم پہ کوئی حق
ہے؟ ناراض ان سے ہوتے جن پہ ہم حق رکھتے ہوں لیکن میں تو
نہ حقدار ہوں اور نہ ہی قابل اعتبار ہوں۔۔۔ وہ دمیر خان کے
حصار سے نکلتی بے تاثر لہجہ میں بولی۔

مورے! ادھر میری طرف دیکھیں، آپ مجھ پہ میری جان سے
بھی زیادہ حق رکھتی ہیں۔ آپ سے زیادہ قابل اعتماد اور معتبر
ہستی کوئی نہیں ہے میرے لئے۔۔۔ میں آپ کا بیٹا ہوں! آپ
کے حکم اور رضا کا پابند، لیکن کچھ فیصلے جو میں نے اور بابا نے

آپ کی رضا جانے بغیر کئے۔۔ وہ ہنگامی حالات میں ہوئے
تھے۔ ہمارا ہرگز مقصد آپ کا دل دکھانا یا آپ کو غیر اہم سمجھنا
نہیں تھا۔ کچھ فیصلے تقدیر میں لکھے ہوتے ہیں اور میرا اور
زر بخت کا نکاح تقدیر میں لکھا جا چکا تھا تو وہ ہو گیا، تقدیر کے
فیصلے تسلیم کئے جاتے ہیں

"اور اس وقت تو پھر تقدیر کے فیصلے سر آنکھوں پر رکھے جاتے
ہیں، جب وہ آپ کی من پسند کے ہو"

وہ نرمی سے ان کا ہاتھ پکڑ کر چومتا ٹھہرے لہجے میں بولا تھا۔
اس معاملے پہ پہلے بھی ان کی تفصیلی بات ہو چکی تھی۔۔۔ دمیر
خان نے کئی بار اپنے لفظوں اور دلائل سے اپنی ماں کو زربخت
کا وجود قبول کرنے کیلئے منانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ
ہمیشہ بغیر کچھ بولے جگہ چھوڑ کے چلی جاتی تھی۔

اگر میں تمہارے لئے قابل احترام ہستی ہوتی تو تم یوں میری اجازت کے بغیر نکاح کا اتنا بڑا فیصلہ نہ کرتے! خیر مجھے اپنا دکھ نہیں ہے کہ میرے بیٹے اور شوہر نے اتنا بڑا فیصلہ مجھے اعتماد میں لئے بغیر ہی کر لیا تھا، مجھے دکھ اپنی بھانجی کا ہے۔ جو اس کا دل ٹوٹا ہے وہ کسی صورت نہیں جڑ سکتا۔

دمیر! وہ تم سے محبت کرتی تھی۔ تمہارا ساتھ پانا چاہتی تھی۔ تم نے اس کے ساتھ بہت برا کیا ہے، تمہارے اس فیصلے نے اس کا دل توڑ کے کرچیوں کی صورت میں بکھیر دیا ہے۔ تم نے اس کو دکھ دیا ہے۔ اور یہ بات میں کبھی نہیں بھولوں گی کہ تم نے میری نافرمانی کر کے میری بھانجی کو اذیت سے دوچار کیا تھا۔۔۔ وہ ان کے چہرے کی طرف دیکھتی کرب سے آنکھیں میچ کر بولی تھی۔ ان کے اپنے بیٹے کو لیکر کچھ ارمان تھے۔ کچھ

امیدیں تھی لیکن دمیر خان کے یوں اچانک زربخت کے ساتھ
نکاح نے سب امیدوں اور ارمانوں پہ پانی پھیر دیا تھا۔
یہ غلط ہے مورے! میں نے انزس سے کوئی وعدہ نہیں کیا
تھا۔ اس کے ساتھ جینے مرنے کے کوئی عہد نہیں کئے تھے۔ کوئی
جھوٹی قسمیں نہیں کھائی تھی۔ مجھے تو اس کے جذبات کی خبر تک
نہیں تھی۔ سب کچھ اس کی طرف سے یک طرفہ تھا۔ پھر میں
کیسے اس کے دل کا قاتل ہو سکتا ہوں؟ میں نے اسے دکھ نہیں
دیا، بلکہ یہ اس کے اپنے دل نے اس کیلئے اذیت کا سامان کیا ہے
اور یقیناً انزس نے آپ کی طرف سے کوئی اشارہ سمجھ کر ہی
میرے بارے میں سوچا ہوگا، ورنہ وہ سمجھدار لڑکی کبھی بھی
اتنی بے وقوفانہ حرکتیں نہیں کرتی، کم از کم محبت تو وہ بالکل بھی
کسی سے یک طرفہ نہ کرتی، آپ نے اس کو امید دلائی ہوگی مجھے

سے جوڑنے کی، اور یہی امید اس کا دل توڑنے کا باعث
بنی، اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔۔ اور نہ ہی میں اب کسی
اور کو مزید اس سے متعلق وضاحتیں دوں گا۔

مورے! ایک ضروری بات اور! آج تو آپ نے انزس کی مجھ
سے یک طرفہ محبت کا ذکر کر دیا ہے آئندہ غلطی سے بھی اس کو
میرے ساتھ منسوب نہ کیجئے گا۔ میں مرد ذات ہوں، میرا کچھ
نہیں جائے گا مگر انزس لڑکی ذات ہے اور لڑکیوں کا ماضی ان کا
مستقبل تباہ کر دیتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ مستقبل میں انزس
کا محرم اسکی ماضی کی یکطرفہ محبت جان لے اور ان کے رشتے
میں کوئی بھی خلش آئے۔ محبت جب یکطرفہ ہو تو اسے دفنا دینا
چاہئے ورنہ وہ مردہ محبت ماضی سے نکل کر خوشیوں سے بھرا
مستقبل کھا جاتی ہے اور میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ انزس کا

ماضی اس کی آنے والی زندگی پہ اثر انداز ہو، یا اس کا محرم اس کے کردار پہ شک کرے، اس لئے بہتر ہوگا آپ اس بات کو یہی پہ دفن کریں اور میری بیوی میری بخت کو بطور بڑی بہو قبول کریں۔۔۔ یہی ہم سے کیلئے بہتر ہوگا۔۔۔ دمیر خان دو ٹوک الفاظ میں انتہائی سمجھداری سے بولتا کرے سے نکل گیا تھا۔ وہ اس موضوع پہ پہلے بھی بحث کر چکا تھا۔ اب وہ مزید اپنی ماں سے بحث نہیں کر سکتا تھا۔ اس کو کچھ پل سکون کے چاہئے تھے، پچھلے دو ہفتوں سے زر بخت کی حالت کی وجہ سے وہ ایک منٹ بھی سکون کی نیند نہیں لے پایا تھا۔ فی الوقت اسے ذہنی اور روحانی سکون کی اشد ضرورت تھی اور اس کے سکون کا مرکز و محور زر بخت تھی۔

وہ اس کی باتیں سن کر کنگ ہوئی تھی، وہ ساری باتیں سچ کہہ کے گیا تھا۔ جب انزش نے اپنی محبت کا اس سے کبھی اظہار ہی نہیں کیا تو پھر وہ کیونکر اس کی محبت کا قاتل ٹھہرایا جا رہا تھا؟ ہاں تب دمیر خان قصور وار ہوتا، اگر انزش اس سے اظہار محبت کرتی اور وہ اسکی محبت کو ٹھکراتا لیکن جب ایسا ہوا ہی کچھ نہیں تھا تو پھر اس کو کیوں کٹہرے میں کھڑا کیا جا رہا تھا؟ انیسہ خان یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اور اپنے بیٹے کی بے سکون حالت دیکھ کر الٹا خود سے شرمگین ہوئی تھی۔ وہ دمیر خان کو ایک ایسی بات پہ اپنے لہجے اور لفظوں سے تکلیف دے رہی تھی جس میں اس کا کوئی قصور ہی نہیں تھا۔

دمیر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے انیسہ بیگم! زربخت کو قبول کرو اپنی بڑی بہو کے طور پر، اور انزش کو بار بار اس سے جوڑنا بند کرو

کیونکہ یہ یکطرفہ محبت کی نسبت تمہاری بھانجی کیلئے مشکلات
کھڑی کر سکتی ہے۔ اپنے بیٹے کے بارے میں سوچو! وہ
بہت بے سکون ہے تمہارے رویے کی وجہ سے!! اس کی
پسند کو اپنی پسند بناؤ اور اس کیلئے سکون کا ذریعہ بنو! زندگی بہت
چھوٹی چیز ہے! نزہت چلی گئی، ہم نے بھی کسی دن ایسے
اچانک چلے جانا ہے، لیکن جب تک ہم زندہ ہیں اپنی اولاد کیلئے
خوشی اور آسانی کا باعث بنیں، ان کی خوشیوں میں خوش ہو کر
ان کو ذہنی اطمینان اور مسرت دیں۔ ہمارے بیٹے کی خوشی
"زربخت" ہے، تم اس کی خوشی میں خوش ہو جاؤ! مزید
ناراضگیاں نہ پاؤ۔۔۔ ختم کرو ساری رنجشیں اور
تلخیاں۔۔۔ اسد اللہ خان جو پہلے خاموشی سے دونوں ماں بیٹے
کی بحث سن رہے تھے دمیر خان کے شکستہ ہو کر کمرے سے

نکلنے پر، انیسہ خان کو نرمی سے مخاطب کرتے ٹھہرے لہجے میں
سمجھانے لگے تھے، جو اس کے یوں جانے سے پریشان کھڑی
تھی۔

ہمم! میں کوشش کروں گی، میری ذات اور الفاظ سے میرے
بیٹے کو صرف سکون مہیا ہو۔۔۔ وہ مدہم آواز میں بولتی و اشروم
کی طرف بڑھ گئیں۔ ان کا انداز ہتھیار ڈالنے اور اپنی غلطی
تسلیم کرنے والا تھا۔

ان کا جواب سن کر اسد اللہ خان کا چہرہ پر امید اور خوشی سے
چمکا کیونکہ وہ سمجھ گئے تھے کہ ان کی بیگم کو اپنی غلطیوں کا
احساس ہو رہا ہے۔ اور ان کیلئے انیسہ خان کی بدلنے کی کوشش
ہی خوشی کا باعث تھی۔

نرہت کی وفات کے بعد آج پہلی بار اسد اللہ خان کے بوجھل دل
کو سکون ملا تھا۔۔ وہ زخمی سا مسکراتے آنکھیں موند کر چھپے
صوفے کی پشت پہ سر ٹکا گئے تھے۔

داعیر۔۔۔۔۔ مہر والنساء جو ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھی
داعیر خان کو بیڈ پہ اوندھے منہ پڑے دیکھ کر فکر مندی سے پکارا
کیونکہ وہ دوپہر سے ایسے ہی اوندھے منہ پڑا تھا اور اب رات ہو
چکی تھی، وہ نیچے کھانے پہ بھی نہیں گیا تھا۔
جب سے نرہت خان کی وفات ہوئی تھی تب سے وہ صرف بے
چینی اور اضطرابی کیفیت میں مبتلا رہا تھا، اس نے گھر سے باہر
نکلنا تقریباً ختم کر رکھا تھا۔ نرہت خان کی وفات اس پہ گہرا
صدمہ چھوڑ کے گئی تھی۔ وہ دکھنے میں مضبوط اعصاب کا مالک

لگتا تھا مگر رشتوں کے معاملوں میں اس کا دل چڑیا سے بھی
چھوٹا تھا۔ اپنوں کو لیکر اسکی طبیعت بہت حساس تھی۔ وہ
اپنے سے جڑے کسی بھی رشتے کو ذرا سی تکلیف میں نہیں دیکھ
سکتا تھا۔

پہلے جو اس نے نزہت خان سے غفلت برتی تھی۔ وہ سب
اس کی چڑھتی جوانی، کچی عمر اور نا سمجھی کا نتیجہ تھی لیکن جب
سے دمیر نے ان دونوں باپ بیٹے کو رشتوں کا احساس دلایا تھا،
داعیر کا مکمل جھکاؤ اپنی پھوپھو کی طرف ہو گیا تھا۔ اور اپنے
سے جڑے ہر رشتے کو بخوبی نبھانے والا داعیر خان پھوپھو کے
یوں اچانک چھوڑ جانے پر دکھ میں مبتلا تھا اور پھر زربخت کا دکھ
بھی اس کیلئے ناقابل برداشت تھا۔

داعیر!۔۔۔ اس کی طرف سے جواب نہ پا کر مہر خان نے بیڈ
کے قریب پہنچتے ہی پھر سے اس کو مخاطب کیا تھا۔
ہمم!!۔۔۔ اس نے تکیے سے منہ نکالے بغیر ہی ہنکارا بھرا تھا

-

آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟۔۔۔ مہر و نے بیڈ پہ چڑھتے
ہوئے فکر مندی سے استفسار کیا۔

ہمم! میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔ اس نے پھر سے ہنکارا بھرا
تھا۔۔۔ اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

لیکن آپ مجھے بالکل بھی ٹھیک نہیں لگ رہے ہیں۔۔۔ وہ آگے
بڑھ کر داعیر کا سر تکیے سے اٹھا کر اپنی گود میں رکھتی اس کے
بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے محبت بھری نگاہوں سے ان کو
دیکھنے لگی کیونکہ وہ جانتی تھی، وہ کس وجہ سے اپ سیٹ ہے

اور مہر خان ہمیشہ سے اسے پریشانی میں پیار سے ٹریٹ کرتی آئی
تھی جیسے کہ کچھلے دو ہفتوں سے کر رہی تھی۔۔

اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں بلکہ روح تک پر سکون
ہوں۔۔۔ داعیر خان مزید اس کی گود میں اپنا چہرہ گھسیڑے اس
کے گرد اپنی بانہوں کا حصار قائم کرنے لگا۔

پھوپھو کی وجہ سے اداس ہیں؟۔۔۔ اس نے بے اختیاری میں
سر سری سا سوال کیا تھا، اس کا ہرگز مطلب اس کا غم کھریدنا
نہیں تھا، وہ تو بس یہ چاہتی تھی کہ داعیر اپنا ہر غم اور پریشانی
اس سے شئیر کرے۔۔

بہت زیادہ!! مجھے پھوپھو کی یاد آتی ہے۔ وہ ہمیں اتنی جلدی
کیوں چھوڑ کے چلی گئی؟ ابھی تو ان کی عمر تھی خوشیاں دیکھنے کی
، زندگی کو صحیح طور پر پرچینے کی، انہوں نے ساری عمر غربت

میں اور گھٹ گھٹ کے زندگی گزاری تھی۔ ابھی ان کے دن
کھل کے چینے کے تھے، زندگی کے ہر پہلو کو خوشنما رنگ میں بدلا
دیکھنے کے، گرٹیا کی خوشیاں دیکھنی تھی، ابھی تو انہوں نے گرٹیا کو
پھلتے پھولتے دیکھنا تھا، وہ ہماری اور اپنی ساری خوشیاں غموں
میں بدل کر ہمیں چھوڑ کر چلی گئی، گرٹیا کا بھی خیال نہیں کیا کہ
اس پہ کیا بیتے گی۔۔۔ وہ غم سے بھاری ہوتی آواز میں رنجیدگی
سے بولا تھا۔ اس کے لہجے کا دکھ مہر و بخوبی محسوس کر سکتی
تھی۔

ہمم! پھوپھو بہت جلدی چلی گئی۔ شاید ان کی زندگی ہی اتنی
تھی۔ ہم اللہ کے فیصلوں کے آگے بے بس ہیں۔ وہ جو بھی
کرتا ہے، بہتری کیلئے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے گرٹیا سے پھوپھو

والا آسرا چھیننا ہے تو لا لا کو اس کا نگہبان بنا کے بھی تو بھیجا ہے

--

اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کبھی بھی بے آسرا نہیں چھوڑتا ہے اور جہاں تک رہی پھوپھو کے جانے کی بات تو ایک دن ہم سب نے وہی جانا ہے، یہ جہان فانی ہے۔ یہ دنیا کی زندگی اور اس کی رونقیں فریب ہیں۔ ہمیں ہر صورت میں اپنے خالق حقیقی کے پاس ہی لوٹنا ہے۔۔۔ پھر چاہے ہم سو سال کی زندگی جئیں یا ایک دن کی۔۔۔ موت برحق ہے اور وہ آکے رہے گی۔ موت جنس اور عمر کا لحاظ نہیں کرتی، بس جس کا اس دنیا میں ٹائم ختم ہو جاتا ہے، اس کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ ہمیں بس ایک ہی دعا کرنی چاہیے زندگی ہماری کم ہو زیادہ اس فرق نہیں پڑتا، اگر فرق پڑتا ہے تو ہمارے نامہ اعمال سے، کوشش ہونی چاہیے کہ

ہمارا خاتمہ ایمان پر ہو اور ہم جب اس فانی جہاں کو چھوڑ کر
جائیں تو ہمارا اللہ ہم سے راضی ہو۔ وہ ہمیں اپنے نیک بندوں
میں شامل کرے اور ہمیں قبر کی سختی اور جہنم کی آگ سے
محفوظ رکھے آمین ثم آمین۔۔۔ مہر و نرمی سے اس کے بالوں
میں انگلیاں چلاتی پر سوچ انداز میں بولتے ہوئے اسے سمجھانے
لگیں۔ داعیر خان نے اس کی اتنی گہری، سچی اور حقیقت پہ مبنی
باتیں سن کر بے ساختہ اپنا سر اوپر اٹھا کے اس کے چہرے کی
طرف دیکھا تھا جہاں پہ سنجیدگی اور سمجھداری ٹپک رہی تھی۔ وہ
حیران ہوا تھا اپنی مہر کی اتنی گہری باتیں سن کر۔۔

نور چشم! تم حسین ہونے کے ساتھ ساتھ سمجھدار بھی ہو
۔۔۔ وہ اپنی سرخ ہوتی آنکھوں سے اس کے چہرہ پہ نظریں جما کے
بولتا نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم گیا۔

آپ کی اداسی ختم کرنے کیلئے مجھے سمجھداری دیکھانی پڑے گی۔
کیونکہ میں آپ کو اداس نہیں دیکھ سکتی۔۔۔ اس نے محبت
بھرے لہجے میں بولتے ہوئے نیچے جھک کر پیار سے داعیر کی بیڑ
پہ لب رکھے۔

پھر سے کرو۔۔۔ وہ اس کی جان لیوا جسارت پہ خوشی سے
سرشار ہوا، وہ مبہم سا مسکراتا پھر سے اس کو اپنا عمل دہرانے
کی التجا کرنے لگا۔

مہرو اس کی التجا اور اس کے چہرے پہ پل میں پھیلی مسرت دیکھ
کر اب کی بار شرم و حیا کو ایک سائیڈ پہ رکھ کر داعیر خان کی
آنکھوں پہ ہاتھ رکھتی، اپنا چہرہ نیچے جھکائے ایک دم اس کے
عنابی لبوں کو زور سے چوم گئی۔ وہ چوم کے چپھے نہیں ہٹی تھی
بلکہ اس کے بالائی لب کو اپنے نازک لبوں کی گرفت میں لیتی

نرمی سے سک کرنے لگی تھی۔ اگر اس کا محرم اس کے لمس سے غم کی کیفیت سے نکل سکتا تھا تو پھر کیونکر اسے اپنے لمس سے محروم رکھ کے غم جھیلنے دیتی؟

اب کی بار اپنی نازک سی مہر کی جسارت پہ داعیر کی آنکھیں پھیلی تھی، وہ خوشگوار حیرت میں مبتلا ہوا۔ اس کی نرم نازک پنکھڑیوں کو اپنے منہ میں محسوس کر کے دل میں گدگدی ہوئی، جوان جذبات بھر کے تھے۔

وہ ایک جست میں مہر کے لبوں کو اپنے ہونٹوں کی حراست میں لیتا اوپر اٹھ کر اسے خود کے نیچے کرتا، ایک ہاتھ اس کے گال پہ جمائے تیزی سے اس کے لبوں کو سسک کرنے لگا۔

مہر خان ہڑبڑاتی ہوئی اس کی آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر کالر سے جکڑتی اس کا جان لیوا لمس برداشت کرنے لگی تھی۔ داعیر خان

مکمل طور پر اس پہ حاوی ہوتا اس کے وجود کے ہر اعضاء پہ حق
جتاتے ہوئے شدت پسند ہو رہا تھا۔ اس کو مہر خان نے خود
چھیڑا تھا، اب داعیر خان نے اپنا حق وصول کئے بنانا زک سی
مہر کی جان خلاصی نہیں کرنی تھی۔

اب پوری رات داعیر خان نے اس کو اپنے حصار میں قید رکھ کر
اس کے وجود کو محبت کی مہروں سے معتبر کرنا تھا۔

مس انز ش! آپ میرے ساتھ آجائیں! میں آپ کو چھوڑ دیتا
ہوں۔۔۔ رات کے دس ہونے والے ہیں، موسم بھی خراب
ہے آپ کا ڈرائیور تو پتہ نہیں کب آئے گا؟ یہاں پہ آپ کا اکیلے
رکنا سیف نہیں ہے۔۔۔ رائم خان سوسائٹی آفس سے باہر

نکلتی انزش بزدار کو تیزی سے آگے بڑھ کر مخاطب کرنے لگا جو
اب تیز تیز قدم اٹھتی باہر میں روڈ کی طرف بڑھ رہی تھی۔
آپ کی پیشکش کا شکریہ مسٹر خان! لیکن میرا ڈرائیور آ رہا ہے، وہ
راستے میں ہے۔۔۔ انزش بزدار نے بنا رکے جواب دیا۔
آفس سے لیکر میں روڈ تک جانے کا سارا راستہ پلاسٹک روف
شیٹ سے کور تھا، اس لئے وہ دونوں بارش سے بھیگ نہیں
رہے تھے۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔
وہ دونوں اس وقت انزش کے متنازعہ پروجیکٹ کے سلسلے میں
اسی جگہ آئے تھے جہاں ہفتوں پہلے رائم خان کو غنڈوں سے
لڑتے ہوئے کندھے میں گولی لگی تھی۔
یہ پروجیکٹ ایک ہفتے پہلے ہی رائم خان نے شروع کروا دیا
تھا۔ اب کی بار رائم خان نے اس ہاؤسنگ سوسائٹی کی تعمیر میں

اس کے ساتھ پارٹنرشپ کی تھی اور انزس نے بغیر کسی بحث کے اسے آسانی سے اپنے پروجیکٹ کا حصہ دار بنا دیا تھا کیونکہ یہ بات وہ بھی جانتی تھی۔ اس پروجیکٹ کو وہ کسی ہونہار اور قابل مرد کی مدد کے بغیر پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتی تھی۔۔۔ اسلئے وہ بنا بحث و تکرار مان گئی تھی۔۔۔

رائم خان کو پارٹنرشپ کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس نے صرف انزس کی سیکیورٹی کیلئے اس پروجیکٹ میں شراکت داری قائم کی تھی تاکہ جب وہ کام کے سلسلے میں یہاں آئے تو وہ اس کے ساتھ آئے۔ پچھلی مرتبہ انزس کے ساتھ پیش آیا واقعہ رائم خان دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے اس کی فکر تمام تر معاملات سے زیادہ تھی۔

ابھی بھی وہ یہاں بیس گراؤنڈ کا کام چیک کرنے آئے تھے۔
کچھ کاغذی معاملات، چیک سائن کرنے، اور موسم خرابی کی وجہ
انہیں یہاں سے نکلنے میں لیٹ ہو گئی تھی۔ موسلا دھار بارش کی
وجہ سے ہر طرف تیز ہوا کا شور چل رہا تھا۔ ہوا اپنے ساتھ سب
کچھ اڑا کے لے جانے کے ارادے رکھتی تھی۔۔

انزس بزدار آج دو ہفتوں بعد گھر سے باہر نکلی تھی۔ دمیر کے
نکاح کی خبر سننے کے بعد اس نے مکمل طور پر خود کو تنہا کمرے
میں قید کر لیا تھا۔ باہر آنا جانا اس نے بالکل بند کر دیا تھا
آج بھی وہ عام بزدار کے اصرار اور رائم خان کے بار بار کالز
کرنے پہ آئی تھی ورنہ اس کا دل دنیاوی کاموں سے اچاٹ ہو گیا
تھا۔

ڈرائیور کو آنے میں دیر ہو جائے گئی، موسم بہت زیادہ خراب ہو رہا ہے۔۔ یہاں پہ میں آپ کو اکیلا چھوڑ کے نہیں جاسکتا، یہ جگہ رات کے اس وقت آپ کے یہاں رک کر ڈرائیور کا انتظار کرنے کیلئے موزوں نہیں ہے۔ آپ میری مانیں تو میرے ساتھ آجائیں، بے شک آگے بیٹھ جائیے گا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔۔ رائٹم خان اس کے ہم قدم ہوتا فکر مند ہونے کے ساتھ ساتھ شوخ لہجے میں بولا تھا۔ اس نے جان بوجھ کے آگے بیٹھنے کی بات کی تھی تاکہ انزس ہمیشہ کی طرح اسے کرا کر جواب دے کیونکہ وہ جب سے یہاں آئی تھی، اس کے چہرے کی اداسی اور طبعیت کی اکتاہٹ وہ بخوبی نوٹ کر چکا تھا اور یہی چیز رائٹم خان کو اندر ہی اندر پریشان کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ کسی گزرے حادثے کا پتہ دیتا تھا لیکن حادثہ کیا ہوا تھا؟ رائٹم خان

اس بات سے بے خبر تھا۔۔ اس کو تو بس اپنی محبت کا مرجھایا
ہوا چہرہ تفکر میں مبتلا کر رہا تھا۔

دمیر خان نے سختی سے داعیر کو مہرو سے انزس والا معاملہ
ڈسکس کرنے سے منع کیا تھا کیونکہ رائم خان بارکزی کا انزس
کیلئے گولی کھانا اور اسے غنڈوں سے بچانا اس کو بہت سی باتوں کا
اشارہ دے گیا تھا لیکن وہ ابھی مکمل طور پر رائم کے جذبات
سے واقف نہیں تھا۔۔ اس لئے اس نے انزس کا ماضی مہرو
اور اس کے گھر والوں سے مخفی رکھنے میں ہی بہتری سمجھی تھی
کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انزس بزدار کا ماضی اس کے مستقبل
میں پریشانی اور اذیت کا باعث بنے۔۔

اوکے! آپ مجھے چھوڑ دیں لیکن مجھے گھر نہیں جانا بلکہ میری ایک
کزن ہے، اس کا گھر یہاں سے بیس منٹ کی دوری پہ ہے۔۔

وہاں چھوڑ دیں۔۔۔ وہ اس کی طرف دیکھے بنا بے تاثر لہجے میں
بولی تھی۔ چہرہ سنجیدہ سپاٹ تھا، البتہ چہرے پہ دکھ کا عنصر
واضح تھا، رائم خان اس کا توقع کے خلاف جواب سن کر حیران
ہوا۔

وہ اس کے ساتھ بیٹھنے کیلئے اتنی جلدی نہیں مانتی تھی۔ پھر وہ
آج کیوں مان گئی تھی؟ کیا اس کے ساتھ کچھ ہوا تھا؟ یا اس کی
طبعیت ناساز تھی؟ وہ اپنے دماغ میں تانے بانے بنتا ابھی سوچ
ہی رہا تھا جب انرش تیز بارش کی پرواہ کئے بنا گاڑی کی طرف
بڑھ گئی۔ وہ گاڑی کے پاس پہنچنے تک مکمل بارش میں بھیگ چکی
تھی۔ وہ برقیلے تاثرات کے ساتھ گاڑی کا دروازہ کھول کے
پیسنجر سیٹ پہ سوار ہوئی تھی۔ اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا، انداز
بکھرا ہوا تھا۔

وہ اسے ہکا بکا ہوتا دیکھ کے رہ گیا تھا۔ وہ آج کچھ زیادہ ہی اپنی شخصیت سے ہٹ کے حرکتیں کر رہی تھی۔ اسے رائم خان کے ساتھ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھنا بالکل بھی پسند نہیں تھا۔ وہ جب بھی اس کے ساتھ بائے چانس سفر کرتی تھی، وہ ہمیشہ پچھلی سیٹ کا انتخاب کرتی تھی، اسلئے تو اس نے اسے چھپرے کیلئے فرنٹ سیٹ کا حوالہ دیا تھا کہ شاید وہ کوئی ری ایکشن دے لیکن وہ رہ ایکشن دینے کی بجائے الٹا فرنٹ سیٹ پہ جا کے بیٹھ گئی تھی۔۔۔ رائم خان اپنے حیران کن تاثرات پہ قابو پاتا تیز قدم اٹھاتے ہوئے گاڑی کی طرف آیا تھا۔ وہ بھی گاڑی میں بیٹھنے تک مکمل بارش سے بھیگ چکا تھا۔

اولس! میں فائل اندر بھول آیا ہوں، آپ دو منٹ ویٹ کریں میں ابھی فائل لیکر آتا ہوں۔۔۔ رائم خان کو گاڑی میں بیٹھتے ہی

کوئی فائل یاد آئی تھی جسے وہ سوسائٹی آفس میں بھول آیا تھا۔ وہ اس کو دو منٹ انتظار کا کہتا تیزی سے گاڑی سے اتر کر اندر کی جانب بڑھ گیا، وہ فائل اس پروجیکٹ کے لئے ضروری تھی۔ انزس نے اس کی کسی بھی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ بے سدھ سی ہو کے بیٹھی اپنی سوچوں میں گم تھی۔۔ اس کیلئے باہر کا موسم، بارش، تیز ہوا، کڑکتی بجلی سب کچھ بے معنی تھا کیونکہ جو طوفان اس کے اندر چل رہا تھا وہ اپنی شدت سے اس کے دل کی درودیوار ہلا رہا تھا۔

وہ ابھی تک اپنی سوچوں میں گم تھی جب اس کی ونڈو سائیڈ آکر زور سے کسی نے ونڈو مر رہا وار کیا تھا۔۔ وار اتنا زوردار تھا کہ گاڑی کے شیشے کے کانچ اڑ کر انزس بزدار کا منہ اور ہاتھ زخمی کر گئے تھے۔

اس اچانک حملے پر وہ ہڑبڑا کے چپھے ہٹی تھی۔ سوچوں کا سلسلہ ٹوٹا تھا۔ اس نے ونڈو سے باہر نظریں دوڑا کے سارا معاملہ سمجھنے کی کوشش کی اور سامنے موجود دو غنڈے نما آدمیوں کو دیکھ کے اس کے دماغ میں خوف برپا ہوا تھا۔ آنکھوں میں کسی حادثے کی لہر دوڑی تھی اور دل کسی انہونی کے تحت زور سے دھڑکا تھا۔

وہ ابھی سارا معاملہ سمجھنے کی جدوجہد میں تھی جب ایک آدمی نے آگے بڑھ کر انزش کی سائیڈ کا دروازہ کھول کر اسے بازو سے پکڑ کر گاڑی سے اٹھا کے باہر پھینکا تھا۔

دونوں آدمیوں کے چہرے ماسک میں ڈھکے تھے، انہوں نے سیاہ جیکٹس پہن رکھی تھی۔ ایک کے ہاتھ میں پستل تھا جبکہ دوسرے کے ہاتھ میں ہاکی سٹک تھی۔

کون۔۔۔ ہو۔۔۔ تم۔۔۔ لوگ؟ انزس بزدار نے زمین پہ ہتھیلی
جما کے چھپھٹتے ہوئے لڑکھڑاتے لہجے میں سوال کیا تھا۔۔
اس کے چہرے پہ خوف کے سائے منڈلائے تھے۔ بارش کی
تیز بوندیں اس کے چہرے پہ تھپڑوں کی طرح پڑ رہی تھی۔ وہ
اپنی آنکھوں سے بارش کا پانی صاف کرتی یہاں سے بھاگنے کیلئے
زمین سے اٹھ کر ابھی دو قدم ہی آگے بڑھی تھی جب اس
کے چھپھکھڑے آدمی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ہاکی سٹک کی
کاری ضرب انزس بزدار کے دماغ کے کھیلے حصے پہ لگا کے اسے
آگے بڑھنے سے قاصر کیا تھا۔۔۔

اہہہ!۔۔۔ اس کے ظالمانہ وار پر انزس کی کراہ بے ساختہ تھی،
وہ اپنے سر کے چھپھکھڑے ہاتھ رکھتی درد سے زمین پہ ڈھ گئی۔

اس آدمی نے پے در پے دو مزید اکھٹے وار اس کے سر اور چہرہ
پہ کر کے دو منٹ میں ہی اس کو ہوش سے بیگانہ کر دیا تھا۔
اس کے سر کے پچھلے حصے سے خون تیزی سے رواں ہوا تھا۔ وہ
آدمی آگے بڑھ کر ابھی مزید کوئی بھی وار کرتا جب دائیں سائیڈ
سے سوسائٹی آفس سے نکلتا رانم خان تیز بارش میں دھندلا سا
اسے دیکھائی دیا تھا۔

بھاگو یہاں سے وہ آرہا ہے!!۔۔۔ دوسرے آدمی نے موٹر
بائیک کو ریس دیتے ہوئے اپنی ساتھی کو بوکھلاتے ہوئے پکارا
تھا۔

نہیں! میں اس کو زندہ نہیں چھوڑ سکتا، اس کی وجہ سے میرے
بھائی کے بازو توڑے گئے، اس کو گولیاں ماری گئیں، میں بھی
اس کو ایسے ہی گولیاں مار کے تڑپاؤں گا جیسے میرا بھائی تڑپا

تھا۔۔۔ وہ آدمی انزش کے پیٹ میں لات مارتا ہوا غصے سے
پھنکارا، وہ تیزی سے اپنے ساتھی کی طرف بڑھ کر اس کے ہاتھ
سے فٹ سے پسٹل کھینچ کر زمین پہ بے جان پڑی انزش بزدار
کے وجود میں دو گولیاں پیوست کر گیا تھا۔ گولیاں لگنے سے اس
کا جسم پھڑپھڑاہٹ کا شکار ہوا تھا۔ رائم خان گولیوں کی آواز
سن کر تعجب سے بھاگا تھا۔۔

وہ دونوں آدمی پل میں ہی موٹر بائیک پہ سوار ہوتے یہاں سے
رفوچکر ہو گئے۔ رائم خان کے گاڑی کے قریب پہنچنے تک وہ
نکل چکے تھے۔

اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ گاڑی کی پیسنجر سیٹ پہ نگاہیں
دوڑائی تھی اور وہاں پہ انزش بزدار نہیں تھی۔ گاڑی میں روف
لائٹ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی لیکن باہر بالکل اندھیرا تھا۔۔ وہ

اس کو سیٹ پہ ناپا کر تیزی سے اپنے بھاری ہوتے قدموں کے
ساتھ آگے بڑھا تھا۔

دل کسی احساس کے تحت بند ہو رہا ہے۔ دماغ میں سوچیں گڈڈ
ہو رہی تھی۔ حلق میں وحشت کے کانٹے چھنے لگے تھے۔

مس انزش!۔۔۔ رائم خان نے مشکل سے حلق سے آواز
نکالی تھی۔ گولیوں کا ہونے والا شور اور انزش کی گاڑی میں غیر
موجودگی اس کو کسی حادثے کی خبر دی رہی تھی۔۔

مس انزش! رائم خان تیزی سے پیسنجر سیٹ کی طرف آتا، ونڈو
کے ٹوٹے شیشے کی کرچیاں دیکھ کے اب کی بار اونچی آواز میں
بولا تھا۔ ٹوٹے شیشے کے کانچ اس کو اپنے سینے میں پیوست
ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔۔

مس انزش! آپ کہاں ہیں؟۔۔۔ وہ چھپڑتا حلق بل کے
دھاڑا تھا، اس کی غیر موجودگی اس کی جسم سے جان نکال رہی
تھی۔

ابھی وہ مزید کوئی بھی قدم لیتا، جب آسمان پہ بجلی کڑکی تھی اور
اس کی روشنی سارے دھندلے منظر عیاں کر گئی تھی۔ گاڑی
سے کچھ ہی فاصلے پہ پڑی انزش کا وجود بے حس و حرکت تھا۔
خون اس کے سر سے نکل کر بارش کے پانی کے ساتھ سڑک پہ
بہہ رہا تھا۔ دو سکینڈز کا یہ منظر تھا۔ بجلی کی روشنی صرف دو
سکینڈز میں ہی رائم خان کی دنیا تاریک کر گئی تھی۔
حادثہ ہو گیا تھا۔۔ اور یہ حادثہ رائم خان کا سب کچھ تباہ کر گیا
تھا؟

یہ منظر دیکھتے ہی اس کے ہاتھ سے فائل چھوٹ کے زمین بوس
ہوئی تھی۔ جسم سے روح پرواز کر گئی تھی۔ دماغ کی شریانیں
پھٹ گئی، آنکھوں سے بے اختیار پانی جاری ہوا تھا۔

قدموں میں زنجیریں پڑ گئی، جسم مردہ ہو گیا، وہ اپنی ساری ہمت
مجموع کرتا اپنے مردہ وجود کے ساتھ آگے بڑھتا انزس کو فوراً کسی
قیمتی اثاثے کے جیسے اپنی بانہوں میں بھر گیا۔

انزس! آنکھیں کھولو پلیز! تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہو؟
میں تم سے جڑا ہوں، تمہاری خاموشی میری روح فنا کر رہی
ہے۔

پلیز آنکھیں کھولو۔۔ کچھ بولو! رائم خان دیوانوں کی طرح انزس
کا زخمی چہرہ تھپتھپاتا اسے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے

زخموں سے چور لہجے میں التجا کرنے لگا تھا۔ وہ ابھی کچھ بھی
سمجھنے سے قاصر تھا کہ ہوا کیا ہے؟

اسے صرف انزس کی فکر تھی جو اس کی بانہوں میں دم توڑ رہی
تھی اور اس کی زخمی حالت اس کے دل کو چھلنی کر رہی تھی
۔ انزس کا ساکت وجود رائم کا رگوں میں چلتا خون منجمد کر رہا
تھا۔

قلبِ راحت! پلیز اٹھو!! ایسے کسی کو تڑپاتے نہیں ہے۔ اللہ
تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔۔۔۔۔ رائم خان کی کرسٹل گرے
آنکھوں سے آنسو بے اختیار ٹوٹ کے اس کے چہرے پہ پڑے
رہے تھے۔ وہ معصومیت سے ٹوٹے لہجے میں پھر سے ملتی ہوا
تھا۔ وہ شاید انزس کو خدا کا خوف دلا کر اٹھانا چاہتا تھا۔

محبوب کو کھونے کا خوف موت کے خوف سے بھی بدتر اور
اذیت ناک ہوتا ہے۔ انزش بزدار کوئی جواب نہیں دے رہی
تھی اس کی بھوری آنکھیں بند تھیں، اس کے سر سے نکلتا خون
رائم کے کپڑوں میں جذب ہو رہا تھا جس کا دایاں ہاتھ اس کے
سر کے نیچے رکھا ہوا خون سے لت پت ہو گیا تھا۔

انزش!!!۔۔۔ رائم خان زور سے اسے اپنے سینے میں بھینچتا
آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے شکستہ لہجے میں چلایا تھا۔ آنسو
کر سٹل گرے آنکھوں سے نکل کر کنپٹی میں جذب ہونے لگے
تھے جیسے وہ سب کچھ ہار گیا تھا۔

یہ بارش یہ طوفان سب کچھ اپنے ساتھ، رائم خان کا بہا کے،
اڑا کے لے جا رہی تھیں۔۔۔ اس کی محبت اس کی بانہوں
میں دم توڑتی اسے زندہ درگور کر رہی تھی۔

رائم خان اپنے ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ انرش کے بے
سدھ وجود کو خود کے ساتھ لپیٹتا بے جان قدموں سے اٹھ کے
گاڑی کی طرف بھاگا تھا۔ سوسائٹی آفس میں موجود افراد کو باہر کی
کچھ خبر نہیں لگی تھی کیونکہ باہر طوفانی بارش سارے سماعتیں
اور منظر دھندلے کئے ہوئی تھی۔

وہ اس کے بے جان ہوتے وجود کو اپنی گود میں لئے ڈرائیونگ
سیٹ پہ سوار ہوتا کانپتے ہاتھوں سے گاڑی سٹارٹ کر کے یہاں
سے ہاسپٹل کیلئے نکلا تھا۔ وہ اسے پیسنجر سیٹ پہ بٹھا کے خود
سے دور نہیں جانے دے سکتا تھا، وہ اسے اپنے سینے میں چھپا
کے ہمیشہ کیلئے خود میں قید رکھنا چاہتا تھا۔۔

لمحے بڑے ظالم ہوتے ہیں کیا خبر رائم خان اسے اپنے سینے سے
نکالے اور اگلے ہی لمحے وہ اس سے چھین لی جائے؟ وہ آج بغیر

کسی حق کے انزس کو اپنے سینے میں بھینچے شریعی حدود توڑ رہا
تھا۔ دل پہ اس کا اختیار نہیں تھا، اور دل کہاں مانتا ہے
حدودوں کو؟ محبت اگر پاکیزہ اور روحانی ہو تو اس کی جان
بچانے کیلئے حدود توڑ بھی لی جائیں تو گناہ قابل معافی ہوتا ہے۔
وہ اسے اپنے سینے سے لگائے جائز رشتے کی تکمیل تک لیکر جانا
تھا۔

”تمہاری سانسوں سے جڑی میں میری سانسیں“ میں اپنی
سانسوں کو اپنے جسم سے جدا نہیں ہونے دوں گا، میں تمہیں
کچھ نہیں ہونے دوں گا، تمہیں صرف میرے لئے بنایا گیا ہے
اور میں تمہیں ہرگز تقدیر کے ہاتھوں نہیں گنواؤں گا۔ میں لڑ جاؤں
گا تقدیر سے، میں لکھا مٹا دوں گا، اللہ تعالیٰ کو میری محبت کیلئے
اپنا لکھا مٹانا ہو گا۔ وہ اپنے بندوں کی سنتا ہے، اللہ تعالیٰ تمہیں

مجھ سے کبھی جدا نہیں کر سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس جانتی ہے میں تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔۔۔ رائم خان نم آواز میں اذیت اور بے بسی کی انتہا پہ بولتا انزس کو کبھی نہ کھونے کے عہد کرنے لگا تھا۔

کر سٹل گرے آنکھیں ہنوز پانی سے بھری تھیں۔ وہ حدت جذبات اور غم کی کیفیت میں بے ساختہ نیچے جھک کر انزس کے سر پہ لب رکھ گیا۔

رائم خان کے اپنی محبت کو کھونے کے ڈر سے لب اور جسم کپکپا رہا تھا۔ محبت کو اپنی آنکھوں کے سامنے مردہ ہوتے دیکھنا، کائنات کی سب تکلیفوں سے بڑی تکلیف ہے۔

وہ ایک نظر انزس کے چہرے پہ ساکت کئے گاڑی کی سپیڈ آخری حد تک بڑھائے پل میں ہاسپٹل پہنچنا تھا کیونکہ گزرتے وقت کے ساتھ انزس کی سانسوں کی ڈوریاں کٹ رہی تھی۔

دمیر خان کچھلے آدھے گھنٹے سے ہمیشہ کی طرح زربخت کو اپنی گود میں لئے وقفے وقفے سے اس کی پیشانی چومتے ہوئے صبر کی تلقین کر رہا تھا لیکن وہ ہر تھوڑی دیر بعد اپنی ماں کی کوئی نہ کوئی بات یاد کر کے بلک بلک کے رو دیتی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے کھانا اسے کھلا چکا تھا۔ وہ دونوں ہر روز کی طرح آج بھی کارپٹ پہ بیٹھے تھے کیونکہ نیچے کارپٹ پہ بیٹھ کے رونے کی عادت زربخت کو شروع دن سے تھی۔

بخت! میری جان!! بس کرو خود کو اور اذیت مت دو،
تمہارے آنسو مجھے اذیت دیتے ہیں۔ میرے بارے میں سوچو،
مجھ پہ کیا گزرتی ہے جب تمہاری پیاری آنکھوں سے آنسو بے
لگام ہو کے نکلتے ہیں؟ مجھ پہ اور اپنی آنکھوں پر رحم کھاؤ!!
دیکھو! تمہاری آنکھیں رو رو کے زخمی ہو رہی ہیں۔۔۔ تمہارا چہرہ
مرجھا رہا ہے۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ رہے ہیں۔ اب تم ہر گز
نہیں روؤں گی کیونکہ میں تمہیں مرجھایا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ تم
میرا روشن بخت ہو، میں ہمیشہ تمہیں چمکتے ہوئے دیکھنا چاہتا
ہوں۔ تمہاری ذات کی روشنی میرے وجود کو پر نور کرنوں سے
منور کرتی ہے۔۔۔ تمہارا وجود میرے لئے سکون کا آخری ذریعہ
ہے اور آج میں بھی اپنے وجود سے تمہیں سکون مہیا کروں
گا۔ تمہیں دکھوں اور غموں کے بوجھ سے نکال کے لذت اور

سکون کے لمحات میسر کروں گا اور ان سکون کے لمحات میں
تمہارے سارے غم دھندلے ہو جائیں گے۔

وہاں پہ بس میں اور تم ہوں گے، ہماری سانسوں کا شور ہوگا،
تمہاری میٹھی آہیں ہوں گی، میری محبت کی تڑپ ہوگی، میری
شدتوں کا جنون ہوگا۔۔

تمہارے لبوں پہ میرا نام ہوگا، تمہارے محملی بدن پہ میرے
لبوں کے نشان ہوں گے، تمہاری انگلیوں میں میری انگلیاں
پیوست ہوگی، میری خمار آلود نگاہوں میں تمہیں پانے کی تڑپ ہو
گی، تمہارے وجود میں میری قربت سے کپکپاہٹ ہوگی، تمہاری
دھڑکنیں میرے وجود کی لرزش سے رقصاں ہونگی، میں جزبات
کا طوفان بن کے تم میں بہہ رہا ہوں گا، تم اپنے وجود سے مجھے
سیراب کرتی پسینے سے تر ہوگی، میری دھڑکنوں میں تمہارے نام

کا ورد ہوگا، ہم دونوں کے وجود آخری حد ایک دوسرے سے
منسلک ہونگے، اور اس آخری حد پہ آکے ہم دنیا کے مسائل اور
غم پس منظر ڈال کر ایک دوسرے میں کھو جائیں گے۔۔۔ یہ
لمحات میری محبت کو امر کریں گے۔

میرے صبر کو اجر ملے گا، میری تڑپ کو سکون ملے گا، میں
قربت کے ان کے حسین لمحات میں تمہیں خود میں ایسے قید
کروں گا کہ تم میرے وجود میں ضم ہو جاؤ گی۔ تمہارا اور میرا
وجود یکجان ہو کر ایک ہی مکمل وجود کا گمان دے گا۔۔۔ وہ
زربخت کے گردن میں منہ گھسیڑے وہاں پہ اپنے لبوں اور
دانتوں کا لمس چھوڑتا بھاری گھمبیر آواز میں بولتا چلا جا رہا تھا،
الفاظ خود بخود اس کے طوفانی جذبات کا پتہ دے رہے تھے۔

جب سے نکاح ہوا تھا اس نے زربخت سے ایک بار بھی اپنا
حق وصول نہیں کیا تھا۔ وہ نزہت خان کے غم سے نڈھال تھی
اور دمیر ہرگز غم کی حالت میں اس کے جسم کا استحصال نہیں
کر سکتا تھا۔ اسلئے اس نے زربخت کو پورے دو ہفتے دیئے
تھے سنہلنے کیلئے، غم سے نکلنے کیلئے، ازدواجی تعلق کو سمجھنے کیلئے
، دمیر خان نے شروع دن سے اسے اپنے لمس سے شناسا رکھا
تھا تا کہ وہ آہستہ آہستہ سے ان کے بیچ کے تعلق کی حقیقت کو
سمجھ جائے۔۔

یہ دو ہفتے دمیر خان نے بڑے ضبط سے گزارے تھے۔ انسان
غم کی حالت میں سکون تلاش کرتا ہے، اپنی حق حلال کی بیوی
رات بھر بانہوں میں ہونے کے باوجود بھی اس نے اس اپنے
سکون کا ساماں نہیں کیا تھا صرف زربخت کی حالت کا سوچ کر

لیکن آج بھی اس کی مسلسل شروع دن والی حالت دیکھ کر
دمیر خان نے اسے اور خود کو غم کی کیفیت سے نکال کے سکون
پہنچانے کا عہد کیا تھا۔

زربخت ہرگز اپنی ماں کی جدائی نہیں بھول رہی تھی، اسے اس
جدائی کی اذیت سے نکالنے کیلئے دمیر خان کی طرف سے ازدواجی
رشتے کی باقاعدہ شروعات کرنا ضروری تھی تاکہ اس کا تھوڑا نئے
رشتے کی طرف دھیان بٹے اور وہ غم کے بوجھ سے آزاد ہو۔
دمیر!!۔۔۔ زربخت مسلسل اس کے لمس پہ ہچکچا رہی تھی
، وہ اس کا چہرہ اپنی گردن سے دور ہٹانے کی کوشش کرتی بھیگی
ہوئی آوازیں بولی۔۔۔ اس کی ساری باتیں اس کے سر کے اوپر
سے گزری تھی، اس نے تو بس دمیر خان کے سینے میں منہ چھپا

کے رونے پہ زور دیا ہوا تھا۔ زربخت کے آنسوؤں سے دمیر
خان کی سینے سے شرٹ بھیک چلی تھی۔۔۔
بولو کیا ہوا ہے متاعِ من؟۔۔۔ وہ اس کی گردن کی سکن اپنے
لبوں میں دبا کے چھوڑتا خمار آلود نگاہوں سے اسے دیکھ کے
استفسار کرنے لگا۔

مجھے مورے کی بہت یاد آتی ہیں، کیا آپ مجھے صبح ان کے پاس
لیں جائیں گے؟ وہ مجھے خواب میں بھی نہیں ملتی۔۔۔ میں اپنی
آنکھوں کے سامنے ان کا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ ان کو دیکھنے
سے مجھے سکون ملتا ہے، میں ان کو کبھی بھلانا نہیں چاہتی۔۔۔
مورے نے میرے ساتھ بہت برا کیا ہے۔ مجھے یہاں اکیلا
چھوڑ کے چلی گئی ہیں، میرے اس بے ضرر وجود کو اپنے ساتھ
لیکر چلی جاتی تو ان کا کیا چلا جاتا؟ مجھے اس دنیا میں مورے کے

بغیر نہیں رہنا۔ یہ دنیا ان کے بغیر ویران صحرا ہے، یہاں پہ
میں کھو جاؤں گی، میں مرجانا چاہتی ہوں۔ یا اللہ مجھے میری
مورے کے پاس بلا لیں۔۔

بخت!! یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ بولنے سے پہلے سوچ تو لیا کرو کیا
بول رہی ہو؟ ایسی جاہلانہ دعائیں کون کرتا ہے؟ بتاؤ مجھے؟۔۔۔
دمیر خان اس کی آخری بات سن کے اونچی آواز میں بولتا اسے
سختی سے ڈپٹنے لگا۔

زربخت کی مرنے والی بات اس کے دل کو دھچکا لگا لگائی تھی۔
ایسا لگا جیسے کسی نے اس کی سانسیں حلق میں گھونٹ دی ہو
۔۔ وہ جو کہ ہچکیوں سے روتی اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی،
اس کے ڈپٹنے اور اس کی اونچی آواز سن کر سہمتے ہوئے اس کی
گود سے نکلنے کی تگ و دو کرنے لگی تھی۔

دمیر خان زندگی میں پہلی بار اتنی اونچی آوازیں اس سے مخاطب
ہوا تھا۔۔۔ زربخت اس کے لہجے اور چہرے کے کرب زدہ
تاثرات دیکھ کے ڈر گئی تھی۔

بخت! میری بات سنو، ادھر میرے پاس آؤ! میں تمہیں صبح
پھوپھو کے پاس لے جاؤں گا۔۔۔ ایسے روتے نہیں ہیں۔۔۔
تمہارا رونا پھوپھو کی روح کو تکلیف میں مبتلا کرتا ہو گا۔ کیا تم
چاہو گی کہ تمہاری مورے تمہارے آنسوؤں کی وجہ سے تکلیف
میں رہیں؟ نہیں نہ! تو آج سے تم پھوپھو کی جدائی میں آنسو نہیں
بھاؤ گی، بلکہ جب بھی رونا آئے گا، ان کیلئے مغفرت کی دعا کرو
گی۔ اللہ تعالیٰ ان کیلئے قبر کو سکون کی جگہ بنائے اور ان کو اپنے
نیکو کاروں بندوں میں شامل کر کے ان پہ اپنا کرم کرے، اللہ
تمہاری مورے اور میری پھوپھو کو کروٹ کروٹ جنت

نصیب کرے آئین!۔۔۔ دمیر خان کی ان دعاؤں پہ زربخت
نے روتے ہوئے آئین دہرایا۔

یہاں میری طرف دیکھو بخت!۔۔۔ وہ اس کا جھکا ہوا چہرہ
اپنے دونوں ہاتھوں میں بھرتا اسے اپنی طرف متوجہ کروانے
لگا۔

میں پھوپھو کی کمی کبھی بھی تمہاری زندگی میں پوری نہیں کر سکتا
کیونکہ ماں کا کوئی متبادل رشتہ نہیں ہوتا لیکن میں اپنے رشتے کے
توسط سے تمہیں دکھوں سے دور لے جا کر سکون کے پل مہیا کر
سکتا ہوں۔۔۔ تم نئے رشتے کی شروعات سے سارے پرانے غم
بھول جاؤ گی۔۔۔ تمہیں بس ایک ہی نام یاد رہے گا اور وہ ہو گا
”دمیر خان آفریدی“۔۔۔۔۔ وہ ایک جست میں زربخت کو اپنے

چہرے کے قریب کرتا ٹھہرتے ہوئے لہجے میں سمجھانے کے
بعد بے تابی سے اس کی گلاب کی پنکھڑیوں پہ حملہ آور ہوا تھا۔
وہ اس کی کمر کو مٹھی میں جکڑے اس کے لبوں کو اپنے ہونٹوں کی
آہنی گرفت میں لیتا شدت سے سک کرنے لگا تھا۔ زربخت جو
پہلے ہی اس کے لمس سے ان کمفرٹبل محسوس کر رہی تھی۔
دمیر خان کو اپنے لبوں پہ قابض ہوتا دیکھ کر جنجھلاتے ہوئے
اس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر اپنے لب چھڑوانے کی سعی کی
تھی لیکن وہ اس کے لب چھوڑنے کی بجائے اس کو پچھلی
گردن سے پکڑ کر اس کے لبوں کو مزید اپنے ہونٹوں میں پیوست
کرتا جنونی ہوا تھا۔ وہمپاسوں کی طرح اس کے رسیلے لبوں اور
زبان کی نمی سک کرتا دو منٹ میں ہی زربخت کا حلق تک خشک
کر گیا تھا۔ زربخت شرم سے آنکھیں میچے اسکے لمس کی تپش سے

خود کو آزاد کروانے کی کوشش کرتی مسلسل مزاحمت کر رہی تھی۔

دونوں کی سانسیں اب پھول رہی تھی۔۔۔ وہ اس کی مزاحمت پہ جھجھلاتے ہوئے ایک دم سے اسے اپنی گود میں لئے اٹھا تھا، وہ آج صوفے پہ جانے کی بجائے بیڈ کی طرف بڑھا تھا۔ دمیر خان احتیاط سے زربخت کو بیڈ پہ لیٹاتا خود اس کے اوپر آیا تھا۔ وہ اس کے لبوں ساتھ ہنوز لیٹا ہوا تھا۔

زربخت کو شرم اور ڈر سے عجیب سی جسم میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ دمیر خان کو صوفے کی طرف جانے کی بجائے بیڈ پہ آتا دیکھ کر اس کا ننھا سادل لرزا تھا۔ اس کی سانسیں بند ہوتی محسوس کرتا دمیر مشکلوں سے اس کے لبوں کو آزادی بخشتا

تھوڑا سا اوپر اٹھ کر آج پہلی بار زربخت کے سامنے اپنی شرٹ
اتار کے دور اچھالتا پھر سے اس کے چہرے پہ جھکا تھا۔
میں تمہیں آج زندگی کی نئی لذتوں سے متعارف کرواؤں گا، تمہارا
اور میرا وجود ایک ہو کر لذت کی انتہا کو پہنچے گا، میں تم میں سفر
کرتا اپنے اور تمہارے درمیان کے سارے فاصلے مٹا کے تمہیں
اپنے نرم گرم جاندار لمس، لبوں کی تڑپ اور جسم کی طلب سے
متعارف کرواؤں گا، میں تمہاری روح کی گہرائیوں میں کھو کر
تمہارے وجود کا ہر پردہ فاش کرنا چاہتا ہوں، میں تمہاری روح کی
گہرائیوں کو اپنے لمس سے ماپنا چاہتا ہوں۔ دمیر خان نرمی سے
اس کے گلابی گال لبوں میں دبا کے چھوڑتا خمار سے بھری آواز
میں بولا تھا۔ اس کا انداز بہکا ہوا تھا، دمیر خان کا آج ارادہ ہرگز

زربخت کو بخشنے کا نہیں تھا وہ آج ہر حال میں اس سے اپنا حق
وصولنے کا ارادہ رکھتا تھا۔۔

د۔۔ دمیر!۔۔۔ زربخت شرم کے مارے آنکھیں بند کرتی اپنی
لرزتی آوازیں اس کو مخاطب کر رہی تھی۔ وہ دمیر کو بغیر شرٹ
اور اس پہ تضاد اسکی آنکھوں میں چھائی خمار کی سرخی جسم کی
تپش اور اس میں تبدیلیاں محسوس کر کے ڈر کے مارے
اس کے حلق میں کانٹے چھبے تھے۔

متاعِ من۔۔۔ وہ محبت سے لبریز لہجے میں بولتا زربخت کو
تھوڑا سا اوپر کی طرف اٹھا کے اس کی شرٹ کو نیچے سے پکڑ کر
ایک پل میں اس کے بدن سے ریموو کر گیا تھا۔

دمیر!!۔۔۔ اپنی شرٹ ریموو ہوتے دیکھ کر زربخت بے
یقینی سے چلائی۔ وہ شرم سے دوہری ہوتی تیزی سے اپنے پاس

پڑی شرٹ اٹھا کے خود کو چھپانے لگی تھی۔ دمیر خان کا چوڑا
کٹاؤ دار برہنہ سینہ اور بازوؤں کے پھولے مسلز دیکھ کے اس کی
حالت غیر ہونے لگی۔ زربخت حیا اور خوف سے بے ہوش
ہونے کے درپہ تھی۔ وہ تیزی سے خود کو شرٹ سے کور کرتی
اٹھ کے چھپے ہیٹی تھی۔۔

بخت! میرے دل کی دھڑکن!۔۔۔ دمیر میٹھے لہجے میں بولتا اس
کے قریب ہوا۔ وہ نرمی سے ایک ہاتھ زربخت کے گال پہ
جمائے اس کے لبوں کو پیار سے چومنے لگا تھا۔ اس کے لمس
پہ وہ پھر سے ہچکچائی اور شرٹ پہ ہاتھ کی گرفت ڈھیلی ہوئی، دمیر
خان اسے آہستگی سے چھپے تکیے پہ پٹکتا اسے ڈیپ کس کرنے لگا
تھا۔

زربخت اس کے لب اور دانتوں کا دباؤ اپنی زبان پہ محسوس
کرتی بے ساختہ اپنی شرٹ چھوڑ کر دمیر خان کے کندھوں پہ ہاتھ
جماتی اسے چھپھٹنے کا اشارہ کرنے لگی تھی جبکہ وہ دور ہٹنے کی
 بجائے دوسرے ہاتھ سے اس کی شرٹ اس کے وجود سے ہٹا
کے دور بیڈ پہ اچھالتا، اس کے آخری پردے میں انگلیاں
الجھائے ایک پل میں زربخت کے نازک سراپے کو ہر پردے
سے آزاد کر گیا تھا۔ وہ ایک دم زربخت کے لبوں کو چھوڑتا اس
کے نازک سراپے پہ جھکا تھا۔ اس کی اچانک حرکت پر
زربخت کی آنکھیں پھیلی تھیں۔ دل اچھل کے حلق میں آیا تھا۔۔
دے۔۔ دمیر!! یہ کیا کر رہیں آپ؟۔۔ وہ اس کے پاگل لمس پر
خود میں سمٹنے لگی۔

شش!! میں محرم ہوں تمہارا!! میں اب سے تمہارا لباس ہوں۔
مجھ سے پردے کرنا چھوڑ دو۔۔ تمہارے وجود کے ایک ایک
انچ پہ میرا حق ہے اور میں اپنے حق کو پورے استحقاق
سے چھوؤں گا بھی اور دیکھوں گا بھی۔۔۔ دمیر خان بے
قراری سے اس کے سراپے کی نازکی کو اپنے لبوں میں محسوس
کرتا مدہوش ہو رہا تھا جب زربخت کی پکار سن کر وہ
اسے اپنی خمار سے لہو چھلکتی آنکھیں اٹھا کے دیکھتا گھمبیر آواز
میں حق جتانے والے انداز میں بولا۔
وہ اس کا دودھیا سفید مخملی نرم و نازک وجود دیکھ کے اپنا خشک
حلق تھوک نگل کے تر کرتا پھر سے اس کے سینے کی نازک سی
ابھری ساخت پہ جھکا تھا۔ وہ بے دردی سے اس کی نازکی کو

لبوں اور ہاتھوں میں جکڑتا زربخت کی ننھی سی جان لبوں پہ لے
آیا تھا۔۔

اہہ!! دمیر دور ہٹیں۔۔۔ زربخت اس کے بے رحم لمس پہ
جھپٹاتی دمیر خان کے بالوں سے پکڑ کر اس کا چہرہ دور کرتی اپنے
سینے کی ناز کی کو اس کے لبوں اور ہاتھوں سے رہائی دلوانے کی
جستجو کرنے لگی۔

اس کا چہرہ اور وجود ہر جذبات سے عاری تھا۔ اس کے چہرہ اور
جسم میں سوائے خوف اور شرمندگی کے کچھ نہیں تھا۔ دمیر
خان کا لمس اس پر مدہوشی طاری نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ اس کے
لمس پہ دو بدو ہو رہی تھی۔ جس انسان کو ساری زندگی محرم کی
نظر سے دیکھا ہی نہ ہو، اس پہ اپنا جسم عیاں کرنا مشکل ہوتا
ہے اور زربخت بھی اتنی جلدی دمیر خان کے بے باک لمس کو

نہیں قبول کر سکتی تھی۔ اس نے ہمیشہ اس کو لالا بولا اور سمجھا
تھا لیکن اچانک نکاح کی وجہ سے وہ اس کی نزدیکی پہ ہمیشہ کنفیوز
ہو جاتی تھی۔

پہلے وہ صرف لبوں تک آتا تھا، زربخت وہ بھی مشکل سے ہضم
کرتی تھی۔ اب اپنے وجود تک اس کی رسائی اس کو پریشان کر
رہی تھی یا شاید یہ کچی عمر کا نتیجہ تھا جو وہ اپنے محرم کے لمس کو
پہچان نہیں پا رہی تھی جبکہ دمیر خان کی حالت زربخت سے
مختلف تھی۔۔

وہ تیس سال کا بھرپور جوان مرد جس کے اندر جذبات کا لاوا بھرا
ہوا تھا۔ وہ جلد از جلد اپنا سارا لاوا اس کی روح میں اتر کر اس
میں منتقل کرنا چاہتا تھا۔ جذبات کی تپش اور ملن کی تڑپ پہ دمیر
خان کو پورا جسم اور چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔ اس کا دھکتا

بدن اس کے جذبات کی گرماہٹ کا پتہ دے رہا تھا۔ اس کی
محبت اس کی پسندیدہ عورت اس کے حصار میں پڑی اسے پاگل
کر رہی تھی۔۔

اس کے جذبات پہ بندھ بند ٹوٹ رہے تھے۔ وہ بے تابی سے
اس سے تھوڑے سے فاصلے پہ ہوتا اپنی پینٹ کے ساتھ چھیڑ
چھاڑ کرتا اسے ایک جست میں ریمو و کرتا تیزی سے زربخت کو
سمجھ لگے بنا اس کی دونوں ٹانگوں کو پکڑ کر تعریض کرتا آگے جھک
کر پردے کے اوپر سے ہی زربخت کی انر تھائیز پہ اپنے وجود کا
دباؤ دینے لگے تھا۔

دمیر!۔۔۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر بے یقینی سے چلاتی خوف
سے آنکھیں میچ گئی تھی۔ اس کیلئے دمیر کو ایسی حالت اور حد
جذبات سے تپتے وجود کے ساتھ دیکھنا ناقابل برداشت تھا۔

وہ ہلکا سا اپنا بدن اس کی تھائیز کے درمیان موو کرتا اس کی
دھڑکنوں پہ اپنے دانتوں کی بے رحمی دیکھانے لگا تھا۔
سس!! چھوڑیں! مجھے درد ہو رہا ہے۔۔۔ وہ اس کی بے باک
حرکت پہ ساکت ہوئی تھی۔ جسم میں سنسنی دوڑی تھی۔ وہ
سانس روکے اور انکھیں بند کئے دمیر کو خود سے چھپھٹانے کی
کوشش کرتی اس کے بے رحم لمس پہ سسکتے ہوئے بولی جبکہ
اس کا گرم لمس اپنی تھائیز کے درمیان گردش کرتا زربخت کی
جان صحیح معنوں میں نکال رہا تھا۔

مزاحمت کرنا بند کرو بخت!! ساری فضول سوچوں کو جھٹکو اور
میرے بارے میں سوچو۔۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں
میرا روشن بخت!! میرے سکون کا ذریعہ ہو تم!۔۔۔ دمیر
خان اس کے سینے کو اپنے لبوں سے آزادی بخشتا اس کی گہری

نیلی آنکھیں چوم گیا تھا۔ وہ تھوڑے سا چھپہٹ کے اس کی
تھائیز کے درمیان نازکی پہ دباؤ ڈالنے لگا تھا۔

وہ ایسا کر کے شاید زربخت کو اپنے لمس پہ مدہوش کر کے اپنی
قربت کیلئے تیار کرنا چاہتا تھا جو وہ بالکل بھی نہیں ہو رہی تھی
بلکہ وہ اس کے لمس پہ اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہو رہی تھی۔

پلیز!! دمیر دور ہٹیں مجھ سے!! مجھے نہیں چاہئے ایسا سکون جو
شرمندگی اور تکلیف کا باعث ہو۔۔۔ وہ اس کی بے باک

جسارتوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اونچی آواز میں چلائی تھی۔۔۔
اس کیلئے دمیر خان کا لمس ناقابل برداشت تھا۔۔۔

چھوڑیں پلیز۔۔۔ وہ اس کی حصار سے نکلنے کی کوشش کرتی ملتی
ہوئی۔ دمیر خان اس کی بات سن کے اپنی جگہ پہ ساکت ہوا

تھا۔ آنکھوں میں بے یقینی، غصہ اور حیرت در آئی تھی۔ جسم
بے اعتنائی کے کوڑوں کی زد میں آیا تھا۔

میرا لمس تمہارے لئے شرمندگی اور تکلیف کا باعث ہے
؟۔۔۔ دمیر خان نے بے یقینی اور شدید طیش کے عالم میں
اس کے الفاظ دہرائے تھے۔

ہاں میرے لئے ہے!!۔۔۔ وہ دل میں سہمتی بظاہر سپاٹ لہجے
میں جواب دیتی خود کو کمفرٹر میں چھپا گئی تھی۔ اس کی نیلی
آنکھوں میں بے اعتنائی کے ساتھ خوف کی رمق بھی واضح
تھی۔

ٹھیک ہے!! میں آئندہ تمہیں اس شرمندگی اور تکلیف سے دوچار
نہیں کرواؤں گا۔۔۔ وہ اس کا جواب سن کے سپاٹ لہجے میں
چلاتا ہوا بے ساختہ زربخت سے دوری اختیار کرتا اپنی حالت

درست کرنے لگا تھا۔ دل اندر سے اس بے اعتنائی اور نا
آشنائی سے ٹوٹ کے ہزاروں ٹکڑوں میں تقسیم ہوا تھا۔۔۔ چہرہ
کرب زدہ ہوا تھا۔

کمال صرف تھا دمیر خان کا جو جوان جذبات کی انتہا پہ پہنچ کے
سکون لئے بنا خاموشی سے ہٹ گیا تھا، کوئی اور مرد ہوتا تو اپنی
بیوی کا استحصال کر کے حق لئے بنا واپس نہ ہٹتا لیکن وہ دمیر خان
اور اس کے جذبات اور لمس کو شرمندگی اور تکلیف کا نام دینے
والی اس کی بچپن کی محبت تھی۔ وہ کیوں اپنی بخت کا
استحصال کرتا بھلا؟ جب اس کی بخت نے منع کر دیا تو وہ
زبردستی کا قائل ہر گز نہیں تھا لیکن زر بخت کی اس حرکت نے
اسے دھچکا ضرور دیا تھا۔ شدید غصہ دلایا تھا مگر وہ ضبط کرنے
لگا۔

وہ اس کے چلانے پہ آنسو ضبط کرنے لگی جبکہ دمیر خان اپنی شرٹ کے بٹن بند کرتا چھپڑا ہی تھا جب کارپٹ پہ پڑا ہوا اس کا فون رنگ ہوا تھا۔ اس نے سنجیدگی سے نیچے جھک کر موبائل اٹھا کے سکرین کی طرف دیکھا۔

رائم خان کا نمبر سکرین پہ رات کے اس وقت جگمگاتا دیکھ کر وہ فکر مند ہوا تھا۔ وہ تیزی سے فون یس کر کے کان کو لگاتا زربخت پہ نگاہ غلط ڈالے بغیر فون کی دوسری سائیڈ رائم خان کی بات توجہ سے سنتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے نکل گیا تھا۔ زربخت اس کے یوں جانے اور اپنی انجانے میں کی گئی حرکت پہ پشیمان ہوتی بے آواز آنسو بہانے لگی۔

مجھے ان کو ایسے نہیں بولنا چاہئیے۔۔ میں نے ان کا دل توڑ دیا۔ وہ اب مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔۔۔ وہ اس کا کرب زدہ

چہرہ اور خمار سے لہو چھلکتی آنکھیں یاد کرتی خود سے مخاطب
ہوتی رو پڑی تھی۔

وہ اپنی حرکت پہ شرمندہ ہوتی تکیے میں منہ گھسیڑے ہچکیوں سے
رونے لگی تھی۔ اب رات گزر جانی تھی لیکن زربخت نے اپنی
نا سمجھی میں کی گئی حرکت پہ رونا بند نہیں کرنا تھا۔

صبح کے چارج رہے تھے۔ ہاسپٹل کے کوریڈور میں اس وقت
عامر بزدار اور رائم خان ایک پیر پہ کھڑے بے صبری سے ڈاکٹر
کے باہر آنے کا انتظار کر رہے تھے جبکہ دمیر بھی اپنے والدین
کے ساتھ یہاں موجود تھا۔ ان کو رائم خان نے ہی کال کر کے
بلایا تھا کیونکہ انرش کی حالت کے پیش نظر اسکے اپنوں کا ساتھ
ہونا ضروری تھا۔

وہ آپریشن تھیٹر میں پھلے کئی گھنٹوں سے تھی۔ نہ کوئی ڈاکٹر باہر آ رہا تھا اور نہ کوئی انزس کی خیریت کی خبر دے رہا تھا۔۔

رائم خان کی حالت اس وقت اس انسان جیسی تھی جو سمندر کے بیچ بیچ کسی طوفان کی لپیٹ میں ہو اور طوفانی لہریں اس کی ناؤ میں چھید کر کے سمندروں کی گہرائیوں میں اس سمیت اس کی ناؤ کو ڈوبنے کے درپے ہو اور وہ جینے کی جدوجہد میں ہاتھ پاؤں مار مار کے تھک چکا ہو۔ اور اب تھک ہار کے بے بسی سمندروں کی تہ میں گمنام ہونے کو تیار ہو۔

بالکل ایسی ہی حالت رائم خان کی تھی۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنا سب کچھ ختم ہوتا دیکھ رہا تھا اور وہ کچھ کر نہیں پا رہا تھا۔ یہ بے بسی کی انتہا تھی۔ وہ ٹوٹے بکھرے وجود کے ساتھ صرف اس وقت تک مضبوطی سے کھڑا تھا جب تک انزس کی

خیریت کی خبر نہیں آجانی تھی، کوئی بھی غیر متوقع خبر سننے کیلئے اس کا دماغ بالکل بھی تیار نہیں تھا۔۔

عامر بزدار نم آنکھوں کے ساتھ دیوار کا سہارا لئے اپنی بیٹی کی دراز عمر کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ انہوں نے ماضی میں جوان اور محبت کرنے والی شریک حیات کا ساتھ کھویا تھا۔۔ وہ صدمہ ان کیلئے کافی گہرا تھا۔ اب ان کی بوڑھی ہڈیوں میں انزس کو کھونے کی طاقت بالکل بھی نہیں تھی۔۔

انہوں نے ایک بار بھی دمیر خان اور اس کے والدین کو مخاطب نہیں کیا تھا۔ وہ ان کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہے تھے کیونکہ ان کے مطابق انزس کی تکلیف کے ذمہ دار صرف دمیر خان اور اس کے والدین ہی تھے۔ اس میں ان کی بھی کوئی غلطی نہیں تھی۔ کئی بار باتوں ہی باتوں میں انیسہ خان

نے انزس کو اپنی بہو بنانے کی خواہش ان کے سامنے ظاہر کی
تھی اور عامر بزدار نے ہر بار ان کی خواہش کا احترام کرتے
ہوئے اپنی بیٹی کا رشتہ زبانی کلامی ان کے بیٹے کو دے دیا تھا۔
بس انیسہ خان کی طرف سے بنا سوچے سمجھے رشتے کیلئے کی گئی
پہل عامر بزدار اور ان کی بیٹی کا دل دکھانے کا باعث بنی تھی اور
وہ اپنی بیٹی کا دل دکھانے والوں کو کسی صورت اپنائیت بھرے
احساس سے نہیں مل سکتے تھے۔۔

دمیر خان خاموشی سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے سینے پہ ہاتھ
باندھے حیرانگی سے رائم خان کی غیر ہوتی حالت ملاحظہ فرما رہا تھا
جبکہ انیسہ اور اسد اللہ خان بیچ پہ بیٹھے کسی اچھی خبر کے منتظر
تھے۔ سب کے چہرہ اس وقت فکر مندی میں مبتلا تھے۔

انیسہ خان اپنی بھانجی کیلئے مسلسل رو رہی تھی۔ وہ بس اللہ
تعالیٰ سے انزس کی صحت والی لمبی زندگی کی بھیگ مانگ رہی تھی
۔ اپنے بیٹوں کے بعد صرف انزس ہی تھی جو ان کو بے حد
پیاری تھی۔۔۔

خان!! آجاؤ بیٹھ جاؤ تھوڑی دیر! ایسے کھڑے رہ رہ کے تھک
جاؤ گے۔ پھلے کتنے گھنٹوں سے تم کھڑے ہو۔۔۔ دمیر خان
اپنے سینے سے بازو ہٹاتا دو قدم رائم خان کی طرف لیتا فکر مندی
سے بولا۔

اس کیلئے اس کو بکھری ہوئی حالت میں دیکھنا تکلیف دہ تھا۔
اا کے سارے کپڑے اور ہاتھ انزس کے خون سے لت پت
تھے۔ کرسٹل گرے آنکھوں میں غم کی جھلک لہو بن کے ٹپک
رہی تھی۔ ڈارک براؤن بال بے ترتیب ہو کے ماتھے پہ

بکھرے ہوئے تھے۔۔ رائم خان کی ملجلی سی دیوانوں کے
جیسی حالت کوئی اندھا بھی دیکھ کے بتا سکتا تھا کہ اس کو عشق کا
مرض لاحق ہے۔

سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ دمیر خان بے اختیار اس کے
کندھے پہ ہاتھ رکھتا دلاسہ دینے لگا۔۔

وہ آسانی سے اپنے دوست کی آنکھوں میں جلتے محبت کے دئیے
پہچان سکتا تھا۔ پہلے دمیر خان کو شک تھا مگر آج اس کی دیوانوں
کے جیسی حالت چیخ چیخ کر اس کی محبت کی گواہی دے رہی
تھی۔۔

کیسے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا؟ اس کو گولیاں لگیں ہیں۔ سر پہ
جان لیوا ضربیں لگائی تھی۔ خون سارا ضائع ہو چکا تھا۔۔ میں
طوفان میں کیسے امید کا دیا جلاؤں؟ ہوائیں، موسم، ماحول،

حالات، تقدیر سب کچھ میرے خلاف ہے۔۔۔ رائم خان
اس کے گلے لگتا اس کی گردن میں منہ گھسیڑے شکستہ لہجے میں
بولا تھا۔ وہ اس کا دوست تھا۔ وہ اپنے دوست سے بلا جھجھک
اپنے دل کی حالت بیان کر سکتا تھا۔۔

محبت میں امیدوں کی دئیے کبھی نہیں جھٹتے، محبت میں بہت
طاقت ہے۔ محبت سب سے لڑ جاتی ہے۔ محبت تو طوفانوں
کو بھی مات دے دیتی ہے۔ پھر یہ موسم یہ ہوا، یہ تقدیر، سب
کچھ بہت معمولی چیزیں ہیں۔

محبت سچا اور پختہ جذبہ ہے۔۔ اس کے دیپ کوئی نہیں بجھا
سکتا۔۔۔ دمیر خان اس کے گرد اپنے بازوؤں کا حصار باندھتا
دلاسہ دینے والے انداز میں گویا تھا۔

اب دمیر خان اتنا بچہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس کی آنکھوں میں
انزس کیلئے بے پناہ محبت کی تحریر نہ پڑھ سکے۔۔

چلو! تم واشروم جاؤ! اپنے ہاتھ دھو کے آؤ، اور یہ خون آلود
کوٹ بھی اتار دو۔ باقی تیری کلاس میں فرصت سے لوں گا، جو تو
نے میری ناک کے نیچے مجھے خبر لگے بنا، محبت کی کھچڑی پکائی
ہے، اس کو پورے جہان میں بانٹ کے تیری خفیہ محبت کا
ڈھنڈھو راپیٹ کے تجھے ننگا نہ کیا تو میرا نام دمیر خان آفریدی
نہیں۔۔۔ وہ ماحول میں افسردگی چھائی دیکھ کر ہلکے بھلکے انداز
میں رائم خان کو دھمکی لگا گیا۔۔

وہ ٹھیک ہو جائے اور میری محبت کو قبول کر لے پھر مجھے بے
شک سارے جہاں کے سامنے کھڑا کر کے پٹوا لینا۔۔ میں ہنسی
خوشی ہر درد اور تکلیف برداشت کر لوں گا۔۔۔ رائم خان زخمی

سا مسکراتا اس کی پہلے والی بات چھوڑ کر دوسری کا جواب دے
رہا تھا۔

اچھا چل میرے مجنوں!! جا کے اپنی حالت درست کر ورنہ وہ
تجھے ایسے بدبودار بالکل قبول نہیں کرے گی۔۔۔ دمیر خان پھر
سے پرانی ٹون میں بولتا اس کو واشروم جانے کا اشارہ دینے لگا۔
جب تک ڈاکٹر باہر نہیں آجاتا، مجھے کہیں نہیں جانا۔۔۔ رائم
خان نے فوراً انکار کیا۔ اس انکار پہ اس نے اس کے ساتھ
زبردستی کرنے کی بجائے خاموشی اختیار کر لی تھی۔
مزید آدھا گھنٹہ اور گزرنے کے بعد بالآخر ڈاکٹر آپریشن تھیٹر سے
باہر نکلا تھا۔ سب ڈاکٹر کو دیکھ کر بے تابی سے اس کی طرف
لپکے تھے۔

میری بیٹی کیسی ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے نہ! کوئی سیریس بات تو نہیں؟ میں اپنی بیٹی سے مل سکتا ہوں؟۔۔۔ ڈاکٹر کو دیکھتے ہی عام بزدار نے اضطرابی کیفیت میں کئی سوال کر ڈالے تھے جبکہ باقی سب بھی بے قراری سے ڈاکٹر کے منہ سے کوئی خیر کی خبر سننے کیلئے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔۔۔

دیکھیں! پیشنٹ کو بہت سیریس کنڈیشن میں یہاں لایا گیا تھا۔ تقریباً اسی فیصد ان کی ڈیٹھ ہو چکی تھی۔ خون کا حد سے زیادہ بہہ جانا، گولیاں جسم میں پیوست ہونا اور دماغ کا پچھلا حصہ مکمل زخمی تھا۔ ایسی حالت میں پیشنٹ کو بچانا کافی مشکل تھا۔۔۔۔۔ ڈاکٹر ٹھہرے لہجے میں بولتا ساری صورتحال سے آگاہ کرنے

لگا۔۔۔

مشکل تھا؟ کیا مطلب ہے آپ کی اس بات کا؟۔۔۔ رائم خان
دو قدم لے کے ڈاکٹر کے سامنے آتا تیکھے لہجے میں سوال کر گیا
تھا۔

اس کو ڈاکٹر کی بات چھبی تھی۔۔۔ سانسیں پھر سے حلق میں اٹکی
تھی جبکہ باقی سب کے چہرے بھی ایک عجیب خوف کی لپیٹ
میں آئے تھے۔۔۔

میرا مطلب ہے ان کو بچانا ہمارے لئے مشکل تھا لیکن ان کا
بچ جانا معجزہ ہے۔۔۔ آپ کی بیٹی زندہ ہے سانسیں لے رہی
ہے۔ گولیاں ہم نے ان کے جسم سے نکال دی ہے۔۔۔ اب
انکی جان تو خطرے سے باہر ہے لیکن!!۔۔۔ ڈاکٹر اپنی بات
کے درمیان اچانک وقفہ لے گیا۔۔۔

لیکن کیا؟ دمیر اور رائم خان نے یک زبان میں سوال کیا تھا۔ وہ
ڈاکٹر کے چہرے پہ آئی پل میں پریشانی دیکھ کر مضطرب ہو رہے
تھے۔۔

پیشنٹ کے دماغ کے پھلے حصے پہ گہری چوٹیں آئی ہیں۔۔ بہت
ہی بے دردی سے ان کے دماغ کے پھلے حصے پہ وار کئے گئے
ہیں۔۔ اور ان واروں کی وجہ سے ان کے دماغ کا پچھلا حصہ
متاثر ہو گیا ہے۔ اور وہاں پہ خون کے لو تھڑے جم گئے ہیں۔
اندرونی زخم اور خون بہاؤ کی وجہ سے RAS اور برین اسٹیم کو
نقصان پہنچا ہے، دماغ پہ دباؤ بڑھنے کے نتیجے میں وہ کوما میں چلی
گئی ہیں۔۔ ہم اب کچھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کوما سے کب باہر آئیں
گی؟ ان کو کوما سے باہر آنے کیلئے تین دن بھی لگ سکتے ہیں یا تین

مہینے یا تین سال!! وہ وقتی طور پر کوما میں گئی ہیں مستقل

نہیں۔۔۔

وہ کب ہوش میں آئیں گی ہم اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتے یہ
پیشنٹ کی ول پاور پہ ڈپنڈ کرتا ہے۔ کہ وہ کتنا جلدی اس حالت
سے باہر آنے کی کوشش کرتی ہے۔ آپ بس اللہ سے ان کیلئے
دعا کریں۔ باقی ہم دوا میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔۔ ڈاکٹر
سنجیدگی سے بولتا عام بزدار کا کندھا تھپتھپا کے آگے بڑھ گیا

تھا۔۔

کوما!۔۔۔ عام بزدار ابھی تک ڈاکٹر کی بات پہ اٹکے ہوئے تھے
۔۔ ان کیلئے یقین کرنا مشکل تھا جبکہ رائم خان اور باقی سب پہ
بھی سکتہ طاری ہوا تھا۔۔ دل دہل اٹھے تھے۔۔

کیا اب میری بیٹی زندہ لاش بن گئی ہے؟۔۔۔ عام بزدار صدمے
سے چور لہجے میں بولتے رائم خان سے مخاطب تھے۔ ان کی
آنکھوں سے آنسو بے اختیار جاری ہوئے تھے۔

بلکل بھی نہیں! وہ انشاء اللہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی! آپ
کے سامنے ہنستی مسکراتی ہوئی آئے گی۔۔۔ ان کے حوصلہ
شکن انداز پہ وہ آگے بڑھ کر ان کو اپنے سینے سے لگائے حوصلہ
دینے لگے تھے حالانکہ اس کا اپنا دل بند ہونے کے درپے تھا۔
سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ لمبی لمبی سانسیں
خارج کرتا خود کو مضبوط کرنے لگا تھا۔

کر سٹل گرے آنکھوں میں غم کی اذیت واضح تھی لیکن وہ اپنی
محبت اور اپنے اللہ پہ کامل یقین رکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات

کبھی بھی اس سے اس کی محبت نہیں چھیننے گی۔ رائم خان کی
محبت کبھی بھی زندہ لاش نہیں بنے گی۔

وہ اس پہ اپنی محبت نچھاور کر کے دوبارہ زندہ کرے گا، وہ اپنی
بے جان محبت کو اپنی سانسیں بخش کے جاندار بنائے گا، بس
یہی امید اور جذبہ رائم خان کو مضبوط بنائے ہوئے تھا۔

جو لوگ کوما میں جاتے ہیں۔ وہ اتنی آسانی سے نارمل زندگی کی
طرف نہیں لوٹتے۔ میری بیٹی بے جان ہو کے رہ جائے گی۔
میں اس کو ایسے نہیں دیکھ سکتا، میرا دل پھٹ جائے گا، عام
بزدار رائم خان کے سینے سے الگ ہوتے تکلیف سے بولے
تھے۔ صدمے سے اور جوان بیٹی کو کھونے کے ڈر سے ان کا
بوڑھانا تو اس جسم کپکپا رہا تھا۔۔

اپنی جوان ہونہار بیٹی کو زندہ لاش بنتے دیکھنا کسی بھی باپ کیلئے
بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔

انکل!! آپ حوصلہ رکھیں۔ انرش کو کچھ بھی نہیں ہوگا، وہ
بہت جلد کوما سے باہر آجائے گی۔ ڈاکٹر نے کہا نہ کہ انرش وقتی
طور پر کوما میں گئی ہے۔ آپ اپنی بیٹی کو جانتے نہیں کہ وہ کتنی
مضبوط ہے۔ وہ آج تک کسی سے بھی نہیں ہاری ہے اور نہ ہی
کسی کے سامنے جھکی ہے۔ وہ زندہ دل بہادر لڑکی زندگی کی بازی
بھی جیت جائے گی وہ بیماری اور موت کو پچھاڑ دے
گی۔۔۔ اب کی بار دمیر خان عامر بزدار کے کانپتے ہاتھ پکڑا سے
دلا سے دینے لگا تھا۔۔

انیسہ اور اسد اللہ خان بھی انہیں اپنے لفظوں سے حوصلہ دینے
کی کوشش کر رہے تھے۔ انیسہ خان کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ

کے عارضوں پہ پھسل رہے تھے جبکہ رائم خان شکستہ انداز میں
پیچھا ہٹا دیوار کا سہارا لے گیا تھا۔

اب رائم کی محبت کا امتحان تھا۔ اب اس کو ثابت کرنا تھا کہ
اس کی محبت کتنی سچی اور پر تاثیر ہے۔۔۔ اسے ثابت کرنا تھا کہ
اس کی محبت میں اتنی طاقت ہے کہ وہ موت سے لڑ کے اس کی
من میں بسنے والی عورت کو واپس لے آئے گی۔۔۔

کیا رائم خان کی محبت انزس کو زندگی کی طرف لے آئے گی؟
رائم خان بار کزئی کی محبت کی ابھی تاثیر دیکھنا باقی ہے۔۔۔

(تین دن بعد)

یا اللہ! اے میرے زندگی بخشنے والے رب! تو رحیم ہے، تو
کریم ہے۔ تیرے لئے تو کچھ بھی کرنا ناممکن نہیں ہے۔ تو

مردوں کو زندہ کر دیتا ہے۔ تو اندھیروں میں اجالے کرتا ہے، تو
ناامیدی میں اپنا کرم کر کے امید کی کرنیں روشن کرتا ہے۔۔۔ تو
سیاہ غموں کی رات کو ایک پل میں خوشیوں بھرے روشن دن
میں بدلتا ہے۔ تو ہر چیز پہ قادر ہے۔ کائنات کی ہر چیز تیری تابع
ہے۔ سب کچھ تجھ پہ عیاں ہے، کچھ بھی تیری ذات سے مخفی
نہیں ہے۔۔۔ تو انسان کی شہہ رگ سے بھی زیادہ اس کے
قریب ہے۔ تو دلوں کے حال جانتا ہے۔ بے شک تو میرے
دل کا حال بھی جانتا ہے کہ میرا دل اس وقت کس اذیت سے
دوچار ہے۔۔۔ میں گنہگار، خطاکار اس قابل ہی نہیں ہوں کہ
تیرے کرم کا حقدار ٹھہراؤ۔۔۔ مگر! اے میرے پروردگار، دو
جہان کے مالک، تو اپنے گنہگار بندوں پہ بھی کرم کرتا
ہے۔۔۔ مجھ پہ بھی کرم کر دے، میری محبت کو مجھے صحیح

سلامت بخش دے، اس کو نئی زندگی عطا کر دے، وہ ہوش
سے بیگانہ زندگی کو ترس رہی ہے۔ اس کو میری عمر لگا دے لیکن
اس کو صحت عطا کر دے۔۔

مجھے پتہ ہے۔ ہم انسان اکثر تجھے تب ہی یاد کرتے ہیں جب ہم پہ
کوئی مصیبت آن پڑتی ہے، جب ہمارا کوئی پیارا ہمیں چھوڑ کے
جارہا ہوتا ہے تو پھر ہم تیرا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں، ہم نے
عبادت کو کام سنوارنے سے منسوب کر دیا ہے۔۔ ہم مطلب
پرست انسان تیری ایک نعمت کا شکر بھی ٹھیک سے ادا نہیں کر
سکتے۔۔ ہم مفاد پرست صرف اپنی ضرورت کے تحت تجھے یاد
کرتے ہیں اور تیری ذاتِ اقدس اتنی شفیق کے کہ تو ہم دو غلے
معیار کے انسانوں کو اس کی پسند چیز عطاء بھی کر دیتا ہے۔ تو
سارے فیصلے ہمارے حق میں کر دیتا ہے کیونکہ تو رحیم و کریم

ہے۔ تو اپنے بندے سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ تجھے اس کی آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں ہوتے، تو ہمارے ایک آنسو پہ ، ایک آہ پہ ، ایک پکار پہ دنیا جہان کہ تمام نعمتیں ہمارے قدموں میں ڈھیر کر دیتا ہے۔ تو اپنے بندوں سے ماں سے بھی سترگنا زیادہ محبت کرتا ہے اور اپنے کمزور بندوں پہ ان کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، جس میں اٹھانے کی ہم میں سکت نہ ہو، وہ غم نہیں دیتا جس کو ہم میں برداشت کرنے کی طاقت نہ ہو۔

یا اللہ!! میں بھی مفاد پرست ہوں۔ میں بھی تیرے در پہ اپنے مفاد کیلئے آیا ہوں۔ میں مطلبی انسان بے بس ہو کے تیرے در پہ اپنی محبت کی سلامتی کی بھیگ مانگنے آیا ہوں کیونکہ صرف تیرا ہی در ہے جو مجھے میری محبت لوٹا سکتا ہے۔

اے میرے پیارے اللہ!! میں جتنا بھی برا ہوں، مفاد پرست
ہوں، جب بھی ضرورت پڑتی ہمیشہ تیرے آگے ہی سر جھکایا
ہے۔۔ تیرے آگے ہی ہاتھ پھیلائے ہیں۔۔ میں نے کبھی کسی
سے تیرے سوا مدد طلب نہیں کی۔ کیونکہ مجھے پتہ ہے میرے
مالک، صرف تیری ذات ہی ہے جو میری خالی جھولی بھر سکتی۔
صرف تو ہی جو لکھا بدلنے کی طاقت رکھتا ہے۔ تیرے سوا میں
کس کے آگے بھیگ مانگوں؟ میں کس کے در پہ جاؤ؟ کوئی تجھ سا
نوازنے والا ہو ہی نہیں سکتا۔۔ کوئی تیرا ثانی نہیں ہے۔ تو
وحدہ لاشریک ہے۔

میں تیرے حضور بیٹھا ہوں اور آج اپنی محبت تجھ سے لے کے
جاؤ گا، میں ضد دیکھاؤ گا، کیونکہ میں جانتا ہوں میری ضد کو فوراً
پورا کیا جائے گا، میرے آنکھوں سے بہتے آنسو تجھ سے نہیں

برداشت ہونگے، تو مجھ گنہگار پہ کرم کر کے میری محبت مجھ کو
تاحیات بخش دے گا۔ بڑی امید لے کر آؤں ہوں تیری بارگاہ
میں، اے سب کے خالق! میری امید کو قائم رکھنا۔
میں نے ساری زندگی تیری جو بھی عبادت کی بس رسمی کی، کبھی
خود کو عبادت میں دلجمعی سے مشغول نہیں کیا۔ میری ساری
نمازیں بغیر توجہ کے تھی، میری ٹوٹی پھوٹی عبادتیں میری ٹوٹی
پھوٹی دعائیں جو میں نے تیرے حضور کی تھی، وہ میری نقص زدہ
تھی۔۔۔ میں عام معمولی سا انسان بھلا کیسے تیری بڑائی بیان کر
سکتا ہوں؟

میں تو تیری نعمتوں کا شکر بھی ٹھیک ہے ادا نہیں کر سکتا۔۔۔

رائم خان دو زانوں ہو کے جائے نماز پہ بیٹھا ہاتھ اوپر دعا کیلئے اٹھائے اپنے رب کے آگے گر گڑا رہا تھا۔ وہ نظریں جھکائے اونچی آوازیں بے بسی سے اپنی رب سے محو گفتگو تھا۔

انزب بے حس و حرکت بیڈ پہ پڑی تھی، اس کا پورا وجود پیٹوں اور نالیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ فجر کی نماز کا وقت تھا اور وہ اس کے روم میں ہی فرش پہ جائے نماز بچھائے نماز ادا کرنے کے بعد دعا میں مشغول تھا۔

وہ کچھلے تین دنوں میں سوائے دو گھنٹوں کے ایک پل کیلئے بھی انزب کو چھوڑ کے کہیں نہیں گیا تھا۔ کل دو گھنٹوں کیلئے وہ اس کے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کیلئے گیا تھا۔ رائم خان نے ان غنڈوں کو پولیس کے حوالے کرنے کی بجائے خود اپنے ہاتھوں سے انہیں عبرت ناک موت دے کے آیا تھا۔ غنڈوں

کی شناخت سی سی ٹی وی فوٹج سے ہوئی تھی۔ ان میں ایک آدمی وہی تھا جس کو رائم خان نے پیٹا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی وہ ان کو پہچان گیا تھا اور پھر اپنے ہاتھوں سے دردناک موت دے کے آیا تھا۔۔

عامر بزدار نے کئی بار اس کو گھر جا کے آرام کرنے کی ہدایت کی تھی لیکن اس نے فوراً انکار کرتے ہوئے ہاسپٹل میں ہی رکنے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ پچھلی تین راتوں سے ایک منٹ کیلئے بھی نہیں سویا تھا۔ وہ ساری رات انزس کے بیڈ کے پاس بیٹھا اس کے ساتھ چھوٹی موٹی باتیں کر کے گزار دیتا تھا۔ اس کی باتوں میں التجائیں ہوتی تھیں، وہ اس سے درخواست کرتا تھا کہ وہ اٹھ جائے، وہ آنکھیں کھولے، اس کی بے قرار روح کیلئے قرار کا ذریعہ بنے۔

تین دنوں میں اس نے انزس کی زندگی اور اپنی محبت کی سلامتی
کیلئے رورو کے دعا کرنے کی حد کر دی تھی۔۔۔ وہ آج بھی کھلے
تین دنوں کی طرح نماز ادا کر کے اشکبار آنکھوں سے دعا کر رہا
تھا۔

تو تو نور ہے جو سات زمینوں کی تہوں سے لیکر سات آسمانوں
تک پھیلا ہوا ہے۔۔۔ اس نور کے صدقے میری دعائیں قبول فرما
۔۔۔ میری ٹوٹی پھوٹی عبادت اور دعا قبول فرما، میرے دل کا
سکون میری من پسند عورت میرے مقدر میں تا عمر لکھ دے۔
یا اللہ! میں نے ساری عمر تجھ سے کچھ نہیں مانگا، کیونکہ تو نے
مجھ جیسے خطا کار کو بن مانگے دیا ہے۔ آج میں تجھ سے مانگ رہا
ہوں۔ میں تجھ سے انزس بزدار کو مانگتا ہوں، مجھے وہ عطاء کر
دے، اس کو پانے کے بعد میں تجھ سے کچھ نہیں مانگوں گا،

کیونکہ اس کی ذات کا حصول میرے لئے کل کائنات ہوگا۔ اس کو پانے کے بعد مجھے کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔۔۔
تجھے تیرے رب ہونے کا واسطہ! مجھ پہ کرم کر مجھے میری من چاہی عورت عطا کر، مجھ میں مانگنے کا ڈھنگ نہیں ہے۔ نہ مجھے ٹھیک سے مانگنا آتا ہے نہ مجھے آداب گفتگو پتہ ہیں نہ مجھے آداب دعا آتے، میں جیسے بھی مانگ رہا ہوں تو میری دعائیں قبول فرما،
اے میرے پروردگار! مجھے اس بوجھ تلے مت دبانا جس کو اٹھانے کی مجھ میں طاقت نہ ہو، اس غم سے مجھے مت دوچار کرنا جس کو سہنے کی مجھ میں سکت نہ ہو، مجھے اتنا مت توڑنا کہ میں دوبارہ جڑ نہ سکوں، مجھ پہ کرم کر، میرے کمزور وجود کو محبت کے کھونے کے درد سے بچالے، میری محبت کی عمر دراز کر، اگر مجھ سے جانے انجانے میں کوئی بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو تو وہ

معاف فرما، اسکی گناہ کی سزا مجھے وہ مت دینا جو میں برداشت نہ کر سکوں۔ میری التجائیں، میری دعائیں قبول فرما اپنے حبیبِ مصطفیٰ کے صدقے!!۔۔۔ آئین ثم آئین۔۔۔ رائم خان کے ہاتھ اشکوں سے بھر گئے تھے۔ وہ اپنی محبت کی دراز عمر کیلئے اتنا رویا تھا کہ شاید ہی کوئی اور مرد اتنا رویا ہو۔ مسلسل تین دنوں سے وہ اپنے رب کے سامنے رو رہا تھا۔ وہ ایک عورت کیلئے رو رہا تھا۔ مرد جب محبت کرنے پہ آتا ہے تو پھر اس کو پانے کیلئے رونے اور گڑ گڑانے سے بھی گریز نہیں کرتا ہے۔ رائم خان کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ انگارہ تھیں۔ اس کے ہاتھ اور لب ابھی تک کپکپاہٹ کا شکار تھے۔ وہ ٹوٹے لہجے میں زمین سے اٹھتا جائے نماز سمیٹ کے سائیڈ پہ رکھتا، منہ میں

کچھ آیتیں پڑھنے کے بعد وہ انزش کے قریب آتا اس کے سر سے
لیکر پاؤں پھونک مارنے لگا۔۔

پھر سے انزش کو بے جان سا بیڈ پہ پڑا دیکھ کے اس کا دل مٹھی
میں جکڑا تھا۔۔ وہ چئیر گھسیٹ کے اس کے بالکل قریب بیٹھتا،
اپنی باتوں کا سلسلہ شروع کرنے لگا تھا، جیسے کہ وہ کچھلے
تین دنوں سے کر رہا تھا۔۔

قلبِ راحت!! تمہیں پتہ ہے۔ میں تم سے کب سے محبت کرتا
ہوں؟ کب سے تمہارے حسن نے میرے دل کا قتل کیا ہوا
ہے؟ میں تمہارے حسن کے سحر میں آج سے دو سال پہلے
گرفتار ہوا تھا۔ جب تم ایک بزنس پارٹی میں دبئی گئی تھی۔
میری خوش قسمتی تھی کہ میں اس پارٹی میں بھی شریک تھا اور
ہماری ملاقات بائے چانس ہوئی تھی۔ میرا ٹکراؤ تم سے اچانک

ہوا تھا۔ میں نے بے دھیانی میں چلتے ہوئے تمہاری ڈریس پہ
جوس گرا دیا تھا اور پھر اپنی ڈریس کی حالت دیکھ کر تم جو مجھ پہ
چلائی تھی۔ وہ لبوں کی جنبش، وہ دنگ انداز، وہ کڑک آواز، وہ
بے خوف لب و لہجہ، بھوری آنکھیں میں اتری غصے کی لالی،
تمہارے چہرے پہ بار بار پڑتی آوارہ زلفیں، تمہارے وجود
سے اٹھتی خوشبو، تمہاری آواز، تمہارا حسن یہ سب چیزیں مجھ
پہ سکتہ طاری کر گئی تھی۔ میں اس وقت تمہاری ڈانٹ ڈپٹ
نہیں سن رہا تھا۔ مجھے تمہارے وہ تلخ الفاظ پھولوں کی برسات
لگے تھے اور میں اسی وقت تمہارے حسن اور محبت میں گرفتار
ہو گیا تھا۔۔ اسی وقت میں نے خود کو تمہارے نام کر کے دل
کا دروازہ کسی اور لڑکی کیلئے بند کر کے چابیاں سمندر میں پھینک
دی تھی۔

میں دو سال سے تمہاری محبت میں مبتلا تھا۔ آج تک ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ کیونکہ میری آنکھوں کو کوئی صورت تمہاری صورت کے سوا بھاتی ہی نہیں۔۔

میں ہمیشہ تمہارے دنگ انداز کی وجہ سے اپنی محبت کے اظہار سے ڈرتا تھا۔ مجھے ڈر لگتا تھا تم سے، جتنی تم بے دھڑک اور دلیر ہو، کیا خبر میں اظہار محبت کروں اور تم بدلے میں مجھے ٹھہر کی سمجھ کے مار مار کے میری چٹنی بنا دو۔۔ بس میں تم سے پٹنے سے ڈرتا تھا۔

محبت سے ڈر نہیں لگتا صاحب!! محبت میں پٹنے اور مکوں گھونسوں کی چٹنی بننے سے ڈر لگتا ہے۔۔۔ وہ ہنوز اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولتا سر جھٹک کر زخمی سا مسکرا دیا

میں تم سے اظہار کیلئے ہمت مجتمع کرتا رہا، موقع کی تلاش میں رہا،
مگر جب بھی اظہار محبت کی ہمت کرتا اور موقع تلاشتا، آگے
سے تمہارا غصیلہ چہرہ دیکھ کے میری سیٹی گم ہو جاتی اور میں بنا
اظہار کئے واپس آجاتا لیکن آج میں ہر خوف بلائے طاق رکھتے
ہوئے یہ اقرار کرتا ہوں کہ مجھے انزس بزدار سے بے پناہ محبت
ہے۔۔۔ اور محبت بھی وہ جو میں تم سے دو جہانوں میں نبھانا

چاہتا ہوں!۔۔۔۔

میں تم سے بے تحاشا، سچی اور کھری محبت کرتا ہوں۔ میرا بے
رنگ وجود ہر وقت تمہاری ذات کی رنگینیوں میں ڈوبا رہنا چاہتا
ہے، میرے ہاتھ تمہاری انگلیوں کا لمس محسوس کرنا چاہتے
ہیں۔ میری آنکھیں ہر وقت تمہارا ہنستا ہوا نورانی چہرہ دیکھنا
چاہتی ہیں، میں تمہیں ہر وقت اپنے سانسوں کے قریب محسوس

کرنا چاہتا ہوں۔۔ غرض کہ میرے جسم کا ہر اعضاء تمہیں
پانے کے لیے تڑپ رہا ہے۔۔

میں تم سے محبت کرتا ہوں قلب راحت!! تم میرے جینے کا
واحد سہارا ہو۔ میری محبت کی تکمیل ہو، انشاء اللہ بہت جلد
تم میری محرم بن کر میری بانہوں میں پناہ گزیں ہوگی اور میں
تمہیں اپنے دل اور زندگی میں پناہ دینے کی بجائے تمہیں وہاں کی
ملکہ بناؤں گا۔۔۔

آنکھیں کھولو انزہ! تمہارا ابھی میرے دل اور وجود پہ حکومت
کرنا باقی ہے۔۔

ابھی باقی ہے تمہارا مجھ سے منسوب ہونا، خوشیاں تمہاری منتظر
کھڑی ہیں۔ زندگی تمہارے انتظار میں ہے۔ اٹھو! زندگی کو گلے

لگاؤ، خوشیوں کو خود میں سمیٹوں۔۔۔ وہ غم سے بھاری ہوتی
آوازیں بولتا، اٹھ کے انزس کے پیروں کی طرف آیا تھا۔
اس نے سوائے حادثے والے دن کے، انزس کو ایک دفعہ بھی
نہیں چھوا تھا۔۔۔ وہ بس فاصلے پہ رہ کر اس کا دیدار اور گفتگو کرتا
رہا تھا۔۔۔

قلبِ راحت! اب مجھے اور مت آزماؤ، میری محبت
کے امتحان کو آخری کرو، میں تمہیں ایسے نہیں دیکھ سکتا
، میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔ میرے جسم سے روح
نکل رہی ہے، میری نبض کی رفتار سست پڑ رہی ہے۔
جب تم مجھ پہ ہجر کی ردا اوڑھنے کی کوشش کرتی ہو تو میری نبض
کی روانی رک جاتی ہے، تم سے جدائی کا خوف مجھ پہ نزع کی
حالت طاری کر دیتا ہے۔۔۔

تم مجھ میں سانس کی نبض بن کر دھڑکتی ہو!

اے نبض آشنا!! اب تو لوٹ آؤ! میں مردہ ہو رہا ہوں۔۔

وہ پھر سے بھاری ہوتی آواز میں انرش سے ہوش میں آنے کی
التجائیں کرنے لگا تھا۔ اس کا چہرہ خاموش درد بھرے اشکوں
سے تر تھا۔۔ لہجہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔۔ دل ویران تھا۔
آنکھیں غم سے نڈھال تھی۔۔

وہ ہمت کر کے اپنے لڑتے ہاتھوں سے انرش کے پیر کمبل
سے نکالتا ان پہ نرمی سے اپنی انگلیوں کا لمس چھوڑنے لگا
تھا۔۔

اے میری رُوح جان!! حرکت کرو! اٹھ کے دیکھو تو سہی اب
تو میں تمہارے پیروں تک پہنچ آیا ہوں۔ اور کتنی منٹیں کروں؟

کتنی التجائیں کروں؟ بتاؤ کس انداز سے تمہیں پکاروں؟ کہ تم اٹھ
کے میری پکار کا جواب دو گی۔

رائم خان کا ضبط ٹوٹا تھا، وہ اشک جو اس کے گالوں تک مقید
تھے، اب حدیں توڑ کے بہتے انزش کے پیروں پہ گرنے لگے
تھے۔۔

یہ حد تھی کسی کے محبت کے امتحان کی، رائم خان کی آنکھوں
سے آنسو نہیں بلکہ خون نکل رہا تھا۔ وہ خون جو انزش کی
خاموشی اس کا دل کا بہا رہی تھی۔۔

وہ گردن بالکل نیچے جھکائے ہوئے تھا۔ اتنی جھکائی کہ اس کی
تھوڑی سینے سے جا لگی تھی۔۔ وہ مضبوط اعصاب کا مالک مرد
آج تیسری دفعہ اذیت سے رو رہا تھا۔۔ وہ اپنی ہچکیوں کا گلے
گھونٹے بے آواز رو رہا تھا۔

گھٹ گھٹ کے رونا زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔۔ وہ نرمی سے اس کے پیروں پہ اپنے ہاتھ کی گرفت جمائے بے ساختہ آنسو بہائے جا رہا تھا جب اچانک انزش کے پیروں میں معمولی سی حرکت ہوئی، لیکن غم کوشی میں بتلا رائم خان نے یہ حرکت نوٹ نہیں کی۔۔

خا۔۔۔۔ خان۔۔۔۔۔ دبی گھٹی ہوئی مدہم سی آواز آنسوؤں کے شور میں رائم خان کے کان سی ٹکرائی تھی۔۔ اس نے چونکتے ہوئے چہرہ اوپر اٹھایا اور بھیگی آنکھوں سے انزش کے چہرہ کی طرف دیکھا تھا، اس کے پیروں پہ رینگتے اس کے ہاتھ تھے تھے۔ انزش نے اپنی آنکھوں کو زرا سی جنبش دی، اور اپنے پیروں کو ہلکی سی حرکت دے کر اس کے ہاتھوں سے دور کرنے چاہے۔۔

یہ منظر دیکھتے اور اس کے پیروں کی نامحسوس انداز میں کی گئی
حرکت محسوس کرتے ہوئے رائم خان کے دل کی دھڑکن رکی،
آنکھیں ساکت ہوئیں۔ وہ بے یقینی سے انرش کے پیروں سے
ہٹ کے اس کے چہرے کی طرف آیا تھا، پیروں سے چہرے
تک آنے کا فاصلہ اس نے تعجب اور معجزے کی کیفیت میں بتلا
ہو کے طے کیا تھا۔

وہ کچھ کہنے کیلئے اپنے لبوں کو حرکت دے رہی تھی لیکن وہ
صاف آواز میں بول نہیں پا رہی تھی کیونکہ خوراک کی نالی کی وجہ
سے اسے بولنے میں دقت ہو رہی تھی۔ آنکھیں نیم کھلی تھی
لیکن زیادہ بند تھیں۔ اسکی ایک آنکھ سے آنسو نکل کر کنپٹی میں
جذب ہوا تھا۔

شش و پنج میں بتلارائٹم نے فوراً اپنے انگوٹھے کے پورے بسے
اس کا آنسو صاف کرتے ہوئے نیچے جھک کر اپنا کان اس کے
لبوں کے قریب لے گیا شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔۔

ایمو۔۔۔ شنل۔۔۔ بلیک۔۔۔ میلر۔۔۔

مجنوا!!۔۔۔ انزش نے مدہم آواز طنر کیا تھا۔۔۔ کو ما کی حالت میں
انسان باقی حرکات سے قاصر ہوتا لیکن وہ سن سب کچھ سکتا

ہے۔

تین دنوں میں رائٹم خان نے جو رونا پیٹنا ڈال کے اسے اٹھانے
کیلئے ایمو شنل ڈائلاگز استعمال کئے تھے۔ وہ اس کی دکھی
حالت اور ڈائلاگز سے شاید اکتا کے ہوش میں آئی تھی۔۔
اسلئے تو ہوش میں آتے ہی پہلے الفاظ منہ سے یہی نکلے تھے
۔۔۔ جتنا رائٹم خان نے اسے ایمو شنل بلیک کیا تھا نہ انزش کا کو ما

سے باہر آتے ساتھ ہی اسے "ایموشنل بلیک میلر مجنو" کا خطاب دینا بنتا تھا۔۔

انزس کی بات سن کے رائم خان کی کرسٹل گرے آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں۔۔ وہ بے ساختہ مسکرا اٹھا تھا۔ دل کی دھڑکن جو پہلے بند تھی اب خوشی کے مارے دوسو کی سپیڈ سے دوڑی تھی۔ پورا جسم میں خوشی میں ڈوب کے ابھرا تھا۔ وہ خوشگوار حیرت سے انزس کے چہرے کو دیکھ کر رہ گیا جو ہوش میں آتے ساتھ ہی اپنی ازلی شخصیت کا انداز دیکھا چکی تھی۔

یا اللہ تیرا شکر ہے تو نے مجھ پہ کرم کیا، مجھے میری محبت لوٹادی، تیری ذات کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔۔۔ رائم خان استعجابیت میں مبتلا سب سے پہلے اس معجزے پہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے لگا تھا جس نے اسکی دعائیں سنی تھیں۔

قلبِ راحت!! تمہارا خطاب سر آنکھوں پر! تمہارا شکریہ جو تم
نے میری مینٹوں اور التجاؤں کا بھرم رکھتے ہوئے مجھے خود سے
ایک نئے سرے نوازا۔۔۔ وہ خوشی سے آنکھوں میں آئی نہی
چھپو دھکیلتا اب کی بار انزس کا شکریہ ادا کر گیا تھا۔۔ رائم خان
کے سارے غم خوشیوں میں بدل گئے تھے۔ مردہ جسم میں جان
ڈال دی گئی تھی۔ اس کے وجود کا پور پور سکون اور خوشی میں
بتلا تھا۔

دل نے بہت کہا اپنی محبت کو بوسے سے نوازوں لیکن رائم
خان اپنے دل کو ڈپٹا بوسہ حلال ہونے تک اسے صبر کی تلقین کر
گیا تھا۔۔

میری بیٹی!۔۔۔ عام بزدار جو کچھلے آدھے گھنٹے سے روم کے
دروازے پہ کھڑے رائم کی ساری دعائیں سن کے حیرت زدہ

تھے۔ انزش کو ہوش آتے ہی اور رائم خان کا اس کو مخاطب کرنا سن کے خوشگوار حیرت سے اندر روم میں داخل ہوئے تھے۔۔۔

میری بچی کو ہوش آگیا۔۔۔ عامر بزدار خوشی اور بے یقینی سے انزش کی طرف لپکے تھے۔

رائم خان جو انزش کے چہرے کو دیوانوں کی طرح دیکھ رہا تھا، عامر بزدار کی آواز سن کر فوراً اچھے ہٹا تھا۔ وہ تیزی سے ڈاکٹر کو بلانے کی غرض سے روم سے نکل گیا تھا۔ عامر بزدار شفقت سے انزش کے ماتھے پہ لب رکھتے اس سے لپٹے تھے ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمکے تھے۔

انزش نے رائم خان کو مخاطب کرنے کے بعد کوئی لفظ مزید ادا نہیں کیا تھا، اس کی آنکھیں ہنوز بند تھیں۔ اس کنڈیشن سے اس

نے آہستہ آہستہ باہر نکلنا تھا چونکہ انزش مستقل طور کو مایں
نہیں گئی تھی، بلکہ سر پہ گہری چوٹ آنے کی وجہ سے وہ وقتی طور
پر کو مایں گئی تھی اس لئے وہ جلدی survive کر کے ہوش میں
لوٹ آئی تھی۔۔

دمیر! انزش کو ہوش آگیا ہے۔۔۔ رائم خان روم سے باہر نکلتے
ہی بیچ پہ میٹھ دمیر سے چمکتے ہوئے مخاطب ہوا تھا۔ یہ بات
بتاتے وقت نہ صرف اس کے لب بلکہ آنکھیں بھی مسکرا رہی
تھی۔۔

واقعی؟۔۔۔ دمیر اور انیسہ خان بیچ سے اٹھتے یک زبان ہو کر
بے یقینی سے بولے تھے۔۔

ہاں سچی!۔۔۔ وہ دمیر کی طرف بڑھتا اس کے سینے سے جا کے
لگا تھا۔

میں دیکھ کے آتی ہوں۔۔۔۔۔ انیسہ خان بے صبری سے
مسکراتی ہوئی انزش کے روم کی طرف بڑھی تھی۔ وہ اور دمیر
خان ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ہاسپٹل آئے تھے۔ انیسہ خان نے
انزش کو دیکھنے کی ضد کی تھی، اسلئے وہ فوراً انہیں ہاسپٹل لے آیا
تھا۔

بہت مبارک ہو تمہیں! دمیر خان اسکے گرد اپنے بازوؤں کا
حصار باندھتا دھیمے لہجے میں بولا تھا۔۔۔
خیر مبارک! رائم خان نے فوراً جواب دیا تھا۔ اس کی خوشی
ناقابلِ بیان تھی۔۔۔

کب کھیلا رہا ہے نکاح کے لڈو پھر؟۔۔۔ وہ اسے مزید سینے میں
بھینچے شوخ لہجے میں پوچھنے لگا کیونکہ اپنے دوست کی حالت اور

محبت کی انتہا دیکھ کے وہ اتنا تو جان چکا تھا کہ اس کی محبت کی
تکمیل کی منزل نکاح ہے۔۔۔

پہلے تو اپنے نکاح کا لڈو کھیلا پھر میں بھی تجھے صرف لڈو نہیں
بلکہ ولیمے کا چرسہ تک، ملائی بوٹی، مٹن چوپس، مٹن پلاؤ، گولا چیز
کباب، مٹن قورمہ، فنگر فش، بہاری بوٹی، بیف بریانی اور بون
لیس مٹن ہانڈی کے ساتھ روغنی تافتان بھی کھلاؤں گا۔۔۔ بس وہ
مان جائے۔۔۔ ابھی صرف وہ ہوش میں آئی ہے، نکاح کیلئے
حامی نہیں بھری۔۔۔۔۔ رائم خان غیر متزلزل لہجے میں اس
سے الگ ہوتے بولا۔

مان جائے گی انشاء اللہ!!! اور میں تمہیں نکاح کا نہیں بلکہ
ڈائریکٹ چاچو بنانے کا لڈو کھیلاؤں گا۔۔۔۔۔ دمیر خان اس کے

بے ترتیب بالوں میں انگلیاں پھیر کے سیٹ کرتا مزے سے بولتا
رائم خان کو آنکھیں گھومانے پر مجبور کر گیا۔۔

باؤں داوے!! کنجوس آدمی! ولیمے کا مینیو بس اتنا سا ہی ہے؟
میٹھے میں کچھ کھانے کو نہیں ملے گا؟۔۔۔ اس کا خوشگوار موڈ
دیکھ کر دمیر خان آہستگی سے اس کے کندھے پہ مکا جھڑ گیا۔
مجھے میٹھے کی ضرورت نہیں! کیونکہ میں اپنا شوگر لیول کسی
دوسرے طریقے سے پورا کروں گا باقی تم فکر نہیں کرو تمہارے
لئے میٹھے کا انتظام کروادوں گا۔۔۔ رائم خان اپنی کرسٹل
گرے آنکھوں میں شوخی لئے زو معنی انداز میں بولا تھا۔

جو شاہ تجھے شریف کہتا ہے نہ! وہ شرافت لفظ کے ساتھ سراسر
ظلم کرتا ہے تیرے جیسا بے شرم آدمی میں نے اپنی زندگی میں
نہیں دیکھا۔۔۔ یسنا کہیں کا!! اب تو کیا پوری تقریب کے سامنے

اپنا شوگر لیول سیٹ کرے گا؟ شرم نہیں آئے گی تجھے بچوں اور
عورتوں کے سامنے یہ حرکت ہوئے؟ شرم کر لے بے شرم
آدمی!! چلو بھرپانی میں ڈوب مر!۔۔۔ دمیر خان مصنوعی
سنجیدگی چہرہ پہ سجا کے بولتا رائم خان کی بے باک بات پہ
اسے مصنوعی غصے سے ڈپٹنے لگا تھا۔۔

میں نے سرعام کی بات کب کی؟ میں تو بند کمرے میں شوگر لیول
سیٹ کرنے کی بات کر رہا تھا جیسے تو کرتا ہے۔۔۔ رائم خان
معصومیت سے آنکھیں پٹپٹا کے بولتا اس کا چہرہ شرم اور غصے
سے سرخ کر گیا۔

رائم خان کو دیکھ کے کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ابھی رورو
کے کسی صدمے کی کیفیت سے نکلا تھا، وہ اس وقت بالکل
ہشاش ہشاش اور خوش لگ رہا تھا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ

وہ ایسے ہی اپنی دکھی اور غم زدہ کیفیت بھول جاتا تھا جیسے اب
سب کچھ خود پہ گزرا بھولے کھڑا تھا۔۔

شٹ اپ!۔۔۔ اس کی بات سن کر بے ساختہ دمیر خان کو
زربخت کا رویہ یاد آیا تھا۔ وہ تکلیف کے آثار اپنے چہرے سے
غائب کرتا اس کو کاٹ دار نگاہوں سے دیکھتا انرش کے روم کی
طرف بڑھا تھا جبکہ رائم خان یوں اس کے جان چھڑوانے والے
انداز پہ ہلکا سا مسکراتا ڈاکٹر کو بلانے کیلئے اس کے کین کی جانب
گیا تھا جو وہ دمیر خان کے ساتھ باتوں میں مگن ہو کے بھول چکا
تھا کہ وہ روم سے نکلا کس مقصد کیلئے تھا؟

رات دس بج رہے تھے جب دمیر خان اپنے کمرے میں داخل
ہوا تھا۔ وہ جو صوفے پہ بیٹھی اپنی سوچوں میں گھیری ہوئی

تھی۔ دمیر خان کی آمد پر سوچوں سے نکل کر، چھپے گردن
موڑتے ہوئے اسے چونکتے ہوئے دیکھا تھا۔۔

کھانا کیوں نہیں کھایا؟۔۔۔ دمیر خان اپنی شرٹ کے اوپری دو
بٹن کھولتا اس کی طرف دیکھے بنا سپاٹ لہجے میں کھانے کی طرف
اشارہ کرنے لگا جو ٹیبل پہ ویسے کا ویسا پڑا ہوا تھا۔

مجھے بھوک نہیں ہے۔۔۔ زربخت نے مدہم آواز میں جواب دیا
تھا۔ اس کا لہجہ اداس اور پشیمان تھا۔۔

کیوں بھوک نہیں ہے؟ کھانا کھاؤ ورنہ بیمار پڑ جاؤ گی۔ پہلے ہی
تمہاری صحت ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ دمیر خان الماری کی طرف
بڑھتا بظاہر سرسری سا بولا تھا لیکن اندر سے اسے زربخت کی ملجلی
سی حالت تکلیف دے رہی تھی۔۔

تین دنوں سے دمیر خان نے اسے خود سے کھانا کھانا اور سلانا
چھوڑ دیا تھا۔ ایون کہ دمیر خان رات کے وقت اپنے کمرے میں
بھی نہیں رکتا تھا۔ وہ تین راتوں سے ساتھ والے کمرے میں سو
رہا تھا۔ اگر زربخت کو اس کی موجودگی پریشان کرتی ہے اور
اس کا لمس شرمندگی اور تکلیف دیتا ہے تو وہ کیونکر اس کمرے
میں رہ کے اس کی جان مشکل میں ڈالتا؟

اسے زربخت کی شرمندگی اور پچھتاوا محسوس ہو رہا تھا لیکن وہ
چاہتا تھا کہ اب وہ خود اس کے پاس آئے اور اپنے کئے پہ غور
کرے، وہ اسے آسانی سے خود سے لگا کے اپنے رشتے کو الجھن
زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ زربخت کو احساس دلانا بہت ضروری
تھا۔۔

اس کو سمجھ ہونی چاہیے کہ ازدواجی تعلق تکلیف اور شرمندگی کا باعث نہیں ہوتا ہے۔ اسے پتہ ہو کہ اس کے محرم کے کیا حقوق ہیں اس پہ اور اس کے وجود پہ۔۔۔

آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں تمہاری؟ رات کو نہیں سوئی تھی کیا؟۔۔۔ دمیر خان الماری سے چند فائلز اور اپنا پاسپورٹ نکالتا سمجیدگی سے چھپھڑا۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک نظر میں زربخت کی حالت کا جائزہ لے چکا تھا۔

نیند نہیں آتی۔۔۔ وہ آنسوؤں کا گولہ حلق میں اتارتی نظریں جھکا کے بولی۔ اسے آج دوپہر میں ہی مہر خان سے پتہ چلا تھا کہ وہ پھر سے آسٹریلیا جا رہا ہے۔۔۔ اسے اس کی بات پہ یقین نہیں آیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی، دمیر خان اسے یوں ان حالات میں اکیلا چھوڑ کے جائے گا لیکن اپنا اس کے ساتھ کیا گیا رویہ یاد کرتے ہوئے

دل پریشان بھی ہوا تھا کہ شاید وہ اس کے کی وجہ سے جا رہا ہے؟
اور اب اس کو الماری سے پاسپورٹ نکالتے دیکھ کر زربخت کی
بے یقینی یقین میں بدلی تھی۔۔

کیا وہ سچ میں اسے یہاں اکیلا چھوڑ کے جا رہا تھا؟ اس نے
تکلیف سے سوچا تھا۔ اس کا چہرہ کرب سے دھک اٹھا تھا۔
کوشش کرو آجائے گی!! فضول مت سوچا کرو! خود کو ہر سوچوں
سے آزاد کرو اور کھانا کھا کے سو جاؤ۔۔ وہ ٹھنڈے لہجے میں
حکم دیتا کرے سے نکل گیا تھا کیونکہ وہ مزید یہاں رک کے اپنے
نرم دل کو لگام نہیں ڈال سکتا تھا جو بار بار زربخت کو اپنی پناہ
میں لینے کی ضد کر رہا تھا۔

دمیر خان اچھے سے جانتا تھا وہ کھانا کیوں نہیں کھا رہی، اس کو
نیند کیوں نہیں آرہی کیونکہ زربخت کو اب اس کے ہاتھ سے

کھانے اور اس کے سینے پہ سر رکھ کے سونے کی عادت پڑ چکی
تھی اور عادتیں بہت جان لیوا ہوتی ہیں۔
اپنے وجود کا عادی بنانے والا شخص اچانک زندگی سے نکلے تو
جسم سے جان نکل جاتی ہے۔

دمیر خان ہر گز اپنی بخت کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن
زر بخت کو سمجھانے کیلئے یہ بے رخی دکھانا ضروری تھی ورنہ وہ ہر
دفعہ قربت کے لمحات میں اسے چھپ دھکیل کے اس کے جذبات
کی توہین کرتی رہتی۔۔۔ دمیر خان کا ٹھنڈا اور ہر جذبات
سے عاری رویہ دیکھ کر زر بخت کو ڈھیروں رونا آیا تھا۔
مجھے کھانا کھلا کے اور سلا کے چلے جاتے تو کیا ہو جاتا آپ کا؟
آپ کو پتہ بھی ہے مجھے آپ کے بغیر نہ نیند اب آتی ہے اور نہ
اپنے ہاتھوں سے کھانا کھایا جاتا ہے۔۔۔ زر بخت گھٹنوں میں سر

دے روتی خود سے مخاطب ہوئی تھی۔ اسے دمیر خان کی ناراض حالت اور لاپرواہی اذیت دے رہی تھی۔۔۔ کیا واقعی میں دمیر مجھ سے سخت ناراض ہیں؟۔۔۔! اچانک زربخت کے دماغ میں مہر خان کے الفاظ گونجنے لگے۔ آج دوپہر میں ہی وہ اس کے کمرے میں آئی تھی۔ اس نے تین دنوں سے دمیر خان کو دوسرے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ پریشانی سے زربخت سے وجہ معلوم کرنے آئی تھی اور وجہ پتہ چلنے پر اس نے زربخت کو سمجھانے کے ساتھ دمیر خان کو منانے کی بھی ہدایت کی تھی۔

زربخت نے مہر خان کو ساری بات نہیں بتائی تھی بس اپنے سخت الفاظ بتائے تھے لیکن مہر خان اس کی آدھی ادھوری بات کو پورا سمجھ گئی تھی۔۔۔ اس لئے تفصیل سے اسے

ازدواجی تعلق کی خوبصورتی اور محرم کی قربت کے متعلق بالکل
بڑی بہنوں کی طرح پیار سے سمجھایا تھا۔ اس وقت مہر خان کی
باتیں سن کے صرف زربخت کو شرم آئی تھی لیکن اب اس کا
مطلب سمجھ آ رہا تھا۔

"اگر آپ سے بے انتہا محبت کرنے والا انسان ناراض ہو
جائے تو اسے بدلے میں تھوڑی سی توجہ اور محبت دے کر منا
لینا چاہئیے ورنہ رشتوں کی خوبصورتی ختم ہو جاتی ہے۔"
وہ اس کی ساری باتیں یاد کرتی دو بدو ہو رہی تھی۔ وہ خود سے
دمیر خان کے پاس جانے سے جھجک رہی تھی۔
بالآخر کافی سوچنے اور ہمت جمع کرتے ہوئے تین گھنٹے بعد
زربخت نے دوسرے کمرے میں جا کے اسے منانے کا فیصلہ کیا

تھا۔ وہ صوفے سے اٹھتی اپنا دوپٹہ اوڑھے ایک نظر وال کلاک
پہ دوڑا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

اپنے کمرے سے چند قدموں کے فاصلے پہ موجود دوسرے کمرے
کی طرف بڑھی تھی۔ وہ ننگے پاؤں تھی۔۔ جس کمرے میں
دمیر خان آرام کر رہا تھا زربخت اس کے دروازے کے قریب
پہنچتی آہستہ سے ڈرتے ہوئے پینڈل پہ رکھ کے گھوما گی۔

دروازہ فوراً کھل گیا تھا۔ اندر سے لاک نہیں تھا۔ زربخت
کمرے میں داخل ہوتی احتیاط سے دروازہ بند کر گئی۔۔ کمرے میں
مکمل اندھیرا چھایا ہوا تھا۔۔ دمیر خان سویا ہوا نہیں تھا بس
ایسے ہی آنکھیں موندے بیڈ پہ لیٹا ہوا تھا۔۔ دروازہ کھلنے اور بند
ہونے کی آواز پہ اس نے سر اٹھا کے دیکھا نہیں تھا۔ وہ
تو خوشبو سے پہچان چکا تھا کہ اس کی بخت آئی ہے۔۔

زربخت پھونک پھونک کر قدم رکھتی بیڈ کی طرف بڑھی
تھی۔۔۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور وہ کسی چیز سے ٹکرا کے چوٹ
نہیں لگوانا چاہتی تھی۔۔۔

دمیر!!۔۔۔ اس نے بیڈ کے قریب پہنچتے ہی اس کو سہمی آواز
میں مخاطب کیا تھا۔

ہمم!!۔۔۔ دمیر خان نے اپنے دھڑکتے دل پہ قابو پاتے ہوئے
ہنکارا بھرا تھا۔۔۔ زربخت کی آمد اس کیلئے غیر متوقع تھی۔۔۔
آپ کہاں ہیں؟۔۔۔ وہ اندھیرے میں ہاتھ پھیلاتی پریشانی سے
پوچھنے لگی۔

بیڈ پہ ہوں۔۔۔ دمیر نے لہجے کو لا تعلق بناتے ہوئے جواب
دیا۔

زربخت ہاتھ مارتے ہوئے بیڈ پہ چڑھتی، گھٹنوں کے بل ہو کے
رینگتی اس کی طرف بڑھی۔ اس کے پاس پہنچتے ہی وہ اس
سے کمفرٹر دور ہٹائے اس کی بانہوں میں لیٹتی پھر سے کمفرٹر
اوڑھ گئی تھی۔

زربخت کے بے دھڑک اس کے حصار میں آنے کے انداز پہ
دمیر خان کا دل اچھل کر حلق میں آیا تھا۔ اسے اپنی چھوٹی اور
معصوم سی بخت سے اتنی ہمت کی امید نہیں تھی کہ وہ اس کی
بانہوں میں آکر خود قید ہو جائے لیکن وہ اس کی بانہوں میں آکر
اسے حیرت زدہ چھوڑ گئی تھی۔

آئی ایم سوری!! میں آئندہ کبھی بھی آپ کو اپنے سخت الفاظ
سے تکلیف نہیں دوں گی۔ آپ میرے محرم ہیں مجھ پہ حق
رکھتے ہیں۔ میں اب آپ کو کبھی بھی آپ کے جائز حق سے

محروم نہیں رکھو گی۔۔۔ زربخت اس کے سینے میں چہرہ
گھسیڑے بھیگی ہوئی آواز میں اپنی غلطی کی معافی مانگ رہی تھی

--

شش!! آئندہ تمہارے منہ سے یہ لفظ نہ سنو میں۔ میرا مقصد تم
سے توجہ ہٹا کے معافی منگوانا نہیں تھا بلکہ میرا مقصد صرف
تمہیں احساس دلانا تھا۔۔۔ جو تمہیں ہو گیا ہے، تمہارا میرے
پاس آنا ہی میرے لئے کافی تھا۔ معافی مانگ کر خود کو کم حیثیت
مت کرو۔ تم میرے دل کی دھڑکن ہو۔ میں تمہیں ہمیشہ اور ہر
حالات میں چاہوں گا۔ اور جہاں پہ تم نا سمجھی کا مظاہرہ کرو گی
وہاں پہ تمہیں پیار سے سمجھاؤں گا نہ کہ تمہاری ذات کم تر سمجھ
کے تمہاری نادانیوں کی معافی منگو اوں۔۔۔۔۔ دمیر خان مزید اسے

خود میں بھینچتا عقیدت سے زربخت کے ماتھے پہ لب رکھ گیا
تھا۔

آپ کو پتہ تھا میں آپ کے بغیر کھانا نہیں کھاتی، مجھے آپ کے بغیر
نیند نہیں آتی، نہ آپ نے مجھے کھانا کھلایا، نہ مجھے تین دنوں سے
سلایا ہے۔ اگر میرے ساتھ ایسا ہی کرنا تھا تو پھر مجھے اپنی
عادت نہ ڈالتے!! میں آپ سے ناراض ہوں سخت والی! مجھے
تین روز سے نیند نہیں آئی ہے۔۔۔ وہ اس کی شرٹ کے بٹنوں
کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتی ناک سکوڑتے ہوئے شکوہ کرنے
لگی۔۔۔ اب دمیر خان مان گیا تھا اور اس کی نرم سائیڈ دیکھتے ہی
زربخت نے شکووں شکایتوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔
عورت اپنے من پسند مرد کے سامنے ہی بچپنہ دیکھاتی ہے جیسے
کہ زربخت اب دیکھا رہی تھی۔۔۔

ہاہاہا!! متاعِ من! تو تم مجھے بتاتی کہ دمیر، مجھے کھانا کھلاؤ، مجھے
سلاؤ میں تمہیں کھانا بھی کھلاتا اور اپنے سینے پہ سلاتا بھی۔۔۔
دمیر خان ایک دم سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اپنے سینے پہ منتقل
کرتا، زربخت کا گال چوم کر ہنستے ہوئے بولا تھا۔ اسے وہ شکوہ
کرتی ہوئی کیوٹ لگی تھی لیکن وہ اس کی کیوٹ شکل اندھیرے
میں دیکھ نہیں پایا۔

میں کیوں بتاتی آپ کو پتہ ہونے چاہئیے تھا۔ آپ کو میرے کھانے
اور آرام کا خیال رکھنا چاہئیے تھا۔ آپ کو پتہ ہونا چاہئیے میں آپ
کے بغیر اب نہیں رہ سکتی، اس لئے میں اب کل آپ کو آسٹریلیا
نہیں جانے دوں گی، میں آپ کے بنا یہاں نہیں رہ سکتی۔۔۔ وہ
نا محسوس انداز میں اس کے سینے پہ لب رکھتی مزید منہ پھولا کے

بولی تھی۔۔ وہ اپنی فیورٹ جگہ پہ آگئی تھی، اس کا دمیر خان کا
سینہ چومنا بنتا تھا۔

آئی ایم سوری! متاعِ من!! میں آئندہ سے تمہاری ہر ضرورت کا
خیال رکھوں گا اور نہیں جا رہا میں کہیں تمہیں چھوڑ کے، ایک
میٹنگ کیلئے جانا تھا وہ میں ظہیر صاحب کو بھیج دوں گا وہ دیکھ
لے گا، اپنی بخت کے پاس رکوں گا۔۔۔ دمیر خان اس کے
لبوں کی ہلکی سی تپش اپنے سینے پہ محسوس کرتا سرشاری سے بے
خود ہوا تھا۔

وہ زربخت کی ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرہ اپنے لبوں کے
قریب ایک دم سے اس کے نازک گلاب کی پنکھڑیوں کو اپنے
لبوں میں لئیے ان کا رس نچوڑنے لگا تھا۔

وہ آنکھیں موندے اسکے لبوں کو سک کرتا اپنی تین دن کی تشنگی
مٹا رہا تھا۔۔ آج زربخت اس کے لمس پہ ہچکچائی نہیں تھی،
وہ بس بوکھلاتے ہوئے اس کے کالر کو مٹھی میں جکڑے اس کا
جان لیوا لمس برداشت کرنے لگی تھی۔۔

دمیر خان کے ہاتھ پورے استحقاق سے اس کے وجود کی
گہرائیوں کو ماپنے میں مگن تھا۔ وہ اس کے لمس اور بے باک
جسارتوں پہ دمیر خان کے چوڑے وجود میں سمٹتی اسی میں ضم
ہو رہی تھی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ دمیر خان اپنے لبوں اور
ہاتھوں کے لمس سے زربخت کے وجود کو معتبر کرتے ہوئے
شدت پسند ہو رہا تھا۔

زربخت کیا کر رہی ہو؟۔۔۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی
زربخت کو الماری میں گھسا دیکھ کے مہرو نے عام لہجے میں
سوال کیا تھا۔

دیدہ! شکر ہے آپ آگئی، آپ میری ڈریس سیلیکٹ کرنے میں
ہیلپ کریں، مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی! کیا پہنوں؟۔۔۔
زربخت الماری سے چھپٹتی تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔
وہ کافی دیر سے کوئی اچھا سا ڈریس ڈیسائیڈ کرنے میں لگی تھی، وہ
کوئی ہلکا اور سیمپل سا ڈریس پہننا چاہتی تھی لیکن الماری میں
موجود سارے کے سارے ڈریسز ہیوی اور بہت شوخ کلرز میں
تھے جن کو وہ بالکل بھی نہیں پہن سکتی تھی۔۔۔

کہیں جانا ہے تم نے؟۔۔۔ مہرو بیڈ پہ بکھرے کپڑوں کو ایک
سائیڈ کرتی خود کے بیٹھنے کی جگہ بناتی ایرو آچکا کے پوچھنے لگی۔

ہم!! دمیر نے کال کی ہے کہ جلدی سے کوئی پیارا سا ڈریس پہن
کے تیار ہو جاؤ! میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔۔۔ وہ اس کی طرف
بڑھتی میڈ پہ پڑے سارے کپڑوں کو اٹھا کے سمیٹتی مصروف
انداز میں بولی۔ اس کے گیلے بال چھپ پشت پہ بکھرے ہوئے
تھے، شاید وہ ابھی شاور لے کے نکلی تھی۔

رات کے اس وقت کہاں جانا ہے؟ آئی مین نوبج رہے
ہیں۔ کھانا تم کھا چکی ہو، پھر لالا کا تمہیں باہر لے جانے کا
مقصد؟۔۔۔ وہ اس کی طرف رخ کرتی کھوجتی نگاہوں سے
زربخت کو دیکھنے لگی۔ اس کا نورانی چہرہ آج مزید نکھرا نکھرا سا
لگ رہا تھا، نیلی گہری آنکھیں تو پھر الگ ہی کشش رکھتی تھی۔
وہی تو دیدہ! مجھے بھی سمجھ نہیں آرہی کہ رات کے اس وقت
دمیر مجھے باہر کیوں لے جا رہے ہیں؟ کھانا میں کھا چکی ہوں اور

شاپنگ بھی نہیں کرنی، انرش دیدہ سے بھی میں نے مل لیا تھا۔
کوئی اور بھی کام نہیں ہے، پھر باہر لے جانے کا کیا مقصد ہو
سکتا ہے؟۔۔۔۔۔ زربخت معصومیت سے بولتی الٹا اسی سے
سوال کرنے لگی۔

کچھ بتایا تھا لالا نے کس جگہ پہ جانا ہے؟ آئی مین انھوں نے بتایا
ہو گا تمہیں کہ ہم آج رات کہاں جا رہے ہیں؟۔۔۔۔۔ مہر نے
متجسس ہو کر مزید بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی، تاکہ دمیر
خان کی منشا پتہ چلے سکے اور پھر وہ اس حساب سے زربخت کو
تیار کرے۔

رات کے وقت زربخت کو باہر لے جانا اور تیار ہونے کے حکم
سے وہ دمیر خان کے آدھی بات تو سمجھ چکی تھی کہ وہ کس

مقصد کیلئے اس کو یوں باہر لے جا رہے ہیں لیکن پھر بھی اس
نے تصدیق چاہی۔۔۔

ہاں یاد آیا! وہ بول رہے تھے کہ فارم ہاؤس جانا ہے، آج رات
ہم وہاں رکیں گے۔ وہ فوراً دمیر خان کی بات یاد آنے پر چہک
کے بولی تھی۔ اس بات سے انجان کہ دمیر خان کے آج
ارادے نیک نہیں ہیں۔

فارم ہاؤس؟ او آئی سی!۔۔۔ فارم ہاؤس کا نام سنتے ہی مہر خان
پوری بات سمجھ گئی تھی وہ تمہید باندھ کے شرارت سے بولی
تھی۔

ہمم! کیوں نہیں جانا چاہئے؟۔۔۔ زربخت اس کے چہرے کی پہ
پھیلی شرارتی مسکراہٹ دیکھ کر نا سمجھی سے پوچھنے لگی۔

نہیں! جانا چاہیے! ضرور جانا چاہیے! رکو، میں تمہارے لئے کوئی
پیارا سا ڈریس نکالتی ہوں جس میں تم اتنی حسین لگو کہ لالا تمہیں
دیکھتے ہی غش کھا کے گر جائیں۔۔۔ مہر خان زو معنی نظروں سے
اس کو دیکھتی مسکراتے ہوئے الماری کی طرف بڑھی۔
لو پھر! وہ ڈریس نہ ہو گیا کوئی ڈراؤنی چیز ہو گئی جسے دیکھ کے
وہ غش کھا کر گر جائیں گے؟۔۔۔ زربخت نے ہنستے ہوئے
اس کی بات مزاح میں ٹال دی۔۔۔ وہ اپنی ماں کی وفات کے بعد
آج پہلی دفعہ مسکرائی تھی۔۔۔

ہنسو مت!! جب تم اس ساڑھی میں حسن کی ملکہ لگو کی تو لالا کا
بہک جانا تو پکا ہے، لیکن ساتھ میں تمہارا بے ہوش ہونا بھی
طے ہے انکی قربت میں! اس بات کی گارنٹی میں دیتی ہوں۔۔۔

مہر خان ایک خوبصورت سی ساڑھی الماری سے نکال کر اس کی طرف بڑھاتی زو معنی انداز میں بولی تھی۔
دیدہ! کیا مطلب ہے آپ کی بات کا؟ اور مجھے یہ نہیں پہننا۔۔
اس کو دیکھ کے ہی مجھے شرم آرہی ہے یہ اتنا چھوٹا ہے۔۔۔
زربخت ساڑھی کا چھوٹا سا بلاؤز دیکھتی ناک سکڑتے ہوئے بولی۔ بلاؤز کو دیکھ کے ہی اس کے گال شرم سے سرخ ہوئے تھے۔۔ وہ بلاؤز تیزی سے مہر خان کے ہاتھ سے لیتی اپنے چھچھے چھپا گئی تھی۔

زربخت! مطلب تو تمہیں لالا خود سمجھائیں گے۔ تم اٹھو اور یہ ساڑھی جلدی سے پہن کے آؤ۔۔ میں کوئی بہانہ نہیں سن رہی، لالا تمہیں لینے کیلئے آنے والے ہوں گے! میں نہیں چاہتی

کہ لالا کو ذرا سا بھی ویٹ کرنا پڑے۔۔ وہ اپنی مسکراہٹ ضبط کرتی سنجیدگی سے اس کو حکم دینے لگی۔

دیدہ! مجھے یہ نہیں پہننی۔۔ یہ بہت بے شرم ہے۔ میرا جسم عیاں ہوگا، اور ہم باہر جا رہے ہیں۔۔ دمیر مجھے ڈانٹیں گے۔ زربخت نے جھر جھری لے کے ساڑھی کی طرف دیکھا تھا۔ وہ یہ ساڑھی ہرگز پہننے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

لالا ناراض نہیں ہوں گے، بلکہ وہ خوش ہوں گے اور تم ایک کام کرو! یہ ساڑھی پہن کے اوپر بڑی سی چادر لے لینا، تمہارا جسم عیاں نہیں ہوگا، پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہے نہ؟۔۔ مہر خان نے جھٹ سے تجویز پیش کی تھی۔ اس نے اس کو ہر حال میں ساڑھی پہننا کے دمیر خان کے دل کے تار ہلانے تھے۔

مہر خان ساڑھی اٹھا کے اس کے ہاتھ میں پکڑاتی، زبردستی
اسے ڈریسنگ روم کی طرف لے کے بڑھی کیونکہ وہ اگر
زربخت کے فیصلے کے انتظار میں رہتی تو صبح یہی پہ ہو جانی تھی
اور دمیر خان کا سارا پلان تباہ ہو جانا تھا۔

جلدی سے چینج کرو! پھر میں تمہیں تیار کر دیتی ہوں۔۔۔ وہ
اس کو ڈریسنگ روم کے اندر کرتی دروازہ بند کر چکی تھی۔
زربخت نے ناچاہتے ہوئے بھی مہر خان کی بات مان لی
تھی۔۔۔

تقریباً دس منٹ بعد ہی زربخت ساڑھی کے پلو سے
اپنے برہنہ پیٹ اور بازؤں کو چھپاتی، باہر آئی تھی۔ ساڑھی
میں اپنا نیم برہنہ وجود دیکھ کے اس کے گال شرم سے لال ہو
رہے تھے۔۔۔

زربخت نے وائن ریڈ کلر میں ساٹن سلک کی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی۔ ساڑھی پوری سیمپل تھی، بس اس کے بارڈرز ہیوی ڈائمنڈ ورک سے لیس تھے۔ ساڑھی کابیک لیس بلاؤز پورا بیڈز سے بھرا ہوا تھا۔ اس چھوٹے سے بلاؤز کو زربخت کے بدن پہ بس دو نفیس سی سٹریپس سہارے دیئے ہوئے تھے۔

اس خوبصورت سی ساڑھی میں وہ اپنی دودھیا سفید رنگت، خوبصورت نقوش اور گہری نیلی آنکھوں کے ساتھ کوئی اپسرا معلوم رہی تھی۔ اس اپسرا کو دیکھتے ہی مہر خان پلک جھپکنا بھول گئی۔

بیوٹی فل، گورجنیس، جسٹ لکنگ لائنک آواؤ! ماشاء اللہ!۔۔۔
مہر خان متحیر زدہ ہوتی آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے آئینے
کے سامنے لے آئی تھی۔

زربخت میری بات سنو! اگر لالا تم سے سکون لینا چاہیں تو بنا
مزاحمت کئے ان کے سکون کا ذریعہ بنا، پچھلی بار کی طرح
نا سمجھی میں ان کو تکلیف نہیں دینا۔۔۔ وہ اس کے سارے
بال سمیٹ کے ان کا بن بناتی بڑی بہنوں کی طرح اسے سمجھانے
لگی تھی۔

دیدہ!! مجھے یہ لپ اسٹک نہیں لگانی اور نہ ہی چوڑیاں پہننی ہیں
۔۔۔ زربخت اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اسے خود
کو تیار کرتے دیکھ کر افسردگی سے بولی۔ اسکی ماں کو مرے ابھی

دن ہی کتنے ہوئے تھے۔۔ وہ زیادہ سجنے سنورنے سے گریز کر
رہی تھی۔۔

زربخت! مجھے پتہ ہے! پھوپھو کو گزرے ہوئے ابھی زیادہ
وقت نہیں ہوا اور ان کی جدائی کا غم تمہارے لئے، ہمارے
لئے ابھی تازہ ہے۔ ہم کبھی بھی ان کو بھول نہیں سکتے ہیں
۔۔ لیکن گڑیا! مرنے والے کے ساتھ مرا نہیں جا سکتا، ہر انسان
اپنے وقت پہ موت کو گلے لگاتا ہے۔ پھوپھو ہمیشہ ہمارے
دلوں میں زندہ رہیں گی لیکن ان کے غم میں اگر تم یونہی روتی رہی
تو تم زندگی میں کبھی آگے نہیں بڑھ پاؤ گی۔ اور پھوپھو کی روح کو
بھی تکلیف ہوگی کہ تم ان کی وجہ سے زندگی کی خوشیوں کو دھتکار
رہی ہو۔

لالا کو ان کے جائز حق اور سکون سے محروم رکھ رہی ہو۔۔۔ خود
کو مضبوط کرو، زندگی اور اسکی خوشیوں کو گلے لگاؤ وہ تمہاری
منتظر ہیں۔ لالا تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں، تمہیں خوش رکھنا
چاہتا ہیں۔ تم تمام غم پس منظر ڈال کر زندگی کی رنگینیاں اور
خوشیاں سمیٹنے میں ان کا ساتھ دو۔۔۔ وہ باتوں ہی باتوں میں
زربخت کو مکمل تیار چکی تھی۔ اس نے اس کو صرف کاجل اور
لب اسٹک لگائی تھی۔ کانوں میں چھوٹے نفیس سے سلور کے
چھمکے اور ایک ہاتھ میں چوڑیاں پہنائی تھی۔ اور اتنی سے تیاری
میں وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔۔۔ زربخت خاموشی
سے بیٹھی مہر خان کی ساری باتیں سن رہی تھی۔ اس کا انداز
کھویا ہوا تھا جیسے وہ اپنے ذہن میں نزہت خان کا چہرہ دہرا رہی
ہو۔

لالا آگئے! زربخت جلدی نیچے جاؤ۔۔۔ نیچے سے آتی ہارن کی
آواز سن کر مہر و جھٹ سے زربخت کے نازک سے وجود کو سیاہ
چادر میں چھپاتی اسے باہر جانے کا اشارہ کرنے لگی۔۔۔ وہ آئینے
کے سامنے سے ہٹتی، چہرے پہ زخمی سی مسکراہٹ لئے
دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

زربخت رکو! جوتے تو پہنے ہی نہیں۔۔۔ مہر خان نیچے اس کے
پاؤں کی طرف دیکھتی اپنے سر پہ افسوس سے ہاتھ مارتی مسکراتے
ہوئے بولی تھی۔ زربخت بے ساختہ اپنے پیروں میں کیجویل
چپل دیکھ کے مسکرا دی۔

ہاہاہا! ساڑھی کے ساتھ ہوائی چپل میچ کر رہی ہے ویسے!
۔۔۔ مہر خان تیزی سے زربخت کی ایک سیاہ پینسل ہیلز
اٹھائے اس کی طرف بڑھتی قہقہہ لگا کے ہنس دی۔

دیدہ! ہوائی چپل کونسی ہوتی ہے؟۔۔۔ زر بخت اپنے پیروں
سے چپل اتار کے نیچے جھک کر ہیلز پہنتے ہوئے سوال کر
گئی۔۔۔

فلحال تم ہوائی چپل کو چھوڑو! مجھروں سے بچ کے رہنا، جس
طرح مجھے کاٹا تھا نہ شادی والی رات۔۔۔ اس طرح تمہیں بھی
کوئی مجھ کاٹ سکتا ہے۔ احتیاط بہت ضروری ہے ورنہ زخم بن
جاتے ہیں۔۔۔ مہر خان کمینگی سی مسکراتی زو معنی انداز میں
بولتی زر بخت کو نیچے جانے کا حکم کر گی تھی۔

زر بخت الجھن زدہ آنکھوں سے اسے دیکھتی اپنی ساڑھی
سنبھالتے ہوئے نیچے کی جانب بڑھ گئی۔ آج اس کو مہر خان کچھ
زیادہ ہی مشکوک لگ رہی تھی لیکن اس کی زو معنی باتیں سمجھنے
کیلئے زر بخت کا ذہن ابھی پختہ نہیں تھا۔۔۔

مہر خان اس کو احتیاط سے سیرھیوں سے اترتے دیکھ کر مطمئن
ہوتی اس کی خوشیوں کی دعا کرتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب
بڑھ گئی۔

اتنی دیر کیوں لگا دی؟۔۔۔۔۔ گاڑی میں بیٹھتے ساتھ دمیر خان
نے زربخت سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔ البتہ اس کے ہونٹوں پہ
سچی ڈارک ریڈ ریڈ لپ اسٹک، ہاتھوں میں چوڑیاں، گہری نیلی
آنکھوں میں چمکتا سیاہ کاجل، اس کی پسند کی ساڑھی میں سچی
زربخت اپنے حسن کی آؤھی جھلک سے ہی دمیر خان کے
ہوش اڑا گئی تھی۔۔۔ یہ ساڑھی دمیر خان خود لایا تھا اور وہ
جانتا تھا اس ساڑھی میں اس کی بخت کتنی حسین لگ سکتی
ہے۔

دل نے کہا فوراً اسکی چادر ہٹا کے پورے حسین بدن کا نظروں
سے طواف کرو لیکن دمیر خان اگر چادر یہی پہ سر کا دیتا تو پھر وہ
فارم ہاؤس کبھی نہ پہنچ پاتا اور وہاں پہ زربخت کیلئے کی گئی

تیاریاں دھری کی دھری رہ جاتیں۔۔۔ دمیر خان اپنے
دھڑکتے دل کو ڈپٹا زربخت سے نگاہ ہٹائے گاڑی سٹارٹ کرتا
تیزی سے حویلی سے نکل گیا۔ سیاہ چادر میں زربخت کا نورانی
مکھڑا دمیر کو چاند کا گمان دے رہا تھا۔۔۔

زربخت آج پہلی دفعہ اتنی تیار ہوئی تھی، ورنہ تو عام سی حالت
میں رہتی تھی۔ اور اس کی یہی تھوڑی سی تیاری سے نکھرتا
حسن دمیر خان کو آج ہر حد پار کر کے اس میں اترنے پر اکسا رہا
تھا۔

وہ زربخت کا ہاتھ پکڑ کر اپنے لبوں سے لگاتا اسے محبت بھری
نگاہ سے دیکھ گیا تھا۔ وہ اس کی نظروں کی تپش اور لمس پہ
شرماتی نگاہیں چراتی وندو سے باہر دیکھنے لگی تھی۔۔۔ وہ اس کی
نظروں کی تاب نہیں لا رہی تھی پھر ناجانے فارم ہاؤس پہ اس کو
کیا کیا برداشت کرنا تھا۔؟ وہ اس کی آنکھوں میں چھائی خمار کی
سرخی دیکھتی، دماغ میں مہر خان کی ہدایات دہرانے لگی تھی جو
اس نے اس کو ازدواجی تعلق کے بارے میں دیں تھیں۔

مہر!۔۔۔ مہر و ابھی اپنے کمرے کے دروازے تک ہی پہنچی
تھی جب چھپے سے اسے داعیر خان نے مخاطب کیا تھا۔
جی داعیر!۔۔۔ اس نے اس کی آواز سن کر پلٹتے ہوئے احترام
اور محبت سے لبریز لہجے میں جواب دیا تھا۔

ہائے نور چشم! اتنے پیارا انداز مت اپنایا کرو، پتہ بھی ہے بھی
تمہارا شوہر پہلے ہی تم سے کتنی محبت کرتا ہے، جب تم محبت
والا انداز بیان رکھتی ہو تو میں مجبور ہو جاتا ہوں تمہاری
محبت اور وجود کو اپنی پرحدت آغوش میں لینے کیلئے۔۔۔ بداعیر
خان اس کے قریب پہنچتا اس کو اپنے حصار میں لئے کمرے میں
داخل ہوتا مخمور لہجے میں بولا تھا۔

مجھے انداز دیکھانے کی ضرورت ہی نہیں ہے، آپ ویسے ہی اپنی
پرحدت آغوش میں مجھے ہر لمحہ قید رکھ کے میرا وجود درد سے چور
کر کے رکھ دیتے ہیں۔۔۔ وہ اس کے حصار سے نکلتی ناک
سکوڑتے ہوئے بولی۔

گڑیا کہاں جا رہی تھی؟۔۔۔ داعیر خان نے پھر اس کو اپنی
طرف کھینچ کر اسکی گال پہ بائٹ کرتے ہوئے سوال کیا تھا۔ وہ

ڈرائنگ روم میں اپنے دوست کے ساتھ بیٹھا تھا جب اس نے
زربخت کو باہر پورچ کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔۔
وہ لالا کے ساتھ گئی ہے۔۔۔ مہر خان اس کے سینے میں چھپتی
زو معنی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

اور لالا اس کو رات کے اس وقت کہاں لے جا رہے؟۔۔۔
داعیر خان نے اس کی مسکراہٹ بخوبی نوٹ کی تھی اسلئے پھر
سے سوال داغا۔۔

فارم ہاؤس آج رات انھوں نے وہی پہرنا ہے۔۔۔ مہر خان
شرم اور لحاظ کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولتی آخر میں ہلکا
ساہنس دی۔۔

تو اس کا مطلب! لالا چھپے رستم نکلے۔۔۔ تبھی میں کہوں کہ لالا آج
رات میرے دوستوں کو ہمارے فارم ہاؤس پہ پارٹی کیوں نہیں

کرنے دے رہے۔ میں نے اصرار بھی کیا لیکن انھوں نے
صاف صاف انکار کر دیا تھا۔۔ اب اصل انکار کی وجہ سمجھ میں
آئی تھی۔ اور تم یہاں مجھ سے دور بھاگ رہی ہو۔۔ میں بتا رہا
ہوں ہمارا بچہ لالا سے پہلے آنا چاہئے۔۔۔ وہ اپنے لالا کی
چالاکیوں پہ حیران ہونے کے ساتھ مہر خان کو بھی شوخ لہجے میں
ہدایت دے گیا۔

داعیر خان نے آج دوپہر میں ہی اپنے لالا سے فارم ہاؤس پہ پارٹی
کا ذکر کیا تھا جو اس کے دوست کرنا چاہتے تھے لیکن دمیر خان
نے اسکی بات سنتے ہی سختی سے منع کر دیا تھا۔ وہ اس کے
سختی سے منع کرنے پر مجبور ہوتا خاموشی اختیار کر گیا تھا لیکن
اس کو نہیں پتہ تھا کہ اس کا لالا آج خود پارٹی کرنا چاہتا تھا۔

ہاں بچے تو جیسے پیڑ پہ لٹک رہے ہیں۔ جن کو آپ لالا سے پہلے جا
کے توڑ لائیں گے؟ یہ تو نصیب کی بات ہے، اللہ جس کو پہلے
اولاد جیسی نعمت سے نواز دے، اس میں ہم انسانوں کا کوئی
کمال نہیں ہوتا بلکہ اللہ کا کرم ہوتا ہے۔ وہ جس پہ مرضی چاہیں
اپنا کرم پہلے کرے جس پہ چاہے بعد میں۔۔۔ مہر و اس کے
سینے سے نکلتی سنجیدگی سے بولی۔ اس نے لہجے کو جان بوجھ کر
سنجیدہ بنایا تھا کیونکہ اب وہ جانتی تھی کہ آج رات اس کو داعیہ
خان کی شدتوں سے کوئی نہیں بچا سکتا، اس لئے لہجے کو سنجیدہ بنا
کے اپنی جان خلاصی چاہی۔

بچے پیڑوں پہ نہیں لٹک رہے، میں یہ بات جانتا ہوں نور چشم!
بچے تو بیڈ پہ محنت کرنے کے بعد آتے ہیں جو پوری رات ہم
کرنے والے ہیں۔۔۔ جتنی محنت زیادہ ہوگی، ہماری پروڈکٹ

اتنی جلدی اس دنیا میں لینڈ کرے گی۔۔۔ وہ اس کو بازو سے پکڑ کر پھر سے اپنی طرف کھینچتا بہکے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔
نہیں میرا آج آپ کی محنت میں عظمت بننے کا کوئی موڈ نہیں ہے۔۔۔ اس لئے مجھے چھوڑیں!!۔۔۔ وہ اس کی بانہوں سے نکلنے کی تگ و دو کرنے لگی کیونکہ وہ اسکی آنکھوں میں طلب کی تڑپ دیکھ چکی تھی۔

موڈ تو تمہارا میں ایک منٹ میں بنا دوں، تم خود تڑپو گی مجھے خود میں سمانے کیلئے۔۔۔ وہ اس کے کان کی لو لبوں میں دباتا بے باکی سے اپنا ہاتھ اس کی کمر سے نیچے لے جا کر پھیرنے لگا تھا۔۔۔ وہ تھوڑی سختی سی اس کی کمر کے نچلے وجود کو سہلاتا مہر خان کو لب بھینچے پہ مجبور کر گیا تھا۔ مہرو نے بے ساختہ آنکھیں رول کرتے ہوئے داعیر کی شرٹ کو مٹھیوں میں جکڑا۔

اس میں جزبات ابھرتے دیکھ کر داعیر خان نے اپنے ہاتھ کی
حرکت سختی مزید بڑھاتے ہوئے مہر خان کو ابھرتے ہوئے
جزبات میں اپنے پیروں سے اٹھنے پہ مجبور کر گیا تھا۔
ابہہ داعیر!۔۔۔ اس نے اس کے ہاتھ کی بے باکی پہ تاب نہ لاتے
ہوئے زور سے اس کے کندھے پہ دانت گاڑھے تھے۔
نور چشم! کچھ نہیں کر رہا، بس تمہارا موڈ بنا رہا ہوں۔۔۔ وہ
اپنے کندھے پہ جلن محسوس کرتا ایک ہاتھ سے اس کا چہرہ اپنے
لبوں کے قریب کرتا اس کی گلاب کی پنکھڑیوں کو اپنے لبوں کی
حراست میں لیا گیا۔

وہ تیزی سے اس کے لبوں کو سک کرتا مہر خان کی زبان کے
ساتھ کھلواڑ کرتے ہوئے اسے دو منٹ میں ہی بے بس کر گیا

تھا۔ داعیر خان بے باکی سے اس کی زبان کو اپنے دانتوں میں
دبا ئے کترنے لگا تھا۔

مہر خان نے اسکے ہاتھ کو اپنے نچلے وجود پر جبکہ اپنی زبان کو داعیر
خان کے دانتوں کی گرفت میں دیکھ کر بوکھلاتے ہوئے زور اس
کی شرٹ کو جکڑا تھا۔

وہ کافی دیر بعد اس کی سانسیں بند ہوتی محسوس کرتا اس کے نچلے
لب کو شدت سے چومتے ہوئے اس کے لبوں کو آزادی بخش
گیا تھا۔

مہر خان کے بدن کی ایک ایک نازکی محسوس کرتے ہوئے داعیر
خان کے جسم میں بے قراری پیدا ہوئی تھی۔ جبکہ اس کے جسم
سے نکلتی آگ بخوبی محسوس کرتے ہوئے مہر خان کے گلے میں
گلی بھر کے معدوم ہوئی تھی۔ دوپل میں ہی دونوں کی آنکھیں

خمار سے سرخ ہوئی، دونوں ہی ایک دوسرے کی قربت میں
پکھلنے کو تیار ہوئے۔

داعیر خان اپنا ہاتھ اس کی کمر کے نچلے حصے سے ہٹاتا ایک جست
میں ہی اس کی شرٹ نیچے سے پکڑ کے اوپر کی جانب کرتے
ہوئے اس کے بازوؤں سے نکال کر زمین بوس کر گیا تھا۔۔ مہر
خان حیاء سے اس کے سینے میں چھپی تھی۔۔

کتنی دفعہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ چکے ہیں نور چشم! مجھ سے
شرمانا چھوڑ دو۔۔۔ وہ اس کی دھڑکنوں کو آخری پردے سے
آزاد کرتا مصروف انداز میں بولا۔

آپ نے تو بے شرمی میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔۔ اب آپ
کیا چاہتے ہیں، میں بھی آپ کی طرح بن جاؤ؟۔۔۔ مہر خان اس
کے سینے پہ ہلکا سا مکا جھڑتی مصنوعی خفگی سے بولی تھی۔

داعیر! آپ اعلیٰ ترین کوالٹی اور انتہائی درجے کے بے شرم ہیں!
 --- مہر خان اس کا اشارہ سمجھتے ہی شرم سے سرخ پڑی تھی۔
 تھینک یو! میری اتنی تعریف کرنے کیلئے، جو بھی ہوں

بس تمہارے ساتھ ہوں۔۔ تمہاری خوبصورتی اور یہ جادوئی
بدن مجھے بے شرم بننے پہ مجبور کرتا ہے۔۔۔ قہ اس کے سینے پہ
ہاتھ پھیرتا کہتے ساتھ ہی اس پہ جھک گیا تھا۔ وہ بے دردی سے
اس کی ابھری ساخت کو لبوں اور ہاتھوں میں مسلتا بے رحم

ہو رہا تھا۔۔ وہ شدت سے اس کی سینے کی نازک ساخت کو اپنے
لبوں میں دبا کے کھینچتا جنونی ہو رہا تھا۔۔

اہہ داعیر! مجھے پین ہو رہی ہے۔۔ مہر خان نے اس کو بالوں
سے جکڑ کر ہوش دلائی چاہی لیکن وہ مزید بے خود ہوا تھا۔ اس
کے لبوں کا گیلہ لمس مہر خان کے سینے کو تر گیا تھا۔ وہ بے چینی
سے اس کو ایک جست میں اپنی بانہوں میں بھر کے بیڈ کی طرف
بڑھ گیا۔

بیڈ کے قریب پہنچتے ہی اس نے نرمی سے مہر خان کو بیڈ پہ پٹکا اور
تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے خود کو ہر پردے سے آزاد کر گیا۔
داعیر! لائٹ آف کریں۔۔۔ اس کو بغیر کپڑوں کے دیکھ کے مہر
خان خوف سے چلائی تھی۔۔

داعیر خان اس کو ان کمفرٹیبل ہوتا دیکھ کے لائٹ آف کرتا پھر
سے اس کی طرف آیا تھا لیکن وہ اس کی جان لیوا قربت سے
خوف کھا کے چھبید کر اؤن کے ساتھ جا کے لگی۔۔۔ داعیر خان
ہمیشہ اپنی جنونی شدتوں سے اس کی جان ہلکان کر کے رکھ دیتا تھا

ایسے نہیں کرتے نور چشم! اب تو مکمل طور پر تیار ہو چکا ہوں
تمہاری روح میں انٹری مارنے کیلئے۔۔۔ داعیر خان گھنٹوں کے
بل ہو کے بید پہ چڑھتا اس کو ایک ٹانگ سے پکڑ کر اپنی طرف
گھسیٹ گیا تھا۔۔۔

مہرو نے اپنے بچاؤ کیلئے بید شیٹ کو اپنی مٹھیوں میں جکڑ کر چھپ
ہٹنے کی سعی کی تھی مگر داعیر خان کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ ایک

جست میں اسے اپنے نزدیک کرتا اس کے ٹراؤز میں ہاتھ
الچھائے اس کے تن سے جدا کر گیا تھا۔۔
مہرو نے شرم سے تکیے میں منہ گھسیڑا تھا۔۔ وہ حیا کے مارے
دوہری ہوئی تھی۔

فاصلہ بناؤ اور مجھے خود میں سما نے کیلئے راستہ دو۔۔ داعیر خان
اس کی پنڈلی پہ بائٹ کرتا خمار آلود لہجے میں حکمیہ طور پر طور اس
سے مخاطب ہوا تھا جو خود میں سمٹ کے اپنی ٹانگوں کو آپس میں
لاک کر گئی تھی۔

نہیں! آپ بہت شدت پسند ہو جاتے ہیں۔۔۔ اس نے لرزتی
آواز میں جواب دیا تھا کیونکہ داعیر خان کی زبان اس کی ٹانگوں پہ
رینگ رہی تھی۔

ہاں! تمہارے معاملے میں شدت پسندی اختیار کر جاتا ہوں
لیکن تمہیں کبھی حد سے زیادہ تکلیف بھی تو نہیں دیتا، تھوڑی
سی دیتا ہوں تو بعد میں پیار بھی تو کرتا ہوں نور چشم!۔۔۔ وہ
نرمی سے اس کی ٹانگوں کو جدا کرتا تھا نیزہ اپنے سلگتے لب رکھتا
نرم لہجے میں بولا۔

کرتا ہوں نہ پیار؟۔۔۔ داعیر خان اس کو خاموش ہوتا دیکھ کر
اسکے چہرے کی طرف دیکھتا استفسار کرنے لگا۔

ہمم! کرتے ہیں۔۔۔ مہرو نے اس کی آنکھوں میں ملن کی سرخی
اور شدتِ جذبات کو دیکھ کر ہنکارا بھرا تھا۔ وہ اس پوائنٹ پہ
اگر نفی کرتی تو وہ مزید شدت پسند ہو جاتا ہے۔ مرد کی فطرت
ہے جب عورت بستر پہ اس کی قربت کے متعلق شکایت کرتی
ہے تو مرد شدت پسندی اور جنونیت اختیار کر جاتا ہے چاہے

پھر وہ عورت سے کتنا ہی پیار کیوں نہ کرتا ہو لیکن داعیر خان ہمیشہ ایک حد تک اس کے ساتھ اپنے لمس کی سختی برتتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کو اعتماد میں لیکر اور بوسے و کنار کے ذریعے اس سے اپنا حق وصول کرتا تھا لیکن جوان جذبات کی دوش پہ کبھی کبھی جانے انجانے میں اسے اسکی برداشت سے زیادہ درد دے جاتا تھا۔

اچھا اب بتاؤ! میں تم اتروں کے نہیں؟ تم جسمانی اور ذہنی طور پر مجھے برداشت کرنے کیلئے تیار ہو؟ اگر تم راضی ہو، کمفرٹبل ہو میرے ساتھ تو میں آگے بڑھو گا ورنہ باخدا ابھی چھپے ہٹ جاتا ہوں، تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔۔۔ داعیر خان اس کا چہرہ تکیے سے نکال کے اجازت طلب نظروں سے بولتا چھپے ہوا۔ وہ اس کا خود سے خوف زدہ ہونا بری طرح چبھاتا تھا۔۔۔

کیسی باتیں کر رہے ہیں داعیر آپ؟ میں ہمیشہ آپ کو برداشت کرتی آئی ہوں اور آج بھی کروں گی۔ آپ کو مجھ سے سکون لینے کیلئے اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔۔ میں تو ایسے ہی بول رہی تھی تاکہ آپ میری جلدی جان خلاصی کر دیں، مجھے نیند آرہی ہے نہ اسلیئے، آپ کا لمس مجھے کبھی تکلیف نہیں دیتا ہے۔۔۔۔ وہ اٹھ کے نرمی سے داعیر خان کی بیئرڈ پہ لب رکھتی یقین دہانی کروانے کی کوشش کرنے لگی جو اس کی باتوں سے پریشان ہوا بیٹھا تھا یا شاید ہمیشہ کی طرح ڈرامے کر رہا تھا۔ میں بھی ڈرامہ کر رہا تھا کیونکہ مجھے پتہ ہے میرا لمس تمہیں تکلیف کے ساتھ بہت مزہ دیتا ہے لیکن تم مجھے بتاتی نہیں ہو، خاموشی سے لیٹ کے مزے لوٹتی رہتی ہو، اور میں تمہیں مزے دینے

کیلئے پسینے بہا رہا ہوتا ہوں۔۔۔ وہ آنکھیں گھوما کے بولتا اپنی
مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے مہرو کے لب چوم گیا تھا۔
تو پسینہ آپ اپنے مزے کیلئے بھی بہاتے ہیں۔ مجھ پہ سارا ملبہ نہ
ڈالیں۔۔۔ مہرو اس کی ٹھوڑی پہ دانت گاڑتی کلس کے بولی
تھی۔۔۔

میں پسینہ صرف مزے لینے کیلئے نہیں بہاتا بلکہ اپنی پروڈکٹ کی
تیاری کیلئے بھی بہاتا ہوں۔۔۔ داعیر خان اس کے سینے کو مٹھی
میں جکڑ کر چھوڑتا پیچھا ہٹا تھا۔

وہ اٹھ کر مہرو کی ٹانگوں کے درمیان ایڈجسٹ ہوا۔ وہ سختی
سے اس کی ٹانگیں اپنی کمر کے گرد لپیٹتا اپنا وجود اس کے ساتھ
جوڑے بے باکی سے مس کرنے لگا تھا۔

اس کے لمس کی شدت محسوس کرتے ہوئے مہرو کے جسم میں
سپارک ہوا تھا۔ داعیر خان دھیرے دھیرے سے اپنا لمس اس
کی تھائیز کے درمیان گردش کرواتا اس کو مدہوش کرنے لگا
تھا۔۔

اہہ! امم!۔۔۔ مہرو بیڈ شیٹ کو مٹھیوں میں جکڑتی اپنا سر تکیے
پر پٹکتی اس کی قربت میں مچلنے لگی تھی۔ کافی دیر تک وہ اپنی
اسی حرکت کو دہراتا رہا تھا۔ اس کو مچلتے دیکھ کر اس کو سکون
مل رہا تھا۔ وہ کب سے بس خود کو اس سے مس کر رہا تھا لیکن
اس میں شامل نہیں ہو رہا تھا۔ وہ آج مہرو کو اپنی قربت کیلئے
پل پل ترپانا چاہتا تھا اور وہ ترپا رہا تھا۔

داعیر!! یہ کیا حرکت ہے؟۔۔۔ بالآخر برداشت ختم ہونے پر
مہرو نے اپنی خمار سے لہو چھلکتی آنکھیں کھول کر اس کو مخاطب
کیا تھا

۔ اس کی آنکھوں میں غصے کے ساتھ طلب کی رمق بھی واضح
تھی۔

کیا کر رہا ہوں؟۔۔۔ داعیر خان مزید شریر ہوا۔
اگر آپ کو نہیں کرنا تو مجھے چھوڑیں۔۔۔ بہت نیند آرہی ہے، میں
سونا چاہتی ہوں۔۔۔ مہرو نے اس سے اپنی ٹانگیں آزاد کروانی
چاہیں۔

اچھا! غصہ نہیں کرو نور چشم! اتر رہا ہوں تم میں۔۔۔ اس کا
بگڑتا موڈ دیکھ کے وہ پیار سے اس کی ٹھوڑی چومتا ایک ہاتھ اس

کے کندھے پہ رکھ کے ایک جھٹکے سے خود کو اس کے اندر دھکیل
گیا تھا۔

اہہ! داعیر۔۔۔ مہرو کی کراہ بے ساختہ تھی۔
شش! نور چشم! تم نے خود ہی کہا تھا اندر آنے کو، ورنہ میں تو
باہر سے کام چلا رہا تھا۔۔۔ وہ آگے جھک کر اس کے ماتھے پہ
لب رکھتا اپنی حرکت آہستہ سے بڑھا گیا تھا۔
مہرو نے اس کے جاندار جھٹکوں کی لرزش سے اس کے
کندھوں کو مضبوطی سے پکڑ کر اس کے سینے پہ درد کی شدت سے
دانت گاڑھ گئی۔

داعیر خان اس میں خود کو گھلتا محسوس کرتا اپنی حرکت خطرناک
حد تک بڑھا گیا تھا۔۔۔ مہرو کا پورا وجود اس کی شدتوں سے لرز رہا
تھا۔ اس کی رقصاں دھڑکنیں داعیر خان کو پاگل کر رہی تھی۔ وہ

نیچے جھک کر انہیں اپنے لبوں میں دباتا، لذت محسوس کرنے لگا
تھا۔

اہہ! امم۔۔۔ مہرو کی سسکیاں اور داعیر خان کی بھاری
سانسوں کا شور پورے کمرے میں گونجنے لگا تھا۔ وہ ہمیشہ کی
طرح جنونی ہوتا، اس کی ٹانگوں کو اپنی پشت سے ہٹائے پنڈلیوں
سے پکڑ کر چھبے آخری حد تک بینڈ کرتا، اس کی تھائیزپہ اپنے دونوں
ہاتھوں کا دباؤ دے کے اوپر اٹھتا اپنا وجود آخری حد تک اس میں
پیوست کر گیا تھا۔ وہ اس کی تھائیزپہ دباؤ ڈال کے خود کو حرکت
دیتا مہرو کی صحیح معنوں میں جان نکال رہا تھا۔

د۔۔۔ داعیر! اہہ! امم۔۔۔ مہرو نے اسے لرزتی آواز میں پکارا
تھا۔ بے ساختہ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا، وہ خود میں اس

کو آخری حد تک محسوس کرتی درد بھری لذت اٹھاتی میٹھی
سسکیاں بھرنے لگی۔

نور چشم! مزہ۔۔۔ آ رہا۔۔۔ ہے؟۔۔۔ داعیر خان اپنی شدتوں میں
اضافہ کرتا غیر ساکن وجود کے ساتھ سوال کرنے لگا۔
مہرو اس کے سوال پہ شرم کے مارے خاموش رہی تھی۔۔۔
داعیر خان کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ چہرہ بھی سرخ انگارہ ہو رہا
تھا۔۔۔ بال ماتھے پہ بکھر گئے اور جسم شدت جذبات میں دیکھتے
ہوئے پسینے سے تر ہو چکا تھا۔

بولو!۔۔۔ مزہ۔۔۔ آ رہا۔۔۔ ہے؟۔۔۔ داعیر خان نے پھر سے اپنا
سوال دہرایا تھا۔۔۔ وہ لب بھینچے ایک زوردار سٹروک دیتا مہرو
کو منہ کھولنے پہ مجبور کر گیا تھا۔

آ۔۔۔ رہا۔۔۔ ہے۔۔۔ مہرو نے ہڑبڑاتے ہوئے اس کو
مضبوطی سے پکڑ کر اپنی لرزتی آوازیں جواب دیا تھا۔۔۔ داعیر
خان گھٹنوں کے بل اٹھتا، اپنا پورا وزن اس پہ ڈال گیا تھا۔
پورا۔۔۔ بولو۔۔۔ کہ۔۔۔ مجھے۔۔۔ بہت۔۔۔ مزہ۔۔۔ آرہا
۔۔۔ ہے۔۔۔ وہ اس کے سینے پہ دانت گاڑھتا، جنونیت آمیز لہجے
میں بولا تھا۔۔۔

بہت۔۔۔ مزہ۔۔۔ آرہا۔۔۔ ہے۔۔۔ مہرو اس کو اپنے اندر
آخری حد تک محسوس کرتی سسکیوں کے درمیان بولی تھی۔۔۔
تم۔۔۔ میں۔۔۔ گھلتے۔۔۔ ہوئے۔۔۔ مجھے۔۔۔ بھی۔۔۔ بہت۔۔۔
مزہ۔۔۔ آرہا۔۔۔ ہے۔۔۔ داعیر خان اس کی برداشت دیکھتا
بنار کے اپنی حرکت جاری رکھے ہوئے تھا۔۔۔ وہ نرمی سے

اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو اپنے لبوں سے صاف کرتا اس کے
ماتھے پہ عقیدت سے لب رکھ گیا تھا۔۔

میری۔۔ مہر۔۔ ہو۔۔ تم۔۔ میں۔۔ نے۔۔ تمہیں۔۔

بہت۔۔ مشکلوں۔۔ سے۔۔ پایا۔۔ ہے۔۔ داعیر خان
اس کے چہرے کا ایک ایک نقوش چومتا، بھاری گھمبیر آوازیں
بولا تھا۔ اس کی آوازیں تکلیف کی اور اذیت کے رمق
واضح تھی۔ چہرے پہ مہر خان کو پانے کی جستجو چمکی تھی۔۔
مہر و قربت کے ان لمحات میں اس کے لہجے کا بھاری پن اور چہرہ
کی تکلیف محسوس کرتی، نرمی سے اس کی مونچھوں تلے عنابی
لبوں کو چوم گئی تھی۔

داعیر خان اس کی جسارت پہ سرشار ہوا تھا۔ وہ اپنی حرکت
رو کے مہر و کے حسین چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

نور چشم! آئی لویو سو مچ! داعیر اس کے لبوں کو چومتا، خوشی
سے سرشار ہو کے بولا تھا۔۔۔ مہرو کی یہ چھوٹی چھوٹی سی
جسارتیں اکثر اس کی خوشی کا باعث بن جاتی تھی۔۔۔
لویو مور! مہر کے داعیر!۔۔۔ وہ پیار سے اس کے ماتھے پہ
بکھرے بال اپنے نازک ہاتھ سے چھپھکرتی اس کے اظہارِ
محبت کو معتبر کرنے والے انداز میں بولی تھی۔
لیکن میں تم سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔۔۔ وہ اس کی کرسٹل
گرے آنکھوں کو چومتا پھر سے اپنے کام مگن ہو گیا تھا۔ مہرو
اس کی قربت میں سسکیاں بھرتی اسکے لمس کو برداشت کرنے
لگی تھی جبکہ داعیر خان اسکے بدن کو ساتھ ساتھ اپنے لبوں سے
مہکاتا اپنی قربت میں پگھلا رہا تھا۔

وہ پوری رات کیلئے اس کو اپنے سخت حصار کی قید میں لیا گیا۔
یہاں سے جلدی رہائی ناممکن تھی۔۔۔ مہرو اپنے ہاتھوں سے
زربخت کو تیار کر کے دمیر خان کے ساتھ بھیجنے پر جس قدر
محفوظ ہوئی تھی داعیر خان نے آکر ان کے فارم ہاؤس پہنچنے
سے پہلے اپنی مہر کے ہوش ٹھکانے لگا کے رکھ دیئے تھے۔۔۔۔۔
مہرو نے اس کی شدتوں کو سہتے ہوئے بے ساختہ سوچا۔ اس
لئے کہتے ہیں کسی کی حالت سے محفوظ مت ہوا کرو۔۔ کیا خبر
اس سے پہلے آپ کے ساتھ واقع ہو جائے جیسے آج مہر خان
کے ساتھ ہو گیا تھا۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد فارم ہاؤس پہنچ چکے تھے۔
فارم ہاؤس شہر سے بالکل باہر سرسبز پہاڑوں اور خاموشی سے

گھیرا ہوا تھا۔۔۔ دمیر خان گاڑی سے اتر کر دوسری سائیڈ آتا
احتیاط سے اس کا ہاتھ پکڑے اندر کی جانب لے کے بڑھا تھا۔
پورا لاؤنج اور سیڑھیاں گلاب کے پھولوں اور کینڈلز سے سجی
ہوئی تھی۔۔۔ دمیر خان بنا وقت ضائع کئے ایک جست میں
زربخت کو اپنی گود میں اٹھائے اوپر اپنے کمرے کی جانب لے
کے بڑھ گیا۔ زربخت نے بوکھلاتے ہوئے اس کو مضبوطی سے
تھاماتھا۔۔۔ ابھی تو وہ لاؤنج کا خوبصورت منظر دیکھ رہی تھی کہ
دمیر خان نے مختصر کرتے ہوئے اس کو کمرے کی طرف لے
کے بڑھ گیا۔

کمرے کو الگ انداز میں دلہن کی طرح سجا تھا۔ ہر طرف گلاب کی
پتیاں بکھری ہوئی تھی۔۔۔ جلتی کینڈلز کی مدہم روشنی اور
پھولوں کی مہک کمرے کے ماحول کو رومانوی بنائے ہوئے

تھی۔ وہ احتیاط سے اس کو نیچے اتارتا اسے پھولوں پر چلنے کا اشارہ کرنے لگا۔ کمرے کے دروازے سے لیکریڈ تک پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ زربخت کنفیوز سی ہوتی اپنی چادر کو درست کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے پھولوں پہ چلتے ہوئے آگے کی طرف بڑھ گئی۔

دمیر! یہ سب کچھ بہت خوبصورت ہے۔۔۔ وہ کمرے کی خوبصورتی دیکھتی تجسس بھرے انداز میں بولی تھی۔
تم سے زیادہ نہیں! میرا روشن بخت۔۔۔ وہ دو قدم اس کی طرف آتا زربخت کی چادر کو ایک منٹ میں اس کے تن سے جدا کر کے دور اچھال گیا تھا جو اس کے نظارے میں رکاوٹ بن رہی تھی۔

اہہ! زربخت اس اچانک حرکت پہ سہمی تھی۔۔۔ وہ تیزی سے اپنے ہاتھوں کی مدد سے خود کو چھپانے لگی تھی۔۔۔ چہرہ پہ شرم کی لالی دوڑی تھی لیکن دمیر خان اپنی آنکھوں کے سامنے آج زربخت کا جوالہ مکھی روپ دیکھ کے ساکن و صامت ہوا تھا۔ شہد رنگ اس کے چھوٹے سے بلاؤز میں مقید سر اُپے پہ اٹک گئی تھی۔ وہ سر اُپے سے اس کی لچمکی کمر تک اور کمر سے پیٹ تک آتا اپنا ضبط کھو چکا تھا۔ دمیر خان کیلئے اس کا یہ سجا سنورا روپ ناقابل برداشت تھا۔ وہ اپنی معصوم شکل اور دلکش حسن سے دمیر خان کے دل کے تار ہلا گئی تھی۔ وہ بہکی نظروں سے اس کا وجود سکین کرتا ایک جھٹکے سے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ گیا تھا۔ زربخت کٹی شاخ کی طرح اس کے

چوڑے سینے سے آٹکرائی تھی۔ شرم سے نظریں جھکی ہوئی
تھی۔

اس کو سینے سے لگاتے ہی دمیر خان کے دل کی سپیڈ دو سو پہ جا
پہنچی تھی۔ اس کے سینے کی ناز کی دمیر خان کے صبر کا امتحان
لے رہی تھی جبکہ اس کا دل آج بھی جھنجھلاہٹ اور خوف کا
شکار تھا۔ وہ اپنے خوف اور شرمندگی پہ قابو پاتی اس کے
چوڑے سینے میں منہ گھسیڑے چھپنے کی کوشش کرنے لگی
تھی۔۔

بہت پیاری لگ رہی ہو!
میرا چاند لگ رہی ہو!
تاروں سے بھری رات لگ رہی ہو!

سیاروں میں چمکتی کہکشاں لگ رہی ہو!
سات جھیلوں کا پر نور عکس لگ رہی ہو!
پھولوں کی مہک لگ رہی ہو!
لبوں کی مسکان لگ رہی ہو!
جسم کی روح لگ رہی ہو!
آنکھوں کا نور لگ رہی ہو!
دل کی دھڑکن لگ رہی ہو!
میری زندگی کی ترنم لگ رہی ہو!
تتلیوں کا خوشنما رنگ لگ رہی ہو!
صبح کا نور، شام کی چمک لگ رہی ہو!
متاعِ من لگ رہی ہو!
دمیر کا روشن ستارہ لگ رہی ہو!

مختصر یہ کہ تم دمیر کی حیات لگ رہی ہو!

وہ آنکھوں میں عقیدت اور چمک لئے محبت بھرے لہجے میں
بولتا اس کا چہرہ اپنے سینے سے نکالتا اس کے ماتھے پہ شدت سے
لب رکھ گیا تھا۔ اس کی شہد رنگوں آنکھوں میں زربخت کیلئے
ناقابل فراموش محبت تھی۔

آپ کو اچھا لگا؟ میں آپ کیلئے تیار ہوئی۔۔۔ اپنی اتنے خوبصورت
انداز میں تعریف سننے کے بعد اس نے جھپکتے ہوئے سوال کیا
تھا۔ وہ اپنے محرم کو خوش کرنے کیلئے اپنی کی گئی چھوٹی سی
کوشش بھی بتانا چاہتی تھی۔

صرف اچھا نہیں بلکہ بہت اچھا لگا ہے۔۔۔ اتنا حسن کون لئے
پھرتا ہے متاعِ من! میرا کمزور سادل تمہارے حسن کی تاب نہ

لاتے ہوئے بند ہو جائے گا۔۔۔ وہ نرمی سے اس کا گال چومتا
بہکے انداز میں بولا۔

اچھا! میرے سینے سے تو نکلو۔۔ مجھے خود کو جی بھر کے دیکھنے تو
دو۔۔ میری بخت میرے لئے کتنا سچی ہے، پھر میں اپنے لبوں
سے تمہاری کوشش کو سراہوں۔۔۔ دمیر خان نے اس کو
کند ہوں سے پکڑ اپنے سینے سے نکالنے کی سعی کی۔
نہیں! سینے سے نہیں نکلوں گی، مجھے شرم آتی ہے۔۔۔ زربخت
نے فوراً انکار کیا تھا۔

میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا، اور آج پھر بتا رہا ہوں۔۔۔ میں تمہارا محرم ہوں۔۔۔ محرم سے نہ خود کو چھپاتے ہیں اور نہ ہی شرماتے ہیں متاعِ من۔۔۔ وہ اس کو ایسے ہی اپنے ساتھ لئے پاس پڑے ٹیبل کی طرف بڑھتا نرمی سے سمجھانے لگا۔

چھوٹے سے ٹیبل پہ پھول، گفٹس اور ایک عدد کیٹ رکھا گیا تھا، جس پہ "آغاز زندگی" کی تحریر درج تھی۔۔۔ یہ سب تیاریاں دمیر خان نے آج دوپہر میں اپنی بخت کو سپیشل فیل کروانے کیلئے خود کروائی تھی۔۔۔

کیٹ کاٹو متاع من! تاکہ آج ہم اپنی حسین زندگی کا آغاز باقاعدہ طور پر میٹھے سے کر سکیں۔۔۔ وہ ایک ہاتھ سے نائف اٹھا کے اسکی طرف بڑھاتا دوسرے ہاتھ سے لائٹریکٹر کرکینڈل جلانے لگا۔

یہ سب کچھ میرے لئے کیا آپ نے؟۔۔۔ زربخت بے یقینی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات سے پوچھنے لگی۔

تمہارے علاوہ کوئی ذات اہم ہے میرے لئے؟ تم میری زندگی کا مرکز و محور ہو، یہ سب کچھ میں نے تمہارے لئے کیا ہے، تمہیں

اچھا لگایہ سب کچھ؟۔۔۔ وہ اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے کیک
کٹ کرتا معتبر کرنے والے انداز میں گویا تھا۔

اوہو دمیر! کینڈل تو بجھائی نہیں کیک پہلے کٹ کر دیا۔۔۔ وہ اس
کی بات توجہ سے سنتی، جلتی کینڈل کی طرف دیکھتی نیچے جھک کر
اسے پھونک مار کر بجھاگی تھی۔

اس کی معصوم سی حرکت پہ وہ مسکراتے ہوئے ایک گفٹ
باکس کھولتا اس میں سے ایک ریڈ ویلوٹ کا باکس نکال کے
زربخت کی طرف بڑھا گیا۔۔۔

کھول کے دیکھو!۔۔۔ وہ باکس کی طرف اشارہ کرتا زربخت کو
اسے کھولنے کا حکم کرنے لگا۔

اس نے نائف سائیڈ پہ رکھتے متجسس ہو کر باکس اوپن کیا تھا
اور اس میں ڈائمنڈز سے بھرا ہیومی سیٹ دیکھ کے خوشگوار
حیرت میں مبتلا ہوئی تھی۔۔

یہ بہت خوبصورت ہے دمیر!۔۔۔ زربخت ڈائمنڈ سیٹ کو
دیکھتی ستائشی انداز میں بولی۔۔ وہ اس کی طرف سے کی گئی اپنی
لئے کوششیں دیکھ کے تحیر زدہ ہوئی، آنکھوں میں خوشی چمک
رہی تھی، وہ خوشی کے مارے اپنی حالت کے بارے میں
بھول چکی تھی کہ وہ دمیر خان کے سامنے نیم برہنہ وجود کے
ساتھ کھڑی ہے۔۔

تم سے زیادہ نہیں! تم سے بڑھ کر کچھ قیمتی نہیں ہے۔۔۔ دمیر
خان اس کے ہاتھ سے باکس لیکر نیکلیس اٹھاتے ہوئے اس کے
گلے کی زینت بنا گیا۔ وہ شرارت سے اسے نیکلیس پہنانے کے

بعد اپنا ہاتھ اس کی برہنہ کمر پہ پھیرتا زربخت کو سٹپٹانے پر مجبور کر گیا۔

وہ فوراً اس کا ہاتھ چھپے کرتی نظریں جھکا گئی تھی۔۔۔
بخت!! میں تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں، بچپن سے کرتا
ہوں، جب سے تم اس جہان میں آئی ہو، تب سے کرتا ہوں، تم
نے میری بانہوں میں ہی آنکھیں کھولی تھیں اور میں تمہاری یہ سحر
انگیز نیلی آنکھیں دیکھ کے ہی تم پہ دل ہار بیٹھا تھا۔ اس وقت
دماغ میں صرف ایک سوچ آئی تھی۔۔۔ یہ آنکھیں، اور تمہارا
وجود صرف میرے لئے ہی زمین پہ اتارا گیا ہے۔ تیرہ سال
کی عمر میں ہی مجھے تم سے محبت ہو گئی تھی، جب تم میری
بانہوں میں آئی تھی میرا دل پہلی بار شدت سے دھڑکا تھا۔ وہی
شور آج تک تمہارے لئے میرے سینے میں گونجتا ہے۔ جب تم

پیدا ہوئی تھی تو بابا تمہیں میری گود میں پر سکون ہوتا دیکھ کے
بولے تھے یہ تو بخت آئی ہے۔ رحمت آئی ہے۔ تو میں نے بابا
سے پوچھا کہ بابا بخت کیا ہوتا ہے؟ تو بابا نے کہا کہ
روشن نصیب، بلند قسمت۔۔۔ بابا کی بات سنتے ہی میں نے
اسی وقت اللہ سے دعا کی تھی کہ وہ تمہیں میرے لئے مختص کر
دے اور میں وقت آنے پر تمہیں اپنا روشن نصیب بنا سکوں
اور اسی لمحے میں نے تمہارا نام زر بخت رکھ دیا تھا کیونکہ میں
نے اپنا نصیب تم سے جوڑ دیا تھا۔ تم میری حیات میں روشن
بخت کی طرح میرے ساتھ گزری ہو۔ تم میرا روشن بخت ہو،
میں تم سے سترہ سال سے پالی گئی شدت سے بھری محبت کرتا
ہوں، اور ہمیشہ کرتا رہوں گا کیونکہ تم چاہے جانے کے قابل
ہو، تمہارے وجود کو اور تمہاری خوبصورتی کو آج میں اپنے

شدت اور محبت سے بھرپور لمس سے سراہوں گا۔ میں تمہیں
بتاؤں گا سترہ سال سے ذخیرہ کی گئی محبت کتنی لذت بخش، میٹھی
اور جنونیت سے بھری ہوتی ہے۔۔۔ وہ اس کا چہرہ اوپر کئے
شدتِ جذبات سے بولا۔ اس کی شہد رنگ آنکھیں خمار سے سرخ
ہو رہی تھیں۔

زربخت اس کے لہجے کا بھاری پن اور تڑپ دیکھ کے خوف سے
تھوک نکلتی انگلیاں مروڑنے لگی تھی۔۔

تو۔۔ آپ۔۔ کی۔۔ مجھ۔۔ پہ۔۔ بچپن۔۔ سے نظر۔۔ تھی
؟۔۔ زربخت نے اٹکتے ہوئے سوال کیا تھا۔۔ وہ حیران
ہوئی تھی اس کی باتیں سن کر۔۔ اب اسے سمجھ آئی تھی کہ دمیر
خان بچپن میں کیوں اسے اتنی آئس کریم اور چاکلیٹس لاکے دیتا

تھا۔ یوں کے اپنے حصے کی بھی دے دیتا تھا۔۔۔ پتہ آج چلا تھا
کہ یہ معاملہ محبت کا تھا۔

صرف نظر نہیں!! دل تھا تم پہ!۔۔۔ دمیر خان کیک کا چھوٹا سا
ٹکڑا اٹھاتا فخریہ انداز میں مسکرا کر بولا تھا۔

تو پھر آپ اس لئے مجھے چاکلیٹس کھلاتے تھے تاکہ میں بڑی ہو
کے آپ سے شادی کروں؟ آپ مجھے بچپن میں رشوت دیتے
تھے؟۔۔۔ زربخت معصومیت سے گویا ہوئی۔

ہا ہا ہا! با خدا! تم سے شادی کرنے کیلئے چاکلیٹس نہیں کھلاتا تھا، وہ
تو میں محبت میں تمہیں کھلاتا تھا۔۔۔ اور اللہ تعالیٰ نے مجھ پہ کرم
کیا میری محبت سے تمہیں کھلائی گئی چاکلیٹس کو اپنی بارگاہ میں
قبول کرتے ہوئے تمہیں انعام کے طور پر میرے حصے میں
ہمیشہ ہمیشہ کیلئے لکھ دیا۔۔۔ یہ میری سچی اور پاکیزہ محبت کی

جیت ہے جو آج تم محرم بن کے میرے روبرو کھڑی ہو اور
اس خوبصورت بندھن پر میں اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کا کروڑوں
شکر ادا کرتا ہوں جس نے مجھے تم سے نوازا اور تاقیامت مجھے
تمہارا اور تمہیں میری روح کا ساتھ نصیب کرے
آمین!۔۔۔۔۔ دمیر خان نے مسکرا کر اپنی محبت کی تکمیل پہ اللہ
کا شکر ادا کیا۔

وہ ہاتھ میں پکڑا کیک کا ٹکڑا اس کے منہ کی طرف کرتا اس کے
ماتھے پہ لب رکھ گیا تھا۔ زربخت تو اس کی محبت کی گہرائی اور
سچائی میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ اس سے اتنی محبت کرتا تھا اور
اس کو کبھی اس کے جذبات کی بھنک بھی نہ لگی، اس نے کیک
کی بائٹ لیتے ہوئے بے ساختہ سوچا۔

دمیر خان کیک کا چھوٹا سا ٹکڑا اپنے منہ میں رکھتا، سوچوں میں
الجھی زربخت کو سوچنے سمجھنے کا موقع دئے بنا اس کی کمر میں ہاتھ
ڈال کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے بے ساختہ اس کے لبوں پر
جھک گیا تھا۔

وہ زربخت کا جبر انرمی سے وا کرتا اپنے منہ لیا ہوا سارا کیک
زربخت کے منہ میں انڈیلے اسکے لبوں کو سک کرنے لگا تھا۔
اس نے اس کی ناگہاں حرکت پر بوکھلاتے ہوئے اس کی شرٹ
کو مٹھیوں میں بھینچا تھا۔ وہ اس کی زبان کی حرکت اپنے
منہ میں محسوس کرتی شرم سے سرخ انار ہوئی تھی۔
دمیر خان اسکے منہ میں لیا کیک ذرا سا لبوں سے سک کرتے
ہوئے اپنے حلق میں اتارنے لگا تھا۔

وہ تیزی سے اس کے لبوں کو اپنے لبوں کی قید میں لئے دو منٹ
میں ہی اس کے منہ سے سارا کیک نکل گیا تھا۔ وہ بے باکی سے
اپنی زبان اس کی زبان کے ساتھ الجھاتا اس کی نمی اب سک
کرنے لگا تھا۔

زربخت اس کی بے باک جسارت پہ شرم آگئیں ہو رہی تھی،
اس کی سانسیں بری طرح پھول چکی تھیں۔
دمیر خان دوپل کیلئے اس کے لبوں کو آزادی دیتا پاس پڑے کیک
سے انگلی کی مدد سے چاکلیٹ اکھٹی کرتا اس کے نازک لبوں پہ
لگاتا پھر سے اس کی گلاب کی پنکھڑیوں پہ جھکا تھا۔
زربخت کی پہلے ہی سانسیں پھولی ہوئی تھی اس نے جھنجھلاتے
ہوئے اپنے لب آزاد کروانے کی ناکام کوشش کی تھی۔۔۔ وہ آج
اسے چھپے نہیں دھکیل رہی تھی کیونکہ پچھلی بار یہ عمل کر کے وہ

اسے تکلیف دے چکی تھی، اسے پھر سے اسی اذیت سے نہیں
گزار سکتی تھی۔ زربخت آج اس کے لمس کیلئے ذہنی طور پر تیار
تھی۔۔

دمیر خان اس کے دونوں لب اپنے منہ میں لیتا بے رحمی سے
ان پہ لگی چاکلیٹ لک کرتا اس کے نازک لبوں کو اپنی شدت
پسندی سے سرخ کر گیا تھا۔

وہ جذبات کی دوش پہ بہکتا ایک پل میں اس کی ساڑھی کا پلو
نیچے گراتا اسے چھپے دیوار کے ساتھ لگا گیا۔ وہ پیاسوں کی طرح
اس کے لبوں کا جام اپنے خشک حلق میں اتارتا بے تاب سے اس
کی سینے کی ابھری نازک سی ساخت پہ ہاتھ پھیرنے لگا تھا۔

اس کا ہاتھ اپنے سینے پہ محسوس کر کے زربخت کی ریڑھ کی ہڈی
میں سنسنی دوڑی تھی۔ وہ پھڑپھڑاہٹ کا شکار ہوتی اس کے
حصار سے نکلنے کی جدوجہد کرنے لگی تھی۔

دمیر خان اس کا سرخ ہوتا چہرہ اور مدہم سانسیں محسوس کرتا
اس کے لبوں کو زور سے چومتا رہائی بخش گیا تھا۔ اس کی اپنی
سانسیں بھی پھول چکی تھی۔ وہ بے چینی سے اس کے بلاؤز کی
سٹریپس میں انگلیاں الجھائے انہیں کھولنے کی بجائے توڑ گیا
تھا۔

وہ ایک لمحے میں ہاتھ چلاتے ہوئے اس کے دل کے مقام کو کوہر
قسم کے پردے سے آزاد کر گیا۔

زربخت نے خوف اور شرم سے زور سے آنکھیں میچی تھی۔ ننھا
سادل کانوں میں زور سے دھڑکا۔

متاعِ من! تم بہت خوبصورت ہو، مجھے پاگل کرنے کیلئے صرف تمہاری یہ دلکش اور رسیلی بناوٹ ہی کافی ہے۔۔۔ وہ خمار سے لہو چھلکتی آنکھوں سے اس کے سینے کی رعنائیوں کی طرف اشارہ کرتا جھک کے زبان پھیرتے ہوئے ایک دم سے انہیں اپنے لبوں کی قید میں لے گیا۔

ابہہ دمیر!!۔۔۔ زربخت اس کے لبوں اور دانتوں کی سختی اپنے نازک حصے پہ محسوس کرتی کراہ اٹھی تھی۔
دمیر خان اس کی کراہ کی پرواہ کئے بغیر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اوپر کی طرف اٹھا کے دیوار کے ساتھ پن کرتا اس کے سینے میں منہ گھسیڑے شدت سے اپنے لبوں اور دانتوں کا نشانہ بنانے لگا۔

س! دمیر مجھے درد ہو رہی ہے۔۔۔ زربخت نے سسکتے
ہوئے اس کے بالوں میں انگلیاں الجھائے اس کا چہرہ اپنے سینے
سے دور کرنا چاہا لیکن وہ مزید بہکا تھا۔ وہ اچھے سے اپنے ہاتھوں
اور لبوں کی طلب پوری کرنے کے بعد اس کے سینے سے منہ
نکالتا اسے نیچے کھڑا کر گیا۔

آزادی ملتے ہی زربخت نے ایک لمبی سانس خارج کرتے
ہوئے شکر ادا کیا تھا۔ وہ تیز تیز سانسیں بھرتی آنکھیں بند کئے چھپ
دیوار پہ ہاتھ جما گئی۔

دمیر خان اس کی دھڑکنوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ کے چھوڑتا نیچے
جھک کر پنچوں کے بل بیٹھا تھا۔

وہ اس کے برہنہ پیٹ کو زور سے سک کر کے چھوڑتا، اس کی
بیلی بٹن میں زبان پھیرتے ہوئے ایک ہاتھ سے زربخت کی

ساڑھی، اس کو سوچنے سمجھنے کا موقع دئے بغیر اس کے سحر انگیز بدن سے ریمو کرتا اسے زمین بوس کر گیا تھا۔

دمیر!۔۔۔ زربخت نے بے یقینی سے اسے پکارا تھا۔۔۔ اسے دمیر سے اتنی جلدی کی امید تھی نہیں تھی ہاں وہ اس کیلئے آج تیار تھی لیکن اس کی بے باک جسارتوں پہ وہ شرم کے مارے زمین میں دھنس رہی تھی۔۔۔

دمیر خان اس کی دودھیا سفید سافٹ سی تھائیز دیکھ کے بہکا تھا۔ آنکھوں میں مزید خمار کا غلبہ ہوا تھا۔ وہ اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پہ زبان پھیر کے تر کرتا نرمی سے اس کی اپر تھائیز پہ اپنی انگلیوں کا لمس چھوڑنے لگا۔ اس کی انگلیاں اپنی تھائیز پہ رینگتے ہوئے محسوس کر کے زربخت کی سانس حلق میں اٹکی تھی۔۔۔

دل خوف سے لرزا اٹھا۔ جسم اور چہرہ شرم سے بھاپ

چھوڑنے لگا تھا۔ دمیر خان اس کی دونوں تھائیز پہ ہاتھ جماتا خود
پہ کنٹرول کھوتے ہوئے پر حدت انداز میں اسکی تھائیز پہ اپنے
دانتوں اور لبوں کا گیلالمس چھوڑنے لگا۔ وہ آج اس کو سوچنے
کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا وہ شروع سے ہی اسے اپنی قربت کیلئے
تیار کر کے تڑپانا چاہتا تھا۔۔۔ وہ آج ہرگز اس سے سکون لئے بنا
چھپے نہیں ہٹنا چاہتا تھا۔ پچھلی بار بھی اس نے خود کو بہت
مشکل سے سنبھالا تھا۔۔۔

اہہ!! دمیر۔۔۔ وہ اس کی بے باک حرکت پہ بالآخر مچل اٹھی
تھی۔ اس نے دمیر کو بالوں سے جکڑتے ہوئے تڑپ کے پکارا
تھا۔

دمیر پلیر!۔۔۔ زربخت کی برداشت کی حد ختم ہوئی تھی، اس
نے ایک بار پھر تڑپتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کروایا، وہ

پنجوں کے بل اٹھتی، دیوار پہ اپنے ناخنوں کی خراشیں چھوڑتی
مچلنے لگی تھی۔ زربخت کی آنکھیں اچانک خمار سے گہری سرخ
ہوئی، وہ اپنے سر چھپ ڈھلاکائے آنکھیں موندے سرور میں دمیر
خان کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی تھی۔

دمیر! زربخت نے بے بسی اسے تیسری بار پکارا تھا۔ زربخت کا
پورا جسم پھر پھر اہٹ کا شکار تھا۔

دمیر خان نے اس کی ٹانگوں پہ اپنی زبان کے لمس سے اس پہ
ایسی مدہوشی طاری کی تھی کہ وہ شرم و حیا بھولے طلب میں
ترپنے لگی تھی۔

بولو متاعِ من!! سن رہا ہوں! دمیر خان اس کی رانوں سے چہرہ
اٹھا کے اوپر اس کی خمار سے سرخ ہوتی آنکھوں میں جھانکتا
بھاری گھمبیر آواز میں بولا تھا۔

لا۔۔ لائٹ۔۔۔ آف۔۔ کریں۔۔ اس نے شرم سے نظریں
چرا کے التجا کی تھی۔

وہ اس سے زیادہ اس کی بے باکیاں تیز روشنی میں نہیں برداشت
کر سکتی تھی پہلے ہی اس کو خوش کرنے کے چکروں میں وہ
بہت کچھ سہہ چکی تھی۔ اس کا جسم آلریڈی ڈر کی لپیٹ میں
تھا۔

او کے بخت۔۔۔ دمیر خان اٹھ کے سوچ بورڈ کی جانب بڑھ
گیا۔

اس کے چھپہٹتے ہی ایک دفعہ پھر سے اسے شرم و حیا نے آن
گھیرا تھا، وہ اپنے سینے پہ بازو لپیٹتی تیزی سے دیوار کی طرف رخ
کرتی خود کو چھپانے لگی تھی۔۔۔ دمیر خان کے لمس کا اثر زائل
ہوتے ہی زربخت پھر سے شرم میں ڈوب گئی تھی۔

دمیر خان پاس ہی لگے سوئچ بورڈ سے کمرے کی تیز روشنی گل کرتا، اسے مدہم رومانوی روشنی میں بدل گیا، وہ پھر سے زربخت کی طرف آیا تھا۔

ادھر میری طرف دیکھو متاعِ من! آج مجھے اپنے وجود کے ہر اعضاء کو سراہنے دو، میں عقیدت سے تمہارے وجود کے ہر اعضاء کو اپنے تشنہ لبوں سے چھونا چاہتا ہوں۔ دمیر خان اس کی پچھلی گردن پہ دانت گاڑتا اسکی کمر سے نچلے حصے کو اپنی مٹھی میں جکڑ کے اس کا رخ اپنی طرف کر گیا تھا۔۔۔۔۔ دمیر خان کا پورا بدن اور چہرہ جزبات کی تپش سے گرم آلود ہوا۔ بے چینی سے اس کے جسم کی رگیں پھولنے لگی تھی۔۔۔

زربخت آج اس کے لمس پہ مرنے کے درپہ تھی۔ دمیر خان اس کے چہرے کا رخ اپنی طرف موڑتا اس کے لبوں کو اپنے

لبوں کی گرفت میں لئے اسے اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے
صوفے کی طرف لے کے بڑھ گیا۔

وہ احتیاط سے اسے صوفے پہ لیٹاتا، چھپہٹ کر خود کو ہر پردے
سے آزاد کرنے لگا تھا۔ بیڈ پہ پچھلی دفعہ وہ پینک ہو گئی تھی، اس
لئے وہ اس کو پہلے صوفے پہ لایا تھا۔

زر بخت مدہم روشنی میں بھی اس کے وجود کو دیکھ سکتی تھی،
دمیر خان کے مضبوط وجود کو دیکھتے ہی ڈر سے اس نے نظروں کا
زاویہ بدل لیا۔

دمیر خان خود کو ہر پردے کے بوجھ سے آزاد کرتے ہی نیچے جھک
کر زر بخت کی ٹانگوں سے پکڑ کر اوپر کی طرف کرتا اس کے نازک
پیروں سے ہیلز اتارنے لگا تھا۔ ہیلز اتارنے کے بعد وہ اس

کے دونوں پیروں کو باری باری چومتا اپنے سینے پہ رکھ کے نیچے کی
جانب اپنے جسم پہ ٹریس کرنے لگا تھا۔

اپنے پیر اس کی ناف سے نیچے جاتے دیکھ کر زربخت کے
اوسان خطا ہوئے تھے۔ دل ڈر کے مارے دھڑکا تھا۔ دمیر
خان اسے گہری نظروں سے دیکھتا بے باکی سے اس کے پیر اپنے
وجود سے مس کرنے لگا تھا۔

اس کے وجود کی تپش اپنے پیروں کے نیچے محسوس کر کے
زربخت جھنجھلاتے ہوئے ایک چھٹکے سے اپنے پیر اس کی گرفت
سے آزاد کروا گئی تھی۔۔۔ ڈر کے مارے اس کی ہمتھیلیاں اور
جسم پسینے سے بھیگ رہا تھا۔ وہ اسکی معنی خیز نظروں کی تاب نہ
لا تے ہوئے شرم سے خود میں سمٹ رہی تھی۔ دمیر خان اس
کو خود میں سمٹتے دیکھ کر اس پہ سایہ فگن ہوا تھا۔

متاعِ من! ریلیکس ہو جاؤ۔۔ میں صرف تمہیں اور خود کو سکون
دوں گا۔ ایک ایسا سکون جہاں تم سب کچھ بھول جاؤ گی۔ اس
لذت سے بھرپور سکون کے لمحے جینے کیلئے میرا ساتھ دو۔۔۔ وہ
اسکی نیلی گہری آنکھوں میں خوف کی تحریر پڑھتا عقیدت سے
اسے کے ماتھے پہ لب رکھتے ہوئے ریلیکس کرنے لگا تھا۔
دمیر! مجھے آپ سے ڈر لگ رہا ہے۔۔۔ وہ ناچاہتے ہوئے بھی
دمیر خان کا چوڑا مضبوط وجود دیکھ کے گھبراتی اپنے دل کی بات
لبوں پہ لے آئی تھی۔ اسے واقعی میں ہی اپنا ننھا سا وجود دمیر
خان کے دیوہیکل وجود کے سامنے چیونٹی لگ رہا تھا جسے وہ اپنی
شدتوں سے ایک منٹ میں ہی مسل کے رکھ دے گا۔
میرا روشن بخت! مجھ سے ڈرو مت۔۔ میں تمہارے ساتھ
بہت نرمی سے پیش آؤں گا پرویس۔۔۔ دمیر خان اس کے

معصوم سے شکوے اور ڈر پہ اپنی مسکراہٹ ضبط کرتا پیار
سے اس کی آنکھیں چوم گیا تھا۔

دمیر خان نیچے جھک کر اپنے نچلے وجود کا دباؤ بڑھاتا زربخت کے
لبوں کو اپنے لبوں کی قید میں لئے سک کرنے لگا تھا۔ وہ ہلکی سی
خود کو حرکت دیتا زربخت کو اپنے لمس برداشت کرنے کیلئے تیار
کرنے لگا تھا۔

اپنی تھائیز پہ رینگتا اس کا لمس پھر سے زربخت کو تڑپنے پہ مجبور
کر رہا تھا۔ وہ بے چینی سے پہلی بار اس کے لبوں کو بے رحمی
سے اپنے دانتوں تلے کاٹنے لگی تھی۔

اس کی طرف سے کی گئی پہلی جسارت دیکھ کر دمیر خان خوشگوار
حیرت میں مبتلا ہوا تھا۔ وہ اپنے لبوں کی حرکت کو چھوڑ کر اپنے
نچلے وجود کی حرکت تیز کر گیا تھا۔

زربخت نے مدہوشی میں سر اوپر اٹھا کر تڑپ سے دمیر خان کے
لبوں کو اپنے نازک لبوں اور دانتوں میں لئے کترنے لگی تھی۔
اس کی ہر جسارت پہ دمیر خان کے لبوں پہ مسکراہٹ گہری
ہو رہی تھی، کافی دیر بعد اس نے اپنی سانسیں بند ہوتی محسوس
کر کے اس کے لبوں کو رہائی بخشی تھی۔

خیر! مقابلہ تو ٹکر کا ہے! ایسے ہی تم کہہ رہی تھی کہ میں چھوٹی
ہوں لیکن تم وائلڈ بہت ہو۔۔۔ سارے میرے ہونٹ کھا گئی
ہو، یہ دیکھو خون آرہا ہے۔۔۔ دمیر خان شرارت سے اس کے
چہرے پہ جھک کر پھونک مارتا اپنے لبوں کی طرف اشارہ کرنے

لگا۔

م۔۔۔ میں۔۔۔ نہیں۔۔۔ کیا۔۔۔ زربخت اس کی بات سنتی شرم
سے اپنے چہرے پہ ہاتھ رکھتی اپنی کی گئی حرکت پہ پچھتانے لگی
تھی۔

ہاہاہا!! شرمانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں اس سے ڈبل
بے رحمی تم پہ دیکھانے والی ہوں۔۔۔ اسلئے مجھے صرف
برداشت کرنے کی بجائے اپنے درد کا بدلہ بھی اترانا، مجھے نوچ
ڈالنا اور اپنے لبوں سے کاٹ کھانا۔۔۔ میں برا نہیں مناؤ گا۔۔
وہ ایک ہاتھ اس کے سینے پہ پھیرتا دوسرا ہاتھ اس کی لوڑبیلی سے
نیچے لے جاتے ہوئے اس کی تھائیز کے درمیان روک گیا۔ وہ
اس کے ہاتھ کی جسارت پہ فوراً آنکھیں کھولے دمیر خان کی طرف
دیکھنے لگی جو زو معنی انداز میں مسکرا رہا تھا۔

کیا ہوا متاعِ من؟۔۔۔ دمیر خان جان بوجھ کے اس کی ٹھوڑی
لبوں میں دباتا شرارت سے سوال پوچھتا اپنے ہاتھ کی حرکت بڑھا
گیا تھا۔

اہہہ! دمیر۔۔۔ اچانک اس کی ہاتھ کی موومنٹ پہ زربخت اپنی
جگہ سے اچھلی تھی۔ دمیر خان نے بے شرمی سے اپنے ہاتھ کی
موومنٹ روکنے کی بجائے مزید بڑھائی تھی۔

اہہہ دمیر!! یہ کیا بد تمیزی ہے؟۔۔۔ اب کی بار وہ اس کے سینے
پہ مکا جھڑتی، غصے اور شرم کے ملے جلے تاثرات سے چلائی
تھی۔ اتنی بے شرم حرکت کی اسے اس سے امید نہیں تھی۔
شش! متاعِ من! یہ سٹیپ ضروری ہے، وگرنہ ڈائریکٹ
پروسیس پہ آیا تو تمہیں زیادہ پین ہوگی۔۔۔ دمیر خان اس کو
مزاحمت کرتے دیکھ کر سختی سے ٹوک گیا تھا۔

وہ اس کی بے باک حرکت پر اب مزاحمت کرنے کی بجائے
آہستہ آہستہ سے مدہوش ہو رہی تھی کیونکہ اس کے ہاتھ کی
موومنٹ دھیرج سے بڑھ رہی تھی جو اس کو مدہوش کرنے
کیلئے کافی تھی۔

اہہ! امم۔۔۔ وہ آنکھیں موندے اپنے کمر اوپر کی طرف اٹھاتی
مچل اٹھی تھی، آنکھوں میں پھر سے خمار کی سرخی نے ڈیرے
جمائے تھے۔

اس کی تڑپتی حالت دیکھ کر وہ اٹھ کے چھپے بیٹا اس کی دونوں
ٹانگوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ وہ اس کی ٹانگوں کو پکڑ کر تعریض
کرتا، ایک ٹانگ صوفے کی پشت کے ساتھ لگاتا، دوسری اپنی
ران پہ رکھتا مزید اس کے قریب ہوا تھا۔

زربخت حیا سے چھپے کو کھسکی تھی۔ پورے جسم میں خوف کی لہر
دوڑی تھی۔ ماتھے پہ پسینے کی بوندیں نمودار ہوئیں۔ دل نے
دھڑکنا چھوڑا تھا۔

دمیر پلیر! آرام سے، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔۔۔ وہ اس کا
اگلا عمل سوچ کر آنکھوں میں رحم کی التجائے خوف سے تھوک
نگلتے ہوئے بولی تھی۔

بھروسہ رکھو مجھ پہ!! تمہیں تکلیف نہیں دوں گا۔ جہاں پہ زیادہ
درد ہو مجھے بتا دینا، میں فوراً رُک جاؤں گا لیکن اپنی متاعِ من کو
ہرگز تکلیف نہیں دوں گا۔۔۔ دمیر خان اس کی بھیگی ہتھیلیاں
چوم کے اپنے سینے پہ رکھتا اپنا وجود اس کے نازک وجود سے
مس کرنے لگا تھا۔۔

دمیر! ایک منٹ۔۔۔ زربخت نے اسے آخری امید کی تحت
پکارا تھا، کہ شاید وہ اس کی جان بخش دے؟
میرا روشن بخت! اجازت دو مجھے خود میں اترنے کی، میں مزید
اپنے جذبات پہ بند نہیں باندھ سکتا۔۔۔ دمیر خان بھاری گھمبیر
آوازیں ملتجی ہوا تھا، زربخت اب اس کے صبر کا امتحان لے
رہی تھی۔

مجھے آپ پہ یقین ہے، آپ مجھے تکلیف نہیں دیں گے۔۔۔ وہ
اس کا گرم دھکتا بدن اور آنکھوں میں ٹرپ دیکھتی دھڑکتے دل
کے ساتھ آنکھوں سے اجازت دیتی اس کے سینے پہ ہاتھ
مضبوطی سے جما گئی تھی۔

میرا روشن بخت! میں تمہارا یقین نہیں توڑوں گا، بہت نرمی اور
پیار سے پیش آؤں گا۔۔۔ وہ اس کی چھوٹی سی ناک لبوں میں دبا

کے چھوڑتا یقین دہانی کروانے لگا۔ جذبات کا لاوا مجتمع ہو کے
وجود کے ہر حصے پہ زور آور ہو رہا تھا۔

وہ احتیاط سے تھوڑا سا اٹھا کے زربخت کے قریب ہوتا ایک
ہاتھ اس کی تھائی پہ جمائے، دوسرے ہاتھ کو زیر استعمال کیے
اسے خود کو مضبوطی سے جکڑنے کا اشارہ کرتا اس میں شامل
ہونے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

زربخت اس کے وجود کا تھوڑا سا دباؤ محسوس کرتی کرنٹ کھا
کے چھپے ہٹی لیکن دمیر خان کی اس کی تھائی پہ گرفت مضبوط
ہونے کی وجہ سے وہ اس کی پکڑ سے نہ نکل سکی۔۔

دمیر! بس کریں! میں نہیں سہہ پاؤں گی آپ کو۔۔۔ زربخت
روہانسی ہو کے بولی تھی۔ وہ صرف اس کا زرا سا دباؤ نہیں
برداشت کر سکی تھی تو اس کو خود میں اترتا کیسے برداشت کرتی؟

ابھی تو شروعات ہی نہیں کی! بس کیسے کر دوں میری جان۔۔
دمیر خان مصروف انداز میں بولتا اس میں شامل ہونے کی ناکام
کوشش کرنے لگا تھا۔

ہر کوشش پہ خود کو ناکام ہوتا دیکھ کر دمیر جھر جھری لیتے ہوئے
زربخت کی ٹانگوں کو مزید تعریض کرتا اس کو کمر سے پکڑ پھر سے
اپنی رانوں میں ایڈجسٹ کرنے لگا تھا۔

اف! کیسے اتروں تم میں؟ تم تو بہت نازک ہو میری
بخت۔۔۔ وہ ایک نظر اس کی آنکھوں میں جھانکتے بولا تھا جو
اپنی آنکھوں میں رحم کی امید لئے اس کی طرف دیکھ رہی
تھی۔۔۔ دمیر خان اس کی آنکھیں پڑھتا ایک لمبی سانس ہوا میں
منتشر کرنے لگا۔

وہ خود بھی اس میں منتقل ہونے پر کنفیوژن کا شکار لگ رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی، وہ اپنی چھوٹی سی نازک شریک حیات میں کیسے اترے؟ جو اس کے لمس پہ پہلے ہی خوف سے کانپ رہی تھی۔۔

وہ بالآخر فیصلہ کرتا خود کو اس کے وجود کے ساتھ جوڑے، سانس روک کر بے حد آہستگی سے ایک چھٹکے سے اپنا گرم لمس اس میں منتقل کر گیا تھا۔

اہہ!۔۔۔ اس میں منتقل ہوتے دمیر خان کے منہ سے راحت بھری آواز نکلی تھی جبکہ زربخت کی دلخراش چیخ پورے کمرے میں گونجی تھی۔

آپ جھوٹ۔۔ بولتے ہیں۔ آپ بہت۔۔ برے ہیں۔ آپ نے تو۔۔ بولا تھا درد۔۔ نہیں ہوگا۔۔ میری جان۔۔ نکل گئی

ہے۔۔۔ زربخت روتے ہوئے غصے سے اس کے سینے پہ
اندھا دھن کے جھڑتی تکلیف میں بولی۔ اس کے ایک ہاتھ میں
پہنی چوڑیاں ٹوٹ کے دمیر خان کے سینے پہ خراشیں چھوڑ گئی
تھیں۔

بس متاعِ من ہو گیا! اتنی سی پین ہونی تھی، اب نہیں
ہوگی۔۔۔ وہ جھک کر اس کے عارضوں پہ ٹکے آنسو اپنے لبوں
سے صاف کرتا عقیدت سے اس کے ماتھے پہ لب رکھ گیا۔ اس
نے اس میں داخل ہونے کے بعد خود کو بالکل ساکت کر لیا تھا۔
کوئی حرکت نہیں کی تھی۔

نہیں آپ مجھے تکلیف دے رہے ہیں، مجھے درد ہو رہی
ہے۔۔۔ زربخت ہنوز اس کے لمس تالاب نہ لاتے ہوئے
مزاحمت کر رہی تھی۔

بخت! مزاحمت بند کرو ورنہ پین ہوگی۔۔۔ میں کہہ رہا ہوں نہ اب
پین نہیں ہوگی جتنی ہونی تھی ہو گئی۔۔۔ وہ نرمی سے اس کے
برہنہ شانے چومتا اسے ریلیکس کرنے لگا تھا۔ وہ اس کے
شانوں سے گردن پہ آتا اس کی سکن کو سک کرتے ہوئے نیچے
سے ہاتھ گزار کے اس کی کمر سہلانے لگا تھا۔ تھوڑی دیر پیار
سے اس کے وجود کو اپنے لبوں سے مہکانے کے بعد وہ چھپے
سیدھا ہوا تھا۔

زربخت کافی حد تک اب نارمل ہو چکی تھی۔۔۔ وہ رو نہیں رہی
تھی۔

اب ٹھیک ہو؟۔۔۔ دمیر خان نے اس کی تھائی پہ لب رکھتے
ہوئے استفسار کیا۔۔۔

ہمم! لیکن آپ میرے ساتھ نرم رہئیے گا۔۔۔ زربخت نے پھر
سے التجا کی۔ وہ کچھ زیادہ ہی اس کی شدتوں سے ڈر رہی تھی اور
اس کا ڈرنا بنتا بھی تھا۔ دمیر خان جیسے بھرپور جوان مرد کو
برداشت کرنا کوئی آسان کام تھوڑی تھا؟
پوری کوشش ہوگی لیکن جذبات میں اگر بے خود ہو گیا تو
معذرت!!۔۔۔ اب کی بار دمیر خان صاف گویائی سے بولا تھا
کیونکہ اپنے جذبات پہ اسے بند ٹوٹے ہوئے محسوس ہو رہے
تھے۔

تھوڑی دیر بعد اسے ریلیکس ہوتے دیکھ کر وہ ہاتھ آگے
بڑھائے اس کے خوبصورت بالوں کو بن کی قید سے آزاد کرتا کھلے
بکھیر گیا تھا۔ وہ اس کے سر کے نیچے کشن دے کے خود کے
نیچے سیٹ کرتا اس کے ہاتھ اپنے سینے پہ جما کے ہلکی سی خود کو

حرکت دینا شروع کر چکا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے خود کو موو کرتا زربخت کو اپنی شدتوں سے آشنا کروانے لگا۔ وہ خاموشی سے اس کے سینے پہ ہاتھ جمائے اسے برداشت کرتے آنکھیں موندھ گئی تھی۔ چند لمحے نرم رہنے کے بعد اس کی برداشت دیکھ کے دمیر خان نے اپنی حرکت میں تیزی کی تھی۔۔۔

زربخت نے فوراً آنکھیں کھولتے ہوئے اس کے سینے کے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑا تھا لیکن وہ ابھی تک خاموش تھی۔

اگرچہ چہرے پہ تکلیف واضح تھی۔ دمیر خان کا لمس اس پہ سسکیاں طاری نہیں کر رہا تھا۔

دمیر خان اس کی خاموشی دیکھ کر شدت سے اس میں سماتا خطرناک حد تک اپنی حرکت بڑھا گیا تھا۔ اس کے جان لیوا دو جھٹکے ہی زربخت کو درد سے منہ کھولنے پہ مجبور کر گئے تھے۔

ابہہ دمیر!!۔۔۔ وہ سسکتے ہوئے اسے پکار اٹھی تھی۔
متاعِ من۔۔۔ دمیر خان محبت بھرے لہجے میں اس کی پکار کا
جواب دیتا آگے جھک کر اس ٹھوڑی چومتا مزید اپنی حرکت میں
برق رفتاری لا گیا۔ زربخت اس کی بے رحم حرکت پہ بوکھلاتے
ہوئے اس کے سینے سے ہاتھ ہٹا کے بازوؤں سے تھام گئی
تھی۔

ابہہ!!۔۔۔ زربخت کی سسکیاں اب پورے کمرے میں گونجنے
لگی تھی۔۔۔ دمیر خان اس کی سسکاریاں سن کے صحیح معنوں
میں پاگل ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر مزید بے چینی سے خود کو آخری حد
تک زربخت کے نازک وجود میں منتقل کر گیا تھا۔ وہ اپنے
جانگداز جھٹکوں سے زربخت کی ننھی سی جان حلق میں اٹکا گیا

تھا۔۔ اس کی آنکھیں باہر نکلنے کو بے تاب ہوئی، کلیجہ منہ کو آیا تھا

--

اہہ!!۔۔ امم!۔۔ دمیر!!۔۔ زربخت نے اسے درد کی

شدت میں لرزتی آوازیں پکارا تھا۔۔

میرا۔۔ روشن۔۔ بخت! مجھے۔۔ خود۔۔ سے۔۔

سکون۔۔۔ لینے۔۔۔ دو! دمیر خان بھاری گھمبیر آوازیں اپنے

غیر ساکت وجود کے ساتھ بولتا، چپھے ہٹنے کی بجائے صوفے کی

تنگ جگہ پہ مزید زربخت کو اپنے سڑوکس سے چپھے دھکیل کے

اس میں سماتا شدت پسند ہو رہا تھا۔

اہہ!! امم۔۔۔ وہ لذت کی انتہا کو چھوتا بھاری گھمبیر آوازیں

نکالنے لگا تھا۔۔ وہ اس نازک سی موم کی گڑیا میں سرایت کرتا

بے خود ہو رہا تھا، جذبات باغی ہو کے لذت اور سکون کی آخری

حدوں کی چھوٹ چاہتے تھے۔۔۔ دمیر خان کا پورا وجود پسینے سے
تر ہو چکا تھا۔۔۔ اسکی بھاری سانسیں اور زربخت کی سسکیاں
کمرے کے ماحول کو پرسوز بنائے ہوئے تھیں۔۔۔ وہ صوفے کی
ریسٹ آرم پہ اپنے دونوں ہاتھ جماتا اوپر اٹھ کر اپنا پورا وجود
اس میں منتقل کرتا جنونی ہو رہا تھا۔

اہہہہ!! بس۔۔۔ کریں۔۔۔ میں۔۔۔ آپ۔۔۔ کو
۔۔۔ مزید۔۔۔ برداشت۔۔۔ نہیں۔۔۔ کر۔۔۔ سکتی۔۔۔
زربخت نے اب روتے ہوئے دہائی دی تھی، اس کی آنکھوں
سے آنسو نکل کر کشن میں جذب ہو رہے تھے۔۔۔ درد سے کمر
دکھنے لگی تھی۔

اہہہہ!۔۔۔۔۔ دمیر خان اس کی پکار نہیں سن رہا تھا۔ وہ مدہوش
ہوتا اس میں سفر کر رہا تھا۔

دمیر۔۔۔ اب کی بار زربخت نے اسکے سینے پہ زور سے دانت
گاڑھ کے اسے ہوش دلائی تھی۔

دمیر صدقے جائے اپنی بخت پہ!۔۔۔ وہ اپنے سینے پہ جلن
محسوس کرتا حرکت روکے شدت سے اس کا آنسوؤں سے بھرا
چہرہ چوم گیا۔

میری۔۔۔ کمر۔۔۔ میں۔۔۔ درد۔۔۔ ہو۔۔۔ رہی۔۔۔ میں
۔۔۔ کب۔۔۔ سے۔۔۔ آپ۔۔۔ کو۔۔۔ بلا۔۔۔ رہی
۔۔۔ تھی۔۔۔ زربخت زور سے اس کی گردن پہ دانت گاڑھتی
روتے ہوئے شکوہ کر گئی۔

جب محبت سترہ سال کے انتظار کے بعد ملے تو کون کمبخت
ہوش میں رہے گا اور محبت بھی وہ جو بلا کی حسین ہے۔ اس
میں صرف میرا قصور نہیں ہے بلکہ تم بھی برابر کی قصور وار ہو۔

کس نے کہا تھا اتنی معصومیت اور حسن سمیٹو ہم؟۔۔۔ وہ
اس کے اوپر سے ہٹتا، زربخت کو نیچے سے اٹھا کے اپنی گود میں
بیٹھاتا نرمی سے اس کی کمر دباتے ہوئے مخمور لہجے میں بولا تھا

--

میرا کوئی قصور نہیں ہے، آپ کی نیت خراب ہے۔۔۔ اس
نے فوراً اس کی گردن پہ بائٹ کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔
ہا ہا ہا! متاعِ من! میری نیت آج کی پوری رات خراب رہنے والی
ہے اس لئے خود کو تیار کر لو۔ دمیر خان نرمی سے اس کی گنپٹی پہ
لب رکھتا ہنستے ہوئے اس کو صوفے سے لے کے اٹھ کھڑا ہوا۔
وہ بیڈ کی طرف آتا زربخت کو سیدھا لیٹا کے اس کے پورے
جسم پہ لبوں کے نشان چھوڑنے لگا تھا۔۔

وہ نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتا اس کے لبوں کو نرمی سے چوم کر پھر سے اس کی ٹانگوں کے درمیان آیا تھا۔۔

فرسٹ راؤنڈ میں تم پینک ہو گئی تھی بٹ اب کی بار تم میرے ساتھ سکون کی لذتوں کو چھوتے ہوئے برابر مدہوش ہو گئی۔۔
دمیر خان اس کے کان میں میٹھی سرگوشی کرتا گھٹنوں کے بل ہو کے بیٹھتا اس کے نچلے وجود کو اٹھا کے اپنی رانوں پہ رکھتا بے قراری سے اس میں سمایا تھا۔۔

ابہہ دمیر! زربخت کی پھر سے کراہ بے ساختہ تھی۔۔
بخت!! سانس لو، ڈھیلا چھوڑو خود کو اور مجھے محسوس کرو۔۔۔ وہ اپنی خمار چھلکتی آنکھوں سے اس کو حکم دیتا اپنی حرکت شروع کر گیا تھا۔ وہ اس کو بازوؤں سے تھام کر اپنے لرزتے وجود پہ قابو پانے لگی تھی۔۔

اہہہ! امم!۔۔۔ اب کی بار وہ بنا مزاحمت کے اسے برداشت
کرنے لگی تھی۔

دمیر خان اس کی سینے کی ناز کی کو چھوتا وحشی ہو رہا تھا۔ وہ ہر
گزرتے لمحے کے ساتھ اپنا وجود زربخت میں پیوست کر رہا
تھا۔۔۔ زربخت میٹھی سسکیاں بھرتی اس کی وحشی پن کو ہوا
دے رہی تھی۔

دمیر خان کا پورا جسم آگ کی طرح جل رہا تھا، اس کا سفید چہرہ
اور کان لال سرخ ہو رہے تھے۔۔۔ جسم پسینے سے تر تھا۔۔۔ وہ
زربخت کی پنڈلیوں میں انگلیاں پیوست کرتا اپنے جان لیوا
اسٹروکس سے بیڈ بھی لرزا کے رکھ گیا تھا۔

دمیر!! میری۔۔ سانسیں۔۔ بند۔۔ ہو۔۔ رہی ہے۔۔۔
زربخت کی برداشت کی حد ختم ہوئی تھی، وہ اس کے لمس کے
زیر اثر جان جانے کے درپے تھی۔

ادھر۔۔ چہرہ۔۔ میرا۔۔ قریب۔۔ لاؤ۔۔ میری۔۔
ساری۔۔ سانسیں۔۔ حلق۔۔ سے۔۔ کھینچ۔۔ لو۔۔۔ دمیر
خان اسے اپنے لبوں کی طرف آنے کا اشارہ کرتا پھولتی سانسوں
کے درمیان بولا تھا۔

نہیں! آپ۔۔ مجھ۔۔ پر۔۔ سے۔۔ ہٹیں۔۔ میں۔۔
آپ۔۔ کے نیچے۔۔ دب۔۔ رہی۔۔ ہوں۔ اس نے فوراً نفی
کی تھی، وہ پہلے بھی اس کو خود سے کس کرنے والی اپنی جسارت
پر شرمندہ تھی۔۔

او کے! میں خود آجاتا ہوں۔۔۔ دمیر خان اس کو اپنے لمس
سے آزاد کرتا اس کے لبوں کی طرف آتا تیزی سے انہیں آہنی
گرفت میں لیا گیا۔۔

وہ شدت سے اس کے لبوں کو چومتے ہوئے اپنی ساری
سانسیں اس میں اندھیلے ہوئے نرم ہاتھوں سے اس کی کمر
سہلانے لگا تھا۔۔۔

زربخت کی سانسیں نارمل کرنے کے بعد وہ چھپے ہٹ کے بیڈ
کراؤن کے ساتھ ٹیک لگاتا زربخت کو اٹھا کے اپنی گود میں بیٹھا
گیا تھا۔

چلو ایسے کرتے ہیں! میرے نیچے تو تمہاری سانسیں بند ہوتی ہیں
اب تم میری سانسیں بند کرو! دمیر خان مخمور لہجے میں کہتا
زربخت کو بے باک حرکت کا اشارہ کر گیا تھا۔

نہیں! اب اور نہیں میں تھک چکی ہوں۔۔۔ زربخت اس کے
سینے پہ مکا جھڑتی فوراً اپنا چہرہ اس کے سینے میں چھپا گئی
تھی۔ اس کا بے باک اشارہ سمجھ کے ہی چہرہ شرم سے لال
گلاب ہوا تھا۔

Oh come on ! Just one more time Please ! I promise it
won't hurt you...

دمیر خان اس کی گردن پہ اپنی گیلی زبان پھیرتا پھر سے اس میں
سمانے کیلئے بے تاب ہوا تھا لیکن زربخت ہٹ دھرمی
دیکھاتے ہوئے اس کے سینے میں مزید گھسی تھی۔
وہ اس کو ضدی بنا دیکھ کر خود ہی اسے کمر سے جکڑ کر اوپر کی
طرف اٹھا کے اپنی رانوں پہ ایڈجسٹ کرتا بے صبری سے اپنا
آپ اس میں تیسری بار گھول گیا تھا۔

زربخت نے سسکتے ہوئے اس کی گردن پہ دانت گاڑھ
تھے۔۔ وہ آج اس کی گردن اپنے دانتوں کے نشانات سے بھر
چکی تھی۔

دمیر خان اس کی کمر کو اپنی آہنی گرفت میں لیتا اوپر نیچے موو
کرتے ہوئے اپنے جنونی جذبات کا لاوا اس میں منتقل کرنے لگا
تھا۔۔

زربخت نے صرف مہر خان سے ازدواجی تعلق کا سنا تھا۔۔
آج پریکٹکی جان کے اس کی جان لبوں پہ اٹکتی پل پل نکل کر
رہی تھی۔ وہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اپنے محرم کی شدت پسند
قربت میں ٹوٹ کے بکھرتی اس کی بانہوں میں سمٹ رہی
تھی۔۔

میرے کندھوں پہ ہاتھ جماؤ اور چہرہ اوپر کرو۔۔۔ دمیر خان حکمیہ
لہجے میں بولتا آگے جھک کر اس کی سینے کی ناز کی کو اپنے ہونٹوں
میں قید کئے محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے اس کو کمر
سے پکڑ اپنے وجود پہ موو کرتا دوسرے ہاتھ سے اسکی رقصاں
دھڑکنوں کو اپنی مٹھیوں میں دبانے لگا تھا۔۔۔

زربخت نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی کیونکہ اس میں اب
مزاحمت کرنے کی ہمت نہیں بچی تھی۔۔۔ وہ بس مضبوطی سے
اس کے کندھوں پر ہاتھ جمائے سسکتے ہوئے اسے سہن کرنے
لگی تھی۔

کافی دیر بعد زربخت کو نڈھال ہوتا دیکھ کر دمیر خان اسے سے اپنا
وجود الگ کرتا اس کے ماتھے پہ لب رکھ گیا تھا۔۔۔ وہ تھکے
ہوئے انداز میں اس کے سینے پہ سر رکھتی آنکھیں موند گئی تھی۔

بخت! تم ٹھیک ہو؟۔۔۔ اس کی یوں خاموشی پر دمیر خان نے
فکر مندی سے استفسار کیا تھا۔

ہمم!! میں ٹھیک ہوں۔۔۔ اس نے آنکھیں کھولے بنا مدہم آواز
میں جواب دیا تھا۔۔۔ اس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھی، پورا
جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔

دمیر خان کمر ٹڑاٹھا کے اس کا پسینہ صاف کرتا، اس کے گردن
پہ چپکے سارے بال سمیٹ کے اس کی پشت پہ ڈالتا اپنے
ہاتھوں سے اس کی کمر کا ہلکے سے مساج کرنے لگا تھا۔۔۔ وہ اس
کے چہرے پہ جا بجا لب رکھتا مزید اس کو اپنے سینے میں بھینچ گیا
تھا۔۔۔

پین تو نہیں ہو رہی کہیں؟۔۔۔ اس نے اس کے لبوں کو
چومتے ہوئے سوال کیا تھا۔

ادھر ہو رہی ہے۔۔۔ زربخت اپنے ہاتھ سے اپنی کمر کے
مخصوص حصے کی طرف اشارہ کرتی آنکھیں کھولے بنا بولی تھی۔
یہاں ہو رہی ہے؟۔۔۔ وہ اس کی کمر کو اپنے ہاتھوں سے دباتا
استفسار کر گیا۔

ہمم! تھوڑا زور سے دبائیں۔۔۔ زربخت نے ہنکارا بھرا تھا۔
دمیر خان اس کی کمر کو اچھے سے دبانے کے بعد کچھ وقت کی
مہلت دیتا، پھر سے اس کو اپنے شدت پسند حصار میں قید کر گیا
تھا، یہاں سے اس کو رہائی فجر کے بعد ہی ملنی تھی۔۔۔ وہ اسے
سترہ سال بعد میسر آئی تھی، اس پہ جنونیت اور محبت نچھاور کرنا
تو دمیر خان کا حق بنتا تھا۔۔۔

سانس لو بخت۔۔۔ دمیر خان بھاری گھمبیر آواز میں بولتا اس
کے کندھے پہ اپنے سلگتے لبوں کا لمس چھوڑتا ایک دم سے اس
میں اتر ا تھا۔

اہہہ! دمیر۔۔۔ زربخت نے اذیت سے سسکی بھرتے ہوئے
اس کو گردن سے جکڑا۔

میرا روشن بخت۔۔۔ دمیر خان تیز پانی کے بہاؤ سے اپنا چہرہ
نکالتا محبت سے اس کی کنپٹی پہ لب رکھ گیا تھا۔۔۔ وہ یکدم سے
خود کو تیز حرکت دیتا زربخت کی گہرائیوں میں گم ہونے لگا تھا۔۔۔
وہ دونوں اس وقت روف شاور کے نیچے کھڑے اپنے آگ کے
جیسے دہکتے جذبات کی تسکین کر رہے تھے۔ دمیر خان پھلپ
آدھے گھنٹے سے اس کی ننھی سی جان ہلکان کئے ہوئے تھا۔

فجر کی اذان ہونے میں بہت ٹائم تھا۔ جب زربخت کی اچانک سے آنکھ کھل گئی اور وہ غلطی سے دمیر خان کو محبت سے پکار بیٹھی تھی، بس اس کی یہی غلطی اس پہ بھاری پڑ گئی تھی۔
حالانکہ زربخت نے تو اسے اسلئے جگایا تھا کہ وہ اس کے وجود کو اپنی قید سے رہائی دے تاکہ وہ شاور لے سکے لیکن دمیر خان اس کو شاور سروس خود سے دینا کا ارادہ کرتا فوراً واشروم میں لے آیا تھا اور وہ تب سے ہی اس پہ اپنی شدتیں لٹا رہا تھا۔ وہ ہر لمحے زربخت پہ ٹوٹ کے برستا اس کے نازک وجود کو اپنی جان لیوا قربت سے نڈھال کر کے رکھ گیا تھا۔

اہہ! امم۔۔۔ زربخت تیز پانی کے بہاؤ سے اپنا چہرہ دور کرتی سسکتے ہوئے اس کو برداشت کرنے لگی تھی۔

ٹھنڈا پانی دونوں کے وجود سے ہوتا نیچے فرش پہ گرتا زربخت کی
سسکیوں اور دمیر خان کی بھاری سانسوں کے ساتھ واشروم کی
تنگ فضا میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ وہ زور سے اس کو چھبے
دیوار کے ساتھ پن کئے ہوئے تھا۔ زربخت کی دونوں تھائیز دمیر
خان کی آہنی گرفت میں تھی۔

وہ اسے زمین سے اوپر اٹھائے اس میں سرایت کرتا خود کو
سکون پہنچانے میں مگن تھا۔ وہ اپنے جان گداز عمل سے
زربخت کو دیوار کے ساتھ ٹکرا نے پہ مجبور کر رہا تھا۔ وہ جنونی
ہوتا ا کے کندھے کی سکن اپنے لبوں میں دبائے، اپنی حرکت
میں وحشی ہو رہا تھا جبکہ وہ درد سے آنکھیں موندے اس کی گردن
کے گرد لپیٹی سسکتے ہوئے اس کو سہن کرنے لگی تھی۔

بخت!۔۔۔ دمیر خان پھولی سانسوں کے درمیان بولتا اس کے
کندھے کی سکن کو چھوڑ کر اس کے گال پہ دانت گاڑھ گیا۔
اہہ! دمیر! بس۔۔۔ کریں۔۔۔ مجھے۔۔۔ سردی
۔۔۔ لگ۔۔۔ رہی۔۔۔ ہے۔۔۔ کافی دیر بعد زربخت اپنی
برداشت ختم ہونے پر اسے پکار اٹھی تھی۔ وہ دونوں ٹھنڈے
پانی کے نیچے مسلسل بھیگ رہے تھے جس کی وجہ سے زربخت
کو اب سردی لگ رہی تھی اور اسی وجہ سے اس کے ہونٹ
نیلے پڑ رہے تھے۔ دمیر خان اس کی پکار سنتا اپنی حرکت روک
گیا تھا۔

سردی لگ رہی ہے؟۔۔۔ دمیر خان اس کو شاور کے نیچے سے
لے کے ہٹا اس کی ٹھوڑی پہ لب رکھتے ہوئے استفسار کرنے
لگا۔

ہم !! زربخت نے ہنکارا بھرا تھا۔۔

اب سردی نہیں لگے گی۔۔۔ دمیر خان اس کو خود کے گرد لپیٹتا

اس کو لئے ہاٹ ہاتھ ٹب میں بیٹھ گیا۔

نیم گرم پانی میں آتے ہی زربخت کے پورے دہکتے وجود کو سکون ملا تھا۔ دمیر خان اس کے چہرے پہ تکلیف کے آثار اور اس کی اپنی شدتوں سے نڈھال ہوتی حالت دیکھتا اس کو مزید تنگ کرنے کی بجائے خاموشی سے اس کے پورے وجود کو اپنے ہلکے ہاتھوں سے مساج دینے لگا تھا۔

زربخت سکون سے آنکھیں موندے اس کے نرم لمس پہ راحت پاتی چھپٹب کے کناروں پہ سر ٹکا گئی تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ دونوں باتھ روم سے باہر نکلے تھے۔ دمیر خان اس کو اپنی گود میں اٹھائے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھاتا تھا۔ ان کا ارادہ اب

چینج کر کے تہجد ادا کرنے کا تھا کیونکہ فجر کی اذان ہونے میں
ابھی ٹائم تھا۔۔

لالا! آپ بھی اب گھر چل کے آرام کر لیں۔ دیدہ اب بالکل
ٹھیک ہیں۔ چار دنوں سے نہ آپ سوئے ہیں نہ گھر گئے ہیں،
مورے اور بابا پریشان ہو رہے تھے آپ لئیے۔۔۔ مورے
بار بار مجھے کالز کر کے بول رہی تھیں کہ اپنے لالا کو سمجھا کے
تھوڑی دیر کیلئے گھر بھیجو۔۔ وہ آرام کر لے پھر بے شک
ہاسپٹل چلا جائے۔۔ میں نہیں روکی گی لیکن بے آرام ہو کے
کہیں اپنی صحت نہ خراب کر لے۔۔۔ پرائیویٹ روم سے نکلتے
ہی مہر و فکر مندی سے اپنے ساتھ چلتے رائم خان سے مخاطب
ہوئی تھی۔

وہ اور داعیر خان ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ہاسپٹل انزش سے
ملنے آئے تھے۔۔ داعیر اندر انزش اور عامر بزدار کو الوداعی
کلمات کہہ رہا تھا جبکہ رائم خان اور مہرو پہلے باہر کی طرف نکل
آئے تھے۔

آج جاؤں گا! گھر کا چکر لگا آؤں گا، ویسے بھی انزش کو اسی ہفتے
ڈسچارج کر دیں گے، پھر تو میں ہر وقت گھر پہ مورے کو میسر
رہوں گا۔۔۔ رائم خان اس کی طرف دیکھے بنا بولا تھا۔ وہ اپنی
بہن کے سامنے شرمندہ ہو رہا تھا کیونکہ اندر داعیر خان اس کی
پریم کہانی پہ شاکڈ ہوتا کافی ڈرامے کرتے ہوئے اا کو چھیڑ چکا تھا
۔ اور اس میں انزش نے بھی کچھ باتیں بتا کر داعیر کا ساتھ دیا
تھا۔ داعیر اور انزش نے ماحول کو خوشگوار بنانے کیلئے ایسے ہی
رائم خان کے چند ایموشنل ڈائلاگز بول کے اس کو چھیڑا تھا۔

یہ صرف ان دونوں نے تھوڑی دیر شغل لگانے کیلئے کیا تھا۔ ان کا ہرگز مقصد ااکے جذبات کی توہین یا ان کا مزاق بنانا نہیں تھا اور اپنے لالا کے ایموشنل محبت سے لبریز ڈائلاگز سن کے مہرو حیران ہوئی تھی۔

اس کے لالا تو بہت سادہ اور شریف تھے لیکن اسے آج پتہ چلا تھا کہ اس کے معصوم اور شریف لالا محبت کے معاملے میں داعیر سے بھی دو قدم آگے نکلے تھے۔ بس اپنی محبت کا پول کھلنے اور اپنے ایموشنل ڈائلاگز کو سوچتے ہوئے رائم خان کو شرم آرہی تھی۔

کتنا رعب تھا اس کا اپنے گھر میں۔۔ لیکن داعیر اور انزس نے اس کا دببہ مٹی میں ملانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

لالا! آپ کو عامر انکل بلا رہے ہیں۔۔۔ چھپے سے تیز تیز قدم اٹھا
کے ان کی طرف بڑھتے داعیر خان نے رائم خان کو ہانک لگائی
تھی۔

اوکے! تم لوگ گھر جاؤ، عامر انکل کی بات سن کے میں بھی
تھوڑی دیر تک گھر کیلئے نکل جاؤ گا۔۔۔ وہ داعیر کی بات سنتے ہی
قدم روکے مہرو سے مخاطب ہوا تھا۔

اوکے لالا! آپ جائیں۔۔۔ مہرو نے اس کی بات کی تائید کی تو
رائم اس کو سینے سے لگا کے ماتھا چومتا واپس پرائیویٹ روم کی
طرف بڑھا گیا تھا جبکہ مہرو اور داعیر خان گھر جانے کیلئے ہاسپٹل
سے نکلے تھے۔

داعیر خان پارکنگ ایریا سے گاڑی نکال کر ہاسپٹل کے سامنے لایا
تھا، اس کو دیکھتے ہی ہاسپٹل کے اینٹرنس گیٹ پہ کھڑی مہرو

گاڑی کی طرف بڑھی تھی۔ ابھی اس نے قدم روڈ کی طرف
بڑھائے ہی تھے۔ جب داعیر خان کی گاڑی کے بالکل ساتھ ایک
سیاہ گاڑی آ کے رکی تھی۔ مہرو جو اپنی دھن میں چلتی آرہی تھی،
اچانک اپنے سامنے گاڑی کو رکنا دیکھ کے سہم گئی تھی۔
گاڑی رکتے ہی دوپل میں ہی ایک نوجوان جس کی رنگت سرخ
وسفید، لمبا چوڑا وجود اور ہیزل گرے آنکھیں، وہ بظاہر پرکشش
دکھنے والا نوجوان مہرو پہ اپنی غلیظ نظریں جما گیا۔ اس کے
چہرے پہ بہت بڑا مندمل زخم کا نشان تھا۔
وہ نوجوان اپنی گاڑی سے اترتا ایک چھٹکے میں مہرو کو اپنی طرف
کھینچتا اس کو بازو سے دبوچ کے پچھلی سیٹ پہ سوار ہوتا آنکھ
جھپکنے کی دیر میں گاڑی لئے منظر عام سے بجلی کی تیزی سے غائب
ہوا تھا۔

مہرو کی اس اچانک ناگہاں حرکت پہ چیخ بے ساختہ تھی مگر اس کی
آواز داعیر خان تک تو کیا اس کے اپنے حلق سے بھی ٹھیک سے
نکلنے سے پہلے وہ نوجوان اس کے منہ پہ ہاتھ رکھے اس کی آواز کا
گلا گھونٹ گیا تھا۔

داعیر خان جو مہرو کی طرف ہی دیکھ رہا تھا، گاڑی نے آکر منظر
اوجھل کر دیا تھا، گاڑی کے سامنے سے ہٹتے ہی مہرو کو نہ پا کر
اس نے پریشانی سے ارد گرد نگاہیں دوڑائی اور پھر اس کو آس
پاس کہیں نہ پا کے اا کے اوسان خطا ہو گئے۔۔

داعیر کی نظر اچانک اپنی پہنچ سے دور نکلتی گاڑی پہ پڑی اور اس
کے چہرے "حمدان بارکزی" کی تحریر پڑھتے ہی لمحے کے گیارہویں
حصے میں وہ سارا معاملہ سمجھ گیا تھا۔۔

اس کا دل اچھل کے حلق میں آیا تھا۔ اس اچانک پیش آتی
صورتحال نے اس کی فہم گویائی چھین لی تھی۔ وہ اپنے شل
ہوتے وجود اور دماغ کے ساتھ چابی گھوماتا گاڑی سٹارٹ کئے
اس سیاہ گاڑی کے تعاقب میں اپنی گاڑی کی سپیڈ بڑھا گیا۔
دل زوروں سے دھڑک رہا تھا۔ دماغ میں کئی خدشات لاحق
ہوئے۔ ایک لمحے میں ہی داعیر خان کو اپنی ہنستی بستی دنیا اجرٹی
محسوس ہوئی تھی۔۔۔

میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں حرام زادے۔۔۔ داعیر خان حلق
کے بل چلایا تھا۔ وہ اسٹیرنگ پہ بار بار اپنے ہاتھ کے مکے جھڑتا
پاگل ہو رہا تھا۔ اس کا چہرہ انتقام کی آگ میں جھلس کر انگارہ
ہوا تھا۔

اس کی آنکھوں میں مہر و کو کھونے کی نئی چمکی تھی۔ ایک خوف
اور دہشت اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لئے اس کی
رگوں میں دوڑتا خون منجمد کرنے لگی۔۔

وہ پاگلوں کی طرح گاڑی بھاگتا سیاہ گاڑی کو ٹریس کرنے لگا تھا۔
چونکہ وہ چند لمحے اس سے پہلے نکل گئی تھی اس لئے وہ اس کو
کر اس نہیں کر پا رہا تھا۔۔ داعیر خان کا جسم اس وقت بے
جان ہو رہا تھا۔۔ دماغ مفلوج اور دل کسی انجانے خوف سے
بند ہونے کے درپے تھا۔۔

اس کی حالت اس وقت ایسی تھی جیسے کسی انسان کو ہاتھ پیر
باندھ کے دریا میں پھینک دیا جائے، جو کہ نہ ہاتھ پیر چلا سکتا ہے
اور نہ ہی تیر کے اپنی جان بچا سکتا ہے۔ وہ اپنے بندھے وجود

کے ساتھ بے بسی سے بس موت کو اپنی رگوں میں اترادیکھ
سکتا ہے۔۔۔ داعیر کی بھی حالت ایسی ہی ہو رہی تھی۔
مہرو اس کی روح تھی۔ وہ اس کے جسم سے روح نکال کے
اس کو پل پل کی موت دے رہا تھا۔ اس کے جسم سے روح فنا
ہو رہی تھی اور وہ دیوانوں کی طرح اپنی روح کی سمت بڑھتا
تڑپ رہا تھا۔

اس کے ہاتھ اور لب کپکپا رہے تھے۔ اسٹرینگ ویل بار بار
ہاتھوں سے چھوٹ رہا تھا۔ گاڑی کی سپیڈ آخری حد تک تیز تھی
مگر پھر بھی وہ اپنی روح تک رسائی حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔
میری مہر۔۔۔ داعیر خان اذیت سے چلایا تھا۔ مہرو کا نورانی
چہرہ دماغ کی سکریں پہ نمودار ہوا تھا اور پھر حمدان کو سوچتے ہی
چہرے کے تاثرات طیش سے لال ہوئے۔ اس نے بہت

مشکلوں سے مہرو کو پایا تھا۔ وہ حمدان کے غلیظ ارادوں سے
بھی واقف تھا، وہ چند لمحوں میں ہی اس کی مہر کی روح داغ دار
کر سکتا تھا۔ اور یہی خوف داعیر خان کی جان حلق میں اٹکائے
ہوا تھا۔

وہ مہرو کو کسی قیمت نہیں کھو سکتا تھا۔ اس نے مہرو کو کانٹوں
اور انگاروں پر چل کے پایا تھا۔ اس کی برسوں کی تڑپ، لگن
اور جستجو لگی تھی اپنی محبت کو پانے میں !!
وہ چند لمحوں کے ہاتھوں ہر گز اپنی مہر کو نہیں کھو سکتا تھا۔ یہ چند
لمحے ہر گز اس کی سالوں کی محبت پہ بھاری پڑ کے اس سے چھین
نہیں سکتے تھے۔

شہد رنگ آنکھیں طیش کی لالی سے سرخ انگارہ ہوئی تھی۔۔۔ پورا
وجود اشتعال کی چنگاریوں میں جل رہا تھا۔

سامنے دوڑتی سیاہ گاڑی اچانک رائٹ ٹرن لیتی داعیر خان کی
نظروں سے اوجھل ہوئی تھی۔

گاڑی اوجھل ہوتے ہی داعیر خان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا
چھانے لگا تھا۔۔ وہ جس زندگی کے چھبے دیوانوں اور سوالیوں
کی طرح دوڑ رہا تھا۔ اس کے بیچ موت آ کے حائل ہوئی تھی۔
اس کی ہاتھوں سے اسٹیرنگ ویل چھوٹا اور گاڑی ڈس بیلنس
ہوتی فٹ ہاتھ پہ چڑھتی ایک درخت سے جا کے ٹکرائی تھی۔
گاڑی کے ٹکرانے سے پہلے ہی داعیر خان اسے بروقت بریک لگا
چکا تھا لیکن پھر بھی گاڑی فل سپیڈ میں تھی اس لئے بریک
لگانے کے باوجود اس کا درخت سے ٹکراؤ شدید ہوا تھا۔

زوردار ٹکراؤ کی وجہ سے داعیر خان اپنی جگہ سے اچھلا تھا۔ اس
کا سر اور ناک اسٹیرنگ ویل پہ جا کے لگتا زخمی ہو گیا تھا۔

اس کے ناک سے خون فوارے کی طرح نکلا تھا جبکہ اس کی

پیشانی سے بھی خون تیزی سے رسنے لگا۔

وہ خود کو سنبھالتا سیٹ بیلٹ کھول کر ڈیش بورڈ سے اپنا پسٹل

نکالتا طیش کے عالم میں گاڑی سے اتر کر رائٹ سمت بھاگا تھا

جس سمت سیاہ گاڑی مڑی تھی۔ وہ سڑک پہ اندھا دھن دوڑتا

اس وقت کوئی دیوانہ لگ رہا تھا۔

اس کی ناک اور پیشانی سے بہتا خون ٹھوڑی سے لڑھک کر

گردن اور گردن سے ہوتا اس کی وائٹ شرٹ میں جذب ہو رہا

تھا لیکن اس کو اپنی حالت کی پرواہ نہیں تھی۔۔ وہ بس اپنی مہر

کیلئے تڑپ رہا تھا۔ اس کا وجود اگر کرچی کرچی بھی ہو جائے تو

داعیر خان اف تک نہیں کرے گا، بس اس کے جسم میں بستی

روح پہ کوئی آنچ نہیں آنی چاہیے۔ حمدان خان کی گاڑی ایک

پرانے سے منگلے کے سامنے آ کے رکی تھی۔ گاڑی رکتے ہی گارڈ
نے فوراً بھاگ کے دروازہ کھولا تھا۔ ڈرائیور گاڑی کو منگلے کے
اندر جا کے بریک لگاتا گاڑی سے اتر کر حمدان خان کی سائیڈ کا
دروازہ کھولے تابعداری سے سر جھکا گیا تھا۔

مہرو کے منہ پہ پورا راستہ حمدان خان کا بھاری وزنی ہاتھ اس کی
سانسیں اور آواز روکے آیا تھا۔ اس کے مضبوط چوڑے
وجود کی گرفت میں مہرو حرکت کرنے سے بھی قاصر تھی تو پھر
وہ مزاحمت کیا خاک کرتی؟

مسلسل منہ پہ حمدان خان کا ہاتھ ہونے کی وجہ سے اس کی
سانسیں بند ہو رہی تھی۔ سانسیں گھٹنے سے اس کا چہرہ لال سرخ
ہو رہا تھا۔

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھی اور دل سو کھے پتے کی مانند
لرز رہا تھا۔۔ اس کی سیاہ چادر چہرے سے بے ترتیب ہو کر
اس کو بے پردہ کر رہی تھی۔

چھوڑو مجھے! کتے انسان۔۔۔ حمدان خان کا ہاتھ اپنے منہ سے
ہٹتے ہی مہر و گرج دار آوازیں اس کے چہرے پہ پھنکاری تھی۔
وہ تیزی سے دوسرے ہاتھ سے اپنی چادر درست کرتی اپنا چہرہ
چھپا گئی۔ غصے کی وجہ سے اس کا چہرہ اور آنکھیں خون آلود ہوئی
تھی۔

یہی کتا انسان تجھے اب کتابن کے دیکھائے گا۔ مجھے چھوڑ کے
گئی تھی نہ اب میں بھی دیکھتا ہوں۔۔ اپنے جس عاشق کو تو نے
مجھ پہ ترجیح دی تھی وہ کیسے اب تجھے میرے چنگل سے آزاد
کرواتا ہے؟۔۔۔ حمدان خان اپنے بھاری ہاتھ کا تھپڑ مہرو کے

نازک چہرہ پہ جھڑتا حلق کے بل دھاڑا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ
مہرو کا کمزور سا وجود سیٹ سے اچھل کر نیچے فٹ میٹ پہ جا
کے گرا تھا۔

حمدان خان گاڑی سے اترتا اس کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے
گاڑی سے نکال کے باہر پھینک گیا تھا۔

پختہ زمین پہ پٹخے جانے پر مہرو کا چہرہ نیچے زمین پہ جا لگا تھا۔ اس
کا نچلانا نازک ہونٹ پھٹ کر زخمی ہوا تھا۔

داعیر! تمہیں چھوڑیں گے نہیں۔۔۔ وہ تمہارے اس غلیظ وجود
سے چمڑی ادھیڑ کے رکھ دیں گے۔۔۔۔ مہرو اپنے ہونٹ سے
رستا خون اپنے ہاتھ کی پشت سے صاف کرتی اونچی آوازیں
گر جتنی پھر سے اپنے چہرے پہ چادر درست کر گئی تھی۔ وہ اس
غلیظ انسان کو کبھی بھی اپنا چہرہ نہیں دیکھا سکتی تھی۔

اسے حمدان خان سے خوف سے زیادہ گھن آرہی تھی۔ مہرو کو اس کے چہرے سے شدید نفرت تھی۔

حمدان خان مہرو کا اپنا کزن تھا۔ مہرو کا رشتہ پہلے اس کے ساتھ اس کے دادا جوڑ کے گئے تھے مگر پھر اس کی مشکوک حرکتیں دیکھ کے رائم خان اور اس کے والد نے اس کی ساری سرگرمیوں پہ نظر رکھتے ہوئے اس کے بارے میں پتہ کروایا تھا۔ حمدان خان نہایت ہی گھٹیا، بد لحاظ، رشوت خور، اور بدنیت آدمی تھا۔ اس کی حقیقت جاننے کے بعد مہرو کے والد نے اس کو اپنی بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا اور اس انکار پر دو خاندانوں کی بیچ طاقت اور غیرت کی جنگ چھڑ گئی تھی۔ حمدان خان اور اس کے گھروالے ہر بار داعیر اور مہرو کے رشتے میں آ کے روڑے اٹکاتے تھے۔۔۔ کئی بار تو حمدان اپنے

خاندان والوں کے ساتھ مل کر مہرو کے گھر پہ فائرنگ بھی کروا
چکا تھا۔

ایک دوبار اس نے داعیر خان پہ بھی حملہ کیا تھا لیکن اس کے
ہاتھوں اسے منہ کی کھانی پڑی تھی۔

اس کی طرف سے کئی حملے ہونے پر رائم خان اور اس کے والد
نے اسکے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کروائی تھی۔ اس کے

جرائم کی بنیاد پر حمدان خان چار ماہ جیل رہا تھا۔

اور اسی عرصے میں داعیر خان اور مہرو کی شادی بھی بغیر کسی
مسئلے کے ہو گئی تھی۔

حمدان خان پچھلے ہفتے ہی جیل سے رشوت دے کے رہا ہوا
تھا۔

مہرو اور داعیر کی شادی کا پتہ چلتے ہی وہ بدلہ لینے کی جستجو میں لگ گیا اور آخر کار ایک ہفتے کی ریکی کے بعد وہ آج مہرو کو اغواء کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

وہ مہرو کو مہرہ بنا کے اپنے سارے بدلے آج داعیر خان کے سینے میں گولیاں پیوست کر برابر کرنا چاہتا تھا لیکن اس بات سے انجان کہ سامنے کوئی عام انسان نہیں بلکہ جنون کی حد تک اپنی محبت کیلئے پاگل داعیر خان آفریدی ہے۔۔۔ وہ اپنی محبت پہ پڑنے والی بری نظروں کو بھی نوچ کے رکھ دے تو پھر حمدان خان کو وہ کیسے اس کے مقصد میں کامیاب ہونے دے سکتا تھا؟ چمڑی تو میں اس کی ادھیڑوں گا آج!! تمہاری آنکھوں کے سامنے تیرے عاشق کو موت کے گھاٹ اتاروں گا۔۔۔ حمدان خان پنچوں کے بل بیٹھتا مہرو کے جبرے سے پکڑ کر اونچی آواز میں

غرایا تھا۔۔ وہ کمینگی سے مسکراتا مہرو کے چہرے سے چادر
نوج کے ہٹا گیا تھا۔ اس کی خوبصورتی دیکھ کر وہ بے ایمان ہوا
تھا۔

مہرو اس کی گندی نظروں کی تپش خود پہ محسوس کرتی، اپنا چہرہ
ڈھکنا چاہا مگر وہ اسے ایک زوردار تھپڑ جھڑکے باز کر گیا۔
مہرو اس کے تھپڑ پہ سہم گئی تھی۔ وہ اپنے گال پہ ہاتھ رکھے
بے یقینی سے اسے دیکھ گئی۔۔ ایسے تو کوئی پرایا بھی نہ کرتا
جیسے وہ اپنا رشتہ دار ہو کے کر رہا تھا۔

تقریباً بیس منٹ دیوانوں کی طرح دوڑنے کے بعد داعیر خان کو
اپنی مطلوبہ جگہ مل چکی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ مہرو کو اسی جگہ پہ
لے کے آئے گا۔۔ وہ حمدان کے بارے میں مکمل معلومات

بہت پہلے سے رکھتا تھا۔ آخر کو وہ اس کا دشمن تھا اور داعیر خان اس سے کبھی غافل نہیں رہا تھا۔۔

وہ اپنا پسٹل سیدھے ہاتھ میں پکڑتا طوفان کی طرح منگلے میں داخل ہوا تھا اور سامنے مہرو کا جبراً حمدان کے غلیظ ہاتھوں میں دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔

دور ہو جاؤ میری بیوی سے غلیظ انسان۔۔۔ داعیر خان اپنی گن سے حمدان کے سر کا نشانہ لیتا اپنی بارعب آواز میں دھاڑا تھا۔
لو آگیا تمہارا عاشق!۔۔ وہ اس کا جبراً اپنے ہاتھ میں دبوچ کر اسے چھپو دھکا دیتا اوپر اٹھا تھا۔

داعیر!۔۔۔ مہرو امید کے تحت بھیگی ہوئی آواز اور آنسو سے تر چہرے کے ساتھ داعیر خان کو تکلیف میں پکارا تھا۔ اسے اپنی تکلیف سے زیادہ اس کا خون آلود چہرہ دیکھ کے ہوئی تھی۔

مہر!۔۔۔ داعیر نے اپنی لرزتی آوازیں رنجیدگی سے جواب دیا
تھا۔

مہرو کے نورانی چہرے سے ہٹا پردہ اس پہ ثبت حمدان کی
انگلیوں کے نشان اور اس کے ہونٹ سے رستا خون دیکھ کے
داعیر خان کے دل میں اذیت کی ٹیس اٹھی تھی۔۔۔
ہاہاہا! گولی چلانے کی غلطی مت کرنا! ورنہ میرا گارڈ ایک لمحے میں
تمہاری پیاری مہر کو جہنم پہنچا دے گا۔ اس جیسی بدکردار اور
عاشق رکھنے والی عورتوں کا ٹھکانہ جہنم ہی ہے۔۔۔۔ وہ مہرو پہ
نفرت بھری نگاہ ڈال کے غلیظ الفاظ کا استعمال کرتا داعیر خان
کی رگوں میں شعلے بھڑکا گیا تھا۔

داعیر خان بنا دیکھے اپنی لفٹ سائیڈ کھڑے گارڈ جو مہرو کے سر کا
نشانہ لئے کھڑا تھا، داعیر خان پسٹل پہ ہاتھ کی گرفت مضبوط
کرتے ہوئے ٹریگر دبا گیا تھا۔

ٹریگر دبتے ہی ایک لمحے میں چھوٹی سی لوہے کی گرم سلاخ گارڈ
کے دماغ کے آر پار ہو گئی اور اگلے ہی پل گارڈ اپنے پورے قد
سمیت زمین بوس ہو گیا تھا۔

یہ منظر دیکھ کے مہرو کی چیخ بے ساختہ تھی جبکہ حمدان خان کی
آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی، جسم میں ایک دم خوف کی لہر
دوڑی تھی، اسے اچانک داعیر خان کا جنونی پن یاد آیا تھا، جب
اس نے اس پہ حملہ کیا تھا، اور داعیر خان نے بے دردی سے
تیز دھار چاقو سے اس کا چہرہ کاٹ کے رکھ دیا تھا۔ جس کا نشان
ابھی تک حمدان خان کے چہرے پہ صاف واضح تھا۔

ڈرائیور گارڈ کی خوفناک موت دیکھ کے یہاں سے ڈر کے مارے
گرتے پڑتے نکل گیا تھا۔ وہ ہرگز یہاں رک کے اپنی قیمتی جان
نہیں گنوانا چاہتا تھا۔

میری مہربا کردار ہے! اس کا کردار آئینے کی طرح شفاف اور
متبرک چیز کی طرح پاک ہے۔ وہ شفاف، پاک اور چاند کی
چاندنی کی طرح پر نور کردار کی مالک ہے۔۔۔ اگر اب تم نے اپنی
بدبودار زبان اور منہ سے میری مہر کیلئے مزید ایسے غلیظ الفاظ
نکالے تو میں تیری گندی زبان ہاتھ ڈال کے حلق سے گھینچ لوں
گا۔۔۔ داعیر خان اپنی لہو چھلکتی آنکھوں سے ایک ایک لفظ چبا
کے بولتا حمدان کی طرف بڑھتا تھا جو پتھر کی مورت بنے اپنے
گارڈ کو تڑپ کے مرتا دیکھ رہا تھا۔

وہ تیزی گارڈ سے نگاہیں ہٹاتا ایک جست میں اپنی ویسٹ بیلٹ
میں اڑیسی پستل نکال کے مہر کو بالوں سے جکڑ کر اوپر کی طرف
اٹھاتا، پستل اس کی گردن پہ رکھے، داعیر خان کو آنکھوں سے
دور رہنے کا اشارہ کر گیا۔

داعیر خان اس کے ہاتھ میں پستل دیکھ کے بے ساختہ قدم
روک گیا تھا جبکہ مہر کا دل اچھل کے حلق میں آیا تھا۔
اس کا رشتہ مجھ سے طے ہوا تھا۔ یہ میرے نام کی تھی لیکن
اس نے تیرے ساتھ عشق لڑا کے مجھے دھوکا دیا۔ اس دھوکے
کا بدلہ میں اس کے گندے وجود سے لوں گا۔ ایک بار تو میں اس
کے وجود پہ اپنی وہشت کی چھاپ چھوڑ کے ہی دم لوں گا۔
رشتہ بنانے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ یہ پہلے ہی بد۔۔۔۔۔

حرام زادے! تیرا میں خون پی جاؤں گا۔۔۔ داعیر خان جو پہلے
مہرو کی گردن پہ پسٹل کا دباؤ پڑتا دیکھ کے ضبط سے کنٹرول کئے
کھڑا تھا۔ حمدان خان کے منہ سے پھر اپنی مہر کیلئے نازیبا الفاظ
سنتے ہی وہ حلق کے بل گر جاتا تھا۔۔

اس کا بس نہیں چل رہا تھا، حمدان خان کے منہ میں تیزاب کی
بوٹل انڈیل دے جو اس کی باکردار بیوی کیلئے ایسے الفاظ نکال رہا
ہے۔

ریلیکس غصہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے! چلو ایک ڈیل کرتے
ہیں میں اس کو چھوڑ دوں گا اور تمہیں بھی کچھ نہیں کہوں گا، بس
تم اس کو آج رات کیلئے میرے حوالے کر دو۔۔۔ وہ مہرو کی
گردن پہ پسٹل کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کمینگی سے مسکرا کے بولا
تھا۔

اس کے الفاظ سن کے داعیر خان کو ایسا لگا جیسے اس کانوں میں
کسی نے پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو۔ جسم میں غصے کی چنگاری
بھڑکی تھی۔۔

مہرو کی آنکھوں سے آنسوؤں کی روانی تیز ہوئی تھی۔ اب اسے
جینے کیلئے اپنے جسم کی سودے بازی کرنا پڑی گی؟ مہرو نے
اذیت سے سوچا تھا۔

تیری ہمت کیسے ہوئی میری بیوی کے بارے میں ایسا سوچنے
کی۔۔۔ داعیر خان ایک جست میں اس کی طرف بڑھتا بجلی کی
تیزی جیسے اس کی کنپٹی پہ پسٹل کا وار کر کے اسے لڑکھڑانے پر
مجبور کر گیا تھا۔ اس کے اچانک حملے سے حمدان خان کے ہاتھ
سے پسٹل چھوٹ کے زمین پہ گرا تھا۔ داعیر خان ایک جست

میں مہر کو بازو سے پکڑ کر اپنے چھپے کرتا اس کی پہنچ سے دور کر
گیا تھا۔

حمدان خان نے بوکھلاتے ہوئے زمین سے تیزی سے اپنا پسٹل
اٹھانا چاہا مگر داعیر خان یکے بعد دیگر چار فائر اس کے ہاتھوں اور
ٹانگوں میں کر کے اس کو گھٹنے کے بل لے آیا تھا۔

مہر نے چختے ہوئے داعیر خان کی شرٹ کو اپنی مٹھیوں میں
بھینچا تھا۔ وہ آج داعیر کے جنون سے سہم رہی تھی۔ ایک
دم چار گولیاں جسم میں پیوست ہونے پر حمدان خان درد سے
کراہ اٹھا تھا۔

وہ زور سے اپنے جبرے بھینچے درد کی شدت کو برداشت کرنے
لگا تھا۔ خون اس کے جسم سے تیزی سے نکل رہا تھا۔

تجھے جیسے کتے کو ہر بار اس لئے چھوڑ دیتا تھا کہ شاید توں سدھر جائے گا لیکن تجھ جیسی حرام ہڈی بھلا سدھرتی کہاں ہے؟ پہلے میں تجھے چھوڑ دیتا تھا کیونکہ تو وار مجھ پہ کرتا تھا لیکن آج تو نے میری بیوی کے کردار پہ بات کر کے اپنی موت کو خود دعوت دی ہے۔ آج تجھے میرے ہاتھوں سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں تجھے بتانا چاہتا ہوں کہ میں اپنی بیوی کو لیکر کس قدر جنونی ہوں۔۔۔ اس کے کردار پہ بات کرنے والوں کو زمین پہ زندہ چھوڑنا میری محبت کی توہین ہے۔۔۔ داعیر خان برفیلے تاثرات کے ساتھ بولتا حمدان کے بالوں سے جکڑے اس کے منہ میں پسٹل کی نالی رکھ گیا۔

ابہہ! داعیر نہیں دفعہ کریں، چھوڑ دو اس کو، پولیس دیکھ لے گی اسے۔۔۔ داعیر خان کے ارادے جان کر مہر و ہل اٹھی تھی

۔ وہ روتے ہوئے اسے رکنے کی التجاء کر گئی جبکہ حمدان خان
کی جان اچھل کے حلق میں اٹکی تھی۔ گلے میں خوف کے کانٹے
چبھے تھے۔

بولو میری مہر باکردار ہے۔۔۔ داعیر خان اس کے منہ میں پسٹل
کی نالی گھوماتا اس کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر تحکم بھرے
لہجے میں بولا تھا۔ وہ مہرو کی التجا نہیں سن رہا تھا۔

تمہاری۔۔ مہر۔۔ باکردار۔۔ ہے!۔۔۔ حمدان نے خوف
سے تھوک نکلتے ہوئے فوراً داعیر خان کے الفاظ دہرائے تھے
۔۔ وہ اپنی جان بخشی کیلئے اب کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔
گڈ! اب یہی سبق قبر میں بیٹھ کے یاد کرنا۔۔۔ داعیر بارعب
آوازیں کہتا سرد مہری سے حمدان کے منہ میں پسٹل کی بچی
ساری گولیاں اتار گیا تھا۔۔

یہ دل دہلا دینے والا منظر دیکھتے ہی مہرو اپنی جگہ سے اچھلی تھی۔

وہ منہ پہ ہاتھ رکھے اپنی چیخ روک گئی تھی۔

حمدان خان کی ہیزل گرے آنکھوں کی پتلی ساکت ہو گئی۔ وہ بے جان وجود کے ساتھ زمین پہ منہ کے بل گرا تھا۔ داعیر خان اس کو زمین بوس ہوتا دیکھ کر ایک سکون کی سانس خارج کرتا اپنے ہاتھ میں پکڑا پسٹل زمین پہ پھنک گیا تھا۔

داعیر۔۔۔ اس کو پسٹل پھینکتے دیکھ کر مہرو روتے ہوئے اس کے چوڑے سینے میں آن سمائی تھی۔ اس کا پورا وجود خوف سے کپکپا رہا تھا۔۔

شش میری جان!! رونا بند کرو۔ میں ہوں نہ تمہارے ساتھ۔۔
تم تک پہنچنے سے پہلے ہر دشمن کو مجھ سے ٹکرا نا ہو گا اور یہ ہماری
محبت کے دشمنوں میں آخری مہرہ تھا جس کا مرنا ضروری

تھا۔۔ آج میں نے اس کا کام تمام کر دیا ہے، اب ہمیں کوئی
الگ نہیں کر سکے گا۔۔۔ داعیر خان نرمی سے اس کی پشت
سہلاتا اس کے چہرے پہ چھپے تھپڑوں کے نشانات پہ نرمی سے
اپنے ہونٹوں کا میٹھا لمس ثبت کرنے لگا تھا۔

داعیر! مجھے ڈر لگ رہا ہے گھر چلتے ہیں۔۔۔ مہرو اس کے سینے
سے نکل کر اس کی ناک سے بہتا خون اپنی چادر سے صاف کرتی
روتے ہوئے بولی تھی۔

او کے! آجاؤ گھر چلتے ہیں۔۔۔ داعیر خان محبت سے اس کے
ماتھے پہ لب رکھے ایک جست میں اسے اپنی بانہوں میں بھر کے
گود میں اٹھا گیا تھا۔

وہ کسی قیمتی اثاثے کی طرح مہرو کو اپنے چوڑے سینے میں چھپاتا
اس کے چہرے پہ نیچے جھک کر وقفے وقفے سے لب رکھتا یہاں

سے لے کے نکلا تھا۔۔۔ وہ آج اپنی محبت کے آخری دشمن کو
بھی مٹا چکا تھا۔ اب تاحیات اس سے مہر و کوئی نہیں چھین
سکتا تھا۔۔

(ایک ماہ بعد)

رات کا ایک بج رہا تھا۔ انزش بزدار اپنی بھوری آنکھیں زبردستی
کھول کے بیٹھی نیند میں جھول رہی تھی۔ ایک تو مسلسل
گھونگھٹ کی وجہ سے اس کی سانسیں بند ہو رہی تھی، گھونگھٹ
اوڑھنے والی خواہش اس سے رائم خان نے ہی کی تھی۔ انزش
بنا کوئی بحث کئے گھونگھٹ کرنے کیلئے مان گئی تھی ورنہ تو وہ
عام روٹین میں دوپٹہ بھی سر پہ نہیں لیتی تھی۔

اور وہ کیوں نہ اس مرد کی خواہش پوری کرتی جس نے اسے
دعاؤں میں گر گڑا کے مانگا تھا۔

وہ کب سے رائم خان کا ویٹ کر رہی تھی لیکن وہ تھا کہ اپنی نئی
نویلی دلہن کو انتظار کی سولی پہ لٹکائے خود باہر مزے سے اپنے
دوستوں کے ساتھ ٹائم سپینڈ کر رہا تھا۔

اب انزش کو کون بتائے کہ رائم خان تو کمرے میں آنے کیلئے
تڑپے جا رہا تھا لیکن دمیر خان اور اس کے باقی کے دوست
اسے کسی صورت اپنے چنگل سے آزاد نہیں کر رہے تھے۔ تو
پھر وہ روم میں کیسے آتا؟

انزش نے آدھا گھنٹہ پہلے رائم خان کو باہر سے اپنے لئے ڈائٹ
کے مطابق کھانا آڈر کرنے کا حکم دیا تھا کیونکہ تقریب میں جو کھانا
دیا گیا تھا، وہ بہت ہیوی تھا اور ڈائٹ کو نشیمن انزش بزوار

ہرگز وہ کھانا نہیں کھا سکتی تھی۔ اس لئے اس نے کھانا نہیں کھایا
تھا۔ اب بھوک بھی لگ رہی تھی اور نیند بھی بہت آرہی
تھی۔ اور بھوک مٹانے والا نہ جانے کہاں رہ گیا تھا؟
انزس تھکے ہوئے انداز میں بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹیک لگا کے
بیٹھتی دروازے کی طرف تکیے لگی تھی۔۔

وہ اس وقت میروں خوبصورت سے عروسی لہنگے میں ملبوس،
سر پہ ہیوی کام دار عروسی دوپٹہ اوڑھے میک اپ اور خاندانی
زیورات کے ساتھ بلا کی حسین لگ رہی تھی۔
اپنی مغروری نقوش میں نکھار اور روپ کی وجہ سے وہ کسی
سلطنت کی ملکہ لگ رہی تھی۔

مغروری ناک میں نتھ، ماتھے پہ ٹیکہ، کانوں میں بڑے سائز کے
چھمکے، کنگن اور چوڑیوں سے بھری سفید کلاٹیاں اور بھرے

بھرے گلابی ہونٹ، اس کا ہر نقش آج الگ طریقے سے ہی
نکھر کے سامنے آیا تھا۔۔۔ بے شک وہ بے حد حسین تھی لیکن
اپنی سنجیدہ طبیعت سے تھوڑی سی سخت مزاج لگتی تھی مگر وہ
تھی نہیں، اندر سے وہ بہت شفیق اور نرم دل کی مالک لڑکی
تھی۔ اس کی نرم سائیڈ ہمیشہ اپنے قریبی لوگوں کیلئے ہوتی تھی۔
باقی ہر کسی کیلئے وہ سنجیدہ اور سخت تھی۔ خاص کر مردوں کو تو
وہ ایک نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتی تھی۔ پھر چاہے کتنا ہی بڑا
بزنس مین اس کے سامنے بیٹھا ہو یا اس سے مخاطب کیوں نہ ہو
اور انزس کہ یہی بات پوری کاروباری دنیا میں اسے سخت مزاج
اور مغروری بناتی تھی۔

خیر جو بھی تھا اس پہ غرور اور اکڑ جیتی تھی۔ کچھ لوگ خالی
رعب جھاڑنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کی شخصیت متاثر

کن نہیں ہوتی۔ انزس کی شخصیت رعب دار تھی۔ اس پہ
رعب اور غرور سوٹ کرتا تھا۔۔

اس کی نظریں ابھی بھی جالی دار گھونگھٹ کو چیرتی دروازے
پہ ہی ٹکی تھی، وہ بے صبری سے رائم خان کا انتظار کر رہی تھی
جب اچانک کلک کی آواز سے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور وہ
اپنے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے لئے اندر کمرے میں داخل ہوا
تھا۔

آئی ایم سوری! میں تھوڑا لیٹ ہو گیا، باہر میرے دوست میری
جان ہی نہیں چھوڑ رہے تھے۔ بہت مشکلوں سے رہائی پا کے
آیا ہوں، تمہارے کھانا کا بہانہ کیا تو آنے دیا ورنہ ان کا میری
گولڈن نائٹ بھاڑ میں جھونکنے کا پورا پلان تھا۔ رائم خان دروازہ

پیر کی ٹھوکر سے بند کرتا ایک ہی سانس میں معذرت کے ساتھ
اپنے لیٹ آنے کی وجہ بتانے لگا۔

البتہ انزس کے روپ پہ نظریں پڑتے ہی اس کے دل کی دھڑکن
بڑھ ہی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ اس کو دلہن کے روپ میں پہلی
بار دیکھ رہا تھا، وہ ہال کے ویٹنگ روم میں اسے چھپ کے ایک
جھلک دیکھ چکا تھا اور وہی جھلک اس کا چین وین لوٹ گئی تھی

--

تو کوئی بات نہیں تھی آپ کھانا بھیجو ادیتے اور اپنی شغل نائٹ
باہر دوستوں کے ساتھ منا کے صبح کمرے میں آجاتے۔۔۔
سامنے بھی کوئی عام لڑکی نہیں تھی بلکہ انزس بزدل تھی۔ وہ
عام لڑکیوں کی طرح شرما نہیں سکتی تھی۔ وہ ایک کڑی نظر راءم
خان پہ ڈال کے بولتی سیدھی ہو کے بیٹھی۔

نہ! ایسے کیسے میں اپنی اتنی قیمتی نائٹ کو شغل نائٹ میں بدل سکتا تھا؟ میں پوری شان سے اپنی گولڈن نائٹ مناؤں گا۔ وہ کھانے کی ٹرے سائیڈ ٹیبل پہ رکھتا، ایک گھنٹہ فولڈ کر کے بیڈ پہ رکھ کے اس کے قریب ہو کر بیٹھا۔

پورا کمرہ گلاب کی پتیوں اور کینڈلز سے سجا ہوا تھا۔ رائم خان اتنی نزدیکی سے انرش کی خاص خوشبو محسوس کرتا بے خود ہوتا آگے بڑھ کر اس کی گود میں سر رکھے لیٹ گیا تھا۔ وہ سکون سے آنکھیں موندے لمبی لمبی سانسیں اندر کی طرف کھینچتا خود میں انرش کی مہک اتارنے لگا تھا۔ اس کو ہمیشہ سے اس کے پاس سے آتی مہک بے حد پسند تھی۔۔

خان! میرا گھونگھٹ ہٹائیں اور میری منہ دیکھائی دیں، ایک تو میری اس گھونگھٹ میں سانسیں بند ہو رہی ہے اور دوسرا مجھے

بھوک لگ رہی، تیسرا مجھے نیند آرہی ہے۔ اسیلئے آرام فرمانے
کی بجائے مجھے گھونگھٹ سے آزادی دلائیں تاکہ میں کھانا کھا کے
سکون سے سو جاؤں۔۔۔ انزس اس کا سر اپنی گود میں محسوس
کرتی اندر سے جھجھکی تھی لیکن وہ ہمیشہ کی طرح مضبوط لہجہ
اپناتی تحکم بھرے انداز میں بولی تھی۔

قلبِ راحت! سب کچھ کر لینا لیکن سونا بھول جاؤ، میں کم از
کم تین راتیں تو تمہیں نیند کا جھونکا بھی نہیں لینے دوں گا۔۔۔ رائم
خان اس کی گود سے سر اٹھا کے سیدھا ہو کر بیٹھتا زو معنی انداز
میں بولا تھا۔

اور آپ کو لگتا ہے کہ میں آپ کی بات مانوں گی؟۔۔۔ انزس
نے گھونگھٹ کے نیچے سے ہی ائیر و آچکا کے سوال کیا تھا۔

اگر تم منع کروں گی تو تمہیں چھوؤں گا بھی نہیں، تم سے شادی
محبت کرنے کیلئے کی ہے نہ کہ زبردستی کرنے کیلئے۔۔ رائم
خان ایک دم سنجیدہ ہوتا ایک پل میں اس گھونگھٹ ہٹا گیا تھا۔
گھونگھٹ ہٹتے ہی ملکہ جیسا حسین چہرہ ایک دفعہ پھر سے رائم
خان کا دل دھڑکا گیا تھا۔ آنکھیں اس کے چہرے پہ جم گئی
تھی۔۔ وہ پلک جھپکنے سے بھی گریز کرنے لگا کہ اگر وہ پلک
چھپکے گا تو دیدار کا وہ لمحہ ضائع ہو جائے گا اور وہ ایک لمحہ بھی ہر
گز ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔۔

چشمِ بدور! ماشاء اللہ بہت حسین لگ رہی ہو قلبِ راحت!
رائم خان اس کی گود سے سر اٹھا کے انزس کے ماتھے پہ لب
رکھتا اس کی خوبصورتی سے مبہوت ہو کے بولا تھا۔

تھینک یو!۔۔۔ وہ اپنے محرم کا پہلا بوسہ پا کے سکون سے
آنکھیں بند کر کے کھولتی مدہم آواز میں گویا ہوئی۔

رائم خان اپنی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ جمائے انزس کا سیدھا ہاتھ
پکڑ کے بار بار اپنے لبوں سے لگاتا اس کو دیوانوں کی طرح دیکھ
رہا تھا۔۔

ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟۔۔۔ انزس مسلسل اس کی نظروں کی
تپش اپنے آپ پہ محسوس کرتی خود کو سوال کرنے سے نہ روک
پائی۔

دیکھ رہا ہوں کہ معجزے کتنے خوبصورت اور نایاب ہوتے ہیں۔
خوش قسمت لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں معجزے، اور دیکھو میں
کتنا خوش قسمت ہو، تم میرے سامنے میری محرم بن کے معجزہ
کی تکمیل لگ رہی ہو۔۔ میں نے کہا تھا اگر اللہ نے میرے

ساتھ معجزہ کیا تو میں تمہیں کائنات کی ہر خوشی دوں گا۔ تمہارے
وجود کو دنیا کا عجب سمجھ کر پھولوں سے سینچوں گا، خدا مجھ پہ
مہربان ہوا، میرے ساتھ معجزہ بھی کیا اور تمہارا وجود میرے
وجود سے منسلک کر کے میری محبت کے لا علاج مرض کو قابل
علاج بھی کیا۔ تم میرے لئے شفا ہو۔ میری چلتی سانسوں کی
گرمابٹ ہو تم!!! میں تمہیں اتنا چاہوں گا کہ دنیا کی ساری لذتیں
اور رونقیں تمہیں پھینکی لگے گی، تمہارا وجود مجھ میں فنا ہو کے
ایک نئے سرے سے تکمیل پائے گا اور جو وجود تخلیق ہو کے
سامنے آئے گا، وہ جسم تو میرا ہو گا۔ لیکن روح تمہاری ہو گی۔
تم میری روح میں بستی ہو، میرے جسم کی ساتھی ہو۔ میں آج
تمہیں اپنی شریک حیات بنا کر، محرم بنا کر اپنی محبت کو امر کر چکا
ہوں اور یہ کرم مجھ پہ میرے رب نے کیا ہے۔ میں اس کی

ذات اقدس کا جتنا شکر ادا کروں، کم ہے۔۔۔ رائم خان نرمی
سے اس کے ہاتھ کی پشت پہ لب رکھتا، آنکھوں میں محبوب کو
پانے کی چمک لئے دھیمے لہجے میں بولا تھا۔

انزس اس کو خاموشی سے سن رہی تھی۔ وہ پچھلے ایک مہینے
سے اس کی محبت اور محبت سے بھرپور سچے الفاظ سن سن
کے خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تصور کرنے لگی تھی۔
وہ رائم خان کا ہر بار محبت بھرا انداز دیکھ کے متحیر زدہ رہ جاتی
تھی۔۔۔ کوئی کسی سے اتنی محبت کیسے کر سکتا ہے جتنی رائم
خان نے انزس بزدار سے کی تھی؟ اور کی بھی تب تھی جب
اس کو پانا معجزے جیسا تھا۔

لیکن رائم خان نے ہار نہیں مانی تھی، وہ اپنی محبت پہ ڈٹا رہا تھا۔ اگر محبتیں سچی ہوں تو ہر عاشق کے ساتھ خدا کو معجزہ کرنا پڑتا ہے اور محبت میں معجزے ہوتے ہیں۔

ضروری نہیں کہ محبوب کو پالینا ہی معجزہ ہے کبھی کبھی محبوب نظر میں بغیر اس کو پائے من پسند اور قابلِ احترام انسان بننا بھی معجزہ ہوتا ہے اور جو روح سے محبت کرتے ہیں ان کیلئے تو اتنا ہی کافی ہوتا کہ وہ اپنے محبوب کی نظر میں معتبر اور قابلِ قدر انسان ہیں۔

باقی جن کو جسموں کی طلب ہوتی ہے، وہ تو صرف جسموں تک ہی رسائی حاصل کرنے کو محبت کا نام دے کے ایک مقدس رشتے کی دھچکیاں اڑاتے ہیں۔۔۔ ان کی نظر میں صرف جسم کا حصول

ہی محبت ہے لیکن سچی محبت کرنے والے انسان کے
نظریات اور خواہشات اپنے محبوب کو لیکر مختلف ہوتی ہیں۔۔۔
انزس اس کے ہر بار اظہارِ محبت کو دیکھ کر بے یقینی میں مبتلا ہو
جاتی تھی۔۔۔ وہ تو عام سی لڑکی تھی تو پھر وہ وہ اتنی محبت کے
کیسے قابل ہو سکتی تھی؟ رائم خان کی محبت اس کیلئے سچے
موتیوں جیسی نکھری، شفاف اور قیمتی تھی۔

رائم خان کے پروزل کو انزس نے خود سے قبول نہیں کیا تھا۔
وہ دل و جان سے رائم خان کی بننے کیلئے راضی تھی لیکن اس بار
اس نے اپنا ہمسفر چنے کیلئے اپنے باپ کو اختیار دیا تھا، وہ اس
بار اپنے دل کے فیصلے سے بالکل بھی مار نہیں کھانا چاہتی تھی۔
جو مار اس کو دمیر خان کی دفعہ ملی تھی۔۔۔ وہ اس بار اپنے باپ کو
عزت بخشے ہوئے فیصلہ ان پہ چھوڑ گئی تھی کیونکہ ماں باپ کی

رضا سے جرّے رشتوں میں اللہ تعالیٰ رحمتیں، برکتیں اور محبتیں
ڈالتا ہے۔۔

انزہ کسی صورت بھی رائم خان کو نہیں کھونا چاہتی تھی۔
محبت لفظ کا اصل مطلب تو اسے رائم خان سے پتہ چلا تھا کہ
محبت ہوتی کیا ہے؟

جو محبت اس نے دمیر خان سے کی تھی وہ محض وقتی چھلاوا
تھا۔ اور چھلاوے اور اٹرکیشن کو محبت کا نام ہرگز نہیں دیا جا
سکتا۔۔

عامر بزدار نے رائم خان کے پرپوزل کو فوراً قبول کر لیا تھا کیونکہ
وہ بھی رائم خان کی تڑپ اور محبت دیکھ کے یہ جان چکے ہو کہ
ان کی بیٹی کیلئے رائم خان سے اچھا کوئی ہمسفر نہیں ہو سکتا۔۔

خان! آپ مجھے سے اتنی محبت کیوں کرتے ہیں؟ حالانکہ میں تو اتنی خوبصورت بھی نہیں ہوں، عام سے خدوخال ہیں میرے، عام سی لڑکی ہوں، مجھ میں کچھ بھی خاص نہیں ہے اور آپ فضول میں پچھلے دو سالوں سے مجھ جیسی عام سی لڑکی سے محبت کر رہے تھے وہ بھی یک طرفہ طور پر! اس خوف سے بالآخر ہو کر کہ میں آپ کو ملوں گی بھی کہ نہیں؟۔۔۔ انزس نے اس کے لبوں کی جسارت پہ کسمساتے ہوئے سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔

شش! خود کو عام سی لڑکی کہنا بند کرو! تم بہت خاص ہو، میرے لئے تو ہیرے سے بھی بڑھ کر نایاب ہو اور دوسری بات محبت اگر حالات اور شرطوں پہ کی جائے تو وہ محبت نہیں ہوتی ہے بلکہ سودے بازی ہوتی ہے اور میں نے تم سے محبت

کی تھی، کوئی سودے بازی نہیں کہ مجھے محبت کے بدلے محبت
چاہئیے۔۔ ہاں لیکن اب میری محبت تمہیں مجھ سے محبت کروا
دے گی اور ایسی کروائے گی کہ تمہارے لبوں پہ صرف میرا نام
ہوگا۔۔ اگر تمہیں تمہاری خوبصورتی کے بارے میں بتاؤ تو

سنو!!

تم اتنی حسین ہو کہ تمہیں گھنٹوں فرصت سے بیٹھ کے دیکھا
جاسکتا ہے۔۔ اگر مجھ سے کائنات کی سب سے بڑی خوبصورتی
پوچھی جائے تو میں، ہر خوشنما رنگ، ہر پھول، ہر مہک، ہر منظر
، ہر دلکش چیز ایک طرف رکھ کے خوبصورتی لفظ کو تمہارے
حسن سے تشبیہ دے کے بات ختم کر دوں گا کیونکہ تم محض ایک
وجود نہیں ہو بلکہ!

میری کل کائنات ہو!

میری محبت کی مثال ہو!

وفا کی علامت ہو!

قربانی کی انتہا ہو!

تڑپ کا صلہ ہو!

میری پاکیزہ محبت کی نشانی ہو!

میری آنکھوں کی روشنی ہو!

میرے سینے میں دھڑکتا دل ہو!

میرے لبوں کی مسکراہٹ ہو!

میری پھیکی زندگی کا مہکتا گلاب ہو!

میرے آنکھوں میں محبت کا ستارہ ہو!

میری حیات کی آخری خواہش ہو!

تم ہو تو میں ہوں، مختصر یہ کہ تم رائم خان بارکزئی کی جان ہو!

اور رائم تمہارے بغیر مردہ ہے قلبِ راحت!۔۔۔ وہ آنکھوں
میں چمک لئے عقیدت سے انزس کے ہاتھ چومے جا رہا تھا۔
تمہیں پتہ ہے قلبِ راحت! تمہیں پانا مجھے بہت مشکل لگتا تھا،
میں سوچتا تھا کہ تم جیسی حسین اور ذہین لڑکی میرے مقدر میں
بھلا کیسے لکھی جاسکتی ہے؟ تم میرا انتخاب بھلا کیونکر کروں گی؟
تم آسمان اور میں زمین! میں سوچتا تھا کہ آسمان اور زمین کبھی
ایک نہیں ہو سکتے جیسے چاند اور سورج ایک نہیں ہو سکتے لیکن
میں غلط تھا، میری محبت تو آسمان کا ستارہ نکلی جو ہر وقت چاند
کے ہمراہ رہتا ہے۔۔۔ تم نے کبھی چاند کے ساتھ ایک چھوٹا
ستارہ جو ہوتا ہے! وہ دیکھا ہے؟ جو ہمیشہ چاند کے ساتھ رہتا
ہے، میں وہی ستارہ ہوں اور تم میرا چاند ہو۔ تمہارا میرا ملنا
ازل سے طے شدہ تھا۔ اور ہمیں ابد تک کوئی جدا نہیں کر سکتا

جب تک آسمان پہ چاند چمکتا رہے گا، میری محبت بھی چمکتی
رہے گی۔ میں اس جہان میں اور اگلے جہاں میں بھی ہمیشہ
تمہارا ستارہ بننا پسند کروں گا۔۔۔ رائم خان اٹھ کر نرمی سے
اسکی ساری پنز کھولتے ہوئے اس کے سر سے بھاری عروسی
دوپٹہ اتار کے سائیڈ پہ رکھتا، محبت سے لبریز لہجے میں اسکے وجود
اور اپنی محبت کو معتبر کرتا، انزس کے ماتھے پہ لب رکھ گیا تھا
کیونکہ وہ جانتا تھا اس کی شہزادی کو دوپٹہ لینے کی عادت نہیں
ہے۔۔۔ وہ اس بھاری دوپٹے میں الجھن کا شکار ہو رہی ہوگی

--

انزس آج اس کے انداز، گہرے اظہار محبت اور سچی تعریفیں
خود کیلئے سن کر حیرت زدہ تھی۔۔۔ خوشی سے اس کی آنکھوں
میں نمی چمکی تھی۔۔۔

خان!! آپ کو پتہ ہے! مجھے آپ کی محبت جاننے سے پہلے محبت
لفظ کی ڈیفینیشن بھی صحیح سے پتہ نہیں تھی۔ ویسے تو میں ذہین
تھی لیکن محبت جیسے جذبے کو پہچاننے میں بالکل نا لائق نکلی، میں
آج تک وقتی اٹرکشن کو محبت کا نام دیتی رہی لیکن مجھے یہ بات
آپ سے پتہ چلی کہ محبت کوئی اٹرکشن کا نام نہیں ہوتی! یہ تو کوئی
الگ ایک خوبصورت سا جذبہ ہے۔

محبت تو دل ہے!
محبت تو قربانی ہے!
محبت تو دعا ہے!
محبت تو معجزہ ہے!
محبت تو سکون ہے!
محبت تو کرم ہے!

محبت تو عاجزی ہے!

محبت تو التجا ہے!

محبت تو قبولیت ہے!

محبت تو جنت کا رستہ ہے!

محبت تو کھلتا گلاب ہے!

محبت تو روح ہے!

محبت تو ”رائم خان بارکزئی“ ہے!

انزش بزدار اپنی دھن میں بولتی بے ساختہ آج پہلی بار اپنے دل کی بات زبان پہ لے آئی تھی۔۔۔ پچھلے ایک مہینے سے بس رائم خان ہی محبت کا بار بار اظہار کر رہا تھا لیکن انزش نے نہیں کیا تھا۔۔۔ وہ ڈرتی تھی اظہار محبت سے!! مگر آج رائم خان کی

دسترس میں آ کے وہ بلا جھجھک اپنے دل کی بات لبوں پہ لے آئی تھی۔

کیا بولا؟ پھر سے بولو! اس کی ساری جیولری اتارتے اپنے لئے اتنا پیارا اظہار سن کے رائم خان کے بے ساختہ ہاتھ تھے تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں کو روکے ایک دفعہ پھر سے اس کے منہ سے وہی الفاظ سننے کی فرمائش کر گیا جن کو سن کر اس کے کانوں کو راحت ملی تھی۔۔

"محبت تو رائم خان بار کزئی ہے"

خان! آپ میرے صبر کا میٹھا اجر ہیں۔۔ بابا ہمیشہ مجھے آپ جیسے ہمسفر کی دعا دیتے تھے اور دیکھیں، ان کی دعائیں پوری ہوں گئی اور مجھے آپ جیسا بے لوث محبت کرنے والا ہمسفر مل گیا دونوں جہانوں کیلئے، میں اس جہان میں بھی آپ کی بن کے رہنا

چاہتی ہوں اور اگلے جہاں بھی مجھے آپ کا ہی ساتھ چاہیے،
اسلیئے محبت میں نو چیٹنگ!! ورنہ آپ کو اپنے ہاتھوں سے جہنم
میں ایک انگاروں والا اپارٹمنٹ بک کروا کے دوں گی۔۔۔
انزس بلا جھک اپنی محبت کا اظہار کرتی آخر میں شرارت سے
اس کو محبت میں ایماندار رہنے کی تلقین کر گئی تھی۔
خان قربان اپنی جان پہ! جس دن تم سے بے وفائی کرنے کی
کوشش کروں گا، تمہیں کھلے عام اجازت ہے میرے اس دغا باز
دل میں پوری چھ گولیاں اتار کے قبر میں پہنچا دینا، تمہیں میرا قتل
معاف ہے۔۔۔ رائم خان اس کے جھمکے اتارتا سنجیدگی سے بولا
تھا۔ البتہ انزس کا اظہار محبت اس کے دل کو قرار دے گیا
تھا۔۔۔

اللہ نہ کرے خان! کبھی ایسا نہ ہو، مجھے آپ کی محبت پہ پورا
یقین ہے، آپ میرے ساتھ دغا ہرگز نہیں کریں گے۔۔۔
انزش اس کی بات پہ دہل اٹھی تھی، وہ اس کے منہ سے مرنے
کا نام سن کے خوف زدہ ہوئی۔ کبھی کسی کے باپ سے بھی
خوف نہ کھانے والی آج محبت میں خوف زدہ ہوئی تھی۔
اچھا! چھوڑو یہ ساری باتیں! کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ کھانا کھاؤ،
باتیں ہم بعد میں بستر پہ کریں گے کیونکہ خالی پیٹ تو ٹھیک سے نہ
باتیں ہوتی ہیں اور نہ ہی پیار۔۔۔ وہ جھمکے سائیڈ ٹیبل پہ رکھتا
کھانے کی ٹرے اٹھا کے انزش کی طرف بڑھاتا زو معنی انداز میں
بولا تھا۔

انزش اس کی بات کا مطلب سمجھتی، بنا کوئی جواب دئیے
خاموشی سے کھانے میں مصروف ہو گئی کیونکہ بھوک اس کو

بہت زوروں کی لگی تھی۔ رائم خان اس کی ساری جیولری اتارتا، اس کو کھانے میں مصروف دیکھ کے الماری کی طرف بڑھ گیا۔

وہ الماری سے انزش کی منہ دیکھائی کے تحائف لیتا واپس بیڈ پہ آیا اور اس کو منہ دیکھائی میں کئی قیمتی تحائف دئے، جن میں سب سے خوبصورت ڈائمنڈ کاپینڈٹ تھا۔ ہارٹ شپ کے پینڈٹ کے بالکل وسط میں "شہزادی" کی تحریر درج تھی۔۔۔ رائم خان پیار سے وہ پینڈٹ انزش کے گلے کی زینت بنا گیا تھا۔ انزش اس کی خوبصورتی دیکھ کے حیران ہوئی۔

اور بھی بہت سے گفٹس تھے جنہیں رائم خان صبح دینے کا ارادہ رکھتا تھا، ابھی وہ کھانا کھا رہی تھی، اس لئے اسے ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔۔۔

انزش نے بھی رائم خان کیلئے اپنی طرف سے گفٹس لئے تھے
جن میں برینڈڈ واچز، پرفیومز، اور اپنے اور رائم خان کے نام کی
customized چین شامل تھی۔

خان! آپ کھانا نہیں کھائیں گے؟ آپ کو بھوک نہیں لگ
رہی؟۔۔۔ انزش کا جب پیٹ بھر گیا تو بچا کھانا دیکھ کر رائم
خان سے استفسار کرنے لگی۔۔۔ پہلے اسے بھوک ہی اتنی لگی
تھی کہ وہ بنا اسے پوچھے خود ہی کھانے میں مگن ہو گئی تھی۔

I'm starving for you right now, Just want to eat Your lips

Passionately!

وہ اپنی شیروانی اتار کے سائیڈ پہ رکھتا، انزش کی گود سے کھانے کی
ٹرے اٹھاتا زو معنی انداز میں بولا تھا۔ انزش نے گڑبڑ کر اس
کی بات پہ نظروں کا زاویہ بدلا تھا۔

میرا نام کہاں لکھوایا ہے؟۔۔۔ رائم خان پھر سے اس کے
قریب بیٹھتا انرش کے مہندی سے سجے ہاتھوں میں اپنا نام
تلاشنے لگا۔

خود ڈھونڈھ کے دیکھائیں تو مانوں آپ کو!۔۔۔ وہ شوخ لہجے میں
بولتی اپنی ہتھیلیاں فولڈ کر گئی تھی۔ رائم خان اس کی ہتھیلیاں
کھولتا دو منٹ میں ہی اپنا نام ڈھونڈھ کے اس پہ لب رکھ چکا
تھا۔

آپ کو اتنی جلدی کیسے پتہ چلا؟ میں نے اتنا چھپا کے لکھوایا
تھا۔۔۔ اس کے اتنی جلدی نام تلاشنے پر وہ منہ کے زاویے
بگاڑ کر بولی۔

میری جان! تم میرا نام ہاتھ پہ تو کیا اپنے جسم کے کسی
بھی مخفی اعضاء پہ لکھواؤ گی نہ تو میں آنکھیں بند کر کے ڈھونڈھ

لوں گا کیونکہ تمہاری ہر دھڑکن میرے نام کا پتہ دیتی تھی۔۔۔۔۔
رائم خان پھر سے اس کے ہاتھوں پہ "خان کی دلہن" کی تحریر
پڑھ کر محبت سے اس کی ہتھیلی چوم گیا تھا۔ وہ ایک دم سے
انزس کے بے حد قریب ہوتا اس کے منہ پھونک مار گیا۔۔
انزس نے اسکی جسارت پہ مسکراتے ہوئے آنکھیں موندھ
لیں۔

رائم خان نے اس کے لپ اسٹک سے سبے لبوں کو فوکس میں
لئے پہلے اس کی ٹھوڑی کو چوما اور پھر اچانک اس کے لبوں کو
نرمی سے اپنے لبوں کی گرفت میں قید کر لیا۔ انزس اس کی
حرکت پہ پٹ سے آنکھیں کھولتے ہوئے ٹھٹکی تھی۔ شرم سے
وہ تھوڑا سا کسمسائی۔ وہ اس کی پچھلی گردن میں ہاتھ ڈالے اس
کے لبوں کو اپنے ہونٹوں میں لاک کرتا پہلی بار انزس کے لبوں کو

چومنے لگا تھا۔ وہ تھوڑی دیر انہیں نرمی سے چومنے کے بعد
اچانک شدت پسند ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اس کے لبوں کو اپنی
زبان میں دبا کے سک کرتا پہلے بوسہ محرم سے خود کو سیراب
کرنے لگا تھا۔ انزس نے اس کی شدت پہ بوکھلاتے ہوئے اس
کو کالر سے جکڑا تھا۔ رائم خان کی مونچھوں کی میٹھی سی چبھن
اس کے دل میں گدگدی کر رہی تھی۔

پہلا حلال بوسہ اسے لذت بخش لگا تھا مگر وہ اپنے لبوں کو خود
سے کوئی حرکت نہیں دے رہی تھی بس رائم خان ہی اس کے
لبوں کو سک کرتا اپنی تشنگی مٹا رہا تھا۔ آگے جھک کر اس کو
لبوں کو سک کرنے میں دقت محسوس کرتے ہوئے رائم خان
نے جھنجھلاتے ہوئے ایک جست میں انزس کی کمر میں ہاتھ ڈال
کے اوپر کی طرف اٹھایا اور اپنی گود میں بیٹھائے تسلی سے اس کی

پنکھڑیوں کی چاشنی سے اپنا حلق تر کرنے لگا تھا۔ انزس اس کی
زبان اپنی منہ میں گردش کرتی محسوس کر کے بے خودی میں
رائم کے ہونٹوں کو اپنے لبوں کی گرفت میں لئے نرمی سے سک
کرتے ہوئے اس کا ساتھ دینے لگی تھی۔ وہ اس کا محرم تھا پھر
وہ کیونکر اس سے شرماتی؟

اس کا ساتھ ملتے ہی رائم خان سرشار ہوا تھا وہ اس کے گال پہ
ہاتھ جماتا اس کے لبوں پہ ظلم ڈھانے لگا تھا۔ وہ اس کی زبان کو
اپنی زبان کے گرد لپیٹ کے اسے پشینیت کس کرنے لگا۔
رائم خان ہر بار اس کی خوشبودار سانسوں سے گھلی نمی اپنے حلق
میں اترتا بے قرار ہو رہا تھا۔ وہ شدت پسند ہوتا اس کی زبان
اور لبوں کو اپنے دانتوں تلے کترنے لگا تھا۔

انزس اس كى زبان كى بے باكى اور دانتوں كى شدت اپنے نازك
لبوں پہ محسوس كرتى اپنى جسارت روك گئى تھى كيونكه وه جنونى
رائم سے ميل نهى كها پارھى تھى ۔ اس كا لمس پر حدت اور
وحشت زده تها ۔ رائم خان جى بھر كے اس كے لبوں كو سك
كرتا ان كو كسى صورت آزادى نهى بخش رها تها ۔ ۔ اپنى
سانسئں گھٹتى محسوس كر كے انزس نے اس كے كندھوں پہ ہاتھ
ركھتے ہوئے اپنے لب چھڑوانے كى سعى كى تھى لىكن وه اس كى
كرمئں اپنے ہاتھوں كى انگلئاں پيوست كرتا، اس كے لب كممل
طور پر اپنى قید مئں لئے ان كا سارا رس نچوڑنے لگا ۔

كافى دير بعد رائم خان نے اس كى مدہم ہوتى سانسئں محسوس
كرنے كے بعد نا چاہتے ہوئے بھى اس كے لبوں كو آزادى بخش

دی۔ انزش تیز تیز سانسیں بھرتی اس کے کندھے پہ سر ٹکا گئی تھی

--

رائم نرمی سے اس کی گردن سے پکڑ کر اس کا چہرہ چھپے کرتا اپنا سر
جھکانے لگا۔ وہ اپنی پوری زبان باہر نکال کے اس کی گردن پہ
پھیر کے اوپر کی جانب بڑھتا اس کی ٹھوڑی پہ دانت گاڑھ گیا۔
وہ ایک بار پھر اس کے لبوں پہ اپنی گیلی زبان پھیر کے انہیں اپنی
حراست میں لیے شدت پسندی سے چومنا لگا تھا۔ رائم خان
کو دوبارہ سے اپنے لبوں پہ قابض ہوتا دیکھ کے انزش نے اس
کے سینے پہ اپنے ناخن پیوست کئے تھے لیکن وہ ڈھیٹ بنا اپنا کام
جاری رکھے ہوئے تھا۔ اسے انزش کے لب اتنے میٹھے لگے
تھے کہ وہ کسی صورت بھی ان کا ذائقہ اپنے لبوں سے جدا نہیں
ہونے دینا چاہتا تھا۔ وہ اس کی زبان کو اپنے دانتوں تلے

مسلتا انزش کو آنکھوں سے اپنا ساتھ دینے کا اشارہ کر گیا تھا مگر
اس نے اس کا ساتھ دینے کی بجائے اپنی زبان اس کے لبوں
سے چھڑوانی چاہی۔

اس نے پہلے بھی ٹھیک سے سانسیں بحال نہیں کی تھی اور رائم
خان اسے مہلت دئے بنا پھر سے اپنی گرفت میں لیا گیا تھا۔۔
اب انزش کا چہرہ سانس گھٹنے سے سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں
سے بے ساختہ پانی نکلا تھا۔۔

رائم خان اس کا سرخ چہرہ اور نرم آنکھیں دیکھتا اس کے نچلے لب
کو اپنی دانتوں میں دبا کے باہر کی جانب کھینچ کے چھوڑتا آزادی
بخش گیا۔۔

Umm ! your lips are so juicy Qalb e Rahat !

وہ اس کے لبوں پہ زبان پھیرتا مخمور لہجے میں بولتا اپنے ہاتھ اس کی کمر سے ہٹا کے بلاؤز کی ڈوری میں الجھاتا اس کا فٹڈ بلاؤز کندھوں سے سرکانے لگا تھا۔۔

انزس جو کہ لبوں کی جان خلاصی ہوتے ہی، سانسیں ہموار کرنے کیلئے اس کے کندھے پہ سرٹکائے ہوئی تھی رائم خان کی انگلیوں کا ٹھنڈا لمس اپنے کندھوں پہ محسوس کرتی، جھٹ سے چھبھٹتی اپنے تن سے جدا ہوتے بلاؤز پہ ہاتھ رکھ گئی۔ اسے نا جانے کیوں اب رائم خان سے شرم محسوس ہو رہی تھی۔۔۔ یہ میرا حق ہے محترمہ!۔۔۔ رائم خان اس کے ہاتھ کی پشت چومتا نرمی سے بلاؤز سے ہٹاتا اس کے وجود کو اس چھوٹے سے پردے کے بوجھ سے آزاد کر گیا تھا۔ انزس نے بنا کوئی حرکت کئے بس اپنی آنکھیں شرم سے جھکالی تھیں۔ اس کی پلکوں کا گرا

جھالردیکھ کے وہ ایک جست میں اسکی ریڈیڈو سٹریپ میں
انگلیاں الجھائے اس کے سینے کی نازکی کو خود پہ عیاں کر گیا تھا۔
آخری پردے ہٹتے ہی انزس کے سینے کی ساخت بے ہنگم ہوئی
تھی۔ وہ رائم خان کی اس حرکت پہ گلنار ہوتی تیزی سے اس کے
سینے میں چھپ گئی۔

اس کے پرکشش اور دلفریب سینے کی ساخت کی ایک جھلک
دیکھ کے ہی رائم خان کی آنکھوں میں خمار کی سرخی اتری تھی۔
وہ اپنا خشک حلق تھوک نکل کے ترکرتا اگلے ہی پل انزس کو
کندھوں سے پکڑ کر چھپ کرتا خود کے مقابل کر گیا تھا۔ اس کی
نازک گہرائیاں بالکل اس کی نظروں کے سامنے رائم خان کے
ضبط کا امتحان لے رہا تھا۔

افف! تم کتنی حسین ہو۔۔۔ رائم خان پہلی بار اس کے سینے
کی ناز کی اور اس کے دل کے مقام پہ چمکتے سیاہ تل کو دیکھتا متحیر
زودہ ہوتا انہیں جھجھکتے ہوئے اپنی ایک انگلی اور انگوٹھے سے
چھونے لگا۔

اس کے جسم کی سوفٹنس محسوس کرتے ہوئے رائم خان بے
ساختہ اس کے سینے کی حساسیت پہ ہاتھ پھیرتا خود کو تسکین دینے
لگا جبکہ انرش اس کے ہاتھوں کا ٹھنڈا لمس اپنی دھڑکنوں پہ
محسوس کرتی پھر سے حیا کے مارے اس کے سینے میں منہ
گھسیڑنے کی کوشش کرنے لگی لیکن رائم خان اس کی کوشش
ناکام بناتا اس کو پچھلی گردن سے پکڑ کے بے ساختہ اس کے سینے
کے سیاہ قاتل تل پہ جھکا تھا۔۔۔ وہ اپنی زبان کی نوک سے اس کے
سینے کی ناز کی میں موومنٹ پیدا کرتا اس کی رعنائیوں میں ارتعاش

پیدا کر گیا تھا۔ رائم خان کی زبان کی دھیرے دھیرے سے تیز
ہوتی حرکت انزس کے ابھری ساخت کو مزید ابھارنے لگی
تھی۔۔ وہ ان میں تناؤ محسوس کرتا بے چینی سے اسکی پھولوں
جیسی دھڑکنوں کی حساسیت کو اپنے منہ میں لے کر دبانے لگا۔
ان کی نرمی فیل کرتے ہی رائم خان بے قرار ہوتا شدت سے
انہیں اپنے لبوں اور دانتوں میں دبائے کھینچنے لگا تھا۔ اس نے
اسکے درد بھرے لمس کو برداشت کرتے ہوئے اس کے کالر کو
مٹھیوں میں جکڑا تھا۔ وہ اپنے سینے پہ رائم خان کے لبوں کا گیدا
لمس محسوس کرتی شرم آگیاں ہو رہی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ سے
اس کے سینے کو مسل کے بے چینی سے اپنے لب ان پہ رول
کرتا دانتوں سے کترنے لگا تھا۔۔

سس! خان!۔۔۔ انزش بے ساختہ اس کی بے رحمی پہ سسک
اٹھی تھی۔۔۔ شرم کے مارے وہ اس کے سینے میں چھپ جانا
چاہتی تھی لیکن رائم خان کی پکڑ اس کی پچھلی گردن پہ مضبوط
تھی۔۔۔

باخدا! نرمی سے پیش آرہا ہوں، اس سے زیادہ نرم نہیں
ہو سکتا۔۔۔ وہ اس کی نزاکت کو اپنے منہ میں گھلتا محسوس
کرتے ہوئے ہر لمحہ بے رحم ہو رہا تھا جبکہ انزش کو اس کی منہ کی
گرماہٹ اور زبان کا گیلہا لمس اپنے سینے پہ گردش کرتا مدہوش کر
رہا تھا۔۔۔

وہ آنکھیں موندے اپنی گردن چھپوڑھلاکائے لب کاٹنے لگی تھی

رائم خان نے بے شرمی سے اس کو مکمل چھپکی چرف
جھکایا۔ یوں کہ انزش کی پسلیاں بخوبی ظاہر ہوئیں۔۔۔ رائم خان
اس کو اپنے ایک بازو میں ہولڈ کرتا دوسرے ہاتھ سے اس کے
دل کے مقام کو جکڑے لبوں اور دانتوں سے سرخ کر گیا تھا۔
یہاں پہ جلن محسوس کرتے ہوئے انزش نے اب مزاحمت
کرتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ اس کے کالر سے ہٹا کے اس کے
بالوں میں الجھاتے ہوئے رائم خان کا چہرہ اپنے سینے سے دور
کرنا چاہا مگر وہ کرنہ پائی۔۔۔ کافی دیر بعد رائم خان اس کا سرخ
ہوتا سینہ دیکھ کے خود ہی چھپے ہٹتا انزش کو اپنی گود سے نکال کے
بیڈ پہ لٹانے لگا۔ وہ اس کے سلکی بھورے بالوں کو کھول کے
چھپے تکیے پہ بکھیرنے لگا۔

وہ چھپھٹتا اور بے صبری سے اپنا لباس اتار کے زیں بوس کرتا
کمرے کی لائٹ آف کرتے ہوئے انزس کے پاس آیا۔

قلبِ راحت! میں آج کی رات تمہاری زندگی کی سب سے حسین
اور لذت بھری رات بنانے والا ہوں۔ میں تم پہ ایسے ٹوٹ کے
برسوں گا کہ تمہیں ہمارے ملن کی یہ رات زندگی بھر نہیں بھولے
گی۔۔۔ وہ نرمی سے اس کی بھوری آنکھیں چومتا اس کے کان
میں سرگوشی نما آواز میں بولا۔

رائم خان کا جسم عجیب سی اضطرابی کیفیت میں مبتلا تھا جبکہ
انزس مدہم روشنی میں اس کا چوڑا وجود دیکھتی پہلی بار خوف
سے تھوک نکل کر خود کو مضبوط دیکھانے کی کوشش کی تھی لیکن
اندر سے اس کا دل رائم خان کا جنونی پن دیکھ کے سوکھے پتے

کی مانند لرز رہا تھا۔۔ وہ چھپھٹتا اس کے لہنگے میں ہاتھ الجھائے
پورے حق سے اس کے بدن سے علیحدہ کر گیا تھا۔

خان!۔۔۔ انزس نے بے یقینی سے اسے پکارا۔۔ وہ تیزی
سے خود کو فولڈ کر کے چھپھٹتی۔۔ اسے شاید زندگی میں پہلی بار
ڈر لگ رہا تھا اور ڈر بھی پیار سے اور ملن سے لگ رہا تھا۔

شش! میرے پاس آؤ! مجھے خود میں سما لو! میں تمہاری محبت کا
مارا ہوں، تمہارے لمس کا تشنہ ہوں، میری تشنگی اور جذبات
کے آوارہ پن کو لگام دو، میں خود پہ مزید کنٹرول نہیں کر سکتا!!
میں تم میں اتر کے تمہارے وجود میں گم ہونا چاہتا ہوں۔۔ اگر
تم میں ضم نہ ہو تو ملن کی تڑپ میں فنا ہو جاؤں گا۔۔۔ وہ
آنکھوں میں شدید تڑپ لئے اس کو اجازت طلب نگاہوں سے
دیکھنے لگا۔

رائم خان کی کرسٹل گرے آنکھیں خمار سے لہو لال اور نسیم
پھڑپھڑاہٹ کا شکار تھیں۔ انزس اس کے لہجے میں التجا اور
آنکھوں میں اپنے وجود سے سکون پانے کی طلب پڑھتی بے
ساختہ اس کی طرف کھسکتی اسکے سینے میں منہ گھسیڑ گئی۔ رائم
خان اس کے اتنی جلدی مان جانے پر خوشی سے سرشار ہوتا
اس کے ماتھے پہ لب رکھتے ہوئے چپھے ہوا۔

بہت شکریہ قلبِ راحت! میرے سکون کو اول رکھنے کیلئے، میں
بھی پوری کوشش کروں گا تمہیں سکون اور لذت کی آخری حدوں
تک لے جاؤں۔۔۔ رائم اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر تعریض کرتا
خود ان کے درمیان بیٹھا تھا۔ وہ نرمی سے اس کی تھائیز پہ ہاتھ
پھیرتا نیچے جھک کر ان پہ اپنے لبوں کا ہلکا سا لمس چھوڑنے لگا
جسے محسوس کرتی انزس تڑپ کے مچلی تھی۔

رائم خان اس کی حرکت نوٹ کرتا اٹھ کے اس کے چہرے کی طرف آتا انزس کے خوف سے خشک پڑتے لبوں کو اپنے لبوں میں لئے سک کرنے لگا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ سے اس کے لبوں کو سک کرتا اپنے ہاتھ کو اس کے تھائیز کے درمیان لے جا کر گہری بے باکیاں کرنے لگا۔ اس کے ہاتھ کا گستاخ ایکٹ اپنی تھائیز کے درمیان محسوس کرتی پہلے تو انزس ڈر سے اپنی جگہ سے اچھلی تھی لیکن پھر وہ اس کے ہاتھ کی سوفٹ اینڈ سلو موومنٹ پہ دھیرے دھیرے مدہوش ہونے لگی تھی۔۔۔

اہہ! خان!۔۔۔ وہ اس کے بازو پہ ہاتھ رکھتی اس کا ہاتھ بے بسی سے اپنی تھائیز سے ہٹانے لگی تھی۔

قلبِ راحت! تم تو ایسے ہی میرے سامنے بہادر بنتی تھی اور مجھ پہ رعب جھاڑتی تھی لیکن آج تو تم میرے لمس کی تاب نہ

لاتے ہوئے میری قربت سے ڈرتے ہوئے مچل رہی ہو؟ باٹ
فئیر۔۔۔ رائم اس کے لبوں کو آزادی بخش کر شرارت سے
بولتا اپنے ہاتھ کی موومنٹ میں مزید سختی لانے لگا۔
اہہ! خان! ہاتھ۔۔۔ چھپے۔۔۔ کریں!۔۔۔ انزش اسکے لمس کی
تاب نہ لاتے ہوئے تڑپتے ہوئے بولی۔

اوو میری جان! تمہاری تو پہلے سٹیپ پہ ہی بس ہو گئی ہے!
آگے کیا تم خاک مجھے ٹف ٹائم دو گئی؟۔۔۔ وہ بے شرمی سے
بولتے ہوئے ہلکا سا ہنسا۔

شٹ اپ! انزش نے اسے اپنی سرخی مائل آنکھوں سے گھورا
تھا۔۔۔ اس کے ہاتھ کی بے باکی اسے بے بس کئے ہوئی تھی۔
وہ زور سے بیڈ شیٹ کو مٹھیوں میں بھینچے آنکھیں رول کرتے
ہوئے مدہوشی میں اپنی کمر اوپر اٹھانے لگی تھی۔ انزش کی

آنکھیں بھی سیم رائم خان جیسی خمار سے سرخ آلود تھی۔
دونوں کے جسم دھک رہے تھے۔۔
اگر تم چاہو تو میں چھبہٹ سکتا ہوں۔۔۔ اس کو محلتے دیکھ
کر وہ اب چھیڑنے والے انداز میں بولا تھا۔

No... Keep...Going

انزش کے منہ سے بے ساختہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکلے۔ وہ
اپنے ہوش میں کہاں تھی بھلا؟ رائم خان مکمل طور پر اسے اپنے
لمس سے مدہوش کر چکا تھا۔ اس کا جواب سن کے رائم خان کو
پہلے تو جھٹکا لگا اور پھر اس پہ طاری مدہوشی کا اندازہ لگاتے
ہوئے مسکراہٹ گہری ہوئی۔۔ وہ اس کی دھڑکنوں پہ زبان
پھیرتا اسے اپنے ایک ہاتھ کی مٹھی میں زور سے جکڑ کے چھوڑتا
انزش کو کراہنے پہ مجبور کر رہا تھا۔

اس کے دوسرے ہاتھ کی گستاخیاں ہنوز انزس کی تھائیز کے
درمیان جاری تھی۔ وہ اس کے نازک انگوں کے ساتھ چھیڑ
چھاڑ کرتا اس کو اپنی قربت کیلئے ترسانے لگا تھا۔

Khan! Please

اسے آگے نہ بڑھتے دیکھ کر انزس نے تکیے پہ سر کو یہاں وہاں
موو کرتے ہوئے اسے ملتجی نگاہوں سے دیکھ کے پکارا تھا۔ وہ
مکمل طور پہ اس کی قربت میں جانے کو بے قرار تھی۔

Please What?

اس نے اپنی مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے انجان بن کر
استفسار کیا کیونکہ وہ اسکی بن آب مچھلی کی طرح تڑپتی حالت
دیکھ کے سمجھ چکا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ طانزس اس کو جواب
دینے کی بجائے آنکھیں بند کرتی اس کو فیل کرنے لگی۔

او کے آرہا ہوں فائنل سٹیپ پہ!! تمہاری تڑپ کو مختصر کرتا
ہوں۔۔۔ رائم اس کے گال پہ لب رکھتا اس کے پیٹ پہ جھکا
اور اس کے بیلی بٹن میں زبان پھیرنے لگا۔ وہ سیدھا ہو کے
بیٹھتا اس کی دونوں ٹانگوں کو تھائیز سے پکڑ کے اپنے قریب کر
گیا۔

رائم بے باکی سے اپنا وجود اس کی تھائیز کے درمیان موو کرتا
ایک آخری بار انزش کو تڑپتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔۔ پہلے تو
اس کا لمس محسوس کرتے ہوئے انزش کے پھر پھڑاتے وجود
میں سپارک ہوا تھا جس پہ وہ اپنی جگہ سے اچھلی تھی مگر پھر
اپنے محرم کو خود میں اترنے کیلئے تیار کر گئی۔ رائم اپنے نچلے
وجود کا ہلکا سا دباؤ دیتا اسکے چہرہ کی طرف نگاہ اٹھا کے دیکھتا اس

کاری ایکشن نوٹ کرنے لگا تھا جو کہ آنکھیں موندے مدہوشی
میں اپنے لب کاٹ رہی تھی۔

قلبِ راحت! آنکھیں کھولو، اپنے لب چھوڑو اور میری طرف
دیکھو۔۔ میں تم میں اترنے لگا ہوں، جب میں تم میں سفر کر رہا
ہوں تو تمہاری ایک منٹ کیلئے بھی مجھ پر سے نگاہ ہٹنی نہیں
چاہئے ورنہ میرے لمس کا ایک ہی جان لیوا جھٹکا تمہیں بوکھلا کے
رکھ دے گا۔۔۔ وہ بھاری گھمبیر آوازیں بولتا اسے آنکھیں بند
کرنے سے منع کرنے لگا۔

خان۔۔۔ وہ خوف کے مارے بے ساختہ اسے پکار اٹھی تھی۔
آنکھوں میں نرم رہنے کی التجا تھی۔

بھروسہ رکھو! بہت پیار سے تم میں اتروں گا اور پوری کوشش
کروں گا تمہیں تکلیف کم سے کم دوں! یہ ایک ایسا درد ہوگا جس

سے تم لطافت اٹھاؤ گی۔۔۔ رائم خان اس کی آنکھوں میں ڈر کی
لکیر دیکھتا یقینی دہانی کروانے والے انداز میں بولتا آگے جھک کر
اس کی آنکھیں چوم گیا۔

انزش اس کی یقین دہانی پہ کچھ پر سکون ہوئی تھی لیکن دل پھر
بھی لرز رہا تھا۔ ہتھیلیاں اور جسم پسینے سے بھیگ رہا تھا۔۔
گلے میں انجانے خوف کے کانٹے چبھے تھے۔ وہ اس کو صحیح سے
اپنی رانوں کے درمیان میں ایڈجسٹ کرتا ایک ہاتھ اس کے
کندھے پہ رکھتے اپنے وجود کا زور دار دباؤ دیتا ایک دم سے انزش
کے وجود میں اپنا وجود گھول گیا۔

ابہہ خان!۔۔۔ انزش نے تکیے سے اچھلتے ہوئے اسے درد
بھری آواز میں پکارا تھا۔ یہ درد اس کیلئے نیا اور جان لیوا تھا۔

درد کی شدت سے آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کے بے مول ہوئے
تھے۔

خان کی جان!۔۔۔ وہ اس کی پکار پہ محبت سے لبریز لہجے میں
جواب دیتا اس کے آنسو اپنے لبوں سے صاف کرتا عقیدت
سے اس کے ماتھے پہ لب رکھ گیا تھا۔
رائم خان اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھا کر تکیہ اٹھا کے اس کی کمر کے
نیچے کرتا صحیح سے اپنا وجود اس میں منتقل کرتا حرکت شروع کر
گیا تھا۔

وہ بے حد نرمی سے اس کی روح کو اپنے لمس متعارف کرواتا
اس کے سینے پہ چمکتے ہیرے جیسے سیاہ تل پہ دانت گاڑھ گیا۔
انزس اس کے سینے پہ ہاتھ جمائے اس کو خود میں اترتا محسوس
کرتی سرور میں آنکھیں موندھ گئی۔

میری طرف دیکھو اور مجھے مضبوطی سے پکڑو۔۔۔ اس کو پھر سے آنکھیں موندے دیکھ کے وہ ایک زوردار پیش سے خود کو اس کے اندر مزید دھکیلتا سیٹھاتی ہوئی انزش کو آنکھیں کھولنے پہ مجبور کر گیا۔

ٹانگ تھوڑی سی اوپر اٹھاؤ۔۔۔ رانم اپنی بھاری گھمبیر آواز میں تحکم بھرے انداز میں بولتا اپنی حرکت میں تیزی لا گیا تھا۔ انزش نے اس کی آنکھوں کی سرخی دیکھتے ہوئے تھوک نگلا اور خود کو کسی بھی حرکت سے باز رکھا۔

جو کہاں ہے۔۔۔ وہ کرو انزش!!۔۔۔ وہ ایک جان لیوا سڑوک دے کر پھولتی سانسوں کے درمیان سختی سے مدھم آوازیں غرایا۔ اس کے بے تاب انداز پہ انزش کے گلے میں گلی بھر کر معدوم ہوئی، اس نے بے ساختہ اپنی ایک ٹانگ کو

حرکت دیتے ہوئے تھوڑا سا اوپر کی طرف کر گئی تھی۔ رائم
خان خود کو آخری حد تک اس میں منتقل کرتا اپنی حرکت،
خطرناک حد تک بڑھا گیا تھا۔

وہ برق رفتاری سے خود کو اس کی روح میں سفر کرواتا انزس کو
بوکھلانے پر مجبور کر گیا تھا۔ وہ تیزی سے اس کے سینے سے ہاتھ
ہٹا کے بازوؤں پہ رکھتی چھوٹی چھوٹی سسکاریاں بھرنے لگی تھی

وہ اس کی برداشت دیکھتا اس کی ٹانگوں کو مکمل تعریض کرتا اپنے
دونوں ہاتھ بیڈ پہ جما کے جذبات میں شدت پسند ہوا تھا۔

اہہ! خان!

Please... Slow...Down...

انزش نے اپنی لرزتی آوازیں التجا کی تھی۔ اس کی نظریں ہنوز
اس پہ جمی ہوئی تھی۔ وہ اس کے وحشی پن سے سرخ ہوتے
چہرے سے نظریں ہٹانے کی گستاخی نہیں کر رہی تھی۔۔
اس کی طرف سے چند زوردار سٹروکس ملتے ہی انزش کی جان
لبوں پہ آئی تھی۔۔

ایسے۔۔ مزہ نہیں۔۔ آئے گا۔۔ جان۔۔۔ رائم خان لذت کی
انتہاء پہ مزید خود کو اس میں پیوست کرتا اپنی پھولی سانسوں کے
درمیان بولا۔ وہ مکمل جوش کے ساتھ اس کی روح سے نکل کر
پھر سے واپس ایک زوردار پیش کے ساتھ اس میں اینٹر ہوتا
انزش کو منہ کھولنے پہ مجبور کر گیا تھا۔

اہہہہ! را۔۔ رائم۔۔۔ انزش اس کے جان گداز چھٹکے کی تاب
نہ لاتے ہوئے بے حال ہوتی اسے پکار اٹھی تھی۔۔

Say..it..Again!

وہ بنا رکے اس کی آنکھوں میں دیکھتا حکمیہ لہجے میں گویا ہوا۔
انزس کے منہ پہلی بار اپنا ٹوٹ کے ادا ہوتا نام سن کے رائم
خان سرشاری سے مزید بہکا تھا۔

Wh..at...

انزس نے لب بھینچے درد برداشت کرتے ہوئے اسے آنکھوں
میں الجھن لئے دیکھا تھا۔

Call..my..name

وہ اس کو تھائیز سے جکڑتا مزید جنونی ہوا تھا۔
اہہ! امم! را۔۔۔ رائم۔۔۔ انزس تکلیف سے آنکھیں میچتی
سکتے ہوئے بولی۔۔۔ اس کا جنونیت آمیز انداز اسے اندر تک ہلا
کے رکھ گیا تھا۔

Loudly

رائم خان اس کے سینے کی ابھری ساخت کو اپنے لبوں اور
دانتوں میں دبا کے چھوڑتا ظالم ہوا تھا۔ اس کا جسم جذبات کی
آگ میں جھلس رہا تھا اور اس کے لمس سے نکلتے انگارے
انزش کی روح کو بھی ساتھ جھلسا رہے تھے۔

اہہ!! امم! را۔۔۔ رائم۔۔۔ انزش نے اس لذت سے بھرپور
درد کو سہتے ہوئے تھوڑی اونچی آواز میں بولی تھی۔
وہ اپنی سکت سے زیادہ اس کو سہن کرنے کی کوشش کر رہی
تھی لیکن رائم خان کی جنونیت کے آگے اس کا نازک وجود درد
سے چور ہونے لگا تھا۔ بے ساختہ انزش کی آنکھوں سے آنسو
بہہ نکلے تھے لیکن انزش نے اسے چھپو دھکیلنے یا ہٹنے کا نہیں کہا
تھا، وہ اس کا محرم تھا، وہ اس کے وجود سے سکون لیتا لذت کی

آخری حدوں پہ تھا، وہ مزاحمت کر کے اس کے سکون میں خلل
نہیں ڈال سکتی تھی۔

آنکھیں کھولو انزش۔۔۔ رائم خان اس کی آنکھوں سے نکلتے آنسو
دیکھتا محبت بھرے لہجے میں اس کے ماتھے پہ لب رکھتا اپنی
حرکت روک گیا تھا۔

پین ہو رہی ہے؟۔۔۔ رائم خان نرمی سے اپنے لبوں سے اس
کے آنسو پیتا استفسار کر گیا تھا۔

تھوڑی۔۔۔ سی!۔۔۔ انزش نے مدہم آوازیں جواب دیا تھا۔
تم میرے لمس کا درد برداشت کر سکتی ہو کیونکہ تم میری قلب
راحت ہو!۔۔۔ وہ اس کو اپنی بانہوں میں لئے بیڈ سے لیکر اتر
تھا۔ وہ آئینے کے سامنے آتا اس کو نیچے کھڑے کر گیا۔

ایک لمحے کیلئے بھی مجھے سے نظریں مت ہٹانا، میں تمہیں دیکھانا
چاہتا ہوں کہ میں دو سال میں اس لمحے کیلئے کتنا تڑپا ہوں،
میرے وجود نے تمہیں محرم کے روپ میں اپنا کے تم تک
رسائی حاصل کرنے میں کتنا صبر کیا ہے؟ میں تمہیں اپنا جنونی پن
دیکھانا چاہتا ہوں جو میں تمہارے لئے رکھتا ہوں۔۔۔ رائم
خان اس کے لب چومتا اپنی مٹھیوں میں اسکی دونوں دھڑکنوں کو
جکڑ کے چھوڑ گیا۔

وہ اپنے ہاتھ سے اسکی دائیں ٹانگ اوپر کی طرف اٹھا کے اپنے
بازو کے گرد ریپ کرتا اپنا وجود اس کے قریب کرتے ہوئے
دوسرے ہاتھ کی مدد سے انزس کے حساس حصے سے ہوتا
اس میں بے صبری سے اترتا تھا۔

اہہ! رائم!۔۔۔ انزش بے ساختہ اس کی گردن کے گرد بازو
حائل کرتی کراہ اٹھی تھی۔ اس کی کنپٹی پہ لب رکھتے اس میں
اترتے ساتھ ہی رائم خان نے تیز تیز حرکت شروع کر دی
تھی۔ انزش کے سینے کی نزاکت اس کے سینے کے ساتھ لگتی
رائم خان کو مزید پاگل کر رہی تھی۔۔۔ وہ دونوں اپنا عکس آئینے
میں بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی قربت میں
جھلس کے راکھ ہو رہے تھے۔ دونوں کے جسم پسینے سے تر
تھے اور سانسیں پھولی ہوئی تھی۔

اہہ! امم! را۔۔۔۔۔ رائم۔۔۔۔۔ پلیر آرام سے
کریں۔۔۔۔۔ کمرے میں اس کی سسکیوں کے ساتھ رائم خان کی
بھی معنی خیز آوازیں گونجنے لگی تھی۔

Look...at..us..in...the..mirror!!

وہ اس کی پچھلی گردن پہ دانت گاڑتا، اس کی دوسری ٹانگ بھی اپنے بازو کے گرد لپیٹتا اسے زمین سے اوپر اٹھائے، خود کو اس میں آخری حد تک گاڑتا وحشی ہو رہا تھا۔

انزہ نے اپنی گردن پہ جلن محسوس کرتے ہوئے بے ساختہ رائم خان کے حکم پہ اپنی جھکی نگاہیں اٹھا کے آئینے کی طرف دیکھا تھا اور سامنے رائم خان کو لمحہ بہ لمحہ خود میں پیوست ہوتا دیکھ کے وہ شرم و حیا سے آنکھیں میچ گئی تھی۔ البتہ اس پہ مدہوشی پوری طاری تھی۔ وہ اس کے کندھے پہ سر ڈھلکاتی سسکیاں بھرتے ہوئے اپنے لب کاٹنے لگی تھی۔

چہرہ۔۔۔ میرے۔۔۔ قریب۔۔۔ کرو۔۔۔ پھولی سانسوں کی وجہ رائم خان کے ہونٹ خشک پڑ گئے تھے۔ وہ انزہ سے اپنے لب نزدیک کرنے کی ہدایت کر گیا تھا۔ اس نے مدہوشی میں

فوراً اپنے لب اس کے لبوں کی طرف کئے تھے۔ رائم خان
پیاسوں کی طرح اس کے لبوں کو سک کرتے ہوئے اس میں
سرائیت کرتا جا رہا تھا۔

Push...me..back

رائم خان گہری سانسیں بھرتا انزس کو بے باک حرکت کا حکم
دینے لگا۔

نہیں!۔۔۔ وہ اس کی بات کا مطلب سمجھتی شریکین ہوئی
تھی۔ وہ اس کی گردن پہ اپنے نوکیلے دانتوں کا نشان چھوڑتی
صاف صاف انکار کر گئی۔

او کے فائن! پل اینڈپش میں خود کر لیتا ہوں۔۔۔ وہ اس کے
انکار پہ بد مزہ ہوتا مزید پاگل بنا۔ دونوں کے ملن کی آوازیں پورے
کمرے میں گونجنے لگی تھیں۔ انزس کی اب بس ہو چکی تھی۔ وہ

مزید ایک منٹ بھی اس کو اپنے اندر برداشت نہیں کر سکتی
تھی مگر رائم خان کا جوش کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔
وہ اس کے لبوں کو چھوڑ کر بے تابی سے اس کے سیاہ تل کو
اپنے لبوں اور دانتوں کی گرفت میں لیتا اس کی سینے کی ابھری
ساخت پہ بے رحمی دیکھانے لگا تھا۔۔

سس!۔۔۔۔۔ رائم۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔ کریں۔۔۔

مجھے۔۔۔۔۔ پین۔۔۔۔۔ ہو۔۔۔۔۔ رہی۔۔۔۔۔ ہے۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ یہاں
۔۔۔۔۔ ان۔۔۔۔۔ کمفرٹیبل۔۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔۔ انرش اس کے سینے پہ دانت
گاڑھتی روہانسی ہو کے بولی تھی۔۔۔۔۔ وہ غصے سے رائم خان کی
پچھلی گردن پہ ناخن پیوست کرتی اپنا بدلا اتارنے لگی تھی۔ اس
کی التجا اور اپنی گردن پہ جلن محسوس کرتا وہ خود کو روک گیا
تھا۔۔۔۔۔

قلب راحت!! کیا ہوا ہے؟۔۔۔۔۔ رائم خان اپنی سرخی
چھلکتی آنکھوں سے دیکھتا اپنی بھاری ہوتی سانسوں سے استفسار
کر گیا۔

مجھے نیچے اتاریں، میں یہاں تھک گئی ہوں۔۔۔۔۔ وہ گہرے
گہرے سانس بھرتی اس کی گرفت سے نکلنے کی تگ و دو کرنے
لگی۔

اوکے! آجاؤ بیڈ پہ چلتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ اس کی کنپٹی پہ لب رکھتا اس
کو اسی پوزیشن میں لئے بیڈ کی طرف بڑھ کر انزش کو ترچھے انداز
میں لٹانے لگا۔ بیڈ پہ آتے ہی انزش نے سکھ کا سانس لیا تھا۔
اس کی کمر میں شدید پین اٹھ رہا تھا مگر وہ شکایت نہیں کر رہی
تھی۔

انزش نے ابھی صحیح سے سانس بھی نہیں لیا تھا جب رائم
خان اس کو ٹانگوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتا پھر سے خود
پورے جوش کے ساتھ مشغول کر گیا تھا۔ انزش نے بوکھلاتے
ہوئے بیڈ شیٹ کو مٹھیوں میں جکڑ لیا۔ اسے ڈر تھا کہیں وہ بیڈ
سے نیچے نہ گر جائے۔۔

وہ زمین پہ کھڑا ہو کے اپنی پوری قوت لگا کے خود کو اس میں
جذب کر رہا تھا۔ رائم کی آنکھیں اور جسم آگ کے کوئلے جیسا
دھک رہا تھا۔ وہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ شدت پسند ہو رہا
تھا۔

انزش کو اس کی حالت دیکھ کر خوف آیا تھا، وہ اپنے ہاتھ اوپر
کرتے ہوئے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں بھرنے

لگی۔۔ رائم خان اسے اپنے چہرہ تک پہنچنے میں ناکام ہوتا دیکھ
کے اپنا چہرہ اس پہ جھکا گیا تھا۔۔

انزس نے فوراً اس کے گالوں پہ ہاتھ جماتے ہوئے نرمی سے
اس کے لبوں کو چومنا شروع کیا تھا۔ وہ ایسا کر کے شاید اسے
ٹھنڈا کرنا چاہتی تھی جو کہ جذبات کی آگ میں جلتا خود کو اور
اسے آج راکھ کر دینے کے درپے تھا مگر انزس کی یہ حرکت اسے
ٹھنڈا کرنے کی بجائے مزید اس کے جذبات کو ہوا دے گئی
تھی۔ رائم خان اس کے لبوں کو چومنے کی بجائے کاٹنے لگا
تھا۔ وہ اس کو ٹانگوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتا جنونی ہوا۔
را۔۔ رائم۔۔ میں۔۔ گر۔۔ جاؤ۔۔ گی۔۔ وہ بیڈ شیٹ کو
اپنی مٹھیوں میں بھینچتی خوف سے چلائی تھی۔ بیڈ پہ صرف اس کا

سر اور کندھے تھے باقی پورا نچلہ وجود رائم خان کے قبضے میں
تھا۔

میں۔۔۔ اپنی۔۔۔ جان۔۔۔ کو۔۔۔ نہیں۔۔۔ کرنے۔۔۔ دوں
۔۔۔ گا۔۔۔ رائم خان اس کی دونوں ٹانگوں کو ٹخنوں سے پکڑ کر
اپنی شدتوں کے اس پہ پہاڑ توڑنے لگا تھا۔

آہہ۔۔۔ امم۔۔۔ امم۔۔۔ انرش منہ کھولے توڑ توڑ کے لفظ ادا
کرتی اسے برداشت کرنے لگی تھی۔۔۔ اس کی آنکھوں سے گرم
آنسوؤں کا لاوا بہہ نکلا تھا۔ کمر اور ٹانگیں درد کی شدت سے چور
ہو رہی تھی۔۔۔

خا۔۔۔۔۔ خان۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔ سٹاپ!! میں۔۔۔ مرجاؤں۔۔۔
گئی۔۔۔ انرش اب اسے رائم کی بجائے خان کی کہہ کے پکارتا تھا
کیونکہ اس کے منہ سے وہ اپنا نام سن کے چھپھٹنے کی بجائے

مزید شدت اختیار کر رہا تھا۔ رائم خان کافی دیر بعد اپنی مرضی سے اس کو آزادی بخشا اس کو اٹھا کے چھپے تکیے پہ لیٹا گیا تھا۔ دونوں کی تیز تیز چلتی سانسیں کمرے میں شور برپا کئے ہوئے تھیں۔

قلبِ راحت!!۔۔۔ رائم خان نے اسے اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے عقیدت سے اس کے ماتھے پہ لب رکھے۔ پسینہ اس کے چہرے سے ہو کے بہتا ہوا سینے کی طرف سفر کر رہا تھا۔ وہ سائیڈ ٹیبل سے چند ٹیشو اٹھاتا اس کا حسین پسینے سے شرابور چہرہ صاف کرنے لگا۔

مت کہیں مجھے قلبِ راحت! میری جان ہلکان کر کے رکھ دی ہے آپ نے، میں نہ روکتی تو آج آپ میری جان لے کے ہی دم لیتے! میں آپ کو بہت شریف سمجھتی تھی لیکن آپ تو بہت بے

شرم اور ڈھیٹ نکلے ہیں۔۔۔ انزس اس کے سینے پہ مکے
جھڑتی خفگی سے بولی تھی۔

آئی ایم سوری جانِ من!! تمہارے معاملے میں ہوش و حواس
کھودیتا ہوں، تم میری محبت ہو اور تم پہ محبت نچھاور کرنے
کے معاملے میں تھوڑا رُف ہو جاتا ہوں۔۔۔ رائم خان اس کی
مغروری ناک لبوں میں دبا کے چھوڑتا بے بسی سے بولا۔ وہ
اس کے معاملے میں بے بس تھا۔ وہ اپنی پسندیدہ عورت کو
اپنے حصار میں دیکھ کے ہر لمحہ بے خود ہو رہا تھا۔
ایسے محبت نچھاور کرتے ہیں؟ میری کمر اور ٹانگیں درد سے چور
کر کے رکھ دی ہیں۔۔۔۔ انزس آنکھوں میں غصے اور شکایت
لئے رنجیدگی سے بولی تھی۔

وائی قربان! اوکے اب اپنی بیوی کو تکلیف نہیں دوں
گا۔۔۔ رائم خان اس کے معصومیت بھرے شکوے پہ اس
کے لب چومتا اپنے سینے سے نکالے اسے الٹا لٹا گیا۔ وہ نرمی
سے اس کی سرخ پڑتی تھائیز اور درد سے ٹوٹی کمر پہ اپنے لبوں اور
ہاتھوں کا نرم لمس چھوڑتا اسے پین سے تھوڑا ریلیف دینے لگا
تھا۔ وہ کافی دیر تک اس کی کمر اور تھائیز اپنے نرم ہاتھوں کی
حرکت سے سہلا کے درد کی شدت کم کر گیا تھا۔ وہ سکون سے
آنکھیں موندے اس کے لمس پہ راحت پا رہی تھی۔ اسے اپنی
کمر کا درد گھٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

اب ٹھیک ہو؟۔۔۔ اس نے اس کے کندھے پہ لب رکھتے ہوئے
استفسار کیا۔

ہمم! انزس نے ہنکارا بھرا تھا۔

رائم خان نے اس کو نرمی سے سینے سے لگا کر کچھ پل کی مہلت
دی اور چند منٹوں بعد پھر اس پہ قابض ہو کر اسے بقیا پوری
رات کے لئے اپنے حصار میں قید کر گیا۔

وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے اس کے سینے پہ ٹھوڑی ٹکائے اس کے
وجہیہ چہرے کی خوبصورتی اپنی آنکھوں میں اتار رہی تھی۔ اس
کی آنکھوں میں رائم خان کیلئے بے لوث اور شدت والی محبت کی
لکیر چمک رہی تھی۔

رائم خان کا پرکشش وجہیہ چہرہ انزس کو کائنات کی تمام
خوبصورت اور پرسکون چیزوں سے افضل لگ رہا تھا۔ وہ
چھوٹی چھوٹی سانسیں بھرتا آنکھیں موندے شاید سو رہا تھا یا

سونے کی ایکٹنگ کر رہا تھا تبھی تو انزش کی یوں محبت بھری
نگاہوں سے بے خبر ہو کے خاموش تھا۔

انہوں نے ابھی آدھا گھنٹہ پہلے ہی شاور لے کے نماز ادا کی
تھی۔ رات کے بعد اس نے انزش کو پھر تنگ نہیں کیا تھا۔ وہ
بنا اس کو چھیڑے خاموشی سے نماز ادا کر کے سو گیا تھا۔ وہ
شاید اسے تھوڑا ٹائم دینا چاہتا تھا کیونکہ رات کے وقت رائم
خان نے اپنی شدتیں اس کے نازک وجود پہ لٹانے میں کوئی کسر
نہیں چھوڑی تھی۔ وہ جتنا شدت پسند ہوا تھا بعد میں اتنی ہی
کئیر کر کے انزش کے وجود کو درد سے ریلیف دی تھی۔

وہ اب کافی پرسکون محسوس کر رہی تھی۔ اس لئے تو اس کو نیند
نہیں آرہی تھی۔ وہ ایسے ہی سونے کی بجائے رائم خان کو جی
بھر کے دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ دیکھ کے انزش کو اپنا وجود اس

کائنات کا سب سے قیمتی اور نایاب وجود لگ رہا تھا کیونکہ اس کو
پانے کیلئے وہ تین راتیں مسلسل رویا تھا۔ وہ رب کے حضور
گڑ گڑایا تھا۔ اس نے انزس کو اپنی دعاؤں کی برکت اور خون
کے آنسو بہا کے پایا تھا۔

وہ نرمی سے اپنا چہرہ اوپر کی طرف کرتی محبت سے اس کی بیڑی پہ
لب رکھ کے چھپھٹنے ہی والی تھی جب رائم خان اس کے
لبوں پہ جھک کر بالائی لب کو اپنے دانتوں میں دبوچ گیا۔
انزس کی آنکھیں پھیلی تھیں۔۔۔ تو کیا وہ سو نہیں رہا تھا؟۔۔
انزس نے بے ساختہ سوچتے ہوئے رائم خان کی بند آنکھوں کی
طرف دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں ہنوز بند تھیں لیکن چہرے پہ
شرارتی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ وہ اس کو مسکراتے دیکھ کر
شرم سے اپنا لب چھڑوانے کی سعی کرنے لگی تھی مگر رائم خان

اس کی پچھلی گردن پہ ہاتھ رکھ کے اس کو مکمل خود پہ جھکا گیا تھا

-

وہ آنکھیں کھولے دوسرے ہاتھ سے اس کا جبراً دبوچ کر ڈپلی کس کرنے لگا تھا۔ انزہ نے جھپٹاتے ہوئے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی تھی مگر وہ رائم خان ہی کیا جو اپنی گرفت سے اتنی آسانی سے آزادی دے جائے؟

وہ بے باکی سے اپنے منہ کی ساری نمی انزہ کے منہ میں اندیل کے واپس سک کرتا، شدت سے اس کے لبوں کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہوئے اپنا سر تکیے سے اوپر اٹھا چکا تھا۔ وہ قطرہ قطرہ کر کے اس کے لبوں کو سک کرتا انزہ کی سانسیں گھوٹنے لگا تھا۔ انزہ نے اس کی بڑھتی جسارتوں اور شدت پر جھنجھلاتے ہوئے اس کے سینے پہ اپنے دونوں ہاتھ رکھ کے اپنا منہ چھپ کرنا

چاہا لیکن رائم خان اس کو اپنی نیند سے بھری کر سٹل گرے
آنکھوں سے ساتھ دینے کا اشارہ کرنے لگا۔

انزش نے اس کو گھوریوں سے نوازا۔ وہ اس کی گھوریوں کی
پرواہ کئے بغیر اپنا ہاتھ اس کے جبرے سے ہٹا کے اس کے سینے
پر رکھتے ہوئے زور سے اس کی نازک ساخت کو اپنی مٹھی میں
جکڑے دبانے لگا تھا۔

اس کی طرف سے کی گئی اچانک جسارت پہ انزش کی درد سر کراہ
نکلی تھی مگر وہ کراہ منہ میں ہی دم توڑ گئی کیونکہ رائم خان سخت
پہرے دار کی طرح اس کے لبوں کی حدود پہ قابض تھا۔
اپنی دھڑکنیں اور لب اسکے دانتوں کی گرفت میں دیکھ کر انزش
نے درد سے کلس کر اپنی پوری قوت لگا کر رائم خان کے لبوں کو
اپنے دانتوں تلے دباتی مسلنے لگی تھی۔ پہلے تو اس کی حرکت

بھلی لگی تھی وہ مسکرایا تھا مگر بعد میں اپنے لبوں کو زخمی ہوتا
دیکھ کے اس نے درد سے آنکھیں میچتے ہوئے اپنے ہاتھ کا دباؤ
انزس کی نازک ساخت پہ بڑھایا تھا۔ اپنے دل کے مقام پہ اٹھتا
درد محسوس کرتے ہی انزس فوراً اس کے لبوں کو چھوڑ گئی
تھی۔ لبوں کو آزادی ملتے ہی رائم خان تیزی سے سرچھپ کر گیا۔
اہہ! ظالم بیوی! میرے ہونٹ زخمی کر دیئے۔۔۔ رائم خان
اپنے نچلے لب سے زرا سا رستا خون انگوٹھے سے صاف کرتا
مصنوعی خفگی سے شکوہ کرنے لگا۔

آپ چھپ ہی نہیں ہٹ رہے تھے، میں کیا کرتی؟ میری سانس بند
ہو رہی تھی۔۔۔۔ اس نے اس کے ہونٹ سے خون نکلتا
دیکھ کے شرمندگی سے نگاہیں جھکالی تھیں۔ خیر وار تو انزس بھی
بہت ظالم کرتی تھی۔

سوئی کیوں نہیں ابھی تک؟۔۔۔ اسے شرمندہ ہوتے دیکھ کر وہ
اپنے دونوں ہاتھوں کا حصار اس کے گرد باندھتا اپنے سینے پہ
منتقل کرتے ہوئے نرمی سے پوچھنے لگا۔

نیند نہیں آرہی تھی۔ مجھے بے وقت نیند نہیں آتی۔ ٹائم پہ آتی
ہے، اگر نیند کا ٹائم گزر جائے تو پھر پوری پوری رات ایسے ہی
گزر جاتی ہے اور نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور رہتی
ہے۔۔۔ وہ اس کے سینے پہ سر ٹکاتی اپنی پھولی سانسوں کو ہموار
کرنے لگی تھی۔ رائم خان اس کی سانسوں کی چراتا تھا جنہیں
واپس بحال کرنے کیلئے اسے دو سے تین منٹ لگ جاتے
تھے۔

تو تم مجھے بتا دیتی ہم مل کر وہ وقت پیار کرنے میں گزار دیتے،
ایسے ہی میرا آدھا گھنٹہ ضائع کیا! میں تو اس لئے خاموش تھا کہ تم

سو رہی ہو۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ میری بیوی کی ابھی طلب باقی ہے
تو میں ہرگز نہ سوتا۔۔۔ رائم خان اپنی کرسٹل گرے آنکھیں
گھوماتا شرارت سے بولتے ہوئے انزس کے گال پہ دانت گاڑھ
گیا۔

جی نہیں مجھے کوئی طلب نہیں ہے اور ویسے بھی آپ کونسا سو
رہے تھے؟ چپکے سے مجھے ہی دیکھے رہے تھے۔۔۔ وہ بھی جواباً
اس کی گردن پہ دانت گاڑھتی ناک سکوڑتے ہوئے بولی۔
قلبِ راحت! تم مجھ سے کبھی دور تو نہیں جاؤ گی؟۔۔۔ رائم
خان ایک دم سنجیدہ ہوتا پر سوچ انداز میں بولا تھا۔
خان! میں آپ سے دور کیوں جاؤں گی بھلا؟ کچھ ہوا ہے
کیا؟۔۔۔ وہ اس کے لہجے کا سنجیدہ پن محسوس کرتی اپنا سر اوپر
اٹھا کے اسے دیکھنے لگی۔

کچھ نہیں ہوا!! ایسے ہی پوچھ رہا تھا کیونکہ تم سے دوری کا تصور
ایک لمحے میں ہی میری رگوں میں بہتا خون منجمد کر دیتا ہے۔
پلیز! مجھے کبھی چھوڑ کے مت جانا۔ ہر حالات میں میرے ساتھ
رہنا، میں تمہیں پا کے بالکل بھی کھونا نہیں چاہتا ہوں، تمہیں
کھونا میرے لئے موت کے مترادف ہے۔ پہلی بات تمہیں
زندگی میں مجھے سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ اگر پھر بھی
خدا نخواستہ کبھی ہمارے درمیان چھوٹے موٹے اختلافات
بنے تو ہم بات کر کے سلجھا لیں گے لیکن تم مجھے خود سے دور
مت کرنا۔ تم سے دوری کا سوچتے ہی میں فنا ہونے کے درپے
ہو جاتا ہوں۔۔ میں نے تمہیں بہت مشکلوں سے پایا ہے!!
اور اب میں ڈرتا ہوں، میری محبت کو کسی گندی نظر نہ لگ
جائے اور وہ تمہیں مجھ سے چھین نہ لے۔۔ وہ اس کے گرد

اپنے ہاتھوں کی گرفت سخت کرتا اس کو کسی قیمتی اثاثے کی طرح اپنے سینے میں بھینچے، اپنے دماغ میں پلتے خدشات سے آگاہ کر گیا تھا۔

شش! آج تو آپ نے یہ بات کر دی ہے! آئندہ مت کیجئے گا۔
حالات چاہے جیسے بھی ہو، میں کبھی بھی آپ کا ہاتھ نہیں چھوڑوں گی، ہاں میں آپ سے لڑوں گی، ناراض ہوں جاؤں گی۔۔۔ ضرورت پڑنے پر آپ کی ٹیونگ بھی کروں گی لیکن آپ کو کبھی چھوڑوں گی نہیں۔ ہمارے درمیان جو رشتہ ہے اس کی خوبصورتی اور مضبوطی ہی ایسی پر تاثیر ہے کہ ہم ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔ آپ نے ہی تو کہا تھا کہ ہمارے ملن سے ایک نیا وجود تخلیق ہوگا، اس میں روح میری ہوگی اور جسم آپ کا ہوگا، تو پھر آپ مجھے بتائیں روح جسم کے بغیر رہ

سکتی ہے؟ اور باقی جہاں تک رہی گندی نظر لگانے والوں کی
بات تو آپ اپنی سر پھری بیوی کو اچھی طرح سے جانتے تو
ہیں۔۔۔ وہ ایسے لوگوں کی آنکھیں نکال کے کس طرح ہتھیلی پہ
رکھتی ہے؟۔۔۔ انرش اس کی گلے کی ہڈی پہ انگلی پھیرتی اس کی
کر سٹل گرے آنکھوں میں جھانکتے ہوئے یقین دہانی کرواتی آخر
میں اپنے ازلی انداز میں گویا ہوئی۔

ہاہاہا! قلبِ راحت!! میں جانتا ہوں تم کیسے لوگوں کی آنکھیں نکال
کے مسل دیتی ہو۔ اس معاملے تو تم بہت سوچ سکتی ہو۔ اینڈ آئی
لو یور سویگ! لیکن ہاں! تم میری ٹیونگ ابھی نہیں کر سکتی کیونکہ
ٹیونگ کرنے کیلئے ٹیونگ کی ٹرس سیکھنی بہت ضروری ہوتی
ہے جو کہ میں ابھی تمہاری کر کے سیکھانے والا ہوں۔۔۔۔
رائم اس کی بات سنتا قہقہہ لگا کے ہنس دیا۔ وہ ایک جست میں

اسے اپنے نیچے منتقل کرتا زو معنی انداز میں بولا تھا۔ اس کے
لبوں پہ کمینی سی مسکراہٹ دوڑ رہی تھی۔
نہیں! مجھے ٹیونگ کرنا آتی ہے۔ مجھے سیکھنے کی ضرورت نہیں،
چھوڑیں مجھے شام کے فنکشن کیلئے بہت سی تیاریاں کرنی
ہیں۔۔۔ وہ اس کی آنکھوں میں چھائے خمار کی سرخی اور اس کی
نیت بھانپ کر فوراً بولی۔ وہ اس کے سینے پہ ہاتھ جما کے اس
کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

قلبِ راحت! ولیمہ شام کو ہے۔ ابھی تو اٹھ بج رہے ہیں!
بہت ٹائم ہے ہمارے پاس تمہیں ٹیونگ سیکھانے کیلئے۔۔۔
وہ اپنی مسکراہٹ ضبط کرتا ایک جست میں انزس کی شرٹ اور
اس کی گداز دھڑکنوں کو ہر پردے سے آزاد کر گیا تھا۔ وہ اس

وقت سادہ سے آرام دہ شلوار قمیض میں ملبوس تھی جبکہ وہ
گرے ٹروازر شرٹ پہنے ہوئے تھا۔

وہ تھوڑا سا اوپر اٹھ کے خود کو بھی ہر پردے کے بوجھ سے بے
نیاز کرتا پیا سوں کی طرح انزش کے سینے کے تل پہ جھکتا اپنے ہاتھ
میں اس ابھری ساخت کو بھرے لبوں اور دانتوں کے نشانات
ثبت کرنے لگا۔ وہ شدت پسند ہوتا اس کے سینے کی حساسیت
کو اپنے لبوں میں دبا کے کھینچتا جنونی ہو رہا تھا۔

سس! رائم! آپ اس تل کے ساتھ ساتھ میرا نام و نشان بھی
مٹا کے چھوڑیں گے کیا؟۔۔۔ انزش اپنے سینے پہ جلن محسوس
کرتی سسکتے ہوئے بولی تھی۔

وہ رات سے ہی اس کے سینے کے تل کا دشمن بنا ہوا تھا۔ اس
تل کی وجہ سے کئی بار انزش کو بلا وجہ درد سہنا پڑا تھا۔ یہ تل تو
انزش کا دشمن ثابت ہو رہا تھا۔

میں کیا کروں؟ قلبِ راحت! تمہارے سینے کا تل مجھے خود ہی
اپنی طرف کھینچتا ہے۔ میں اس پہرے دار کو تمہارے سینے کی
ناز کی پہ بیٹھا دیکھ کے پاگل ہو جاتا ہوں۔ باقی یہ میرے لبوں اور
دانتوں کے لمس سے مٹے گا تو نہیں لیکن چمکے گا ضرور!۔۔۔
رائم خان اس کے سینے سے سراٹھا کے اس کی ٹھوڑی چومتے
ہوئے بولا تھا۔ وہ چھپے ہٹ کے انزش کے پیٹ کی سکن
سک کرتے ہوئے اس پہ اپنی بیئر ڈر گڑنے لگا تھا۔۔

ہاہا! خان نہیں کریں! مجھے گدگدی ہو رہی ہے۔۔۔ وہ اس کی حرکت پہ کھلکھلا کے ہنستی اس کے بالوں میں انگلیاں الجھائے اسے روکنے لگی تھی۔

رائم خان اس کی جلت رنگ ہنسی دیکھتا، دو تین بار اپنی حرکت دہرا کے اس کی ہنسی اپنی آنکھوں اور کانوں میں محفوظ کرنے لگا تھا۔ وہ کافی دیر تک اس بوس و کنار کرنے کے بعد چھپے اٹھ کے بیٹھا تھا۔۔

تھوڑا سا اوپر اٹھو! رائم خان اس کے ٹراؤزریں ہاتھ الجھاتا انزش کو بھاری گھمبیر آواز میں حکم دینے لگا۔

خان! ہم لیٹ ہو جائیں گے۔۔۔ انزش نے شرم اور خوف سے آنکھیں میچ کر جھجھکتے ہوئے آخری بار اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔

قلبِ راحت! تھوڑا سا اوپر اٹھو! ابھی تقریب میں بہت ٹائم ہے، میں رات تک ویٹ نہیں کر سکتا۔۔۔ وہ حکمیہ لہجے میں گویا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں خمار کی سرخی گہری ہوئی تھی۔ اس کے جذبات بھرکانے والی انزس خود تھی ورنہ وہ تو سونے کا ارادہ باندھے ہوئے تھا۔

اس کا حکمیہ لہجہ دیکھ کر اس نے تھوک نگلتے ہوئے اپنی کمر تھوڑی سی اوپر اٹھائی تھی اور اگلے ہی لمحے وہ اس کا ٹروازر اس کی ٹانگوں سے نکال کر زمین بوس کر گیا تھا۔

وہ بے چینی سے اس میں ایڈجسٹ ہونے لگا۔ کمرے میں مدہم روشنی تھی لیکن پھر بھی انزس شرم اور ڈر سے خود میں سمٹی تھی۔۔۔

رائم خان اس کے مزید قریب ہوتا اپنا وجود اس کے نازک وجود
کے ساتھ جوڑ کے مس کرنے لگا تھا۔۔

اس کا بے باک لمس محسوس کرتے ہی انزس پھر پھڑا کے چھپ
ہٹی تھی لیکن رائم خان اس کو تھائیز سے جکڑ گیا۔

بھروسہ رکھو! اب درد نہیں ہوگا۔۔۔ وہ بے باکی سے دو تین بار
اپنا لمس اس کی تھائیز کے درمیان گردش کرواتا گھمبیر آواز میں
بولا تھا۔ وہ آگے جھک کر گھٹنے کے بل ہوتا اپنا آپ ایک دم
انزس میں منتقل کر گیا تھا۔ اس کے جان لیوا لمس پہ کراہتے
ہوئے انزس نے اس کے کندھوں پہ اپنے ناخن پیوست کئے
تھے۔ رائم خان اس کے ماتھے پہ لب رکھتا اپنی حرکت میں تیزی
لانے لگا۔ وہ اس کی دونوں ٹانگوں کو پنڈلیوں سے پکڑ کر اس میں
آخری حد تک سمایا تھا۔

اہہ!! رائم۔۔۔ انزش نے سسکتے ہوئے اس کو کمر سے پکڑا
تھا۔۔۔ وہ اس کی گردن پہ دانت گاڑھے مزید جنونی ہوا تھا۔ وہ
خود کو برق رفتاری سے حرکت دینے لگا۔

انزش اس کی جان لیوا قربت میں میٹھی سسکاریاں بھرتی اسے
سہن کرنے لگی تھی۔ رائم خان اس کی رقصاں دھڑکنوں کو
مٹھیوں میں جکڑ کر دباتا اس کے لبوں کو اپنی گرفت میں لیتا اس
کی سسکیوں کا دم گھوٹنے لگا۔

رائم خان کا ہر ایکٹ درد اور شدت سے بھرپور تھا۔ انزش اس
کا دیا ہوا میٹھا درد برداشت کرتی اسے خود میں گھلتا محسوس کرتی
اس کے ساتھ مدہوش ہوتی چلی گئی تھی۔

اور اس مدہوشی سے شاید ہی وہ دونوں جلدی باہر نکل پائیں۔۔۔

داعیر! پلیزاب نہیں ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔۔ مہرو اس
وقت آئینے کے سامنے کھڑی کوئی چوتھی بار اپنے لبوں پہ لب
اسٹک لگا رہی تھی لیکن ہر بار لب اسٹک لگانے کے بعد داعیر
خان بے خود ہو کے اس کے لبوں پہ جھک کر ساری لب
اسٹک کھا جاتا تھا۔

وہ انزس اور زربخت کے ساتھ پارلر سے تیار ہو کے آئی تھی
اور جب سے آئی تھی، وہ اس کی جان دشمن بنا اسے کمرے سے
باہر ہی نہیں جانے دے رہا تھا۔

نور چشم! بس آخری بار پھر اس کے بعد پرایس تمہاری لب
اسٹک خراب نہیں کروں گا۔۔۔ داعیر خان اس کو چھپے سے پکڑ
اس کے گال کے ساتھ اپنا گال مس کرتا فرمائشی انداز میں بولا
تھا۔ اسے اس کو تنگ کرنے میں مزہ آرہا تھا۔

بلکل بھی نہیں! پچھلے پندرہ منٹوں سے آپ کا ایک بار ختم ہی نہیں ہو رہا۔ سارے مہمان باہر آ گئے ہیں۔ ہمیں اب باہر چلنا چاہئیے۔۔ مہرو اس کے حصار سے نکلنے کی کوشش کرتی اسے سختی سے ٹوکنے لگی۔ داعیر کا بس نہیں چل رہا تھا، ولیمے کی تقریب کو بھاڑ میں جھونک کے اس کو اپنے سخت پر حدت حصار کی قید میں کر لگ، اس کا نکھرتا روپ بار بار اس کو بہکا رہا تھا۔ اس نے سیم انزش اور زربخت کے ساتھ کی ٹی گرین کلر میں میکسی زیب تن کر رکھی تھی۔۔ ہاں البتہ اس کی انزش اور زربخت کی نسبت میکسی تھوڑی لائٹ ویٹ تھی جبکہ ان دونوں کی ہیوی نفیس کام سے بھری ہوئی تھی۔

مہرو اس خوبصورت سی میکسی میں اپنے پرکشش پٹھانی نقوش
اور کر سٹل گرے آنکھوں کے ساتھ اس قدر حسین لگ رہی
تھی کہ داعیر خان کا دل بار بار اس کو دیکھ کے للچا رہا تھا۔
داعیر بھی کچھ کم نہیں لگ رہا تھا، وہ سبج گرین شلوار قمیض میں
ملبوس گلے میں شال لئے اپنے وجہیہ نقوش کے ساتھ جاذب
نظر لگ رہا تھا۔

ٹھیک ہے! تم جاؤ، مہمانوں کو ٹائم دو۔۔۔ اسے اپنے جذبات
سے زیادہ مہمانوں کی فکر کرتے دیکھ کے وہ خفگی جتاتے ہوئے
فاصلہ قائم کرنے لگا۔

اچھا! اوکے کر لیں لیکن صرف گال پہ!۔۔۔ اسے ڈرامے بازی
کرتے دیکھ کے مہرو نے ناک چڑھا کے اپنا گال آگے کیا تھا
جس پہ مسکراہٹ دبا کر نرمی سے اس کے گال پہ ہونٹ ثبت

کرتا بے اختیاری میں پھر سے اس کے لبوں پہ جھک کر ان کو
چومنے لگا تھا۔

ابھی وہ شدت اختیار کرتا کہ مہرو نے اس کے سینے پہ ہاتھ رکھتے
ہوئے اسے ہوش دلائی تھی۔۔۔ داعیر خان جو کہ آنکھیں
موندے اب مہرو کے چاشنی بھرے لبوں سے مسرور ہونے
لگا تھا۔ اپنے سینے پہ مہرو کے ہاتھوں کو دباؤ محسوس کر کے فوراً
آنکھیں کھول گیا۔

وہ مہرو کی آنکھیں میں غصے کی لکیر پڑھتا شرارت سے مسکراتے
ہوئے ناچاہتے ہوئے بھی اس کے لبوں کو چھوڑ گیا تھا۔
اب اگر وہ مہرو کی لب اسٹک کا بیڑہ غرق کرتا تو اس نے پکا
ناراض ہو جانا تھا۔ اور پھر اس کو منانا داعیر خان کیلئے مشکل

ہو جانا تھا۔ اسلئے داعیر خان اپنی خواہش کو مارتا تا بعد اری سے
اس کے لبوں کو چھوڑ گیا تھا۔

تقریب ختم ہونے تک کا ویٹ کر لیں پھر جتنی مرضی کسز کرنی
ہوں، کر لیجئے میں نہیں روکوں گی۔۔۔ اس کی اداس شکل دیکھ
کر وہ ڈریسنگ ٹیبل سے ٹیشو اٹھاتی نرمی سے اس کے لبوں پہ
کس کرنے کی وجہ سے لگی لب اسٹک صاف کرتے ہوئے
مفاہمتی انداز میں بولی تھی۔

داعیر خان کے ہونٹوں سے لب اسٹک صاف کرنے کے بعد وہ
نرمی سے اس کی بیئرڈ پہ لب رکھ گئی تھی کیونکہ وہ اس کا اداس
چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

او کے!! پھر تم بھی مجھے میری مرضی کے مطابق کس کرو گی،
جتنی دفعہ میں کہوں گا اتنی دفعہ کرو گی۔۔۔ وہ اسکی دلفریب
جسارت پہ مسرور ہوتا شرطاً گویا ہوا۔

وہ اپنے جذبات کی تسکین کیلئے اب اپنی بیوی کی تیاری اور اس کی
تقریب کیلئے خوشی غارت نہیں کر سکتا تھا۔ اسلئے ڈیل کرتے
ہوئے اپنے جذبات کو لگام ڈال دی کیونکہ وہ پہلے ہی مہر و کو کافی
زیادہ تنگ کر چکا تھا۔

او کے ڈیل!۔۔۔ مہر و اس کی شال درست کرتی مسکرا کے
بولی۔

آئی لویو سو مچ نور چشم!!۔۔۔ داعیر خان اس کے اتنی جلدی
مان جانے پر خوشی سے سرشار ہوتا اس کے ماتھے پہ لب رکھے
اس کو اپنے ساتھ لئے باہر کی جانب بڑھا تھا۔

لویو مور!۔۔۔ مہرو اس کے ہمراہ چلتی سیڑھیاں اترنے تک
اس کے سینے سے لگ گئی تھی۔ وہ اس کی ہمسفر بن کر بے
تحاشا خوش تھی۔

ولیمے کی تقریب دمیر خان کی حویلی میں ہی مشترکہ طور منعقد کی
گئی تھی کیونکہ آج رائم انزس کے ساتھ دمیر اور زربخت
کی ولیمے کی تقریب بھی تھی۔ دمیر خان کا نکاح ہنگامی حالات
میں ہوا تھا اور پھر نزہت خان کی بیماری اور ان کی وفات کی بعد
اس کی ولیمے کی تقریب اس ٹائم پہ کرنا ناممکن ہو گئی تھی۔ اب
انیسہ خان نے اپنے بڑے بیٹے کی خوشیوں کو سیلیبریٹ کرنے
کی خواہش اسد اللہ خان سے ظاہر کی تو وہ بھی اسے انکار کئے بنا
نہ رہ پائے اور دمیر خان سے مشورے کے بعد انہوں نے رائم

خان اور اس کا ولیمہ اکھٹا کرنے کا سوچ لیا تھا۔ اور ویسے بھی
دمیر خان کے سارے دوست اسے شادی کی باقاعدہ طور پر کوئی
نہ کوئی تقریب اٹینڈ کر کے ہی مبارک دینا چاہتے تھے تو اس لئے
وہ بھی آسانی سے مان گیا تھا۔

اس تقریب کیلئے زربخت کا دل بالکل بھی نہیں تھا مگر وہ پھر انکار
کر کے انیسہ خان کی اور باقی سب کی خوشی غارت نہیں کرنا
چاہتی تھی۔ ابھی تو انیسہ خان کا زربخت کے ساتھ رویہ اچھا
ہوا تھا، وہ اپنی کسی بھی نافرمانی سے ان کا دل خود سے بدگمان
نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے فضول کے وہموں کو جھٹکے ہوئے
سب گھر والوں کی خوشی سر آنکھوں پہ رکھ گئی تھی۔

باقی جہاں تک رہی نزہت خان کے جانے کی بات۔۔۔ تو وہ غم تو
زربخت کے خساروں میں زندگی بھر اس کے ساتھ چلنا تھا۔

خوشی اور غمی کے ہر موقع پہ اپنی ماں کی کمی محسوس کر کے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگنی تھی۔

ہم اپنی خوشیاں غارت کر کے مردوں کو واپس نہیں لاسکتے، ہاں مگر اپنی خوشیاں ٹھکرا کر خود مردوں میں شامل ہو سکتے ہیں۔ پوری حویلی کا لان ولیمے کی تقریب کی مناسبت سے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ اسٹیج سفید اور گلابی پھولوں سے سجایا گیا تھا۔۔ پس منظر پہ دمیر خان کی زربخت کے ساتھ اور رائم خان کی انرش کے ساتھ، مسکراتی پینٹڈ فوٹوز مقیموں کی روشنی میں جگمگا رہی تھی۔۔

مردوں اور عورتوں کا انتظام علیحدہ کیا گیا تھا۔۔ صرف عورتوں والی سائیڈ اسٹیج بنایا گیا تھا جبکہ مردوں والی سائیڈ جسٹ بیٹھنے اور کھانا کھانے کیلئے چیرز اور ٹیبل لگے ہوئے تھے۔

بھا بھی! اب آپ کو پتہ چل گیا ہے، رات کو مجھ کیسے کاٹتا ہے؟
میری دفعہ تو آپ لوگوں نے بڑی تشویش کی تھی۔ آج زرا آپ
ہمیں بھی دیکھائیں۔۔ کہاں کہاں نشانات دئے ہیں آپ کو
مجھ۔۔۔۔۔ آئی مین میرے لالانے!۔۔۔۔۔ مہرو کن اکھیوں سے
زربخت کو دیکھتی زو معنی انداز میں انزش سے مخاطب ہوئی
تھی۔

مہرو کا سوال سنتے ہی، علیزے، دعا، شانزے اور باقی سٹیج پہ
موجود انزش کی دوستیں اس کی طرف جواب کیلئے متوجہ ہوئی
تھی۔۔۔

سب کے چہروں پہ ایک کمینی سی مسکراہٹ رقصاں ہوئی
تھی۔

انزس اور زربخت دونوں سٹج پہ ولیمے کی مناسبت سے سچی
سنوری حوروں کا گمان دے رہی تھی۔ ان دونوں نے اس
وقت باٹل گرین کلر کی میکسی زیب تن کر رکھی تھی جن پہ
ہیوی تھری ڈی ورک پر لڑکے ساتھ نہایت ہی نفاست اور
سلیقے مندی سے کیا گیا تھا۔ وہ دونوں میچنگ جیولری، لائٹ
سے میک اپ اور اپنے اپنے اٹریکٹو نقوش کے ساتھ بے حد
حسین لگ رہی تھیں۔

ہاں نہ یہ دیکھو! بہت نشانات دئے ہیں تمہارے لالانے، جان
ہی نہیں چھوڑ رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ تمہارے ہونٹ بہت
رسیلے ہیں، تمہاری تھائیز بہت سوفٹ اینڈ فلفی ہیں، تمہاری کمر
بہت لچکیلی ہے۔ اف!... تمہارے سینے کا قاتل تل۔۔۔۔۔

بھا بھی۔۔۔۔ انزش اپنے گلے سے تھوڑا سا ایمرائیڈ دوپٹہ ہٹا
کے اپنی گردن پہ ثبت رائم خان کے دانتوں کے نشانات دیکھاتی
بے باکی سے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبائے بنا بریک کے بولتی
جا رہی تھی جب اس کی بے باکیوں کی تاب نہ لاتے ہوئے مہرو
چلائی تھی۔

انزش کی باتیں سن کے نہ صرف مہرو بلکہ زربخت اور ساتھ بیٹھی
ایزل شاہ کا چہرہ بھی شرم سے سرخ ہوا تھا جبکہ شانزے اور دعا
کے لب معنی خیز گہری مسکراہٹ میں ڈھلے تھے۔

مہرو نے تو ایسے ہی اسے چھیڑنے کیلئے سوال کیا تھا لیکن انزش
تو گزری رات کا پورا واقعہ کھول کے بیٹھ گئی تھی۔ وہ اپنی باتوں
سے کہیں سے بھی ایک رات کی دلہن نہیں لگ رہی تھی۔ مہرو
کو لگا تھا وہ ایسی باتیں کر کے انزش کو شرمندگی سے منہ چھپانے

پر مجبور کر دے گی جیسے وہ زربخت کو کر دیتی تھی مگر وہ بھول
گئی تھی اب اس کے سامنے معصوم زربخت نہیں بلکہ بے
باک انزس ہے۔

توبہ بھابھی! آپ تو پوری رات کی گزری فلم سنانے لگ گئی
ہیں۔۔۔ ایزل شاہ شرمندگی اور سنجیدگی کے ملے جلے تاثرات
سے ناک سکوڑ کے بولی، وہ تو بے باکی میں میرال سے بھی دو
ہاتھ آگے لگ رہی تھی۔

ہاہاہا! آپ! آپ کو فلم آڈیو میں نہیں سننی تو ہماری انزی آپ کو
ساتھ میں لائیو ویڈیو بھی دیکھا دے گی۔۔۔ کیوں انزی!؟۔۔۔
شانزے دعا کے ہاتھ پہ ہاتھ مارتی قہقہہ لگاتے ہوئے انزس سے
مخاطب ہوئی تھی۔

ہاں مجھے کوئی مسئلہ نہیں میں انہیں اپنی لائیو رومینس پر فارمینس
تو دیکھا دوں، بشرط یہ کہ دونوں شریف زادیاں شرم سے بے
ہوش نہ ہو جائیں؟۔۔۔ وہ جواباً ایزل اور مہرو کی طرف اشارہ
کرتی شانزے کی بات پہ متفق نظر آئی۔۔

توبہ!! توبہ!! کیسا زمانہ آگیا ہے۔ تھوڑی سی تو شرم کر لو۔۔۔
ایزل شرم سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ بولتی انزس کو دیکھ
کے رہ گئی جو اس قدر آزاد خیال تھی کہ اپنا رومینس لائیو
دیکھانے پہ رضامند ہو گئی؟

کیا توبہ؟ بھئی میری شادی تو ابھی کل ہوئی ہے! میں نے صرف
ایک رات گزارا ہے اور زربخت نے بھی بہت کم ٹائم اپنے
میاں کے ساتھ گزارا ہے تو اس حساب سے ہمارے وجود پہ
نشانات کا ہونا بنتا ہے کیونکہ ہم ابھی نئی نئی اپنے شوہروں کو ملی

ہیں۔ تو اس وجہ سے ان کا ہمارے وجود پہ نشانات چھوڑنا،
ہمیں اپنی قربت میں پگھلا کے لذت کی بلندیوں تک لے جانا، ہم
میں اتر کے سکون کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے ہمیں اپنے
ساتھ مدہوش کرنا تو بنتا ہے لیکن تم دونوں کی گردنیں کس خوشی
میں نشانات سے بھری ہوئی ہیں؟ مہرو! تمہاری شادی کو تین
مہینے ہونے والے ہیں اور ایزل بی بی! تمہارے تو دو بچے بھی
ہو گئے ہیں۔۔۔ تم دونوں تو نہ توبہ کر رہی ہو، نہ تم دونوں کی
طلب پوری ہو رہی ہے۔ حوسی عورتوں!! اور ہمیں نئی نویلی
دلہنوں کو توبہ کا قاعدہ پڑھاتے ہوئے شرم نہیں آرہی؟۔۔۔۔۔
انزس اپنی تیز نظر سے ایزل شاہ اور مہرو کی گردن پہ میک اپ
سے چھپے ہلکے ثبت دانتوں کے نشانات دیکھ کر انہیں شرم
دلاتے ہوئے بولتی بے باکی کی انتہا کر گئی تھی۔

اس کی بات سنتے ہی مہرو اور ایزل شاہ نے سٹپٹاتے ہوئے
اپنے اپنے دوپٹے درست کئے۔ دونوں کے چہرے شرم سے
لال سرخ ہو گئے۔ ایزل شاہ تو شرم سے زمین میں دھنس گئی
کیونکہ ساتھ میں دو بچوں کا بھی طعنہ ملا تھا اور اس کے شاہ جی
تیسرے کی پلاننگ کرنے سے ہار نہیں مان رہے تھے، وہ تو اس
نے احتیاطاً روک رہا تھا۔ شانزے، دعا اور علیزے کے ساتھ
انزہ کا سیویج ریپلائے سنتے ہی باقی سب لڑکیوں کا مشترکہ قہقہہ
لان کی زینت بنا تھا جبکہ زربخت اس کی باتوں کی تاب نہ لاتے
ہوئے شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی۔ وہ اپنی گردن نیچے
جھکائے معصومیت سے انگلیاں مروڑنے لگی تھی۔

اسے انزس کی باتوں سے دمیر خان کی بے شرمیاں اور جنونی پن یاد آرہا تھا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہی اس کا چہرہ شرم سے گردن میں دھنس گیا تھا۔

لالا کے سامنے اتنی بے باکیاں کر کے دیکھائیں تو میں آپ کو مانوں!۔۔۔ مہرو اپنے شرمندہ تاثرات کنٹرول کرتی سب کو ہنستے دیکھ کر اپنے لفظوں کا دفاع کرنے لگی تھی۔

اگر میں نے بے باکیاں دیکھائی نہ تو باخدا!۔۔۔ تمہارے لالا اگلے دن دل کے عارضے میں مبتلا ہو کر تمہیں ہاسپٹل میں ملیں گے اور میں اپنے نئے نویلے دلہے کو اتنی جلدی اپنی اداؤں سے لبھا کے ہاسپٹل نہیں پہنچا چاہتی۔۔۔ ننھا سادل ہے تمہارے لالا کا، وہ میری بے باکیاں اور ادائیں برداشت نہیں کر پائیں گے۔ خیر تم دونوں میرا چھوڑو!! اپنی تھائیز دیکھاؤ، تم دونوں کی ادائیں

تو بہت ان کو لہراتی ہونگی۔۔ میں گارنٹی سے کہہ سکتی ہوں، تم دونوں کی گردنوں سے زیادہ ان کی شدتوں کی سوغاتیں تھائیز بہت ہوں گی۔ آخر کو تم دونوں ان کو اپنی اداؤں سے ہر رات اکساتی جو رہتی ہو۔۔۔ انزس پھر سے مہرو اور ایزل کو اپنی طرف متوجہ کرواتی بے شرمی سے مزید بولتے ہوئے دونوں کو منہ کھولنے پہ مجبور کر گئی تھی۔ دونوں نے بے یقینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کے نگاہوں کا تبادلہ کیا۔

تبادلہ خیال کرنا بند کرو! تم دونوں کی تھائیز بہت نشانات زیادہ ہے نہ! میں سچ بول رہی تھی نہ؟ چلو تم دونوں اندر چلو، مجھے اپنی تھائیز کی نشانات دیکھاؤ پھر میں بتاؤ گی تم میں سے کون زیادہ ادائیں دیکھاتی ہے؟۔۔۔ انزس ان دونوں کو پھر سے زو معنی نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے سوال کی تصدیق چاہی۔۔۔ سب

لڑکیاں انزس کی بے باک باتوں سے محظوظ ہو رہی تھی
۔ سوائے زربخت کے کیونکہ وہ شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی۔
استغفرلہ! بھابھی! بے شرمی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔۔۔
مہرو اپنے شرم سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ اس کو گھورتی
، پیرٹکتے ہوئے سٹیج سے نیچے اتری تھی۔۔۔

آپ تو بے شرمی میں میرال آپی سے بھی دو ہاتھ آگے
ہیں۔۔۔ ایزل بھی خفگی سے اسٹیج سے اترتی مہرو کے ہمقدم ہوئی
تھی۔ ان دونوں کیلئے انزس کی بے باک باتیں ہضم کرنا مشکل
ہو رہا تھا۔

ارے سنو تو! میری حسیناؤں! رک جاؤ، نہیں لیتے ہم آپ سے
آپ کی اداؤں کا حساب!۔۔۔ انزس نے اپنی ہنسی ضبط کرتے
ہوئے دونوں کو ہانک لگائی لیکن وہ دونوں اس کی سنی ان سنی

کرتی جا کے منت کے ساتھ بیٹھ چکی تھیں جو پھولوں کے
گلدستوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ ان کے یوں بھاگنے والے
انداز پہ ایک دفعہ پھر سے سب لڑکیوں کا دلکش قہقہ فضا میں
گوںجا تھا۔ زربخت ابھی تک شرمندگی سے نگاہیں جھکائی ہوئی تھی

-

ارے زربخت! میرا بچہ میں تیرے نشانات نہیں دیکھوں گی، تم
پریشان نہیں ہو۔۔۔ انرش نے پریشان اور شرمیلیں ہوتی
زربخت کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے پیار سے پچکارا تھا جو شرم
کے مارے کنفیوز ہو رہی تھی۔۔۔

ویسے زربخت! اب تم مجھ کے کاٹنے سے بچنے کیلئے کون سا
مجھ پر بھگاؤ لوشن استعمال کرتی ہو؟۔۔۔ شانزے نے آنکھیں
ٹپٹپا کے زو معنی مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا تھا۔

م۔۔۔ میں۔۔۔ کوئی۔۔۔ روشن۔۔۔ استعمال نہیں۔۔۔ کرتی۔۔۔

زربخت نے بوکھلاتے ہوئے تیزی سے جواب دیا تھا۔۔۔

کیونکہ اس کو یہ مجھروالی بات ہر روز مہرو سے سننا پڑتی تھی، وہ اسے جان بوجھ کے چھیڑنے کیلئے پوچھتی تھی۔۔۔ زربخت تو اس

دن کو پچھتا رہی تھی جب اس کے منہ سے یہ منہوس مجھروالی

بات نکلی تھی۔ اب یہ مجھرو جگہ اسے شرمندہ کروا رہا تھا۔۔۔

اچھا اچھا! سمجھ لگ گئی! تم بنا روشن کے ہی مجھرو کو ہینڈل کر

لیتی ہو؟۔۔۔ شانزے نے جان بوجھ اسے چھیڑنے کیلئے بات

کو نیا رنگ دے ڈالا۔۔۔ اس کی بات سنتے ہی، انزش اور باقی

سب لڑکیوں نے ملامتی نظروں سے شانزے کو گھورا تھا۔

بی پازیٹیو گائز! میں نے کچھ گندا نہیں بولا۔۔۔ تم لوگوں کے دماغ

ہی گندے ہیں ڈرٹی مائنڈ ڈیپیل!۔۔۔ شانزے پر اعتمادی سے

اپنے بے باک بات کو کور کر گئی کیونکہ سب اب اسے افسوس
سے دیکھ رہے تھے۔

میری بہو کو کیوں چھیڑ رہی ہو تم سب!۔۔۔ زربخت کے
چہرے پہ پریشانی اور شانزے کی بے باک بات سنتی انیسہ خان
سٹیج پہ آتے ہوئے مصنوعی انداز میں ڈانٹنے لگیں۔ وہ اس کے
ساتھ بیٹھتی پہلی بار اسے اپنے ساتھ لگا کے اس کے ماتھے پہ
لب رکھ گئی تھی۔۔۔

ان کی بانہوں کا حصار اور لبوں کا لمس اپنے ماتھے پہ محسوس
کرتے ہی زربخت نے بے یقینی اور خوشی کے ملے جلے
تاثرات سے انیسہ خان کی طرف دیکھا تھا جو کہ اس کو دیکھ کے
مسکرا رہی تھی۔۔۔

ان کے لمس اور آنکھوں میں آج اپنے لئے محبت زربخت کو پہلی بار خالص لگی تھی۔ وہ بے ساختہ انیسہ خان کے سینے سے لپٹ کر بے آواز رونے لگی تھی۔ انزہ نے بھی اپنی خالہ کا بدلتا رویہ بے یقینی سے نوٹ کیا تھا اور پھر وہ بھی انیسہ اور زربخت سے لپٹی ان کے گرد اپنے بازوؤں کا گھیرا تنگ کر گئی تھی۔

رائم خان سے جڑنے کے بعد انزہ اور عامر بزدار کے سارے شکوے شکایت ان سے ختم ہو گئے تھے۔ اور وہ اللہ کا شکر ادا کرتے تھے کہ ان کی بیٹی کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا تھا کیونکہ بدلے میں اسے رائم خان جیسا سچی محبت کرنے والا ہمسفر جو نصیب ہوا تھا۔ اور پھر رائم خان کو پالینے کے بعد انزہ کی ساری ناراضگی اپنوں سے ختم ہوئی تھی۔ کیونکہ اسے وہ نہیں ملا

تھا جو اس کے لئے بہتر تھا بلکہ اس کو وہ ملا جو اس کی زندگی اور اس کے وجود کیلئے بہترین تھا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی اس بہترین عنایت پہ بے حد خوش تھی اور اس کی ذات اقدس کی شکر گزار تھی جس نے اسے بہتر نہیں بلکہ بہترین سے نوازا تھا۔

انیسہ خان محبت سے انرش کے ماتھے پہ بھی لب رکھے تھے جو سکون آج ان کو اپنے رشتوں کے ساتھ مخلص ہو کے ملا تھا وہ انہیں زندگی بھر میسر نہیں آیا تھا۔

لاؤنج سے نکل کر مردوں کی سائیڈ بڑھتے دمیر خان کے یہ منظر دیکھ کے بے ساختہ قدم رکے تھے۔ بالآخر اس کی کاوشیں رنگ لے آئی تھیں۔ وہ اپنے گھر والوں کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہو چکا تھا کہ زندگی کی اصل خوبصورتی اپنوں کے ساتھ جرّ کے رہنے میں ہے، محبتیں بانٹنے میں ہے، رشتوں کو دنیاوی آسائشوں سے

اول رکھنے میں ہے۔ وہ دھیمسا مسکراتا، دل میں اللہ تعالیٰ کا
شکر ادا کرتے ہوئے مردوں والی سائیڈ بڑھ گیا۔

دمیر اور رائم خان کی ڈریسنگ سیم تھی۔۔ دونوں نے آف
وائٹ شلوار قمیض کے ساتھ ہم رنگ شال گلے میں ڈال رکھی
تھی۔

وہ دونوں ہمیشہ کی طرح اپنے وجہ نقوش اور بارعب شخصیت
کے ساتھ محفل میں منفرد چاند لگ رہے تھے۔۔

کیا سپیڈ ماری ہے تم دونوں نے! شادی کرتے کرتے دونوں
اکٹھے ہی گھوڑی چڑھ گئے۔ اتنے شادی کیلئے مرے جا رہے تھے
تم دونوں؟۔۔۔ کاظم شاہ نے چپھے سے آکر دمیر اور رائم خان
کی گردن دبوچتے ہوئے آئبرو آچکا کے سوال کیا تھا۔

شاہ! اب ہم نے سوچا ہمارا دوست دو بچوں کا باپ ہے تو وہ
خود کو ہم دو حسین جوان کنواروں کے ساتھ بوڑھا فیل نہ کرے
تو اس لئے ہم نے جلدی گھوڑی چڑھنے کو ترجیح دی۔۔۔ رائم
خان اپنا رخ چھپے موڑتا آنکھیں پٹپٹا کے بظاہر سنجیدگی سے بول رہا
تھا مگر آنکھوں میں شرارت چمک رہی تھی۔

ہمم! خان ٹھیک کہہ رہا ہے۔۔۔ اب تو تو ہم دو سنگل جوان
لڑکوں کے ساتھ بوڑھا لگتا ہے! اس لئے ہم نے تجھے شرمندہ
ہونے سے بچا لیا۔۔۔ دمیر خان نے بھی شرارت سے اپنی
شہد رنگ آنکھیں گھوماتے ہوئے رائم خان کی بات کی تصحیح کی
تھی۔

شٹ اپ! چھوٹے معصوم کا کہ تو تم لوگ بھی کوئی نہیں ہو!
میری عمر کے ہی ہو۔۔۔ اگر میں بوڑھا ہوں تو تم دونوں بھی

بوڑھوں میں شمار ہوتے ہو، مجھے تو اب تم دونوں کی فکر لاحق
ہونے لگی ہے۔ عمر تو تم دونوں کی نکلی جا رہی ہے، بچے بھی پتہ
نہیں ہونگے کے بھی نہیں؟ میں تو تم لوگوں کی عمر میں دو بچوں کا
باپ ہوں۔۔ تم لوگوں کو پتہ ہے نہ اس ایج میں آکر زرا سے
جراثیم کم ہو جاتے ہیں اور طاقت میں بھی کمی آ جاتی ہے۔
اسلیئے تم دونوں میری عمر کا چھوڑ کے اپنے فیوچر بچوں کے
بارے میں سوچنے پہ دماغ اور طاقت لگاؤ۔۔ کاظم شاہ دونوں
کے کالر سے فرضی دھول صاف کرتا معنی خیزی سے بولا
۔۔ اس کی بات سنتے ہی دمیر اور رائم خان نے منہ کھولے بے
ساختہ ایک دوسرے کے چہروں کی طرف دیکھا تھا یہ جاننے کیلئے
کہ کیا وہ واقعی میں ہی ابھی سے بوڑھے لگنے لگ تھے؟

ہاہا! لالا! آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ مجھے لگتا ہے ان کے بچے میرے بچوں کے بعد ہی آئیں گئے، کیونکہ پرانے انجن جلدی سٹارٹ کہاں ہوتے ہیں؟ شادی اور تقریبات جتنی مرضی یہ جلدی کر لیں لیکن باپ مجھے سے پہلے نہیں بن سکتے۔۔۔ داعیر خان جس نے بالکل ابھی انہیں جوائن کیا تھا، کاظم شاہ کی بات سنتے ہی قہقہہ لگا اٹھا۔ وہ ان تینوں کے قریب پہنچ کر بے باکی سے بولتا رائم اور دمیر خان کے چہرے غصے اور شرم سے لال کر گیا تھا۔

ہاں داعیر! میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ تم خان کو بہت جلدی "ماموں" کے عہدے پہ فائز کرنے والے ہو۔۔۔ کاظم شاہ اپنی مسکراہٹ ضبط کرتا اس کی بات کی تائید کرنے لگا۔ لفظ ماموں سنتے رائم خان کے کان کی لوئیں سرخ ہوئی تھیں۔

ان چاروں کی بے باک باتیں اور نوک جھوک جاری تھیں جب
ازمیر کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

بابا۔۔۔ ازمیر اپنے ہاتھ میں آئس کریم کا درمیانے سائز کا
باکس اٹھائے کاظم شاہ کے قریب آیا۔

ہمم؟۔۔۔ کاظم نے اسی پل ان سب کی زو معنی باتوں کو بریک
لگوائی اور ہنکارا بھرتے ہوئے بیٹے کی طرف متوجہ ہوا۔

یہ دیکھیں!! میں نے اپنے ٹیبل پہ پڑی آئس کریم سویٹ ہارٹ
کے لئے بچالی تھی، آپ اس کو سنبھال کے رکھیں، میں کھیلنے جا
رہا ہوں۔۔۔ وہ سنجیدگی سے اپنے ہاتھ میں پکڑا باکس کاظم شاہ
کی طرف بڑھاتے ہوئے باور کروانے والے انداز میں اس کو
ایک بڑی ذمہ داری سونپ رہا تھا۔ کون نہیں جانتا تھا کہ اس کی
سویٹ ہارٹ آئس کریم کے چھپے پاگل ہے۔

ہا ہا ہا۔۔۔ لکھوالے شاہ! تیرا یہ بھالو عشق معشوقی میں ڈبل پی
ایچ ڈی کرے گا۔۔۔ اس کی اپنی سویٹ ہارٹ کے لئے اتنی
فکر دیکھ کے دمیر خان قہقہہ لگاتے ہوئے خود کو لب کشائی
کرنے سے روک نہ پایا، اس نے جان بوجھ کے از میر کو آج پھر
بھالو بول کے چھیڑا تھا۔ رائم اور داعیر کا بھی قہقہہ بے ساختہ
تھا۔ خود کے لئے بھالو کا لفظ سن کے از میر نے آنکھیں
پھیلائیں، اس کو پورے جملے میں صرف یہی ایک لفظ سمجھ آیا
تھا۔

بابا!!!۔۔۔ از میر شاہ پیر پٹکتے ہوئے چڑ کر شکایتی نگاہوں سے
باپ کو دیکھنے لگا جیسے آنکھوں سے ہی اس کے دوست کی
شکایت لگا رہا ہو۔

بابا کی جان۔ ان کمینوں کو چھوڑو اور آئس کریم واپس سے ٹیبل
پر رکھ کے آؤ! سویٹ ہارٹ کے لئے ہم راستے سے لے لیں
گے۔۔۔ کاظم شاہ نے ان تینوں کو ہنستے دیکھ کے پہلے تو
گھوری سے نوازا اور پھر رسائی سے اپنے بیٹے کو جواب دیا۔
اب وہ شاندار مرد پوری تقریب میں آئس کریم کا ڈبہ پکڑ کے اس
کی حفاظت تو کرنے سے رہا۔۔

نہیں! مجھے سویٹ ہارٹ نے آرڈر دیا تھا کہ میں ایونٹ سے اس
کے لئے اپنے حصے کی آئس کریم ضرور بچاؤں۔ ہم یہی والی
آئس کریم اس کے لئے لے کر جائیں گے۔۔۔ از میراٹل انداز
میں بولتا پھر سے یہ باکس اس کی طرف بڑھانے لگا۔

سمجھ رہے ہو؟ آرڈر دیا تھا اس ٹڈے کو؟۔۔۔ دمیر خان نے
رائم اور داعیر کے ساتھ نگاہوں کا تبادلہ کرتے ہوئے پھر سے
ازمیر کو طنزاً چھیڑا۔

کیوں تنگ کر رہے ہو میرے شہزادے کو۔۔۔ لفظ ”ٹڈے“ پہ
ازمیر کا پھولتا منہ دیکھ کے رائم خان اپنی ہنسی ضبط کرتا جھک
کے اس کو اپنے بازوؤں میں اٹھاتا عادتاً ہوا میں اچھالنے لگا۔
ہوا میں اچھلنے کے باعث کھلکھلاتے ہوئے بھی ازمیر کی گرفت
آئس کریم کے ڈبے پہ مضبوط تھی جس کو دیکھ کے داعیر اور
دمیر کو اور ہنسی آرہی تھی لیکن کاظم شاہ کی گھوریوں پہ وہ ضبط
کرتے لب دبا گئے کیونکہ وہ اپنے بیٹے کی شان میں گستاخی
برداشت نہیں کرتا تھا۔

ہر طرف خوشیوں کا سماں تھا۔۔ ہر طرف رشتوں کی خوبصورتی
اپنے سر بکھیر رہی تھی اور ان سروں میں کوئی نفرت، حسد، جلن
، منافقت، ریاکاری، دیکھاوا، دوغلاپن، بے اعتنائی، منافقت
اور اپنوں سے لا تعلقی کی دھن شامل نہیں تھی۔۔ خوبصورت
رشتے ہی انسان کی خوشیوں کو دوبالا کرتے ہیں جیسے کہ آج رائم
خان اور دمیر اپنوں کے ساتھ اپنی خوشی مناتے ہوئے پھولے
نہیں سمار رہے تھے۔ مسکراہٹ ان کے چہروں سے جدا ہونے
کا نام نہیں لے رہی تھی۔۔

دور کھڑے عامر بزدار کے ساتھ اسد اللہ خان اپنے بچوں کو خوش
دیکھتے ایک پر سکون سانس بھرتے ہوئے ہر عطاء کیلئے ہاتھ اوپر
اٹھائے اپنے رب کی ذات کا شکر ادا کرنے لگے جس نے ان
لوگوں کو ہدایت دی تھی۔ اور وہ اپنے رشتوں سے جڑے تھے۔

جو انسان اپنے سے جڑے لوگوں کا نہیں ہوتا وہ بھلا خدا کا کیسے
ہو سکتا ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات کا قرب حاصل کرنا ہے تو
اس کے بندوں کے ساتھ مضبوط محبت، پیار، احترام اور اعتبار
کا رشتہ بناؤ۔۔

آج اس محفل میں گونجتے قہقہے رشتوں کی جیت کا اعلان کر رہے
تھے۔ ان قہقہوں میں نفرتیں کہیں دور جا کے غرق ہو گئی
تھی۔ محبت اور وفا جیت گئی تھی، نفرت اور بے اعتنائی ہار
گئی تھی۔۔

اور یہ ہار جیت سے زیادہ قابلِ جشن تھی۔

"بندہ راضی تو رب راضی"

ولیمے کی تقریب ختم ہوتے ہی رائم خان اور اس کے والدین اپنی بہو انزس کو لئے اپنے گھر کیلئے نکل گئے تھے۔ دمیر خان نے خود کاظم شاہ اور باقی سب مہمانوں کو عزت سے رخصت کیا تھا۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے زربخت اس وقت اپنے دونوں پیر صوفے پہ فولڈ کر کے بیٹھی کھانا کھانے میں مگن تھی جب وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔

وہ اس وقت اپنی میکسی، جیولری، اور میک اپ کے ساتھ کھانے میں مشغول تھی، اسے بھوک ہی اتنی لگی تھی کہ وہ چیخ کئے بنا ہی کھانا کھانے لگ گئی تھی۔ تقریب میں تو انزس کی بے باک باتیں سن سن کے زربخت نے نظریں ہی اوپر نہیں اٹھائی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ گود میں رکھ کے مروڑتی بس جلدی سے

تقریب ختم کا انتظار کر رہی تھی، تاکہ جلد از جلد انزس کی بے
باکیوں سے چھٹکارا حاصل کر سکے، سارا وقت تو زربخت کو
شرمانے سے فرصت ہی نہیں ملی تھی تو پھر وہ کھانا کیا خاک
کھاتی؟

دمیر خان اپنی شال گلے سے نکال کے صوفے کی پشت پہ رکھتا،
ایک دلکش مسکراہٹ لبوں پہ سجائے زربخت کی طرف بڑھتا تھا

--

پہلے کھانا نہیں کھایا تھا میری بخت نے؟۔۔۔ وہ اس کے
قریب بیٹھتا چاشنی بھرے لہجے میں استفسار کرنے لگا۔
نہیں! تب بھوک نہیں تھی۔۔۔ زربخت نوالہ چباتی مصروف
انداز میں بولی تھی۔

اچھا! دمیر خان نرمی سے اس کا ہیومی کام دار دوپٹہ پنر سے آزاد
کر کے اس سر سے اتارتا سائڈ پہ رکھ گیا تھا۔

آپ نے کھانا ہے؟۔۔ اس نے ایک نوالہ بنا کے اپنے منہ کی
طرف لے جانے کی بجائے دمیر کی طرف بڑھایا تھا۔

نہیں میں فل ہوں۔ دمیر خان اپنے ہاتھ سے وہ نوالہ اس کے
منہ میں ڈالتا شائستگی سے بولا تھا۔ وہ اس سے زیادہ گفتگو کرنے
سے گریز کر رہا تھا کیونکہ وہ کھانا کھا رہی تھی۔

دو تین اور نوالے لینے کے بعد زربخت کھانے کی ٹرے سائڈ پہ
کرتی اپنے ہاتھ ٹیشو سے صاف کرتے ہوئے پانی کا گلاس اٹھا
کے لبوں کے ساتھ لگانے لگی۔

بہت حسین لگ رہی تھی آج تم۔۔ مگر تمہارے چہرے پہ
چھائی اداسی تمہاری خوشی کو غارت کر رہی تھی۔ کیوں اداس

تھی تم؟۔۔۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں الجھائے ان کو ہیر
پنزاور ربن کی قید سے آزاد کرتا کھوجتی نگاہوں سے پوچھ رہا تھا۔
اس نے تقریب میں اس کے چہرے کی اداسی بخوبی نوٹ کی
تھی مگر وہ اس وقت سوال نہیں کر سکا کیونکہ اس وقت اس کے
پاس ساری لڑکیاں تھی اور بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔
نہیں تو! میں اداس تو نہیں تھی۔ بس بیٹھ بیٹھ کے تھکن ہو رہی
تھی۔ تو اس لئے شاید آپ کو لگا ہو کہ میں اداس ہوں۔۔۔ وہ
نظریں جھکائے بولی تھی۔

ادھر میری طرف دیکھو متاعِ من! پھوپھو کی وجہ سے اداس
تھی نہ تم؟۔۔۔ وہ ٹھوڑی سے پکڑ کے اس کا چہرہ اوپر کرتا
انکشاف کر گیا تھا۔

زربخت نے اسے چونکتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ہر بار اس کی دل
بات کیسے جان لیتا تھا؟ اس نے بے ساختہ سوچا۔

ہمم! تھوڑی سی۔۔۔ دمیر خان کے اپنائیت بھرے لہجے میں
پوچھنے پر زربخت بے ساختہ اپنے بازو پھیلائے افسردگی سے اس
کے سینے سے لگی۔

تو پھر پہلے کیوں انکار کیا تھا؟۔۔۔ وہ اس کی ادا پہ گھائل ہوتا،
مسکراتے ہوئے اس کے سر پہ لب رکھ گیا تھا۔ البتہ اس کا
افسردہ چہرہ فکر مندی میں مبتلا کر گیا تھا۔

دمیر! آپ کو خوشی ہوئی ہمارے ولیمے کی تقریب رکھنے سے
؟۔۔ وہ اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے الٹا اس کے
چہرے کی طرف دیکھتی سوالیہ انداز میں گویا ہوئی۔

بہت زیادہ!! کیونکہ پہلے میں نے تمہیں دلہن بنتے نہیں دیکھا تھا
لیکن آج تمہیں اپنے لئے تیار دیکھ کے، تمہارے ہاتھوں پہ اپنے
نام کی مہندی دیکھ کے، تمہیں پورے زمانے کے سامنے اپنے
نام سے متعارف کروا کے مجھے بہت زیادہ خوشی ملی ہے۔۔۔
وہ اس کے مہندی سے سچے ہاتھوں کو پکڑ کر باری باری چومتا سر
شاری اور مسرت کے عالم میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں ایک
چمک تھی اور وہ چمک زربخت کو آج سب کے سامنے اپنے نام
سے متعارف کروانے کی تھی۔۔

پھر میں بھی بہت خوش ہوں! آپ خوش تو میں خوش! کیونکہ
اب مجھے پتہ چلا گیا ہے دمیر! ہم مرنے والوں کے ساتھ مر نہیں
سکتے۔۔ اب مجھے کسی کی ضرورت اور کمی محسوس نہیں ہوتی،
جب سے آپ کا ساتھ پایا ہے۔ آپ میری ساری کمیوں کو پوری

کرنے کیلئے کافی ہیں۔ آپ مجھے سارے جہاں کی خوشی دینے کے قابل ہیں، میرے سکون، میری خوشی، میری روحانی راحت کا مرکز و محور اب آپ ہیں۔ آپ سے منسلک ہو کے میں ہر لحاظ سے پایہ تکمیل کو پہنچتی ہوں۔ مجھے اب کسی اور رشتے کی تمنا نہیں ہے کیونکہ آپ میرے محرم بن کر میری زندگی کو سنوار چکے ہیں۔

زربخت کو دمیر کے علاوہ اب کچھ نہیں چاہئے۔ اور میرا دمیر مجھے آخری سانس تک چاہیے۔۔۔ میں مرنا بھی آپ سے پہلے چاہتی ہوں، کیونکہ آپ جتنا میری روح تک بس چکے ہیں، آپ سے ایک لمحے کی جدائی بھی زربخت برداشت نہیں کر پائے گی۔۔۔ وہ زور سے اس کے سینے سے لگتی اپنائیت بھرے انداز میں بولی۔ وہ آج پہلی بار اتنا بولی تھی اور آج پہلی بار اس

نے دمیر کے وجود کو اپنے لئے سانسوں کے جیسا ضروری قرار دیتے ہوئے معتبر کیا تھا۔

شش! مریں تمہارے دشمن! تم نے اور میں نے تو ساتھ مل کر جینا ہے، دنیا جہان کی خوشیاں سمیٹنی ہیں۔ تمہیں خوشیوں کا وہ جہاں دیکھانا ہے جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ہم زندگی میں ہمیشہ دو جسم اور ایک جان بن کے رہیں گے اور تمہارے لئے ہمیشہ میں کافی رہوں گا، تمہارے اور میرے درمیان ہمارے بچے بھی آکر میری محبت کو تم سے کم نہیں کروا سکیں گے۔ تم میری پہلی محبت ہو باقی سب بعد میں آتے ہیں، اور ہمیشہ آتے رہیں گے۔۔۔ دمیر خان اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے کے اپنی گود میں شفٹ کرتا محبت بھرے لہجے میں بولتا اس کے ماتھے پہ لب رکھ گیا تھا۔

بچے؟۔۔۔ بچوں کا نام سنتے ہی زربخت نے اٹھنے سے سوال کیا۔

ہاں بچے! ہم دونوں کے بچے بھی تو ہوں گے نہ! جو تمہاری اور میری محبت کی نشانی ہونگے۔ کیوں تمہیں بچے پسند نہیں؟۔۔۔ وہ اس کے چہرے پہ چھائی عجیب کیفیت دیکھ کے آبرو اچکا کر پوچھنے لگا۔

نہیں! مجھے تو بچے بہت پسند ہیں، مجھے تو منت اور از میر بہت پیارے لگتے ہیں، میرا دل کرتا ہے وہ ہر وقت میرے پاس رہیں لیکن وہ چلے جاتے ہیں۔۔۔ زربخت چہک کے بولتی آخر میں اداسی سے چہرہ جھکا گئی۔

بخت! وہ اپنے ماں باپ کے بچے ہیں۔ انھوں نے تو اپنے ماں باپ کے ساتھ واپس جانا ہوتا نہ! اگر تمہیں بچے ہر وقت چاہئے

تو ہمیں اپنے پیدا کرنے پڑیں گے، پھر وہ ہر وقت تمہارے پاس
رہیں گے۔۔ تم ان کے ساتھ کھیلنا، باتیں کرنا، پیار کرنا کوئی
روک ٹوک نہیں ہوگی۔ تمہارا جب جی چاہے گا، تم ان کو اپنے
سینے سے لگا کے اپنے سچے جذبات کی تسکین کر سکتی ہو۔۔ دمیر
خان اس کا ہاتھ سیدھا کھول کے اپنا مہندی سے سجا نام اسکی
ہتھیلی پہ دیکھتے ہی وہاں لب رکھتا زو معنی انداز میں بولا تھا
لیکن دمیر! وہ تو بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، میں ان کو
کیسے سنبھالوں گی؟ مجھے ڈر لگتا ہے۔۔۔ زربخت اس کی بات کا
مطلب سمجھتی اس کے سینے میں منہ گھسیڑے شرم اور
معصومیت کے ملے جلے تاثرات سے بولی تھی۔
میرا روشن بخت! میں ہوں سب سنبھالنے کیلئے، میں سب کو
پال لوں گا! بس تم جلد از جلد مجھے ایک عدد اپنی کاربن کاپی دینے

کی تیاری پکڑو کیونکہ میں جلد از جلد اپنے پیار کی نشانی کو اپنی
بانہوں میں بھرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ دمیر خان اس کی گردن پہ
لب رکھتا مخمور لہجے میں بولتا اس کو ایسے ہی اپنی گود میں لئے
اوپر اٹھا تھا۔

وہ احتیاط سے اسے ڈریسنگ ٹیبل پہ بٹھا کر چھپے بیٹا۔۔۔ زربخت
کے چہرے پہ شرم کی لالی بکھری ہوئی تھی۔
دمیر خان اس کی ساری جیولری اتار کے سائیڈ پہ رکھتا ایک
جست میں اپنی قمیض اتار کے دور اچھال گیا تھا۔
وہ اس کا چوڑا سینہ دیکھتے ہی گلنار ہوتی نگاہیں جھکا گئی تھی کیونکہ
اس کے پورے سینے پہ اس کے ناخنوں اور دانتوں کے نشانات
ثبت تھے۔۔۔

دمیر خان معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا
سوئچ بورڈ کی طرف بڑھ کے کمرے کی تیز روشنی غارت کر گیا
تھا۔

وہ واپس زربخت کے پاس آتا اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے ایک دم
سے اسکے لبوں پہ جھکا تھا۔

وہ نرمی سے اس کے لبوں کو چومتا چھپے سے اس کی میکسی کی
زپ کھسکا گیا تھا۔

وہ اس کا چہرہ تھوڑا ترچھا کر کے اس کے دونوں لبوں کو جذب
کرتا شدت سے سک کرنے لگا تھا۔ زربخت نے اس کی شدت
بڑھتے ہی فوراً اس کو برہنہ کندھوں سے تھاما تھا۔۔

دمیر خان اس کے کندھوں سے میکسی نیچے سرکاتا اس کی
دھڑکنوں کو تھوڑا پردے سے آزاد کرتا انہیں اپنی مٹھی میں
جکڑنے لگا تھا۔

وہ زربخت کی خوشبودار سانسیں خود میں اتارتا بے خود ہو رہا
تھا۔۔

وہ تیزی سے اس کے لبوں کی ساری نمی سک کرتا، اضطرابی
کیفیت میں اس کے سینے پہ اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھا گیا تھا۔۔
زربخت نے اپنی سانسیں گھٹتی محسوس کرتی، اس کے برہنہ
کندھے پہ اپنے نوکیلے ناخن پیوست کئے تھے۔

دمیر خان اس کی مدہم ہوتی سانسیں اور اپنے کندھے پہ جلن
محسوس کرتا فوراً اس کے لبوں کو آزادی بخش گیا۔ وہ تیز تیز

سانسیں بھرتا دوپل میں ہی زربخت کے اوپری دھڑ کو ہر پردے
سے آزاد کر چکا تھا۔

اہہ! ہر بار اپنے خم دار خوبصورتی سے مجھے پاگل کر دیتی ہو
بخت!۔۔۔ دمیر خان آنکھوں میں خمار کی سرخی لئیے اس کی
سینے کی ابھری نازک ساخت پہ ہاتھ مسلتا، ایک دم انہیں اپنے
لبوں میں دبائے ان کی نازکی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ جو گہری
سانسیں لیتی خود کو نارمل کر رہی تھی، اس اچانک اتفاق پہ سسک
اٹھی تھی۔۔

وہ اس کے بالوں میں انگلیاں الجھائے، آنکھیں موندے دمیر
خان کے لبوں اور دانتوں کا لمس اپنی دھڑکنوں پہ برداشت
کرنے لگی تھی۔۔

وہ ایک دم سے اس کی نازک ساخت کو اپنے لبوں اور دانت میں
کھینچ کے چھوڑتا اس کو کراہنے پہ مجبور کر گیا تھا۔
وہ آنکھوں میں خمار اور ملن کی تڑپ لئے خود اور زربخت کو
آخری پردے سے بھی آزاد کر گیا تھا۔

وہ بے باکی اپنا ہاتھ اس کی کلوز تھائیز کے درمیان فورس سے دیتا
اپنی ایک ہی بے باک موومنٹ سے اس کی ٹانگوں میں فاصلہ
قائم کر گئے تھا۔ اس نے مچلتے ہوئے اس کا ہاتھ دور ہٹانا چاہا مگر
دمیر خان نے اپنی موومنٹ نہ روکی۔ زربخت نے اب کی بار
مدہوشی میں اپنے لب کاٹے۔

اپنے کھڑے ہونے کی جگہ بنتے دیکھ کر ہی دمیر خان اپنا ہاتھ اس
کی تھائیز سے ہٹاتا خود کو ایڈجسٹ کرنے لگا۔ وہ گہری سانسیں

بھرتا اپنا لمس کا دباؤ اس کی انر تھائی پہ دیتے ہی بے صبری سے
اس میں اتر ا تھا۔

اہہ دمیر! اس کی اچانک خود میں شمولیت پر زربخت کی کراہ
بے ساختہ تھی۔

بخت۔۔۔ دمیر خان آگے بڑھ کر اس کے ماتھے پہ لب رکھتا
اس کے گھٹنوں کے نیچے سے اپنے ہاتھ گزار کے بانہوں کے گرد
لیپٹ کے اوپر کی طرف اٹھاتا اس میں آخری حد تک شامل ہوا
تھا۔۔

وہ اپنی چند منٹ کی محنت سے ہی زربخت کو اندر تک جھنجھوڑ
کے رکھ گیا تھا۔۔ وہ اپنی حرکت میں تیزی لائے جنونی ہو رہا تھا

اہہہہ! امم! دمیر۔۔۔ وہ اپنے دونوں بازوؤں اس کے گردن کی
گرد حائل کرتی سسکتے ہوئے اسے برداشت کرنے لگی تھی۔
دونوں کے وجود آپس میں ٹکرانے کی آواز کے ساتھ ساتھ
زربخت کی سسکیاں اور دمیر کی خان کی بھاری تیز چلتی سانسوں
کا شور پورے کمرے میں ارتعاش پیدا کئیے ہوئے تھا۔
اہہہہ! تم۔۔۔ نشے۔۔۔ جیسی۔۔۔ ہو۔۔۔

تم۔۔۔ میں۔۔۔ اترتے۔۔۔ ہی۔۔۔ میں۔۔۔ ہوش۔۔۔ سے۔
سیگانہ۔۔۔ ہو۔۔۔ جاتا۔۔۔ ہوں۔۔۔ دمیر خان اپنی پھولی
سانسوں کے درمیان بولتا، اس کی گردن کی پہ بائٹ کرتے
ہوئے وہاں کی سکن سک کرنے لگا تھا۔
وہ تیز رفتار سے خود کو موو کرتا زربخت کے اندر سفر کرتا جا رہا
تھا۔ وہ ہر لمحے بے خود اور آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

وہ جنونی ہوتا اس کے لبوں پہ دانت گاڑھ کر نیچے اس کے نازک
دل کے مقام پہ جھکا تھا۔۔

وہ پیاسوں کی طرح اس کی حساسیت کو اپنے لبوں میں دبا کے
کھینچتا جنونیت اور جوش کی آخری حد تک پہنچ گیا تھا۔

اہہ! امم! دمیر! میری۔۔ کمر۔۔ چھپے۔۔ لگ۔

رہی۔۔ ہے۔۔۔۔۔ چھپے۔۔۔۔۔ ہٹ۔۔۔۔۔ جائیں۔۔۔۔۔ چھپے مر رہے

ٹکرائے کی وجہ سے اپنی کمر میں اٹھتا درد محسوس کرتے ہوئے
زربخت نے اس کے سینے پہ دانت گاڑھ کر اسے پکارا تھا۔۔۔

اہہ! بخت! تھوڑی۔۔۔ دیر۔۔۔ برداشت۔۔۔ کرو! دمیر خان

تھکم بھرے لہجے میں بولتا، اپنی کمر میں اندر کی طرف خم دئے
اس کے نازک وجود کے پردوں کو اپنے وجود سے فاش کرنے

لگا تھا۔۔

وہ اسے برداشت کرتے ہوئے درد کی شدت سے اس کے
کندھے پہ دانت گاڑھے ہوئی تھی، وہ آنکھیں میچے دمیر خان کی
گردن کے گرد لپیٹی اسے سہن کرنے لگی تھی۔

کافی دیر بعد زربخت کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر دمیر خان اپنی
حرکت روکے اس کو بیڈ کی طرف لایا تھا۔

ٹھیک ہو؟۔۔۔ دمیر خان اس کے پسینے سے تر چہرے پہ ہاتھ
پھیر کے اس کے ماتھے پہ عقیدت سے لب رکھتا پوچھنے لگا۔
ہمم۔۔۔ زربخت نے شکایت کرنے کی بجائے ہنکارا بھرا۔
وہ دمیر خان کا جنونی پن جانتی تھی، اس لئے وہ اس کو اب خود
سے سکون لینے سے نہیں روکتی تھی۔ بلکہ ہمت سے اسے
برداشت کرتی تھی۔

دمیر خان اپنا ایک گھٹنہ فولڈ کر کے بیڈ پہ رکھتا جبکہ دوسری ٹانگ
نیچے زمین پہ جمائے اپنی رانوں کے درمیان زربخت کے نچلے
وجود کو پھر سے ایڈجسٹ کرنے لگا تھا۔

وہ آگے جھک کر اس کے لبوں کو اپنے ہونٹوں کی گرفت میں لیتا
ایک دفعہ پھر سے اس میں پورے جوش کے ساتھ شامل ہوا
تھا۔

زربخت اس کے لبوں سے اپنے لب آزاد کرواتی سسک اٹھی
تھی۔۔

دمیر خان نرمی سے اس کے سینے پہ زبان پھیرتا اس میں سرائیت
کرتا ایک دفعہ پھر سے اس میں ضم ہونے لگا تھا۔
زربخت نے اس کے جھٹکوں سے اپنے لرزتے وجود کو قابو
کرنے کیلئے دمیر خان کو بازوؤں سے جکڑا تھا۔

وہ ایک دم اس کی کمر اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑتا لب بھینچے اس
میں اپنا سارا وجود گھولنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔
زربخت کی سسکیاں کمرے کی درودیوار سے ٹکراتی واپس دمیر
خان کے کانوں سے ٹکراتی اسے مزید بے قرار کر رہی تھی
۔ گزرتی رات کے ساتھ اس کی شدتیں بڑھتی جا رہی تھی اور
زربخت کا نازک وجود ان شدتوں کو صبر سے سہن کرتا نہ ڈھال ہو
رہا تھا۔

خان! پلیز بتائیں تو ہم کہاں آئے ہیں؟۔۔۔ انزس اپنی بند
آنکھوں سے پٹی ہٹانے کی کوشش کرتی فکر مندی سے تحقیق
کرنے لگی۔

نہیں! نہیں! دیکھنا مت۔۔ ہم اپنی مطلوبہ جگہ پہ پہنچ چکے ہیں،
تمہاری آنکھیں سے پٹی ہٹاتا ہوں، بس تھوڑا سا صبر کرو۔۔
رائم خان سیٹ بیلٹ کھولتا تیزی سے انزش کو اپنی آنکھوں سے
پٹی ہٹاتے دیکھ کر ٹوک گیا تھا۔

خان! جلدی کریں۔۔ اب میری آنکھوں میں درد ہو رہا ہے۔
کب سے آپ نے میری آنکھوں کو دیدار سے محروم رکھا ہوا ہے
۔۔۔ وہ اپنی آنکھوں کے آگے کب سے اندھیرا محسوس کرتی
جھنجھلاتے ہوئے بولی۔

قلبِ راحت! میرے دیدار کیلئے ترس رہی ہو؟۔۔۔ رائم خان
گاڑی سے اتر کر اس کی سائیڈ آتا گاڑی کا دروازہ کھولے انزش
کا ہاتھ احتیاط سے پکڑ کر گاڑی سے باہر نکالنے لگا۔

میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔۔۔ وہ تیزی سے اپنی بات سے
مکری تھی۔ حالانکہ وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے رائم خان کا چہرہ دیکھنے
کو ترس رہی تھی۔

گھر سے نکلتے ہی اس نے اس کی آنکھوں کے آگے پٹی باندھ دی
تھی اس لئے وہ اب جھنجھلا رہی تھی۔۔۔

لیکن میرے کانوں نے تو سنا کہ ”خان! میں آپ کے دیدار سے
محروم ہو رہی ہوں“۔۔۔۔۔ رائم خان اسے احتیاط سے دو قدم
آگے لے کر چلتا شوخ لہجے میں گویا ہوا۔

اب کھول دوں پٹی؟۔۔۔ انرش اس کی بات کا جواب دینے کی
 بجائے اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹانے لگی تھی۔

رکو!! میں اتارتا ہوں۔۔۔ وہ آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں پہ
بندھی پٹی کھولنے لگا۔

انزش نے فوراً اپنی آنکھیں کھولیں اور سامنے کا منظر دیکھ کے
اس کی آنکھیں کھلی ہی رہ گئی تھی۔

وہ بے یقینی سے رائم خان کی طرف دیکھتی پھر سے اپنی آنکھیں
مسلتے ہوئے سامنے کے منظر کو اپنی آنکھوں میں خوشگوار حیرت
سے اتارنے لگی تھی۔

خان!! یہ سب میرے لئے ہے؟۔۔۔ انزش بے یقینی اور
الجھن سے رائم خان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

جی میری جان! یہ سب کچھ آپ کیلئے ہی میں نے کیا ہے۔ آپ
کے علاوہ کوئی اور ہے میری زندگی میں خاص جس کیلئے میں یہ
سب کچھ کروں گا؟۔۔۔ وہ دھیمسا سا مسکرا کے اس کو چھپے سے
پکڑے اس کے برہنہ کندھے پہ لب رکھتے ہوئے وہاں پہ اپنی
ٹھوڑی ٹکا گیا تھا۔۔

انزش اس وقت سیلیو لیس مون لائٹ ساڑھی میں ملبوس
تھی جس کا بلیک بلاؤز بیک لیس تھا۔ بلاؤز پورا سلور پر لڑ سے
بھرا تھا۔ انزش کے ہاتھوں میں بلیک اور سلور چوڑیاں، گلے
میں رائم خان کی طرف دیا گیا ڈائمنڈ پینڈٹ، کانوں میں ڈائمنڈ
ٹاپس، چہرے پہ ہلکے کے سے میک اپ اور پشت پہ بکھرے
سلکی سٹریٹ بالوں کے ساتھ وہ اس رات کی چاندنی میں اس قد
حسین لگ رہی تھی کہ رائم خان مشکل سے اپنے دل اور
جزبات کو لگام ڈالے ہوئے تھا۔

انزش ابھی تک سامنے کے منظر میں قید تھی۔

پہاڑوں کے نیچے وسیع و عریض ایریا سفید پھولوں سے بھرا
ہوا تھا۔ ان سفید پھولوں کی حدود دور تک پھیلی ہوئی تھی اور

ان حدود کی نشاندہی ان کے کناروں پہ جلتی قمقموں کی روشنی کر
رہی تھی۔۔۔

اس وسیع و عریض ایریا کے وسط میں ایک بڑا سا درخت تھا اور
درخت کے اوپر اس کی شاخوں اور ٹہنیوں کے درمیان ایک
چھوٹا سا ٹری ہاؤس بنا ہوا تھا۔ ہاؤس چھوٹا تھا لیکن اس
میں دو انسانوں کے رہنے کی گنجائش آرام سے تھی۔ ہاؤس
زمین سے کافی اونچا تھا۔ پورا ہاؤس لائٹس اور پھولوں سے سجا
ہوا تھا

درخت کے نیچے عین وسط میں سفید پھولوں پہ "قلبِ راحت"
کی تحریر سرخ گلاب کے پھولوں سے بہت بڑے سائز میں درج
کی گئی تھی۔

انزش کا رائم خان کی طرف سے دیا گیا لقب سفید پھولوں کی
درمیان روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ ققمموں کی روشنی لفظ "قلبِ
راحت" کو رات کی چاندنی میں ہائی لائٹ کئیے ہوئے تھی۔

یہ جگہ اسلام آباد شہر سے دور سرسبز اونچے پہاڑوں کے دامن میں
رائم خان نے خود پر سنہلی بنوائی تھی۔ اور اس کو رائم خان کی
پسند کے مطابق بنانے میں کافی محنت لگی تھی۔۔۔

صرف سوفیٹ کے گول ایریا میں تو سفید پھول پہاڑوں کی
پتھریلی سطح پہ بکھرے ہوئے تھے۔۔

اور ان سفید پھولوں کے وسط اور تاروں سے بھرے آسمان
کے نیچے خوبصورت ساٹری ہاؤس خوبصورتی میں اپنی مثال آپ
تھا۔۔

خان! یہ سب کچھ بہت بہت زیادہ پیارا ہے۔۔ انزہ اس جگہ
کی خوبصورت سے مہبوت ہوتی چہک کے بولی تھی۔۔
تمہیں اچھا لگا؟۔۔ رائم خان اس کے پیٹ کے گرد اپنے ہاتھ
ریپ کرتا اس کا گال پیار سے چوم گیا۔

بہت زیادہ اچھا لگا ہے۔۔ خود سے واقعی میں اب مجھے
شہزادیوں والی فیلنگ آرہی ہے، ایسا لگ رہا ہے کہ میں ایک
شہزادی ہوں۔ انزہ اپنے خوشگوار تاثرات پہ قابو پانے کی
کوشش کرتی فخریہ انداز میں گویا ہوئی تھی
رائم خان دن بدن اپنی محبت کا اظہار نئے طریقے سے کر کے
انزہ کے وجود کو اپنے لئے معتبر اور خاص کئے جا رہا تھا۔

یہ آدمی مجھے خود سے عشق کروا کے ہی چھوڑے
گا۔۔۔۔۔ انزش نے اپنا رخ ترچھا کئے اس کے چہرے کو
دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بے ساختہ سوچا تھا۔
اور میں پیارا نہیں ہوں؟ جس نے یہ سب کچھ کیا ہے؟ کیا میں
اپنی شہزادی کا شہزادہ نہیں لگتا؟۔۔۔ رائم خان اس کے برہنہ
پیٹ پہ اپنے ہاتھوں کا ٹھنڈا لمس چھوڑتا سوالیہ انداز میں گویا
ہوا۔

آپ پیارے تو لگ رہے ہیں لیکن شہزادے نہیں! شہزادی کی
آن بان تک پہنچنے کیلئے ابھی آپ کو بہت ساری محنت کی
ضرورت ہے۔۔۔ انزش اس کے ہاتھ کی بڑھتی گستاخیاں دیکھ
کر اسکے ہاتھ کی پشت پہ چٹکی کاٹی شرارت سے بولی۔

چلو! پھر آجاؤ۔۔ محنت کرتے ہیں تاکہ میں غلام سے شہزادے
کے عہدے پہ فائز ہو سکوں۔۔۔ رائم خان ایک جست میں
انزش کو اپنے کندھے پہ اٹھاتا آگے کی طرف بڑھتا تھا۔
خان! مجھے نیچے اتاریں میں گر جاؤں گی۔۔۔ رائم خان کو خود
سمیت تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر انزش نے ڈرتے
ہوئے اس کی قمیض کو مضبوطی سے جکڑا تھا۔
ٹری ہاؤس کم از کم زمین سے بیس سے تیس فٹ کی بلندی پہ تھا۔
رائم خان کو یوں بے دھڑک اوپر چڑھتے دیکھ کر اس کو خوف آیا
تھا۔

گروگی تو تم صرف میرے پیار میں! اس کے علاوہ میں تمہیں کہیں
نہیں کرنے دوں گا قلبِ راحت۔۔۔ وہ اس کو مضبوطی سے

پکڑتا ساری سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔ ہاؤس میں اینٹر ہوتے ہی رائم
خان نے اسے اپنے کندھے سے نیچے اتار دیا۔

چھوٹا سا لکڑی سے بنایا ہاؤس اندر سے نہایت ہی نفاست اور
خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ بڑے سائز کی کینڈلز چاروں کونے
میں جلتی دھار کی طرح مدہم مدہم پہ دھواں اڑا رہی تھی۔

ہاؤس چاروں طرف سے لکڑی کی بنائی گئی دیواروں سے کور تھا
۔ دو سائیڈز پہ کھڑکیاں جبکہ بیک سائیڈ پہ چھوٹا سا ہی لکڑی کا
ٹیریس بنایا گیا تھا۔ ٹیریس والی کھلی سائیڈ اور کھڑکیوں پہ سفید
پردے گرے ہوئے تھے۔ ہاؤس کی چھت ٹرانسپیرنٹ تھی۔
اگر اوپر کی طرف دیکھو تو چاند اور ستاروں سے بھرا آسمان
صاف دیکھائی دے گا۔

رائٹ سائیڈ والی کھڑکی کے بالکل نیچے وڈن فلور بیڈ تھا۔ بیڈ پہ سفید سلک کی بیڈ شیٹ بچھی تھی اور اس کے اوپر ہارٹ شیپ میں سرخ گلاب کے پھولوں کو ترتیب سے رکھا گیا تھا۔ ہاؤس میں ایک چھوٹا سا ٹیبل اور چئیر کونے میں رکھی گئی تھی۔ ٹیبل پہ بھی پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھی۔۔ چھت اور فلور کا فاصلہ مشکل سے دس فٹ کا تھا۔۔

آپ نے یہ سب کچھ کب کیا؟۔۔۔ اس کو آج رائم خان حیران در حیران کر رہا تھا۔۔ پہلے باہر کا منظر اور اب اندر کی خوبصورتی دیکھ کر وہ تعجب اور حیرت کے ملے جلے تاثرات سے بولی تھی۔

پچھلے ماہ سے ہی میں نے یہ پلیس پر سنلی تمہارے اور اپنے لئے
بنوائی تھی تاکہ ہم ہفتے میں ایک بار اپنے قیمتی لمحات یہاں گزار
سکیں۔

میں تمہارے ساتھ اپنی زندگی کا ایک ایک پل قیمتی اور یادگار بنانا
چاہتا ہوں۔ اگر میں نے کہا تھا کہ دنیا کی ساری خوشیاں
تمہارے قدموں میں ڈھیر کروں گا تو کروں گا اور ساری زندگی
کرتا رہوں گا۔ رائم خان ایک جست میں اسے بازو سے پکڑ
اپنے چوڑے سینے میں بھینچتا عہد وفا کرنے والے لہجے میں بولا
تھا۔

خان! ہماری زندگی کے سفر کی شروعات اتنے خوبصورت انداز
میں کرنے کیلئے شکریہ۔۔۔ انزس نا محسوس انداز میں اس کے

سینے پہ لب رکھتی ستائشی انداز میں گویا ہوئی۔ اس کو اس وقت اپنا آپ کوئی حور اور پریوں کا گمان دے رہا تھا۔۔

ابھی تو شروعات ہے، یہ غلام آپ کو شہزادی سے ملکہ بنا کے رکھے گا ساری زندگی! تم میرے دل، حیات اور وجود پہ راج کرنے کیلئے بنی ہو، قلبِ راحت۔۔۔۔۔ رائم خان اس کے لبوں کی تپش اپنے سینے پہ محسوس کرتا ایک دم اس کو اپنے سینے سے نکال کر اس کا چہرہ اپنے مقابل کرتا بے لگام ہو کے اس کے نازک لبوں پہ جھکا تھا۔ انزس نے اس کی ناگہاں حرکت پر اس کی شرٹ کو مٹھیوں میں دبوچا تھا۔

رائم خان بے خود ہوتا اس کے لبوں کو چومنے کی بجائے کھانے لگا تھا۔ وہ بے باکی سے اپنی زبان اس کی زبان کے گرد لپیٹتے ہوئے اس کی منہ کی ساری نمی اپنے حلق میں اتارنے لگا۔۔

رائم خان اس کو اپنے ایک بازو میں ہولڈ کرتا، اوپر کی طرف اٹھاتے ہوئے مزید ان پنکھڑیوں کو آہنی گرفت میں لئے بیڈ کی طرف بڑھا۔۔

چونکہ بیڈ فلور پہ تھا اس لئے رائم خان گھٹنے فولڈ کر کے بیٹھتا نرمی سے اس کو لئے چھپے تکیے پہ گرا تھا۔ وہ ہنوز اس کے لبوں کے ساتھ لیٹا اس کی ہر آتی جاتی سانس چراتھا۔ اس نے جھنجھلاتے ہوئے اس کے نچلے لب پہ دانت گاڑھ کر اپنا بدلہ اتارنے کی کوشش کی تھی۔

اس نے ہمیشہ کی طرح بہت زور سے کاٹا تھا۔ اپنے لبوں پہ جلن محسوس کرتے ہی رائم خان فوراً اس کے لبوں کو آزادی بخش گیا تھا۔

لبوں کو آزادی ملتے ہی انزش نے فوراً اس کا دیوہیکل وجود اپنے
اوپر سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔۔۔ وہ اس کے نیچے دب کے
مرنے والی ہو گئی تھی۔

بہت ظالم ہو تم! رائم خان اپنا نچلہ لب مسلتا شکوہ کناں
نظروں سے انزش کو دیکھ کر رہ گیا جو اپنی پھولی سانسیں ہموار
کرنے کی غرض سے اس کے نیچے سے نکلنے کی کوشش میں لگی
تھی۔

تم نے تو مجھے کاٹ لیا! اب میرے وار کیلئے بھی تیار ہو جاؤ۔۔۔
وہ کہتے ساتھ ہی انزش کی ساڑھی ایک منٹ میں ہی اس کے
مخملی بدن سے جدا کر گیا تھا۔

وہ تھوڑا سا اوپر اٹھ کے خود کو ہر پردے سے آزاد کرتا، انزش پہ
سایہ فگن ہوا۔

ہاؤس میں صرف کینڈلز کی مدہم روشنی پھیلی ہوئی تھی لیکن
روشنی اچھی خاصی تھی۔ اس لئے انزس اپنی اور رائم خان کی
حالت دیکھتی شرم سے اپنے اوپر کمفرٹر لینے لگی۔

قلبِ راحت! اب کیسا پردہ؟ ہم ایک دوسرے کے ساتھ آج
تیسری رات گزار رہے ہیں، میں تمہارے جسم کے ہر راز سے
واقف ہوں۔۔۔ رائم خان اس کے ہاتھ سے کمفرٹر لے کر
دور اچھالتا اس کے چمکتے سینے کے تل پہ جھکا تھا۔

وہ اس کے سینے سے پیٹ تک آتا اپنے لبوں اور دانتوں کا گیدا
لمس چھوڑنے لگا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی جسارتیں اپنی تھائیز
کے درمیان محسوس کرتے ہوئے انزس نے بے خودی میں
اپنی کمر اوپر اٹھائی تھی۔

وہ اپنے محرم کی قربت کیلئے مچلتی تکیہ پہ سر ٹکنے لگی تھی۔

چند منٹوں میں ہی دونوں کی آنکھیں خمار سے لہو لال ہوئی تھی

--

دو جسم طلب اور جذبات کی تپش میں جھلسنے لگے تھے۔
رائم خان اس کے سینے کی ابھری ساخت کو اپنی مٹھیوں میں جکڑ
کے چھوڑتا، اس کے لبوں کو شدت سے چوم گیا تھا۔
قلبِ راحت! تم بہت میٹھی ہو! دل کرتا ہے تمہیں کھا
جاؤں۔۔۔ رائم خان اس کو لبوں کو شدت سے سک کرتے
ہوئے بہکے ہوئے انداز میں بولا تھا۔ وہ بے قراری سے چپھے ہٹتا
اس کی دونوں ٹانگوں کو پکڑ کر پھیلانے لگا۔ رائم خان خود کو اس
کے نازک وجود سے مس کرنے کے بعد اس میں بے چینی سے
اترا تھا۔

اس کی خود میں جان لیوا شمولیت پر انزس کے منہ سے سسکی
نکلی تھی۔۔

رائم خان اس کے ماتھے پہ لب رکھ کر اس کے گال کے ساتھ
اپنا گال ٹکاتا اپنی حرکت شروع کر گیا تھا۔۔

وہ چھبے ہٹ کے اس کی کمر سے جکڑ کر اوپر کی طرف اٹھاتا، اس
میں مزید گھلتے ہوئے اپنی جان لیوا شدتیں اس پہ لٹانے لگا تھا۔
رائم خان ایک دم انزس کے پورے نچلے وجود کو کمر سے ہولڈ
کرتا جنونی ہوا تھا۔۔

اہہہ! امم! را۔۔۔ رائم۔۔۔ اپنا نچلا وجود اوپر اٹھنے کی وجہ سے
انزس کی ہڈیاں ماس چیر کے باہر آنے کو بے تاب ہوئی تھی۔
رائم خان مزید جنونی ہوتا اس کی کمر کو آخری حد تک خم دے گیا
تھا۔۔

اہہ! امم! رائم! پلیز سٹاپ۔۔۔ وہ سسکتے ہوئے اس کو پکار
اٹھی۔ درد کی شدت میں اضافہ ہوا تھا۔۔

شش!! آج۔۔ تم۔۔ بغیر۔۔ مزاحمت۔۔ کے۔۔ مجھے۔۔
برداشت۔۔ کرو۔۔ گی، میں۔۔ نے۔۔ پچھلی۔۔ دو

۔۔ راتیں۔۔ تمہارے۔۔ ساتھ۔۔ بہت۔۔ نرم۔۔ رہ۔۔

کے۔۔ اپنا۔۔ لمس۔۔ کا عادی۔۔ بنایا۔۔ ہے۔۔ آج۔۔

تو۔۔ بغیر۔۔ مزاحمت۔۔ کے۔۔ تمہارا۔۔ مجھے

برداشت۔۔ کرنا۔۔ بنتا۔۔ ہے۔۔ رائم خان اپنے غیر ساکت
وجود کے ساتھ بولتا اپنے کام میں مگن ہوا تھا۔

اس کی آنکھیں اور چہرہ حدت جذبات میں سرخ انگارہ ہوا تھا اور

ان جذبات کی آگ میں وہ اپنے ساتھ ساتھ انزس کو بھی

جھلسانے کا ارادہ رکھتا تھا۔۔

اہہہ! امم! انزش اب مزاحمت نہیں کر رہی تھی وہ سسکیاں
بھرتی اس بس برداشت کرنے لگی تھی۔ ہاں البتہ اپنے ناخنوں
سے رائم خان کی کمر خراشوں سے بھر دی تھی۔
رائم خان ایک جھٹکے سے اس کے بازو سے پکڑ کر کروٹ کے بل
کر گیا تھا۔

وہ اپنے لاوے جیسے دھتکے وجود کو اس کی گہرائیوں کی ٹھنڈک سے
راحت بخشنے لگا تھا۔ انزش نے منہ تکیے میں گھسیڑے زور سے
بیڈ شیٹ کو اپنی مٹھیوں میں جکڑا تھا۔ بے ساختہ انزش کی
آنکھوں سے آنسو ابل کے باہر آئے تھے۔

Ahh ! This is very gratifying ! You are too much
Delicious...

رائم خان اپنے حلق سے معنی خیز آوازیں نکالتا، انزش کے سینے
کی ابھری ساخت کو اپنے لبوں اور دانتوں سے کترنے لگا تھا۔

This is not gratifying ! It's worse than Hell...

انزس درد کی شدت سے چلائی۔ اس کی آنکھوں میں شکوے اور
غصے کی رمق واضح تھی مگر اس پہ مدہوشی پوری چھائی ہوئی
تھی۔

قلبِ راحت۔۔۔ رائم خان اس کی بھیگی ہوئی آواز اور غصہ
سے دیکھتے ہی اپنے حرکت روکے، عقیدت سے انزس کے
ماتھے پہ لب رکھتا نرمی سے اس کے خشک پڑتے ہونٹ چوم گیا
تھا۔

زیادہ درد ہوا؟۔۔۔ رائم خان اس کے بال سمیٹ کے چھپ
کرتا، اس کی کمر نرم ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے استفسار کر گیا
تھا۔۔

وہ محبت سے اس کے چہرے پہ جا بجا لب رکھتا، اپنی شدتوں کا
درد زائل کرنے لگا تھا۔

میرے لئے آپ کو برداشت کرنا آسان نہیں ہوتا۔۔۔ انزس
خفگی سے اس کے سینے پہ دانت گاڑھتی، شکایت کر گئی تھی۔
چلو! پھر آجاؤ آج میں تمہارے نیچے اور تم میرے اوپر! جتنے
مرضی مجھ پہ اپنے ناخنوں اور دانتوں کے نشانات ثبت کرنے
ہیں کر لو۔۔۔ رائم خان اس کی کنپٹی پہ لب رکھتا، اس کو اپنی
گود میں اٹھائے بیڈ سے اٹھا تھا۔ وہ ایک کونے میں پڑے ٹیبل پہ
بیٹھتا، انزس کو ٹھیک سے خود پہ ایڈجسٹ کرنے لگا۔

اوکے! موویور باڈی۔۔۔ رائم خان اس کو خود پہ ایڈجسٹ کر
کے اس میں منتقل ہونے کے بعد، بے باک حرکت کرنے کا
اشارہ کر گیا تھا۔

نہیں! میں نہیں کروں گی! وہ زور سے اس کے سینے پہ مکا جھڑتی
اس کی گردن میں منہ چھپا گئی۔ شرم سے چہرہ اور جسم بھاپ
چھوڑنے لگا تھا۔۔

انز ش! مجھے تمہارا ساتھ چاہیے، میرا ساتھ دو، میری پیاس اور
میری تڑپ کو مٹاؤ۔۔۔ رائم خمار سے سرخ ہوتی آنکھوں کے
ساتھ بھاری گھمبیر لہجے میں التجا کر گیا تھا۔ اس کا انداز اس
وقت شدتِ جذبات کی لپیٹ میں لگ رہا تھا
انز ش اس کی جسم کی گرامہٹ اور لہجے کی تڑپتے ہوئے التجا سن
کے بے ساختہ اس کی گردن سے چہرہ نکال گئی تھی۔۔
موو کرو! اور میرے سکون کا آخری لذت سے بھرپور ذریعہ
بنو۔ رائم خان نرمی سے اس کی ٹھوڑی پہ لب رکھتا پھر سے
ملتجی ہوا تھا۔۔

انزش اس کی بار بار کی التجائیں سن کر، ہمت کرتے ہوئے
اپنے دونوں ہاتھ اس کے سینے پہ جما گئی۔ نظریں شرم سے جھکی
ہوئی تھی۔ دل زوروں سے دھڑکتا سینے سے باہر نکلنے کو بے تاب
ہوا تھا۔

انزش تھوک نکل کے اپنا خشک حلق تر کرتی ساری ہمت مجتمع
کرتے ہوئے خود کو آہستہ سے موو کرنا شروع کر گئی تھی۔۔ وہ
آنکھیں میچے نظریں جھکائے اپنے کانپتے ہاتھوں اور بدن کے
ساتھ اپنی موومنٹ میں ردھم بنانے لگی اور ردھم بنتے ہی رائم
خان کے ساتھ انزش بھی مدہوش ہوئی۔

رائم خان اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں دباتا، اپنی خمار
سے سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ موومنٹ تیز کرنے کا اشارہ کر
گیا تھا۔۔ انزش مدہوشی میں مزید ردھم سے موو کرنے لگی

تھی۔ رائم خان اس کی جان لیوا ادا پہ گھائل ہوتا، اپنی دونوں
کہنیوں چھپے ٹیبل پہ جما گیا۔ وہ اپنے سر چھپے ڈھلکائے آنکھیں
موندے سرور اٹھانے لگا تھا۔

Ahhh! Ohhh! Uhh! That's my Girl

رائم خان حلق سے گہری معنی خیز آوازیں نکالتا انزش کو
بوکھلانے پر مجبور کر گیا تھا۔۔ انزش اس کی آپے سے باہر ہوتی
حالت دیکھ کر تیزی سے خود کو روکے اس کے سینے سے لپٹی
تھی۔ اسے رائم خان کی حالتِ اضطرابی دیکھ کے خوف آیا تھا

-

رائم خان اسے رکتے دیکھ کر ہی ایک لمحے میں خود کے ساتھ
پلٹ کے انزش کو احتیاط سے ٹیبل پہ لٹائے خود اس کے اوپر آیا
تھا۔

وہ انتشاری کیفیت میں پھر سے اس میں داخل ہوتا، اپنے لذت سے بھرپور لمحات کا سلسلہ پھر سے شروع کر گیا تھا۔
انزش نے ٹیبل کے کناروں کو مضبوطی سے جکڑ کر، اس کی طوفانی شدتوں کا سسکاریاں بھرتے ہوئے مقابلہ کرنے لگی تھی

--

اوپر چاند اور ستاروں سے بھرا آسمان بھی ان کے شدت سے
بھرپور ملن پر شرما گئے ہونگے۔۔

رائم خان ہر لمحہ اس پہ دیوانہ وار، گرفت مضبوط کرتا انزش کے
نازک کے نازک وجود کو پوری رات کیلئے اپنے حصار میں قید کر
گیا تھا۔

(تین سال بعد)

رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہر ذی روح اپنے نرم بستروں میں دہکی نیند کے مزے لے رہی تھی لیکن کچھ انسان اپنے خالق سے سجدے میں محو گفتگو تھے اور کچھ اس کے حضور پیش ہونے کی نیت کر رہے تھے۔

تہجد کا ٹائم تھا۔ جب دمیر خان کی اچانک آنکھ کھلی۔۔۔ اس نے اپنی نیم کھلی آنکھوں سے وال کلاک پہ ٹائم دیکھنے کی کوشش کی لیکن کمرے میں روشنی مدہم ہونے کی وجہ سے وہ ٹائم صحیح سے دیکھنے سے قاصر تھا، پھر اس نے اپنی نیند سے بھری آنکھیں آدھی وا کرتے ہوئے سائیڈ ٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے، اپنا فون اٹھانے کیلئے جیسے ہی اپنا دائیں ہاتھ آگے بڑھایا تو اس کے بازو پہ سویا ننھا سا وجود نیند میں کسمسا اٹھا۔

دمیر خان اپنے بازو پہ سوئے وجود کو حرکت کرتا دیکھ کے فوراً
اپنی پوری آنکھیں کھول کے اپنے ہاتھ کو وہی ساکت کر گیا تھا۔
اس کے بازو اور سینے دونوں جگہ پہ دو نازک اجسام کا وزن تھا۔
وہ دونوں اس کے سینے اور بازو سے لپٹے چھوٹی چھوٹی سانسیں
بھرتے نیند کی وادیوں میں گم تھے۔۔

وہ دونوں اس قدر دمیر خان کے چوڑے وجود میں ضم تھے۔
ایک نظر دیکھنے پر وہ اس کے وجود کا حصہ معلوم ہو رہے تھے

--

دمیر خان ایک نظر دونوں کی طرف دیکھتا بے ساختہ مسکرا دیا۔
اسکی ہر صبح کی شروعات ان دو حسین چہروں کو دیکھ ہوتی تھی،
جن پہ پہلی نظر پڑتے ہی اس کے لب اور روح خوشی
سے جھوم اٹھے تھے۔۔

وہ احتیاط سے پہلے زربخت کو اپنے سینے سے ہٹا کے چھپے تکیے پہ
کرتا پھر اپنے بازو پہ سوئے معصوم سے وجود کو بے حد آہستگی
سے اپنے بازو سے ہٹاتا زربخت کے ساتھ لیٹا گیا تھا۔ وہ اپنے
دونوں ہاتھ بیڈ پہ جما کے اٹھتا، بیڈ سے نیچے اترتا تھا۔

دمیر خان نرمی سے اپنے دونوں جان سے عزیز پیاروں پہ کمفرٹر
دیتا، نیچے جھک کر باری باری ان کو اپنے لبوں کے لمس سے
نواز گیا تھا۔۔

وہ اپنے منہ پہ ہاتھ رکھ کر جمائی روکتا نیچے جھک کر سائیڈ ٹیبل
سے فون اٹھائے ٹائم دیکھ گیا۔

ٹائم دیکھتے ہی وہ فون واپس ٹیبل پہ رکھتا اپنے پیروں میں جوتا
اڑیے واشروم کی طرف بڑھ گیا۔

دمیر خان پانچ منٹ میں ہی وضو کر کے باہر آتا ریک سے جائے
نماز اٹھائے کے فرش پہ بچھاتا سر پہ ٹوپی لئے اپنے کپڑے
درست کرتے ہی تہجد کی نماز کی نیت باندھ گیا۔
دمیر خان دلجمعی سے تہجد کے نوافل ادا کرنے میں مشغول ہو
گیا۔

اس کا چہرہ پرسکون اور روشنی میں چمک رہا تھا۔۔
نوافل ہمیشہ دمیر خان اپنے کمرے میں ہی ادا کرتا تھا کیونکہ اس کو
اپنے کمرے کے علاوہ کہیں اور تہجد پڑھنے کی عادت نہیں تھی۔
بابا! بابا زان۔۔۔ ایک باریک معصوم سی آواز کمرے میں گونجی
تھی۔

نوافل میں مشغول دمیر خان کی توجہ اس آواز پہ بھٹکی تھی۔

بابا زان۔۔۔ اس معصوم آوازیں اب لرزش تھی جیسے وہ
رونے کی تیاری پکڑ رہا ہو۔ اور اگلے ہی لمحے زربخت کے ساتھ
لیٹا ننھا سا وجود اپنے گلے کا سپیکر پھاڑ کے رو دیا تھا۔
بابا زان! وہ اپنی بند آنکھوں سے ہاتھ پاؤں مارتا کسی کو تلاشتے
ہوئے اونچی آوازیں رونے لگا تھا۔ اس کے ساتھ سوئی
زربخت فوراً اس کے رونے کی آواز سنتی ہڑبڑا کے اٹھی تھی۔
کیا ہوا میرے بیٹے کو؟۔۔۔ زربخت نیند میں جھولتی نرمی سے
اس معصوم کے گال پہ لب رکھتی استفسار کرنے لگی۔
میلے بابا زان تاں اے؟ (میرے بابا جان کہاں ہیں) وہ معصوم
سا بچہ اپنی بند آنکھوں میں لب لب پانی لئے روتے ہوئے بولا
تھا۔

وہ رہے میرے بیٹے کے بابا! جاؤ چلے جاؤ بابا کے
پاس۔۔۔ زربخت اسے اٹھا کے سیدھا بیٹھاتی دمیر خان کی
طرف جانے کا اشارہ کرنے لگی۔

وہ بچہ اپنی نیند سے بھری شہد رنگ آنکھیں کھولتا سامنے کی
طرف دمیر خان کو دیکھتے ہی روتے ہوئے ہنس دیا۔
دمیر خان اس لئے تہجد یہاں پڑھتا تھا کیونکہ اس کے بیٹے کو ایک
منٹ بھی اس کے وجود کی خوشبو اپنے اندر اتارے بنا نیند نہیں
آتی تھی۔ وہ جتنی گہری نیند میں ہی کیوں نہ ہو، دمیر خان کے
حصار سے نکلتے ہی اس کی آنکھ کھل جاتی تھی اور پھر وہ روتے
ہوئے اپنے باپ کو تلاشتا کرنے لگ جاتا تھا اور دمیر خان کو پتہ
تھا کہ ہمیشہ کی طرح اس کے بیٹے نے اٹھ جانا ہے اس لئے وہ

نماز بالکل بیڈ کے پاس بیٹھ کے پڑھتا تھا تاکہ وہ اپنے بیٹے کی
آنکھوں کو میسر رہے اور اس کو زیادہ رونا نہ پڑے۔

بابا زان (بابا جان)۔۔۔ وہ بچہ تیزی سے اپنے ہاتھوں اور پیروں
کے بل رینگتا بیڈ سے اتر کے دمیر کی طرف بڑھا۔

زربخت اس کو احتیاط سے بیڈ سے اترنا دیکھ کے پھر سے اپنے
چہرے پہ کمفرٹر کرتی لمبی تان کے سو گئی تھی کیونکہ وہ جانتی
تھی، دمیر اس کو سنبھال لے گا۔

وہ بچہ اپنے ننھے منے قدم اٹھاتا دمیر خان کے پاس جا پہنچا جو کہ
اب سجدے کی حالت میں تھا۔

بابا۔۔۔ وہ چہک کے ایک جست میں اپنے باپ کی پیٹھ پہ
چڑھتا، اپنے آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ کھلکھلا اٹھتا تھا۔

اس کی کھلکھلاہٹ پہ سجدے میں گرے دمیر خان کے لب
نا محسوس انداز میں مسکراہٹ میں ڈھلے تھے، اس پھول کا وزن
اپنے وجود پہ محسوس کرتے ہوئے اس کی روح تک کو سکون ملا
تھا۔

دمیر خان کو اس کی وجہ سے اپنے سجدے لمبے کرنے پڑتے تھے
کیونکہ ہمیشہ نماز میں وہ سجدے کی حالت میں اس کی گردن، پیٹھ
اور گود میں بیٹھ جایا کرتا تھا۔

وہ اب دمیر خان کی پیٹھ سے اتر کے اس کے سامنے آچکا تھا۔
اس کے اترتے ہی دمیر خان دوزانوں ہو کے بیٹھتا التحیات
پڑھنے لگا تھا۔

وہ بچہ کھلکھلاتے ہوئے اس کی طرف بڑھ کر کبھی دمیر خان کا
کان اپنے منہ میں چباتا تو کبھی اس کے گال اور آنکھوں کو اپنے
لبوں اور ہاتھوں سے چھونے لگتا۔

وہ دو سال کا بچہ بے حد پیارا تھا۔ اس کے چہرے کا ایک ایک
معصوم نقش دمیر خان پہ تھا یہاں تک کہ آنکھیں بھی، وہ شکل
و صورت سے اپنے باپ پہ گیا تھا لیکن اسکی کچھ عادتیں زربخت
پہ تھی اور کچھ دمیر خان پہ۔۔

بابا زان! اللہ۔۔ وہ اب دمیر خان کی گود میں بیٹھتا اس کی
ٹھوڑی پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کروانے لگا تھا۔
دمیر خان سلام پھیرتے ہی نیچے جھک کر پیار سے اس کے گال پہ
لب رکھتا اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔

احرار! بابا کی جان! جب بابا نماز پڑھ رہے ہو تو تنگ نہیں کرتے۔۔۔ دمیر خان اس کا چہرہ اپنی طرف کئے سمجھانے والے انداز میں بولا۔

بابا زان میں اللہ تر نے آیاتا، مزے بی اپ شات اللہ ترنا اے) بابا جان میں اللہ کرنے آیا تھا، مجھے بھی آپ کے ساتھ اللہ کرنا ہے) احرار اپنے چھوٹے چھوٹے گلابی ہونٹ مروڑتا معصومیت سے گویا ہوا۔

میرے بیٹا کو اللہ کرنا ہے؟۔۔۔ دمیر خان اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کے اپنے برابر جائے نماز پہ بیٹھاتا استفسار کر گیا تھا۔ اس کی بات سنتے ہی احرار نے زور زور سے سر اثبات میں ہلایا تھا۔۔۔

او کے! اپنا ہاتھ ایسے کرو اور اللہ سے دعا مانگو۔ دمیر خان اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پکڑ کر دعا کیلئے جوڑتا ہدایت دے گیا تھا

-

بابا زان؟ داتیا اوتی اے؟ (بابا جان! دعا کیا ہوتی ہے) اصرار اپنی شہد رنگ آنکھوں میں الجھن لئے اوپر دمیر خان کے چہرے کی طرف دیکھ گیا۔

جو چیز ہمیشہ اچھی لگتی ہے، یا جو چیز ہم پانے کی خواہش رکھتے تو ہم اللہ کے آگے ہاتھ اٹھا کے جو مانگتے ہیں اسے دعا کہتے ہیں اور پھر اللہ ہماری دعا سن کے ہماری فیورٹ چیزیں ہمیں عطا بھی کرتا ہے۔۔۔ دمیر خان محبت بھری نگاہ اپنے چاند سے بیٹے پہ ڈالتا اسے دعا کے متعلق آگاہ کر گیا۔

بابا زان! تجھ بی اپنا فیولت ماندو تو اللہ دے دیتا اے؟ (بابا
جان! کچھ بھی اپنا فیورٹ مانگو تو اللہ دے دیتا ہے) اصرار
اپنے گلابی ہونٹ وا کرتا دعا کے متعلق مزید متجسس ہو کے
سوال پوچھا تھا۔

جی میری جان! جو چیز آپ کو اچھی لگتی ہے آپ کی فیورٹ ہے
وہ آپ اللہ سے مانگو تو وہ آپ کو دے دے گا۔۔۔ دمیر خان
تحمّل سے بولا تھا۔۔۔ اصرار بہت زیادہ سوال کرتا تھا اور وہ
ہمیشہ اس کے سوالات کے جواب ٹھہرے لہجے میں خندہ پیشانی
سے دیتا تھا۔

چلو اب ہاتھ اوپر اٹھاؤ اور اللہ سے اپنی فیورٹ چیز مانگو جو آپ
کو چاہیے۔۔۔ دمیر خان پھر سے اس چھوٹے چھوٹے ہاتھ دعا
کیلئے جوڑتا دعا کرنے کا حکم دے گیا تھا۔

وہ اصرار کو ہدایت دینے کے بعد خود بھی دعا کیلئے ہاتھ اٹھا گیا تھا

--

ذا اللہ مزے دھیل شاری نین دے دو! اتی تہ وہ تہی تتم نہ او!
ذا اللہ مزے دھیل شارے پیشے دے دو! ذال اللہ مزے دھیل
شاری چاتلیت دے دو! ذال اللہ لوحان تو تجھ بی نہ دو! (یا اللہ
مجھے ڈھیر ساری نین دے دو! اتنی کہ وہ کبھی ختم نہ ہو! یا اللہ
مجھے ڈھیر سارے پیسے دے دو! یا اللہ مجھے ڈھیر ساری چاکلیٹ
دے دو! یا اللہ روحان کو کچھ بھی نہ دو) اصرار اپنے چھوٹے
چھوٹے ہاتھوں پہ سر گراتا جھولتے ہوئے اپنی معصوم مگر اونچی
آوازیں دعا مانگنے لگا تھا۔

دمیر خان جو اپنی دعائیں مشغول ہو گیا تھا۔۔ اپنے بیٹے کی دعا سنتے ہی آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں۔۔ وہ تیزی سے اپنے منہ پہ ہاتھ کے دعا ختم کرتا اصرار کے منہ پہ ہاتھ رکھ گیا تھا۔
اسے اپنے بیٹے کی دعا سن کے حیرت کے ساتھ ساتھ ہنسی بھی آرہی تھی۔ وہ اصرار کو خاموش کرواتا کن اکھیوں سے بیڈ پہ زربخت کو دیکھنے لگا جو کمبل سے منہ نکالے دونوں باپ بیٹے کو گھور کے دیکھ رہی تھی۔

باخدا! میں نے نہیں سیکھائی۔۔۔ دمیر خان نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے اس کی طرف مصنوعی معصومیت سے دیکھا۔
اسے ڈر لگتا تھا جیسے دمیر اس کے چھپے بچپن سے پاگل تھا ایسے اصرار بالکل بھی نہ ہو کیونکہ قسمت ہر دفعہ دمیر خان جیسی نہیں ہوتی۔ وہ اپنے بیٹے کے کچے دماغ کو ایسی خواہشات اور

جذبات سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ جن خواہشات کے پورا ہونے کے آثار ابھی دور دور تک نہیں تھے۔

بیٹے باپ پہ ہی جاتے ہیں لیکن مجھے اپنا بیٹا عاشق نہیں بنانا،
اسلیئے اس کو صحیح سے دعا سیکھائیں۔۔۔ زربخت سنجیدگی سے
اسکو حکم دیتی پھر سے کبھل منہ پہ کئے سو گئی تھی۔ وہ پچھلے تین
سالوں میں کافی بدل گئی تھی، وہ اب اپنی چھوٹی چھوٹی حرکتوں
اور باتوں سے ڈرانے کی کوشش کرتی تھی اور دمیر خان اس کا
بھرم رکھتے ہوئے ڈرنے کا اداکاری بھی کر جاتا تھا۔۔۔ اس کی
معصوم سی زربخت اب کافی خطرناک ہو گئی تھی۔

اصرار بابا کی جان! ایسے دعا نہیں کرتے ہیں۔۔۔۔ وہ بیٹے کے
منہ سے ہاتھ ہٹاتا نرمی سے بولا تھا۔

بابا زان اپ نے تو تہا تا تہ اپنی فیولت چج اللہ شے ماند لو (بابا جان! آپ نے تو کہا تھا اپنی فیورٹ چیز اللہ سے مانگ لو) اصرار آنکھوں میں الجھن لئیے دمیر خان کی طرف دیکھ گیا جو ہنسی ضبط کرتے ہوتے اپنا چہرہ نیچے کئے ہوئے تھا۔

لیکن اصرار! اللہ تعالیٰ سے ایسے لڑکی نہیں مانگتے ہیں۔۔۔۔۔ دمیر خان مصنوعی سنجیدگی سے بولا تھا۔۔۔

آپ نے پھر مجھے سترہ سال کیوں مانگا؟۔۔۔۔۔ وہ اس کی بات سنتی چہرے سے کمفرٹ ہٹائے بغیر اونچی آواز میں بڑبڑائی تھی۔
تو تیا تا چو زان شے ماند تے ایس؟ (تو کیا چاچو جان سے مانگتے ہیں؟)۔۔۔۔۔ اصرار نے نا سمجھی سے سوال پوچھا۔

نہیں میرے بیٹا چاچو جان سے یہ مت مانگنا ورنہ اللہ تو دے دے گا، وہ کبھی نہیں دے گا۔۔۔ دمیر خان ہنستے ہوئے اصرار کو

اپنی گود میں لئے اوپر اٹھا تھا۔ وہ زربخت کی بات کو نظر انداز کر گیا تھا۔

بابا زان! ابی تو اپ تہہ لے تے اللہ لتری نئی دیتا (بابا جان! ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ اللہ لڑکی نہیں دیتا) اصرار نے فوراً باپ کی بات اسے یاد دلائی تھی، وہ اس کی بات بہت غور سے سنتا اور پک کرتا تھا۔

ہا ہا ہا! اصرار میری جان ابھی آپ بہت چھوٹے ہیں جب بڑے ہو جاؤ گئے تو تب لتری (لڑکی) اللہ سے مانگنا۔۔۔ دمیر خان نے ہنستے ہوئے اس کے گال پہ لب رکھ گیا تھا۔۔۔

وہ اس وقت اپنی معصوم باتوں اور فرمائشوں پہ اس کو بہت کیوٹ لگ رہا تھا۔۔۔

آپ میرے بیٹے کو لتریوں (لڑکیوں) کے چکر سے دور
رکھیں۔۔۔ زربخت ان کی ساری باتیں سن رہی تھی، دمیر خان
کو بیڈ پہ چڑھتے دیکھ کر کمفرٹر سے منہ نکالے تحکم بھرے لہجے میں
بولی تھی۔

ہاہاہا! زربخت کا کمفرٹر سے تھوڑا سا منہ نکال کر بات کرنے والا
انداز دیکھ کر اس بار دمیر خان خود کو قہقہہ لگانے سے نہ روک
پایا۔

دمیر خان کی ہنسی دیکھ کر سوالوں میں الجھے اصرار کی بھی قلقاری
نکلی تھی جبکہ کمفرٹر میں دبکی پڑی زربخت کی بھی ہنسی بھی بے
ساختہ تھی۔

وہ نرمی سے اصرار کو اپنی آغوش میں لئے بیڈ پہ چڑھتا اس پہ اور
خود پہ کمفرٹر اوڑھ گیا۔

اس وقت اصرار کو سلانا بہت ضروری تھا ورنہ وہ اپنے سوالوں سے دمیر خان کا دماغ گھوما کے رکھ دیتا۔ تھوڑی ہی دیر میں اصرار اپنے باپ سے معصومیت بھرے سوال کرتا پھر سے نیند میں ڈوب گیا تھا۔۔

اس کے نیند میں جاتے ہی دمیر خان آگے بڑھ کر زربخت کی کمر میں ہاتھ ڈالے اپنے سینے سے لگا گیا تھا۔

میلی پالی لتری! (میری پیاری لڑکی)۔۔۔ دمیر خان بیٹے کی طرح بولتا شرارت سے زربخت کے گال پہ دانت گاڑھ گیا تھا۔

مز شے دول لہیں میں بری تطنرات اوں (مجھ سے دور رہیں میں بڑی خطرناک ہوں) زربخت بھی اس کے انداز میں بولتی دمیر خان کے سینے پہ اپنے نوکیلے دانت ثبت کر گئی تھی۔

دمیر خان اپنے اور اس کے توتلے انداز پہ قہقہہ لگانا چاہتا تھا مگر
احرار کی نیند کا خیال کرتے ہوئے وہ زربخت کی گردن میں منہ
دئیے اپنی ہنسی ضبط کر گیا تھا۔

یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ یہ دونوں ہر روز صبح سحری ٹائم احرار
کے سونے کے بعد خود احرار بنتے ہوئے توتلی زبان میں باتیں
کرتے ہوئے ایک دوسرے کو محظوظ کرتے تھے۔۔۔ سحری
میں ابھی ٹائم تھا، وہ اکثر صرف بیس منٹ بچنے پر ہی نیچے سحری
کرنے کیلئے جاتے تھے کیونکہ وہ احرار کو زیادہ اکیلا نہیں چھوڑتے
تھے، وہ ڈر جاتا تھا۔

تان! تان! (خان!) روحان ریلنگ کا سہارا لیکر سیڑھیاں چڑھتا
رائم خان کے کمرے کی جانب بڑھا۔ سحری کے بعد وہ نیچے ہی

اپنے دادا دادی کے پاس رک جاتا تھا اور پھر انزس اور رائم
خان کے آفس جانے سے پہلے ان کے کمرے میں جا کے ان سے
مل آتا تھا۔

روحان خان بھی دو سال کا حسین مغروری بچہ تھا۔ وہ بالکل اپنی
ماں انزس جیسا تھا۔ اس کی ساری شخصیت اپنی ماں جیسی
تھی۔ سب پہ رعب بنا کے رکھنا، خود کو مسٹر پرفیکٹ کہنا، اپنی
لک کو لیکر صرف دو سال کی عمر میں بے حد کوششیں، پھرتیلا اور
ہوشیار بچہ تھا۔

اس کے باقی سارے نقش اپنی ماں جیسے تھے بس آنکھیں رائم
خان پہ تھی۔ خوبصورت کرسٹل گرے آنکھیں اس کی لک اور
معصومیت کو مزید نکھارتی تھی

خان! چھوڑیں مجھے روحان آرہا ہے۔۔۔۔۔ روحان کی آواز
سنتے ہی انزس فوراً ہڑاتے ہوئے اس کی گرفت سے نکلنے کی
کوشش کرنے لگی جو اس کے سینے پہ سر رکھ کے لیٹا اس کو مکمل
اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھے۔

یہ میری راتوں کا دشمن! مجھے دن میں بھی دو گھڑی سکون نہیں
لینے دیتا۔۔۔۔۔ وہ جھنجھلاتے ہوئے اس کے سینے سے سر ہٹا
کے تکیے پہ رکھتا خفگی سے بڑبڑایا۔

کیا ہو گیا ہے خان آپ کو! وہ آپ کا بیٹا ہے۔ دشمن تو مت کہیں
آپ اس کو۔۔۔۔۔ انزس اپنی ہنسی ضبط کرتی تیزی سے اٹھ کے
بیٹھتی دوپٹہ اوڑھنے لگی۔۔۔۔۔ روحان کے آنے کی وجہ انزس کو
ایک فائدہ ہو گیا تھا، وہ رائم خان کی جنونی شدتوں سے زیادہ دیر
بچی رہتی تھی کیونکہ روحان اپنی ماں کے بغیر نہیں سوتا تھا۔ اس

لئے رائم خان کو اسے اپنی قربت میں لینے کا موقع بہت کم ملتا تھا اور جب ملتا تھا تو جلدی رہائی بخشنی پڑتی تھی کیونکہ روحان انزس کی ایک منٹ غیر موجودگی پہ رو رو کے پورا محلہ اکھٹا کر لیتا تھا۔

رائم خان ہمیشہ اس کے رونے سے ڈرتا تھا کیونکہ وہ جب رونا شروع کرتا تھا تو پھر اسے چپ کروانا دنیا کا مشکل ترین کام بن جاتا تھا۔۔

تان!۔۔۔ روحان دھڑام سے کمرے کا سارا دروازہ کھولتا دنگ انداز میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔

خان کی سوتن کیا ہوا ہے؟۔۔۔ رائم خان اپنا چہرہ تکیے سے نکال کر دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔

تان! مزے حنا پاش لے تلیں (خان! مجھے حنا کے پاس لے
چلیں) روحان اپنے بالوں کو آنکھوں سے چھپے ہٹاتا سنجیدگی سے
حکمیہ لہجے میں گویا ہوا۔ روحان کے بال کافی ہیلتھی تھے جو
کانوں سے نیچے تک آتے تھے۔ اور بال کٹوانا اسے سخت ناپسند
تھا۔ اس لئے اس کے بال دوسرے بچوں کی نسبت بڑے
تھے۔

دیکھ رہی ہو! کیسے باپ پہ آرڈر کرتا ہے۔ جیسے باپ سے بات نہ
کر رہا ہو بلکہ چھوٹے بھائی سے مخاطب ہو۔۔۔ رائم خان ایک
سخت نظر انزس پہ ڈالتا اسے روحان کے اندازِ مخاطب سے آگاہ
کرنے لگا۔

بچہ ہے ابھی تو!!! بڑا ہو گیا تو آپ کی عزت بھی کرے گا اور
آپ کو بابا بھی بولے گا۔۔۔ انزش پر امید می سے بولتی ایک
محبت بھری نگاہ روحان کے معصوم چہرے پہ ڈال رہی تھی۔
تان اتھیں! مزے آدای حنا پاش دانا اے (خان اٹھیں! مجھے آج
ہی حنا پاس جانا ہے) روحان بیڈ کے قریب آتا کمفرٹر کھینچتے
ہوئے رائم خان کو بیڈ سے اٹھانے لگا تھا۔

روحان! میرا بچہ! ادھر مورے کے پاس آؤ۔۔۔ انزش اس کو
اپنی طرف متوجہ کرواتی پیار سے بولی۔

مولے! تان تو بولو مزے میلی حنا تے پاش لے تلیں نہ)
مورے! خان کو بولو مجھے میری حنا کے پاس لے چلیں نہ)
روحان جب سے کمرے میں آیا تھا ایک ہی رٹ حنا کے پاس
جانے کی لگائی ہوئی تھی۔

جس حنا کے پاس جانے کی توں ضد کر رہا ہے نہ اس کے باپ کو
پتہ چلا تو تیری باچیں رگڑ دے گا۔ اس کو میری حنا کہنا بند کرو اور
مجھے پہلے بابا بولو پھر لے کے جاؤں گا۔۔۔ رائم خان نے اس
کو گھورتے ہوئے شرط رکھی تھی۔

جب سے روحان نے بولنا شروع کیا تھا رائم خان کے کان ترس
گئے تھے اس کے منہ سے بابا لفظ سننے کیلئے، روحان نے اپنی
ماں سے خان نام سنا تھا اس لئے وہ بھی اس کو صرف خان کہہ
کے ہی پکارتا تھا۔۔۔ اسے عادت ہی نہیں تھی، رائم خان کو بابا
بولنے کی۔

تش تو بولوں؟۔ روحان نے نا سمجھی سے بیڈیہ چڑھتے ہوئے
سوال کیا تھا۔

ابے ٹڈے تجھے میں نظر نہیں آ رہا؟ باپ ہوں تیرا میں! مجھے بابا
بول۔ رائم خان تکیے سے سر اٹھا کے چھبے بیڈ کراؤن کے ساتھ
ٹیک لگائے مصنوعی خفگی سے بولا تھا۔

تب شے؟ روحان انزش کی گود میں جا کے بیٹھتا، چہرے پہ الجھن
لئیے سوال کر گیا۔

کیا مطلب کب سے؟ رائم خان بھی اسی کے انداز میں سوال
کر گیا۔

اپ میلے بابا تب شے بنے او؟ اپ تو تان او (آپ میرے بابا
کب سے بنے ہو؟ آپ تو خان ہو) روحان چھوٹے چھوٹے گلابی
ہونٹ مروڑ کے بولتا رائم خان کی آنکھیں حیرت سے پھیلانے پہ
مجبور کر گیا جبکہ اس کی بات سن کے انزش کو ہنسی کا دورہ پڑا
تھا۔

بیٹا! تیرے اس دنیا میں آنے سے پہلے میں تیرا باپ تھا۔ میرا
وجود ہی وسیلہ بنا ہے تجھے اس دنیا میں لانے کا! اس لئے عزت
سے مجھے بابا بول ورنہ اپنی حنا کے پاس جانا بھول جا۔۔ رائم
خان بیوی کو سخت گھوریوں سے نوازتا روحان سے رعب دار
لہجے میں مخاطب ہوا تھا۔

تو اپ تو واں نئی تے واں میں تو داڑی میں مولے شات ایاتا دنیا
میں مزے پھیری شوڑتے دئی تی اسپتال۔۔ (تو آپ تو نہیں
تھے وہاں! میں تو گاڑی میں مورے ساتھ آیا تھا دنیا میں، مجھے
فیری چھوڑ کے گئی تھی ہاسپٹل) روحان حیرانگی سے اپنے
ہاتھوں اور منہ کے زاویے بنا کے بولتا اب صحیح معنوں میں اس
کی آنکھیں تعجب سے پھیلا گیا تھا۔

واٹ دا ہیل!۔۔۔ رائم مصنوعی غصے سے تکیہ پٹکتا رنجیدگی

سے بولا تھا۔۔۔

تم نے اسے یہ سب کچھ سیکھایا ہے نہ؟۔۔۔ وہ اب انرش کو
اپنی تپتی نظروں کے حصار میں لیتا تیکھے لہجے میں سوال کر گیا۔
وہ جان بوجھ کے لہجے کو تیکھا بنائے ہوئے تھا۔ ہاں روحان کی
باتیں اسے چھٹکے پہ چھٹکے دے رہی تھی لیکن وہ اس کی
معصومیت بھری باتیں اندر سے انجوائے کر رہا تھا مگر اسکے دل
میں اپنے پیٹے کے منہ سے اپنے لئے لفظ بابا سننے کی خواہش بھی
شدید تھی۔

میں نے اس کو کچھ غلط نہیں بتایا تھا۔ بس یہی بتایا تھا کہ اس کو
ہاسپٹل میں فیری چھوڑ کے گئی تھی اور میں اس کو گاڑی پہ گھر

لے کے آئی تھی۔۔۔ انزش اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی
تھی۔

حلانکہ اندر سے اسے رائم خان کی بیچارگی سی حالت مزہ دے رہی
تھی۔

تم نے صرف اپنا کیوں بتایا؟ میرا بھی تو بتاتی میں بھی تو گیا تھا۔
اب جب تک یہ مجھے بابا نہیں بولے گا، تم دونوں کا گھر سے نکلنا
بند!۔۔۔ رائم خان بھی آج ضد لگائے بیٹھا تھا آج اس نے
روحان کے منہ سے بابا سن کے ہی رہنا تھا۔

جس دن ہم ہاسپٹل سے ڈسچارج ہو کے گھر آئے تھے، اس دن
تم ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ انزش اسے یاد دہانی کرواتی ناک
سکوڑتے ہوئے بولی تھی۔۔۔

او کے! روحان بیٹا! کام ختم کرو، مجھے بابا بولو پھر میں سوچتا ہوں
تمہیں شام کو تمہاری حنا کے پاس لے جانے کا۔۔۔ رائم خان
حتمی انداز میں گویا تھا وہ بحث میں کبھی بھی ان دونوں ماں بیٹے
سے نہیں جیت سکتا تھا۔

انرش اس کی بات سنتی تیزی سے روحان کے کان قریب اپنے
منہ لے جا کر کچھ بڑبڑانے لگی تھی۔ اس کے چہرہ پہ شرارت
کے آثار واضح تھے جبکہ روحان کا چہرہ بات سن کے تجسس سے
بھرا تھا۔

رائم خان کن اکھیوں سے ماں بیٹے کے چہرے کے تاثرات دیکھ
رہا تھا جو کہ فلوقت خطرناک لگ رہے تھے۔۔

اوتے بوتا اوں اپ تو! تو فل شنیں، اپ تو بلیت میلل ایں!
موشنل بلیت میلل مدنوں! (او کے بولتا ہوں آپ کو! تو پھر

سنیں! آپ تو بلیک میلر ہیں "ایموشنل بلیک میلر مجنو" (روحان
مشکل سے اپنے ہاتھ اکڑا کر سانسوں کے درمیان کئی بار وقفے
لیکر اپنے گلابی ہونٹوں کو مروڑتے ہوئے بولا تھا۔

وہ جو روحان کے منہ سے بابا سننے کی امید لگائے بیٹھا تھا۔ اپنے
لئے "ایموشنل بلیک میلر مجنو" کا لقب سنتے ہی اب آنکھیں
حیرت پھیلی نہیں تھیں بلکہ اچھل کے باہر آئی تھی۔ زبان کچھ بھی
بولنے سے قاصر ہوئی تھی۔۔۔ وہ چند لمحے کچھ بول نہ سکا!
وہ تحیر زدہ ہو کے اپنے دو سالہ بیٹے کی ذہانت اور مہارت کو
دیکھ رہا تھا جس نے ایک بار میں ہی اتنا مشکل لفظ بول کے
باپ کو اندر تک سلگایا تھا۔

زرا تمیز نہیں سیکھائی تم نے اس کو کہ کیسے باپ کے ساتھ پیش
آنا ہے؟ آج باپ کو ایموشنل بلیک میلر مجنو بول رہا ہے، کل کو

کچھ اور بولے گا۔۔۔ انزش کا ہنسی ضبط کرنے کی وجہ سے سرخ
ہوتا چہرہ دیکھتا رائم خان کلس کے بولا۔۔۔ اسے زیادہ غصہ
روحان کی باتوں کی بجائے انزش کی اسے چیرانے والی ہنسی پہ
آ رہا تھا۔

تان! اپ بابا لدتے ای نئی او اپ تو ہینڈ شم این! می اپ تو تیشے
بابا بولوں؟۔ (خان! آپ بابا لگتے ہی نہیں ہو، آپ تو ہینڈ سم ہیں
میں آپ کو کیسے بابا بولوں؟) باپ کا غصے سے سرخ ہوتا چہرہ دیکھ
کر روحان افسردگی اور دلجوئی سے بولتا اس کو اپنے لب و لہجے
سے پگھلنے پر مجبور کر گیا تھا۔

ہاں بابا نہیں لگتے ہیں، یہ ایموشنل بلیک میلر مجنوں لگتے ہیں۔۔۔
اس نے رائم خان کے چہرے پہ چھائے خوشی کے بادل دیکھ
کر فوراً روحان کی نصیحت کی تھی۔ ناجانے کیوں آج انزش کا موڈ

اپنے خان کو تپانے کا تھا اور وہ اسے تپا کر بھرپور اس کی حالت
کا مزہ لے رہی تھی۔۔

رائم خان کا غصے سے سرخ ہوتا چہرہ انزس کو آج کافی وقتوں کے
بعد محظوظ کر رہا تھا اور وہ اس کی حالت انجوائے کرتی اب
ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

ہنس لو جتنا ہنسنا ہے۔ آج رات چاند نظر آنے دو تمہاری ساری
ہاہا! کو اہہہ اہہہ میں نہ بدلاتو میرا نام رائم خان بارکزی نہیں۔
اگر میری طوفانی شدتوں سے بچنا چاہتی ہو تو اسے شام تک بابا
سیکھا کے رکھنا ورنہ تم تو گئی آج۔۔۔ رائم خان تپے ہوئے
لہجے میں انزس کے کان کے قریب جھک کے سرگوشی نما آواز
میں بولتا بیڈ سے اتر۔ اسے اب روحان اور انزس دونوں کی ہنسی
مزید سلگا رہی تھی۔ وہ ایک خفت بھری نگاہ اس پہ ڈالتا پیرٹکتے

ہوئے واشروم میں بند ہوا تھا جبکہ اس کے یوں لڑکیوں کی طرح ناراض ہونے والے انداز پہ انزس کا بلند قہقہہ کمرے کی زینت بنا تھا۔ اس نے اس کی دھمکی کا اثر ہی نہیں لیا تھا۔

انزس کے ساتھ روحان بھی نا سمجھی ہنس دیا۔۔۔ روحان وہی کرتا تھا جو اس کی ماں کرتی تھی۔ وہ ان دونوں کی ہنسی کی آواز سن کر بے ساختہ واشروم میں کھڑا مسکرا دیا۔ وہ سارے رعب جھاڑنے اور ناراضگی کے ڈرامے کر رہا تھا۔ بھلا وہ اپنے جان کے ٹکڑے بیٹے اور بیوی سے ناراض ہو سکتا تھا؟

مولے! تان نالاج اودے؟ (مورے! خان ناراض ہو گئے؟
(۔۔۔۔۔ روحان ایک دم سنجیدہ ہوتا اپنی ماں سے سوال کر گیا

اس نے رائم خان کا خفا چہرہ بخوبی نوٹ کیا تھا۔

نہیں مورے کی جان! بابا ہم سے ناراض نہیں ہو سکتے۔۔
انزس پیار سے اپنے پیٹے کی کرسٹل گرے آنکھیں چومتی فخریہ
انداز میں بولی کیونکہ وہ جانتی تھی، وہ کچھ بھی کر لے اس کا خان
کبھی بھی اس سے ناراض نہیں ہو سکتا۔

وہ زور سے روحان کو اپنے سینے میں بھینچے بیڈ سے اٹھ کے
ڈریسنگ روم کی طرف بڑھی گئی تاکہ روحان کو چینج کروا سکے
۔۔ وہ رائم خان کو بعد میں اپنے طریقے سے منانے اور خوش
کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ ابھی اس کا اور رائم خان کا روزہ
تھا، اس لیے وہ روزے کی حالت میں اس کے پاس جا کر اپنے
خان کے جذبات نہیں ابھار سکتی تھی۔

ولیمے کی تقریب ختم ہوتے ہی رائم خان اور اس کے والدین اپنی
بہوانزش کو لئے اپنے گھر کیلئے نکل گئے تھے۔ دمیر خان نے
خود کاظم شاہ اور باقی سب مہمانوں کو عزت سے رخصت کیا تھا۔
رات کے گیارہ بج رہے تھے زربخت اس وقت اپنے دونوں پیر
صوفیہ فولڈ کر کے بیٹھی کھانا کھانے میں مگن تھی جب وہ کمرے
میں داخل ہوا تھا۔

وہ اس وقت اپنی میکسی، جیولری، اور میک اپ کے ساتھ کھانے
میں مشغول تھی، اسے بھوک ہی اتنی لگی تھی کہ وہ چیخ کئے بنا
ہی کھانا کھانے لگ گئی تھی۔ تقریب میں تو انزش کی بے باک باتیں
سن سن کے زربخت نے نظریں ہی اوپر نہیں اٹھائی تھی۔ وہ
اپنے ہاتھ گود میں رکھ کے مروڑتی بس جلدی سے تقریب ختم کا انتظار
کر رہی تھی، تاکہ جلد از جلد انزش کی بے باکیوں سے چھٹکارا حاصل

کر سکے، سارا وقت تو زربخت کو شرمانے سے فرصت ہی نہیں ملی
تھی تو پھر وہ کھانا کیا خاک کھاتی؟

دمیر خان اپنی شال گلے سے نکال کے صوفے کی پشت پہ رکھتا، ایک
دلکش مسکراہٹ لبوں پہ سجائے زربخت کی طرف بڑھتا تھا۔۔
پہلے کھانا نہیں کھایا تھا میری بخت نے؟۔۔۔ وہ اس کے قریب
بیٹھتا چاشنی بھرے لہجے میں استفسار کرنے لگا۔

نہیں! تب بھوک نہیں تھی۔۔۔ زربخت نوالہ چباتی مصروف
انداز میں بولی تھی۔

اچھا! دمیر خان نرمی سے اس کا ہیومی کام دار دوپٹہ پنز سے آزاد کر
کے اس سر سے اتارتا سائید پہ رکھ گیا تھا۔۔
آپ نے کھانا ہے؟۔۔ اس نے ایک نوالہ بنا کے اپنے منہ کی طرف
لے جانے کی بجائے دمیر کی طرف بڑھایا تھا۔

نہیں میں فل ہوں۔ دمیر خان اپنے ہاتھ سے وہ نوالہ اس کے منہ میں ڈالتا شائستگی سے بولا تھا۔ وہ اس سے زیادہ گفتگو کرنے سے گریز کر رہا تھا کیونکہ وہ کھانا کھا رہی تھی۔

دو تین اور نوالے لینے کے بعد زربخت کھانے کی ٹرے سائیڈ پہ کرتی اپنے ہاتھ ٹیشو سے صاف کرتے ہوئے پانی کا گلاس اٹھا کے لبوں کے ساتھ لگانے لگی۔

بہت حسین لگ رہی تھی آج تم۔۔ مگر تمہارے چہرے پہ چھائی اداسی تمہاری خوشی کو غارت کر رہی تھی۔ کیوں اداس تھی تم؟۔۔۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں الجھائے ان کو ہیرپنز اور ربن کی قید سے آزاد کرتا کھوجتی نگاہوں سے پوچھ رہا تھا۔

اس نے تقریب میں اس کے چہرے کی اداسی بخوبی نوٹ کی تھی مگر وہ اس وقت سوال نہیں کر سکا کیونکہ اس وقت اس کے پاس ساری لڑکیاں تھی اور بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

نہیں تو! میں اداس تو نہیں تھی۔ بس بیٹھ بیٹھ کے تھکن ہو رہی
تھی۔ تو اس لئے شاید آپ کو لگا ہو کہ میں اداس ہوں۔۔۔ وہ
نظریں جھکائے بولی تھی۔

ادھر میری طرف دیکھو متاعِ من! پھوپھو کی وجہ سے اداس تھی نہ
تم؟۔۔۔ وہ ٹھوڑی سے پکڑ کے اس کا چہرہ اوپر کرتا انکشاف کر گیا
تھا۔

زر بخت نے اسے چونکتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ہر بار اس کی دل بات
کیسے جان لیتا تھا؟ اس نے بے ساختہ سوچا۔

ہمم! تھوڑی سی۔۔۔ دمیر خان کے اپنائیت بھرے لہجے میں
پوچھنے پر زر بخت بے ساختہ اپنے بازو پھیلانے افسردگی سے اس
کے سینے سے لگی۔

تو پھر پہلے کیوں انکار کیا تھا؟۔۔۔ وہ اس کی ادا پہ گھائل ہوتا،
مسکراتے ہوئے اس کے سر پہ لب رکھ گیا تھا۔ البتہ اس کا افسردہ
چہرہ فکر مندی میں مبتلا کر گیا تھا۔

دمیر! آپ کو خوشی ہوئی ہمارے ولیمے کی تقریب رکھنے سے؟۔۔
وہ اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے الٹا اس کے چہرے کی
طرف دیکھتی سوالیہ انداز میں گویا ہوئی۔

بہت زیادہ!! کیونکہ پہلے میں نے تمہیں دلہن بنتے نہیں دیکھا تھا لیکن
آج تمہیں اپنے لئے تیار دیکھ کے، تمہارے ہاتھوں پہ اپنے نام کی
مہندی دیکھ کے، تمہیں پورے زمانے کے سامنے اپنے نام سے
متعارف کروا کے مجھے بہت زیادہ خوشی ملی ہے۔۔۔ وہ اس کے
مہندی سے سجے ہاتھوں کو پکڑ کر باری باری چومتا سرشاری اور
مسرت کے عالم میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی اور وہ

چمکِ زربخت کو آج سب کے سامنے اپنے نام سے متعارف
کروانے کی تھی۔۔

پھر میں بھی بہت خوش ہوں! آپ خوش تو میں خوش! کیونکہ اب
مجھے پتہ چلا گیا ہے دمیر! ہم مرنے والوں کے ساتھ مر نہیں سکتے
۔۔ اب مجھے کسی کی ضرورت اور کمی محسوس نہیں ہوتی، جب
سے آپ کا ساتھ پایا ہے۔ آپ میری ساری کمیوں کو پوری کرنے
کیلئے کافی ہیں۔ آپ مجھے سارے جہاں کی خوشی دینے کے قابل ہیں،
میرے سکون، میری خوشی، میری روحانی راحت کا مرکز و محور
اب آپ ہیں۔ آپ سے منسلک ہو کے میں ہر لحاظ سے پایہ تکمیل کو
پہنچتی ہوں۔ مجھے اب کسی اور رشتے کی تمنا نہیں ہے کیونکہ آپ
میرے محرم بن کر میری زندگی کو سنوار چکے ہیں۔

زربخت کو دمیر کے علاوہ اب کچھ نہیں چاہئے۔ اور میرا دمیر مجھے
آخری سانس تک چاہیے۔۔ میں مرنا بھی آپ سے پہلے چاہتی ہوں،

کیونکہ آپ جتنا میری روح تک بس چکے ہیں، آپ سے ایک لمحے کی جدائی بھی زربخت برداشت نہیں کر پائے گئی۔۔۔ وہ زور سے اس کے سینے سے لگتی اپنائیت بھرے انداز میں بولی۔ وہ آج پہلی بار اتنا بولی تھی اور آج پہلی بار اس نے دمیر کے وجود کو اپنے لئے سانسوں کے جیسا ضروری قرار دیتے ہوئے معتبر کیا تھا۔

شش! مریں تمہارے دشمن! تم نے اور میں نے تو ساتھ مل کر جینا ہے، دنیا جہان کی خوشیاں سمیٹنی ہیں۔ تمہیں خوشیوں کا وہ جہاں دیکھانا ہے جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ہم زندگی میں ہمیشہ دو جسم اور ایک جان بن کے رہیں گے اور تمہارے لئے ہمیشہ میں کافی رہوں گا، تمہارے اور میرے درمیان ہمارے بچے بھی آکر میری محبت کو تم سے کم نہیں کروا سکیں گے۔ تم میری پہلی محبت ہو باقی سب بعد میں آتے ہیں، اور ہمیشہ آتے رہیں گے۔۔

۔ دمیر خان اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے کے اپنی گود میں شفٹ کرتا
محبت بھرے لہجے میں بولتا اس کے ماتھے پہ لب رکھ گیا تھا۔
بچے؟۔۔۔ بچوں کا نام سنتے ہی زربخت نے اٹھنے سے سوال کیا۔
ہاں بچے! ہم دونوں کے بچے بھی تو ہوں گے نہ! جو تمہاری اور
میری محبت کی نشانی ہونگے۔ کیوں تمہیں بچے پسند نہیں؟۔۔۔ وہ
اس کے چہرے پہ چھائی عجیب کیفیت دیکھ کے آبرو اچکا کر پوچھنے
لگا۔

نہیں! مجھے تو بچے بہت پسند ہیں، مجھے تو منت اور از میر بہت
پیارے لگتے ہیں، میرا دل کرتا ہے وہ ہر وقت میرے پاس رہیں
لیکن وہ چلے جاتے ہیں۔۔۔ زربخت چہک کے بولتی آخر میں
اداسی سے چہرہ جھکا گئی۔

بخت! وہ اپنے ماں باپ کے بچے ہیں۔ انھوں نے تو اپنے ماں
باپ کے ساتھ واپس جانا ہوتا نہ! اگر تمہیں بچے ہر وقت چاہئے تو

ہمیں اپنے پیدا کرنے پڑیں گے، پھر وہ ہر وقت تمہارے پاس رہیں گے۔۔ تم ان کے ساتھ کھیلنا، باتیں کرنا، پیار کرنا کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔ تمہارا جب جی چاہے گا، تم ان کو اپنے سینے سے لگا کے اپنے سچے جذبات کی تسکین کر سکتی ہو۔۔ دمیر خان اس کا ہاتھ سیدھا کھول کے اپنا مہندی سے سجا نام اسکی ہتھیلی پہ دیکھتے ہی وہاں لب رکھتا زو معنی انداز میں بولا تھا

لیکن دمیر! وہ تو بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، میں ان کو کیسے سنبھالوں گی؟ مجھے ڈر لگتا ہے۔۔۔ زربخت اس کی بات کا مطلب سمجھتی اس کے سینے میں منہ گھسیڑے شرم اور معصومیت کے ملے جلے تاثرات سے بولی تھی۔

میرا روشن بخت! میں ہوں سب سنبھالنے کیلئے، میں سب کو پال لوں گا! بس تم جلد از جلد مجھے ایک عدا اپنی کاربن کاپی دینے کی تیاری پکڑو کیونکہ میں جلد از جلد اپنے پیار کی نشانی کو اپنی بانہوں میں

بھرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ دمیر خان اس کی گردن پہ لب رکھتا مخمور
لہجے میں بولتا اس کو ایسے ہی اپنی گود میں لئے اوپر اٹھاتا تھا۔
وہ احتیاط سے اسے ڈریسنگ ٹیبل پہ بٹھا کر چھپھٹا ہٹا۔۔۔ زربخت کے
چہرے پہ شرم کی لالی بکھری ہوئی تھی۔
دمیر خان اس کی ساری جیولری اتار کے سائیڈ پہ رکھتا ایک جست
میں اپنی قمیض اتار کے دور اچھال گیا تھا۔
وہ اس کا چوڑا سینہ دیکھتے ہی گلنار ہوتی نگاہیں جھکا گئی تھی کیونکہ اس
کے پورے سینے پہ اس کے ناخنوں اور دانتوں کے نشانات ثبت
تھے۔۔۔

دمیر خان معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا سوچ
بورڈ کی طرف بڑھ کے کمرے کی تیز روشنی غارت کر گیا تھا۔
وہ واپس زربخت کے پاس آتا اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے ایک دم سے
اسکے لبوں پہ جھکا تھا۔

وہ نرمی سے اس کے لبوں کو چومتا چھپے سے اس کی میکسی کی زپ
کھسکا گیا تھا۔

وہ اس کا چہرہ تھوڑا ترچھا کر کے اس کے دونوں لبوں کو جذب کرتا
شدت سے سک کرنے لگا تھا۔ زربخت نے اس کی شدت بڑھتے
ہی فوراً اس کو برہنہ کندھوں سے تھاما تھا۔۔

دمیر خان اس کے کندھوں سے میکسی نیچے سرکاتا اس کی دھڑکنوں کو
تھوڑا پردے سے آزاد کرتا انہیں اپنی مٹھی میں جکڑنے لگا تھا۔

وہ زربخت کی خوشبودار سانسیں خود میں اتارتا بے خود ہو رہا تھا۔۔
وہ تیزی سے اس کے لبوں کی ساری نمی سک کرتا، اضطرابی کیفیت
میں اس کے سینے پہ اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھا گیا تھا۔۔

زربخت نے اپنی سانسیں گھٹتی محسوس کرتی، اس کے برہنہ کندھے
پہ اپنے نوکیلے ناخن پیوست کئے تھے۔

دمیر خان اس کی مدہم ہوتی سانسیں اور اپنے کندھے پہ جلن محسوس کرتا فوراً اس کے لبوں کو آزادی بخش گیا۔ وہ تیز تیز سانسیں بھرتا دوپل میں ہی زربخت کے اوپری دھڑ کو ہر پردے سے آزاد کر چکا تھا۔

اہہ! ہر بار اپنے خم دار خوبصورتی سے مجھے پاگل کر دیتی ہو

بخت!۔۔۔ دمیر خان آنکھوں میں خمار کی سرخی لئیے اس کی سینے کی ابھری نازک ساخت پہ ہاتھ مسلتا، ایک دم انہیں اپنے لبوں میں دبائے ان کی نازکی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ جو گہری سانسیں لیتی خود کو نارمل کر رہی تھی، اس اچانک اتقاد پہ سسک اٹھی تھی۔۔۔

وہ اس کے بالوں میں انگلیاں الجھائے، آنکھیں موندے دمیر خان کے لبوں اور دانتوں کا لمس اپنی دھڑکنوں پہ برداشت کرنے لگی تھی۔۔۔

وہ ایک دم سے اس کی نازک ساخت کو اپنے لبوں اور دانت میں کھینچ کے چھوڑتا اس کو کراہنے پہ مجبور کر گیا تھا۔

وہ آنکھوں میں خمار اور ملن کی تڑپ لئے خود اور زربخت کو آخری
پردے سے بھی آزاد کر گیا تھا۔

وہ بے باکی اپنا ہاتھ اس کی کلوز تھائیز کے درمیان فورس سے دیتا
اپنی ایک ہی بے باک موممنٹ سے اس کی ٹانگوں میں فاصلہ قائم
کر گئے تھا۔ اس نے مچلتے ہوئے اس کا ہاتھ دور ہٹانا چاہا مگر دمیر
خان نے اپنی موممنٹ نہ روکی۔ زربخت نے اب کی بار مدہوشی
میں اپنے لب کاٹے۔

اپنے کھڑے ہونے کی جگہ بنتے دیکھ کر ہی دمیر خان اپنا ہاتھ اس کی
تھائیز سے ہٹاتا خود کو ایڈجسٹ کرنے لگا۔ وہ گہری سانسیں بھرتا
اپنا لمس کا دباؤ اس کی انر تھائی پہ دیتے ہی بے صبری سے اس میں
اترا تھا۔

ابہہ دمیر! اس کی اچانک خود میں شمولیت پر زربخت کی کراہ بے
ساختہ تھی۔

بخت۔۔۔ دمیر خان آگے بڑھ کر اس کے ماتھے پہ لب رکھتا اس
کے گھٹنوں کے نیچے سے اپنے ہاتھ گزار کے بانہوں کے گرد لپیٹ
کے اوپر کی طرف اٹھاتا اس میں آخری حد تک شامل ہوا تھا۔۔
وہ اپنی چند منٹ کی محنت سے ہی زر بخت کو اندر تک جھنجھوڑ کے
رکھ گیا تھا۔۔ وہ اپنی حرکت میں تیزی لائے جنونی ہو رہا تھا۔
اہہہہ! امم! دمیر۔۔۔ وہ اپنے دونوں بازوؤں اس کے گردن کی گرد
حائل کرتی سسکتے ہوئے اسے برداشت کرنے لگی تھی۔
دونوں کے وجود آپس میں ٹکرانے کی آواز کے ساتھ ساتھ زر بخت کی
سسکیاں اور دمیر کی خان کی بھاری تیز چلتی سانسوں کا شور پورے
کمرے میں ارتعاش پیدا کئے ہوئے تھا۔
اہہہہ! تم۔۔۔ نشے۔۔۔ جیسی۔۔۔ ہو۔۔۔

تم۔۔۔ میں۔۔۔ اترتے۔۔۔ ہی۔۔۔ میں۔۔۔ ہوش۔۔۔ سے۔۔۔
بیگانہ۔۔۔ ہو۔۔۔ جاتا۔۔۔ ہوں۔۔۔ دمیر خان اپنی پھولی سانسوں

کے درمیان بولتا، اس کی گردن کی پہ بائٹ کرتے ہوئے وہاں کی
سکن سک کرنے لگا تھا۔۔

وہ تیز رفتار سے خود کو موو کرتا زربخت کے اندر سفر کرتا جا رہا تھا۔
وہ ہر لمحے بے خود اور آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

وہ جنونی ہوتا اس کے لبوں پہ دانت گاڑھ کر نیچے اس کے نازک دل
کے مقام پہ جھکا تھا۔۔

ومیاسوں کی طرح اس کی حساسیت کو اپنے لبوں میں دبا کے کھینچتا
جنونیت اور جوش کی آخری حد تک پہنچ گیا تھا۔

ابہہ! امم! دمیر! میری۔۔ کر۔۔ چھپے۔۔ لگ۔

رہی۔۔ ہے۔۔۔۔۔ چھپے۔۔۔۔۔ ہٹ۔۔۔۔۔ جائیں۔۔۔۔۔ چھپے۔۔۔۔۔

ٹکرانے کی وجہ سے اپنی کمر میں اٹھتا درد محسوس کرتے ہوئے
زربخت نے اس کے سینے پہ دانت گاڑھ کر اسے پکارا تھا۔۔۔

اہہ! بخت! تھوڑی۔۔ دیر۔۔ برداشت۔۔ کرو! دمیر خان تحکم
بھرے لہجے میں بولتا، اپنی کمر میں اندر کی طرف خم دئے اس کے
نازک وجود کے پردوں کو اپنے وجود سے فاش کرنے لگا تھا۔۔
وہ اسے برداشت کرتے ہوئے درد کی شدت سے اس کے کندھے پہ
دانت گاڑھے ہوئی تھی، وہ آنکھیں میچے دمیر خان کی گردن کے گرد
لیٹی اسے سہن کرنے لگی تھی۔

کافی دیر بعد زربخت کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر دمیر خان اپنی حرکت
روکے اس کو بیڈ کی طرف لایا تھا۔

ٹھیک ہو؟۔۔۔ دمیر خان اس کے پسینے سے تر چہرے پہ ہاتھ پھیر
کے اس کے ماتھے پہ عقیدت سے لب رکھتا پوچھنے لگا۔
ہمم۔۔۔ زربخت نے شکایت کرنے کی بجائے ہنکارا بھرا۔

وہ دمیر خان کا جنونی پن جانتی تھی، اس لئے وہ اس کو اب خود سے سکون لینے سے نہیں روکتی تھی۔ بلکہ ہمت سے اسے برداشت کرتی تھی۔

دمیر خان اپنا ایک گھٹنہ فولڈ کر کے بیڈ پہ رکھتا جبکہ دوسری ٹانگ نیچے زمین پہ جمائے اپنی رانوں کے درمیان زربخت کے نچلے وجود کو پھر سے ایڈجسٹ کرنے لگا تھا۔

وہ آگے جھک کر اس کے لبوں کو اپنے ہونٹوں کی گرفت میں لیتا ایک دفعہ پھر سے اس میں پورے جوش کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ زربخت اس کے لبوں سے اپنے لب آزاد کرواتی سسک اٹھی تھی۔۔

دمیر خان نرمی سے اس کے سینے پہ زبان پھیرتا اس میں سرائیت کرتا ایک دفعہ پھر سے اس میں ضم ہونے لگا تھا۔

زربخت نے اس کے جھٹکوں سے اپنے لرزتے وجود کو قابو کرنے
کیلئے دمیر خان کو بازوؤں سے جکڑا تھا۔

وہ ایک دم اس کی کمر اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑتا لب بھینچے اس
میں اپنا سارا وجود گھولنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

زربخت کی سسکیاں کمرے کی درودیوار سے ٹکراتی واپس دمیر خان
کے کانوں سے ٹکراتی اسے مزید بے قرار کر رہی تھی۔ گزرتی رات
کے ساتھ اس کی شدتیں بڑھتی جا رہی تھی اور زربخت کا نازک
وجود ان شدتوں کو صبر سے سہن کرتا نڈھال ہو رہا تھا۔

خان! پلیز بتائیں تو ہم کہاں آئے ہیں؟۔۔۔ انرش اپنی بند آنکھوں
سے پٹی ہٹانے کی کوشش کرتی فکر مندی سے تحقیق کرنے لگی۔
نہیں! نہیں! دیکھنا مت۔۔۔ ہم اپنی مطلوبہ جگہ پہنچ چکے ہیں،
تمہاری آنکھیں سے پٹی ہٹاتا ہوں، بس تھوڑا سا صبر کرو۔۔۔ رائم

خان سیٹ بیلٹ کھولتا تیزی سے انزش کو اپنی آنکھوں سے پٹی
ہٹاتے دیکھ کر ٹوک گیا تھا۔

خان! جلدی کریں۔۔۔ اب میری آنکھوں میں درد ہو رہا ہے۔ کب
سے آپ نے میری آنکھوں کو دیدار سے محروم رکھا ہوا ہے۔۔۔
وہ اپنی آنکھوں کے آگے کب سے اندھیرا محسوس کرتی جھنجھلاتے
ہوئے بولی۔

قلبِ راحت! میرے دیدار کیلئے ترس رہی ہو؟۔۔۔ رائم خان
گاڑی سے اتر کر اس کی سائیڈ آتا گاڑی کا دروازہ کھولے انزش کا ہاتھ
احتیاط سے پکڑ کر گاڑی سے باہر نکالنے لگا۔

میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔۔۔ وہ تیزی سے اپنی بات سے مکری
تھی۔ حالانکہ وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے رائم خان کا چہرہ دیکھنے کو ترس
رہی تھی۔

گھر سے نکلتے ہی اس نے اس کی آنکھوں کے آگے پٹی باندھ دی تھی
اس لئے وہ اب جھنجھلا رہی تھی۔۔

لیکن میرے کانوں نے تو سنا کہ ”خان! میں آپ کے دیدار سے
محروم ہو رہی ہوں“۔۔۔۔۔ رائم خان اسے احتیاط سے دو قدم
آگے لے کر چلتا شوخ لہجے میں گویا ہوا۔

اب کھول دوں پٹی؟۔۔۔ انرش اس کی بات کا جواب دینے کی
 بجائے اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹانے لگی تھی۔

رکو!! میں اتارتا ہوں۔۔۔ وہ آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں پہ
بندھی پٹی کھولنے لگا۔

انرش نے فوراً اپنی آنکھیں کھولیں اور سامنے کا منظر دیکھ کے اس
کی آنکھیں کھلی ہی رہ گئی تھی۔

وہ بے یقینی سے رائم خان کی طرف دیکھتی پھر سے اپنی آنکھیں
مسلتے ہوئے سامنے کے منظر کو اپنی آنکھوں میں خوشگوار حیرت
سے اتارنے لگی تھی۔

خان!! یہ سب میرے لئے ہے؟۔۔۔ انز ش بے یقینی اور الجھن
سے رائم خان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

جی میری جان! یہ سب کچھ آپ کیلئے ہی میں نے کیا ہے۔ آپ کے
علاؤہ کوئی اور ہے میری زندگی میں خاص جس کیلئے میں یہ سب کچھ
کروں گا؟۔۔۔ وہ دھیمسا مسکرا کے اس کو چھپے سے پکڑے اس
کے برہنہ کندھے پہ لب رکھتے ہوئے وہاں پہ اپنی ٹھوڑی ٹکا
گیا تھا۔۔

انز ش اس وقت سیلیولیس مون لائٹ ساڑھی میں ملبوس تھی
جس کا بلیک بلاؤز بلیک لیس تھا۔ بلاؤز پورا سلور پرلرز سے بھرا تھا۔
انز ش کے ہاتھوں میں بلیک اور سلور چوڑیاں، گلے میں رائم خان

کی طرف دیا گیا ڈائمنڈ پینڈٹ، کانوں میں ڈائمنڈ ٹاپس، چہرے پہ ہلکے
کے سے میک اپ اور پشت پہ بکھرے سلکی سٹریٹ بالوں کے
ساتھ وہ اس رات کی چاندنی میں اس قد حسین لگ رہی تھی کہ رائم
خان مشکل سے اپنے دل اور جذبات کو لگام ڈالے ہوئے تھا۔
انزس ابھی تک سامنے کے منظر میں قید تھی۔

پہاڑوں کے نیچے وینچ و سیم و عریض ایریا سفید پھولوں سے بھرا ہوا
تھا۔ ان سفید پھولوں کی حدود دور تک پھیلی ہوئی تھی اور ان حدود
کی نشاندہی ان کے کناروں پہ جلتی قمقموں کی روشنی کر رہی
تھی۔۔۔

اس وسیع و عریض ایریا کے وسط میں ایک بڑا سا درخت تھا اور
درخت کے اوپر اس کی شاخوں اور ٹہنیوں کے درمیان ایک چھوٹا
ساٹری ہاؤس بنا ہوا تھا۔ ہاؤس چھوٹا تھا لیکن اس میں دو انسانوں

کے رہنے کی گنجائش آرام سے تھی۔ ہاؤس زمین سے کافی اونچا تھا
۔ پورا ہاؤس لائٹس اور پھولوں سے سجا ہوا تھا
درخت کے نیچے عین وسط میں سفید پھولوں پہ "قلبِ راحت" کی
تحریر سرخ گلاب کے پھولوں سے بہت بڑے سائز میں درج کی گئی
تھی۔

انزس کا رائم خان کی طرف سے دیا گیا لقب سفید پھولوں کی
درمیان روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ مقیموں کی روشنی لفظ "قلبِ
راحت" کو رات کی چاندنی میں ہائی لائٹ کئیے ہوئے تھی۔
یہ جگہ اسلام آباد شہر سے دور سرسبز اونچے پہاڑوں کے دامن میں
رائم خان نے خود پر سنلی بنوائی تھی۔ اور اس کو رائم خان کی پسند
کے مطابق بنانے میں کافی محنت لگی تھی۔۔۔
صرف سو فیٹ کے گول ایریا میں تو سفید پھول پہاڑوں کی پتھریلی
سطح پہ بکھرے ہوئے تھے۔۔

اور ان سفید پھولوں کے وسط اور تاروں سے بھرے آسمان کے نیچے خوبصورت ساٹری ہاؤس خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھا۔۔۔ خان! یہ سب کچھ بہت بہت زیادہ پیارا ہے۔۔۔ انزہ اس جگہ کی خوبصورت سے مہبوت ہوتی چہک کے بولی تھی۔۔۔

تمہیں اچھا لگا؟۔۔۔ رائم خان اس کے پیٹ کے گرد اپنے ہاتھ ریپ کرتا اس کا گال پیار سے چوم گیا۔

بہت زیادہ اچھا لگا ہے۔۔۔ خود سے واقعی میں اب مجھے شہزادیوں والی فیلنگ آرہی ہے، ایسا لگ رہا ہے کہ میں ایک شہزادی ہوں۔۔۔ انزہ اپنے خوشگوار تاثرات پہ قابو پانے کی کوشش کرتی فخریہ انداز میں گویا ہوئی تھی

رائم خان دن بدن اپنی محبت کا اظہار نئے طریقے سے کر کے انزہ کے وجود کو اپنے لئے معتبر اور خاص کئے جا رہا تھا۔

یہ آدمی مجھے خود سے عشق کروا کے ہی چھوڑے گا۔۔۔۔۔ انزس
نے اپنا رخ ترچھا کئے اس کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کرتے
ہوئے بے ساختہ سوچا تھا۔

اور میں پیارا نہیں ہوں؟ جس نے یہ سب کچھ کیا ہے؟ کیا میں اپنی
شہزادی کا شہزادہ نہیں لگتا؟۔۔۔ رائم خان اس کے برہنہ پیٹ پہ
اپنے ہاتھوں کا ٹھنڈا لمس چھوڑتا سوالیہ انداز میں گویا ہوا۔

آپ پیارے تو لگ رہے ہیں لیکن شہزادے نہیں! شہزادی کی آن
بان تک پہنچنے کیلئے ابھی آپ کو بہت ساری محنت کی ضرورت ہے
۔۔ انزس اس کے ہاتھ کی بڑھتی گستاخیاں دیکھ کر اس کے ہاتھ کی
پشت پہ چٹکی کاٹتی شرارت سے بولی۔

چلو! پھر آجاؤ۔۔ محنت کرتے ہیں تاکہ میں غلام سے شہزادے کے
عہدے پہ فائز ہو سکوں۔۔۔ رائم خان ایک جست میں انزس کو
اپنے کندھے پہ اٹھاتا آگے کی طرف بڑھتا تھا۔

خان! مجھے نیچے اتاریں میں گر جاؤں گی۔۔۔ رائم خان کو خود
سمیت تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر انرش نے ڈرتے ہوئے
اس کی قمیض کو مضبوطی سے جکڑا تھا۔

ٹری ہاؤس کم از کم زمین سے بیس سے تیس فٹ کی بلندی پہ تھا۔
رائم خان کو یوں بے دھڑک اوپر چڑھتے دیکھ کر اس کو خوف آیا
تھا۔

گروگی تو تم صرف میرے پیار میں! اس کے علاوہ میں تمہیں کہیں
نہیں گرنے دوں گا قلبِ راحت۔۔۔ وہ اس کو مضبوطی سے پکڑتا
ساری سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔ ہاؤس میں اینٹر ہوتے ہی رائم خان
نے اسے اپنے کندھے سے نیچے اتار دیا۔۔

چھوٹا سا لکڑی سے بنایا ہاؤس اندر سے نہایت ہی نفاست اور
خوبصورتی سے سجایا تھا۔ بڑے سائز کی کینڈلز چاروں کونے میں
جلتی دھار کی طرح مدہم مدہم پہ دھواں اڑا رہی تھی۔

ہاؤس چاروں طرف سے لکڑی کی بنائی گئی دیواروں سے کور تھا۔ دو سائیڈز پہ کھڑکیاں جبکہ بیک سائیڈ پہ چھوٹا سا ہی لکڑی کا ٹیریس بنایا گیا تھا۔ ٹیریس والی کھلی سائیڈ اور کھڑکیوں پہ سفید پردے گرے ہوئے تھے۔ ہاؤس کی چھت ٹرانسپیرنٹ تھی۔ اگر اوپر کی طرف دیکھو تو

چاند اور ستاروں سے بھرا آسمان صاف دیکھائی دے گا۔ رائٹ سائیڈ والی کھڑکی کے بالکل نیچے وڈن فلور بیڈ تھا۔ بیڈ پہ سفید سلک کی بیڈ شیٹ بچھی تھی اور اس کے اوپر ہارٹ شیپ میں سرخ گلاب کے پھولوں کو ترتیب سے رکھا گیا تھا۔

ہاؤس میں ایک چھوٹا سا ٹیبل اور چئیر کونے میں رکھی گئی تھی۔ ٹیبل پہ بھی پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھی۔۔ چھت اور فلور کا فاصلہ مشکل سے دس فٹ کا تھا۔۔

آپ نے یہ سب کچھ کب کیا؟۔۔۔ اس کو آج رائم خان حیران در حیران کر رہا تھا۔۔ پہلے باہر کا منظر اور اب اندر کی خوبصورتی دیکھ کر وہ تعجب اور حیرت کے ملے جلے تاثرات سے بولی تھی۔

پچھلے ماہ سے ہی میں نے یہ پلیس پر سنلی تمہارے اور اپنے لئے بنوائی تھی تاکہ ہم ہفتے میں ایک بار اپنے قیمتی لمحات یہاں گزار سکیں۔

میں تمہارے ساتھ اپنی زندگی کا ایک ایک پل قیمتی اور یادگار بنانا چاہتا ہوں۔ اگر میں نے کہا تھا کہ دنیا کی ساری خوشیاں تمہارے قدموں میں ڈھیر کروں گا تو کروں گا اور ساری زندگی کرتا رہوں گا۔۔۔ رائم خان ایک جست میں اسے بازو سے پکڑ اپنے چوڑے سینے میں بھینچتا عہد وفا کرنے والے لہجے میں بولا تھا۔۔۔

خان! ہماری زندگی کے سفر کی شروعات اتنے خوبصورت انداز میں کرنے کیلئے شکریہ۔۔۔ انزہ نا محسوس انداز میں اس کے سینے پہ

لب رکھتی ستائشی انداز میں گویا ہوئی۔ اس کو اس وقت اپنا آپ
کوئی حور اور پریوں کا گمان دے رہا تھا۔

ابھی تو شروعات ہے، یہ غلام آپ کو شہزادی سے ملکہ بنا کے رکھے
گا ساری زندگی! تم میرے دل، حیات اور وجود پہ راج کرنے کیلئے
بنی ہو، قلبِ راحت۔۔۔۔۔ رائم خان اس کے لبوں کی تپش اپنے
سینے پہ محسوس کرتا ایک دم اس کو اپنے سینے سے نکال کر اس کا چہرہ
اپنے مقابل کرتا بے لگام ہو کے اس کے نازک لبوں پہ جھکا تھا۔
انزس نے اس کی ناگہاں حرکت پر اس کی شرٹ کو مٹھیوں میں دبوچا
تھا۔

رائم خان بے خود ہوتا اس کے لبوں کو چومنے کی بجائے کھانے لگا
تھا۔ وہ بے باکی سے اپنی زبان اس کی زبان کے گرد لپیٹتے ہوئے
اس کی منہ کی ساری نمی اپنے حلق میں اتارنے لگا۔

رائم خان اس کو اپنے ایک بازو میں ہولڈ کرتا، اوپر کی طرف اٹھاتے ہوئے مزید ان پنکھڑیوں کو آہنی گرفت میں لئے بیڈ کی طرف بڑھا۔۔

چونکہ بیڈ فلور پہ تھا اس لئے رائم خان گھٹنے فولڈ کر کے بیٹھتا نرمی سے اس کو لئے چپھے تکیے پہ گرا تھا۔ وہ ہنوز اس کے لبوں کے ساتھ لپٹا اس کی ہر آتی جاتی سانس چرا تھا۔ اس نے جھنجھلاتے ہوئے اس کے نچلے لب پہ دانت گاڑھ کر اپنا بدلہ اتارنے کی کوشش کی تھی۔

اس نے ہمیشہ کی طرح بہت زور سے کاٹا تھا۔ اپنے لبوں پہ جلن محسوس کرتے ہی رائم خان فوراً اس کے لبوں کو آزادی بخش گیا تھا۔

لبوں کو آزادی ملتے ہی انزس نے فوراً اس کا دیو ہیکل وجود اپنے
اوپر سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔۔ وہ اس کے نیچے دب کے
مرنے والی ہو گئی تھی۔

بہت ظالم ہو تم! رائم خان اپنا نچلہ لب مسلتا شکوہ کناں نظروں
سے انزس کو دیکھ کر رہ گیا جو اپنی پھولی سانسیں ہموار کرنے کی
غرض سے اس کے نیچے سے نکلنے کی کوشش میں لگی تھی۔

تم نے تو مجھے کاٹ لیا! اب میرے وار کیلئے بھی تیار ہو جاؤ۔۔ وہ
کہتے ساتھ ہی انزس کی ساڑھی ایک منٹ میں ہی اس کے مخملی
بدن سے جدا کر گیا تھا۔

وہ تھوڑا سا اوپر اٹھ کے خود کو ہر پردے سے آزاد کرتا، انزس پہ
سایہ فگن ہوا۔

ہاؤس میں صرف کینڈلز کی مدہم روشنی پھیلی ہوئی تھی لیکن روشنی اچھی خاصی تھی۔ اس لئے انزس اپنی اور رائم خان کی حالت دیکھتی شرم سے اپنے اوپر کمفرٹر لینے لگی۔

قلبِ راحت! اب کیسا پردہ؟ ہم ایک دوسرے کے ساتھ آج تیسری رات گزار رہے ہیں، میں تمہارے جسم کے ہر راز سے واقف ہوں۔۔۔ رائم خان اس کے ہاتھ سے کمفرٹر لے کر دور اچھالتا اس کے چمکتے سینے کے تل پہ جھکا تھا۔

وہ اس کے سینے سے پیٹ تک آتا اپنے لبوں اور دانتوں کا گیلا لمس چھوڑنے لگا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی جسارتیں اپنی تھائیز کے درمیان محسوس کرتے ہوئے انزس نے بے خودی میں اپنی کمر اوپر اٹھائی تھی۔

وہ اپنے محرم کی قربت کیلئے مچلتی تکیے پہ سر پٹکنے لگی تھی۔
چند منٹوں میں ہی دونوں کی آنکھیں خمار سے لہو لال ہوئی تھی۔۔۔

دو جسم طلب اور جذبات کی تپش میں جھلسنے لگے تھے۔
رائم خان اس کے سینے کی ابھری ساخت کو اپنی مٹھیوں میں جکڑ
کے چھوڑتا، اس کے لبوں کو شدت سے چوم گیا تھا۔
قلبِ راحت! تم بہت میٹھی ہو! دل کرتا ہے تمہیں کھا
جاؤں۔۔۔ رائم خان اس کو لبوں کو شدت سے سک کرتے ہوئے
بہکے ہوئے انداز میں بولا تھا۔ وہ بے قراری سے چپھے ہٹتا اس کی
دونوں ٹانگوں کو پکڑ کر پھیلائے لگا۔ رائم خان خود کو اس کے نازک
وجود سے مس کرنے کے بعد اس میں بے چینی سے اترتا تھا۔
اس کی خود میں جان لیوا شمولیت پر انرش کے منہ سے سسکی نکلی
تھی۔۔۔

رائم خان اس کے ماتھے پہ لب رکھ کر اس کے گال کے ساتھ اپنا
گال ٹکاتا اپنی حرکت شروع کر گیا تھا۔۔۔

وہ چھپہٹ کے اس کی کمر سے جکڑ کر اوپر کی طرف اٹھاتا، اس میں
مزید گھلتے ہوئے اپنی جان لیوا شدتیں اس پہ لٹانے لگا تھا۔
رائم خان ایک دم انزس کے پورے نچلے وجود کو کمر سے ہولڈ کرتا
جنونی ہوا تھا۔۔

اہہہ! امم! را۔۔۔ رائم۔۔۔ اپنا نچلا وجود اوپر اٹھنے کی وجہ سے
انزس کی ہڈیاں ماس چیر کے باہر آنے کو بے تاب ہوئی تھی۔
رائم خان مزید جنونی ہوتا اس کی کمر کو آخری حد تک خم دے گیا تھا

--

اہہہ! امم! رائم! پلیز سٹاپ۔۔۔ وہ سسکتے ہوئے اس کو پکار
اٹھی۔ درد کی شدت میں اضافہ ہوا تھا۔۔

شش!! آج۔۔۔ تم۔۔۔ بغیر۔۔۔ مزاحمت۔۔۔ کے۔۔۔ مجھے۔۔۔
برداشت۔۔۔ کرو۔۔۔ گی، میں۔۔۔ نے۔۔۔ پچھلی۔۔۔ دو
۔۔۔ راتیں۔۔۔ تمہارے۔۔۔ ساتھ۔۔۔ بہت۔۔۔ نرم۔۔۔ رہ۔۔۔

کے۔۔ اپنا۔۔ لمس۔۔ کا عادی۔۔ بنایا۔۔ ہے۔۔ آج۔۔ تو۔۔
بغیر۔۔ مزاحمت۔۔ کے۔۔ تمہارا۔۔ مجھے برداشت۔۔ کرنا
۔۔ بنتا۔۔ ہے۔۔ رائم خان اپنے غیر ساکت وجود کے ساتھ بولتا
اپنے کام میں مگن ہوا تھا۔

اس کی آنکھیں اور چہرہ حدت جذبات میں سرخ انگارہ ہوا تھا اور ان
جذبات کی آگ میں وہ اپنے ساتھ ساتھ انزس کو بھی جھلسانے کا
ارادہ رکھتا تھا۔۔

اہہہ! امم! انزس اب مزاحمت نہیں کر رہی تھی وہ سسکیاں بھرتی
اس بس برداشت کرنے لگی تھی۔ ہاں البتہ اپنے ناخنوں سے رائم
خان کی کمر خراشوں سے بھر دی تھی۔

رائم خان ایک چھٹکے سے اس کے بازو سے پکڑ کر کروٹ کے بل کر
گیا تھا۔

وہ اپنے لاوے جیسے دھتکے وجود کو اس کی گہرائیوں کی ٹھنڈک سے
راحت بخشنے لگا تھا۔ انزس نے منہ تکیے میں گھسیڑے زور سے بیڈ
شیٹ کو اپنی مٹھیوں میں جکڑا تھا۔ بے ساختہ انزس کی آنکھوں سے
آنسو ابل کے باہر آئے تھے۔

Ahh ! This is very gratifying ! You are too much Delicious...

رائم خان اپنے حلق سے معنی خیز آوازیں نکالتا، انزس کے سینے کی
ابھری ساخت کو اپنے لبوں اور دانتوں سے کترنے لگا تھا۔

This is not gratifying ! It's worse than Hell...

انزس درد کی شدت سے چلائی۔ اس کی آنکھوں میں شکوے اور غصے
کی رمق واضح تھی مگر اس پہ مدہوشی پوری چھائی ہوئی تھی۔
قلبِ راحت۔۔۔ رائم خان اس کی بھیگی ہوئی آواز اور غصہ سے
دیکھتے ہی اپنے حرکت روکے، عقیدت سے انزس کے ماتھے پہ لب
رکھتا نرمی سے اس کے خشک پڑتے ہونٹ چوم گیا تھا۔

زیادہ درد ہوا؟۔۔۔ رائم خان اس کے بال سمیٹ کے چھب کرتا،
اس کی کمر نرم ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے استفسار کر گیا تھا۔۔
وہ محبت سے اس کے چہرے پہ جابجا لب رکھتا، اپنی شدتوں کا درد
زائل کرنے لگا تھا۔

میرے لئے آپ کو برداشت کرنا آسان نہیں ہوتا۔۔۔ انزس خفگی
سے اس کے سینے پہ دانت گاڑھتی، شکایت کر گئی تھی۔
چلو! پھر آجاؤ آج میں تمہارے نیچے اور تم میرے اوپر! جتنے مرضی
مجھ پہ اپنے ناخنوں اور دانتوں کے نشانات ثبت کرنے ہیں کر
لو۔۔۔ رائم خان اس کی کنپٹی پہ لب رکھتا، اس کو اپنی گود میں
اٹھائے بیڈ سے اٹھا تھا۔ وہ ایک کونے میں پڑے ٹیبل پہ بیٹھتا،
انزس کو ٹھیک سے خود پہ ایڈجسٹ کرنے لگا۔

او کے! موویور باڈی۔۔۔ رائم خان اس کو خود پہ ایڈجسٹ کر کے
اس میں منتقل ہونے کے بعد، بے باک حرکت کرنے کا اشارہ کر
گیا تھا۔۔

نہیں! میں نہیں کروں گی! وہ زور سے اس کے سینے پہ مکا جھڑتی اس کی
گردن میں منہ چھپا گئی۔ شرم سے چہرہ اور جسم بھاپ چھوڑنے لگا
تھا۔۔

انز! مجھے تمہارا ساتھ چاہیے، میرا ساتھ دو، میری پیاس اور
میری تڑپ کو مٹاؤ۔۔۔ رائم خمار سے سرخ ہوتی آنکھوں کے
ساتھ بھاری گھمبیر لہجے میں التجا کر گیا تھا۔۔ اس کا انداز اس وقت
شدتِ جذبات کی لپیٹ میں لگ رہا تھا

انز اس کی جسم کی گرماہٹ اور لہجے کی تڑپتے ہوئے التجا سن
کے بے ساختہ اس کی گردن سے چہرہ نکال گئی تھی۔۔

موو کرو! اور میرے سکون کا آخری لذت سے بھرپور ذریعہ بنو۔
رائم خان نرمی سے اس کی ٹھوڑی پہ لب رکھتا پھر سے ملتجی ہوا
تھا۔۔

انزش اس کی بار بار کی التجائیں سن کر، ہمت کرتے ہوئے اپنے
دونوں ہاتھ اس کے سینے پہ جما گئی۔ نظریں شرم سے جھکی ہوئی تھی
۔ دل زوروں سے دھڑکتا سینے سے باہر نکلنے کو بے تاب ہوا تھا۔
انزش تھوک نکل کے اپنا خشک حلق تر کرتی ساری ہمت مجتمع
کرتے ہوئے خود کو آہستہ سے موو کرنا شروع کر گئی تھی۔۔ وہ
آنکھیں میچے نظریں جھکائے اپنے کانپتے ہاتھوں اور بدن کے ساتھ
اپنی موومنٹ میں ردھم بنانے لگی اور ردھم بنتے ہی رائم خان کے
ساتھ انزش بھی مدہوش ہوئی۔

رائم خان اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں دباتا، اپنی خمار سے
سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ موومنٹ تیز کرنے کا اشارہ کر گیا تھا

۔۔ انزش مدہوشی میں مزید ردھم سے موو کرنے لگی تھی۔ رائم
خان اس کی جان لیوا ادا پہ گھائل ہوتا، اپنی دونوں کہنیوں چھپے ٹیبل
پہ جما گیا۔ وہ اپنے سر چھپے ڈھلاکائے آنکھیں موندے سرور اٹھانے
لگا تھا۔

Ahhh! Ohhh! Uhh! That's my Girl

رائم خان حلق سے گہری معنی خیز آوازیں نکالتا انزش کو بوکھلانے پر
مجبور کر گیا تھا۔۔ انزش اس کی آپے سے باہر ہوتی حالت دیکھ کر
تیزی سے خود کو روکے اس کے سینے سے لپٹی تھی۔ اسے رائم خان
کی حالتِ اضطرابی دیکھ کے خوف آیا تھا۔

رائم خان اسے رکتے دیکھ کر ہی ایک لمحے میں خود کے ساتھ پلٹ
کے انزش کو احتیاط سے ٹیبل پہ لٹائے خود اس کے اوپر آیا تھا۔
وہ انتشاری کیفیت میں پھر سے اس میں داخل ہوتا، اپنے لذت
سے بھرپور لمحات کا سلسلہ پھر سے شروع کر گیا تھا۔

انزش نے ٹیبل کے کناروں کو مضبوطی سے جکڑ کر، اس کی طوفانی شدتوں کا سسکاریاں بھرتے ہوئے مقابلہ کرنے لگی تھی۔۔
اوپر چاند اور ستاروں سے بھرا آسمان بھی ان کے شدت سے بھر پور ملن پر شرما گئے ہونگے۔۔

رائم خان ہر لمحہ اس پہ دیوانہ وار، گرفت مضبوط کرتا انزش کے نازک کے نازک وجود کو پوری رات کیلئے اپنے حصار میں قید کر گیا تھا۔

داعیر! داعیر! بابا! بابا!۔۔۔ داعیر خان نیچے لاونج میں بیٹھا ہوا تھا جب اچانک اس کے کانوں سے دو معصوم اور ایک مہر کی غصے والی گرجدار آواز ٹکرائی تھی۔
وہ فوراً ہنستا ہوا صوفے سے اٹھتا بھاگنے والے انداز میں اپنے کمرے کی جانب بڑھا تھا۔

داعیر خان کو یوں افراتفری میں بھاگتا دیکھ کر انیسہ اور اسد اللہ خان بھی بے ساختہ مسکرا دیئے کیونکہ وہ جانتے تھے داعیر کس وجہ سے اتنی عجلت میں اوپر جا رہا ہے، ان کے گھر میں اب اس طرح کی اچانک صورت حال پیش آنا روز کا معمول بن چکا تھا۔۔

داعیر خان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی دو ننھی ننھی سی بچیاں، خوشی اور ڈر سے چیختی چلاتی ہوئی بھاگ کر اس کے پیروں سے آ کے لپٹی تھی۔

داعیر خان ان کی معصومیت اور قلقلاریوں پہ کھل کے مسکراتا اپنی دونوں بیٹیوں کو اپنی بانہوں میں بھر گیا تھا۔۔

کیا ہوا ہے میری بیٹیوں کو؟۔۔۔ داعیر خان دونوں کو اپنے سینے سے لگائے استفسار کر گیا تھا۔۔

بابا زان! ام نے شارت تی اے (بابا جان! ہم نے شارت کی ہے) ننھی سی داین اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اپنے ماتھے

پہ بکھرے بال چھپھٹاتی، معصومیت سے اپنے اور اپنی دیدہ کے
کارنامے بتانی لگی۔ وہ یہ بات بتاتے ہوئے اپنے لب اسٹک سے
پینٹ چہرے کے ساتھ بے حد کیوٹ لگی تھی۔

حنادے کے سارے ہاتھ لب اسٹک سے رنگے تھے جبکہ داین کا
پورا چہرہ لب اسٹک سے پینٹ ہوا تھا جو یقیناً ہمیشہ کی طرح
حنادے نے بیوٹیشن کورس سیکھتے ہوئے داین کے چہرے پر تجربہ
آزمائی کی تھی۔۔

حنادے اڑھائی سال کی بہت زیادہ صحت مند بچی تھی۔ وہ اتنی
صحت مند تھی کہ اسکی گردن کہیں سے نظر بھی نہیں آتی تھی۔ اس
کے سیب کی طرح پھولے گلابی گال، شہد رنگ آنکھیں اور معصوم
صورت! وہ سیرت اور صورت ہر لحاظ سے داعیر خان کی کاپی تھی
جبکہ داین ایک سال کی دہلی پتلی مہر کی جیسی کر سٹل گرے آنکھیں

اور اس کے جیسے چہرے کے پٹھانی نقوش سے وہ مہرو کی کاپی لگتی تھی۔

داعیر! دیکھیں نہ! میں نے آج صبح ہی اپنے لئے آن لائن میک اپ پروڈکٹس منگوائی تھی اور میری دو منٹ کی غفلت پر آپ کی بیٹیوں نے ساری میری پروڈکٹس کا ستیاناس کر دیا ہے۔۔۔ یہ دونوں ہمیشہ میرے ساتھ ایسا ہی کرتی ہیں، میری ساری قیمتی چیزیں بگاڑ دیتی ہیں۔۔۔ مہرو اپنی ٹوٹی پھوٹی لب اسٹک اور سارا میک اپ کا خراب سامان داعیر خان کو دیکھاتی افسردگی سے بولی تھی۔

نور چشم! کوئی بات نہیں میں تمہیں پھر سے لے دوں گا۔

میری بیٹیوں کو یہ اچھا لگا تو انہوں نے استعمال کر لیا، تمہیں میں نیا لے دوں گا۔۔۔ تم پریشان نہیں ہو۔۔۔ داعیر خان اپنی ہنسی ضبط کرتا دلجوئی سے بولا۔

جبکہ اپنی بیٹیوں کے معصوم لب اسٹک سے بھرے چہرے اور ہاتھ دیکھ کر داعیر خان کو ان پہ ٹوٹ کے پیار آ رہا تھا۔۔۔ وہ کتنی پیاری شرارتیں کرتی تھی۔۔۔ داعیر خان نے بے ساختہ سوچا تھا۔ نہیں مجھے یہی سب کچھ واپس چاہئیے! ہر بار آپ کی آفت کی پڑیاں میری چیزیں خراب نہیں کر سکتی۔ آج میں ان کو سمجھاؤ گی تاکہ آئندہ یہ میری چیزوں کو ہاتھ لگانے سے پہلے سو بار سوچیں۔۔۔ مہرو ایک دم غصے میں بولتی داعیر خان کی طرف بڑھ گئی۔

بابا زان! ایس پچاؤ! (بابا جان! ہمیں بچاؤ) مہرو کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر دانیں اور حنادے داعیر خان کے سینے میں چھپتی، چلائی تھی

--

مہر! غصہ تھوک دو، روزے کی حالت میں غصہ کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔۔۔ داعیر خان زور سے اپنے بیٹوں کو اپنے سینے میں چھپاتا اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولا تھا۔

اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اپنی بیٹیوں کی حرکت پہ ہنسے یا اپنی
مہر کے نقصان پہ افسردہ ہو؟ وہ بے بسی سے کبھی حنادے اور
دائین کے معصوم چہروں کو دیکھتا تو کبھی مہرو کا غصے سے سرخ ہوتا
چہرہ دیکھتا۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹیوں کے درمیان بے بس تھا۔
مہرو داعیر خان کو اپنی بیٹیوں کا باڈی گارڈ بنے دیکھ کر شکستہ لہجے میں
چھپے مڑتی جا کے صوفے پہ بیٹھی تھی۔۔ اس کی بیٹیوں نے جب
سے چلنا شروع کیا تھا، مہرو کی ساری قیمتی اور فیورٹ چیزیں
خراب کرنا انہوں نے اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔

حنادے بہت زیادہ شرارتی بچی تھی تبھی تو روحان کو پسند تھی
کیونکہ وہ اس کے ٹائپ کی تھی جبکہ دائین معصوم سی تھی، وہ تو بس
حنادے کی شرارتوں میں تھوڑی سی حصے دار بنتی تھی۔۔ کرتی نہیں
تھی۔۔

وہ دھیمی طبیعت کی مالک تھی بالکل اصرار جیسی۔۔۔ اسلیئے وہ اس کو اچھی لگتی تھی۔

جاؤ مورے کو سوری بول کے آؤ۔۔۔ داعیر خان دونوں بہنوں کو نیچے اتارتا ان کے باری باری چہرے چوم کے ان کو مہرو کے پاس بھیج گیا کیونکہ وہ جانتا تھا اس کی مہر کا غصہ ٹھنڈا صرف اس کی بیٹیوں کے معصوم چہرے ہی کر سکتے ہیں۔۔۔

شولی مولے! (سوری مورے) حنادے اور دانیں اپنے کان پکڑ کر مہرو سے دو قدم کے فاصلے پہ کھڑی ہوتی اپنے کئے کی معافی مانگنے لگی تھی۔

وہ دور اس لئے کھڑی تھیں کیونکہ ان کو ابھی بھی مہرو کی ڈانٹ سے ڈر لگ رہا تھا۔

سوری تو میں تب آپ کی مانوں جب آپ دونوں اپنی یہ حرکتیں
چھوڑیں گی، کل پھر آپ نے یہی حرکت کرنی ہے پھر سوری کا
فائدہ؟۔۔۔ مہرو افسردگی سے بولی تھی۔

مولے!! پھل اپ نالاج اونا شوڑ دیں، تونتہ ام اپنی شارتیں نئی شوڑ
شکتے، بابا تہتے ایں شارتیں نئی شوڑ نئی (مورے! پھر آپ ناراض
ہونا چھوڑ دیں، کیونکہ ہم اپنی شرارتیں نہیں چھوڑ سکتے، بابا کہتے ہیں
شرارتیں نہیں چھوڑنی) حنادے اپنی شہد رنگ آنکھیں گھوماتی ہمیشہ
کہ طرح بنا کسی لگی لپٹی کے صاف گویائی سے کہتی داعیر خان کو بے
ساختہ قہقہہ لگانے جبکہ مہرو کو آنکھیں پھیلانے پہ مجبور کر گئی تھی۔
کردو نہ میری گول کپیوں کو معاف!! کتنے پیار سے کہہ رہی ہیں کہ وہ
شرارتیں نہیں چھوڑ سکتی۔۔۔۔ داعیر خان زور سے ہنسنے کی وجہ
اپنی آنکھوں سے بہتا پانی صاف کرتا مفاہمتی انداز میں بولا۔

اپنی گول گپیوں کے عزائم بھی تو دیکھیں نہ! مجھے کہہ رہی ہیں،
مورے آپ ناراض ہونا چھوڑ دیں ہم شرارتیں نہیں چھوڑ
سکتیں۔۔۔ لائک سیریسلی؟۔۔۔ مہرو اپنی بیٹیوں کی معصوم شکلوں
کے ساتھ خطرناک حرکتیں دیکھ کر صدمے سے بولی تھی۔

ہاں تو اتنی پیاری شرارتیں کرتی ہیں میری بیٹیاں!! تم ناراض ہونا
چھوڑ دو۔۔۔ تم اپنی بیٹیوں کی یہ کیوٹ حرکتیں انجوائے کیا کرو،
ناراض ہو کے اپنا مزہ مت خراب کیا کرو، پلکیں جھپکنے کی دیر ہے
انھوں نے بڑے اور سمجھدار ہو جانا اور پھر تم نے انکی کیوٹ
اور معصوم حرکتوں کو مس کرنا ہے، انکی شرارتیں تو ہمارے لئے
خوبصورت یادیں ہیں۔ ان کی قلقاریاں ہی تو اس گھر کی درودیوار کو
زندگی سے بھرپور کرتی ہیں۔۔۔ داعیر خان صوفے کی طرف بڑھتا
نرمی سے مہرو کا ہاتھ پکڑ کر اپنی مٹھی میں دبا گیا۔

مجھے نہیں پتہ آپ جانیں اور آپ کی بیٹیاں جانیں۔ ان کے بڑے اور
سمجھدار ہونے کا تو مجھے پتہ نہیں ہے لیکن ان کی شرارتوں کی میں
گارنٹی دے سکتی ہو، بڑے ہو کے بھی نہیں رکنے والی، اس لئے
ان کی شرارتوں اور قلقاریوں کو یادیں بنانے کی ضرورت ہی نہیں
کیونکہ یہ دونوں بڑی ہونے تک سب کچھ لائیو دکھا کے آپ کو محفوظ
کریں گی اور میری قیمتی چیزوں کا ستیاناس۔۔۔ مہرو مصنوعی خفگی
سے بولی تھی۔

مہرو اب جان بوجھ کر تھوڑا غصہ اور ناراضگی دیکھانے کی کوشش کر
رہی تھی تاکہ اس کی بیٹیاں کوئی تھوڑا تو اس سے ڈر کے اس کی
چیزیں چھیننا چھوڑ دیں۔

مہرو کا غصہ ہمیشہ بس تھوڑی دیر کا ہی ہوتا تھا! ابھی تھوڑی دیر
تک وہ اپنی بیٹیوں کے صدقے واری جاتی ہوئی دیکھائی دے گی۔
اس لئے داعیر خان اس کو چھوڑ کے اپنی جیب سے فون نکالے اپنی

بیٹیوں کے لپ اسٹک سے بنائے کارنامے اپنے فون میں قید کرنے
لگا تھا اور وہ دونوں بہنیں اب خرگوش کے جیسے دانت نکال
کر کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

زے تاوا اے نین تو؟ (یہ کیا ہوا ہے نین کو؟) اصرار جو کہ ابھی
زربخت کے ساتھ مہرو کے کمرے میں داخل ہوا تھا، دانیل کے منہ
پہ لپ اسٹک کے بنے ڈیزائن دیکھ کے پریشانی سے بولا تھا۔
اہلال! زے میلے فیش پہ دیدہ نے بائے ایس زائن (اصرار یہ میرے
فیس پہ دیدہ نے بنائے ہیں ڈیزائن) وہ اصرار کو دیکھتے ہی اس کی
طرف بڑھتی چہک کے بولی تھی جبکہ زربخت بھی ان دونوں بہنوں
کو کارٹون بنا دیکھ کے ہنس دی۔

اصرار نرمی سے سینٹرل ٹیبل سے ٹیشو باکس سے ڈھیر سارے ٹیشو
نکالتا دانیل کو ایک ہاتھ سے پکڑے صوفے کی طرف لے کے بڑھا
تھا۔

وہ دونوں احتیاط سے صوفے پہ چڑھتے ایک دوسرے کے مقابل ہو
کے بیٹھے تھے۔ دانیل ہمیشہ اصرار کی بات مانتی تھی اور وہ ہمیشہ
اس کا لپ اسٹک سے پینٹ چہرہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں
سے صاف کرتا تھا کیونکہ اصرار کو دانیل کے چہرے پہ ذرا سی بھی چیز
برداشت نہیں ہوتی تھی۔۔۔

وہ اس کے چہرے پہ ٹیشو پھیرتا ایک نظر حنادے کو بھی گھور کے
دیکھ رہا تھا جس نے اس کی نین کا چہرہ خراب کیا تھا۔
داعیر خان اور حنادے فون میں ابھی لی گئی تصویریں دیکھنے میں مگن
تھے جبکہ زربخت مہرو کی دلجوئی کرنے میں مصروف ہو گئی تھی
جب اچانک وہ دانیل کا ٹیشو سے چہرہ صاف کرتے کرتے صوفے
کے کنارے پہ آگیا۔۔۔ وہ ہر اینگل سے آگے جھک کر دانیل کا چہرہ
دیکھ رہا تھا کہ کہیں لپ اسٹک باقی تو نہیں رہ گئی۔

اور وہ داین کا چہرہ ہر زاویے سے دیکھنے کے چکروں میں بالکل
صوفے کے کنارے پہ اگیا اور پھر اگلے ہی پل اصرار دس بیلنس
ہوتا چھپرے سر کے بل صوفے سے دھڑام سے نیچے گرا تھا۔ نیچے
گرتے ہی اصرار کی چیخ نکلی تھی۔

اصرار!۔۔۔ دمیر خان جو ابھی داعیر خان کے کمرے میں داخل ہوا
تھا، اپنے بیٹے کو نیچے گرتے دیکھ کر اس کا دل اچھل کے حلق میں
آیا تھا جبکہ باقی سب بھی بے ساختہ اصرار کی چیخ پہ چونک اٹھے۔
کسی کے بھی بڑھنے سے پہلے دمیر خان فوراً آگے اصرار کو زمین سے
اٹھائے زور سے اپنے سینے میں بھینچے اس کے چہرے پہ جا بجا لب
رکھنے لگا۔

اصرار! بابا کہ جان! رونا بند کرو، کچھ نہیں ہوا میرے بیٹے کو۔۔۔
دمیر خان فکر مندی سے اصرار کے سر کا معائنہ کرتا اسے چپ

کروانے لگا تھا لیکن وہ چپ کرنے کی بجائے اپنی سانس روکے

اذیت سے رویے جا رہا تھا۔

زر بخت پریشانی سے اپنے بیٹے کو دکھنے کیلئے لپکی تھی، مہر و اور داعیر
خان بھی اصرار کا اذیت سے رونا دیکھ کے فکر مند ہوئے تھے جبکہ
بچیاں ڈر کے مارے سہم گئی تھی۔۔

لائیں مجھے دکھائیں میرا بیٹا۔۔۔ اصرار کو اذیت سے روتا دیکھ

کر زر بخت تڑپتے ہوئے بولی۔

دھیان کہاں تھا تمہارا زر بخت؟ تم سے ایک بچہ نہیں سنبھالا جاتا،
بچے کو صوفے پہ چھوڑ کے خود باتوں مصروف ہو گئی تھی۔ میرے
بیٹے سے زیادہ ضروری تھی تمہاری باتیں جو اس کو صوفے پہ اکیلا
گرنے کیلئے چھوڑ دیا؟۔۔۔ وہ اصرار کو اپنے سینے میں بھینچے چپ
کروانے کی کوشش کرتا، اس کو زر بخت کی گود میں دینے کی بجائے،

آج پہلی بار اونچی اور سخت آوازیں اسے ڈانٹ رہا تھا۔ دمیر خان
کا چہرہ غصے اور تکلیف سے سرخ ہو رہا تھا۔

زربخت اس کی دھاڑ پہ سہمتی ہوئی بے ساختہ چھپہٹ گئی۔ وہ
بے یقینی سے دمیر خان کو دیکھ کے رہ گئی جو اس پہ چلایا تھا۔ دکھ
سے اس کی آنکھیں ایک دم آنسوؤں سے بھری تھیں۔۔۔

لالا! کوئی بات نہیں بچے گر جاتے ہیں۔۔۔ داعیر خان نے نرمی
سے اپنے لالا کو مخاطب کیا تھا۔ اصرار کو کوئی چوٹ نہیں آئی تھی،
بس وہ اچانک گرنے کی وجہ سے ڈر گیا تھا اسلئے زیادہ تو رہا تھا مگر
دمیر خان سے اس کا صرف رونا بھی کہاں برداشت ہوتا تھا؟ وہ
داعیر خان کی بات سنی ان سنی کرتا ایک افسوس کی نظر زربخت پہ
ڈالے اصرار کو اپنے سینے میں بھینچے باہر جانب کی بڑھا تھا جبکہ زربخت
اپنے منہ پہ ہاتھ رکھ کے اپنے رونے کی آواز دباتی بھاگتے ہوئے
مہرو کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

آج پہلی بار دمیر خان کا سخت رویہ اسے بہت تکلیف دے گیا تھا۔
مہرو، داعیر اور بچیاں پریشانی سے اس اچانک پیش آتی صورتحال پہ
ایک دوسرے کے چہرے تکنے لگے۔

شام کے چار بج رہے تھے۔ لاؤنج میں اس وقت رائم خان اپنے
بیوی بچے کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ آج اپنی بہن کو عیدی دینے کے
ساتھ ساتھ اپنے بیٹے کی ضد اور خواہش پر اسے حنادے سے بھی
ملوانے لے آیا تھا۔۔

سب لاؤنج میں ہلکی پھلکی باتوں میں مصروف تھے سوائے زربخت
کے، وہ دوپہر سے اپنے کمرے میں بند تھی۔ دمیر اس وقت کا اصرار
کوچپ کروانے کی غرض سے گھر سے باہر لے کے نکلا اب واپس آیا
تھا۔۔ اس نے اصرار کو کافی جگہ گھومایا پھیرایا اور چاکلیٹس لے کی
دی تھی۔

اب اصرار بالکل ٹھیک ہشاش بشاش داین اور حنادے کو روحان کی
نظروں سے بچانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔
وہ کسی صورت بھی روحان کو حنادے کے قریب بھی بھٹکنے نہیں
دے رہا تھا۔

روحان جس سائیڈ سے حنادے کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتا،
اصرار اپنے بازو پھیلا کے آگے آجاتا۔
بپجاری حنادے اور داین تو ان دو لڑکوں کی ضد میں کبھی ادھر تو
کبھی ادھر ہوتی پھنس گئی تھیں۔۔۔ یہاں پہ حنادے کے بڑے
ہونے کے باوجود بھی اس پہ اصرار کا زور چلتا تھا۔

اصرار کو شروع سے ہی یہ لمبے بالوں والا شوخا روحان ایک آنکھ نہیں
بھاتا تھا۔ اصرار کے مطابق وہ اس کی دیدہ پہ حق جتا کے غلط کام
کرتا تھا اور اس کی نظریں روحان ایک شوخا اور چھنچھورا لڑکا
تھا۔ اس لئے وہ اپنے گھر کی لڑکیوں کو اس سے محفوظ رکھنے کی بھر

پور کوشش کرتا تھا۔ اس بات سے انجان کہ جتنی وہ اس کی کزن
لگتی ہیں، اتنی ہی روحان کی بھی لگتی ہیں۔

اہلال میں تڑے حلام تر دودا اور تم نے مزے میلی حنا شے دول تیا
تو (احرار میں تجھے حرام کر دوں گا اگر تم نے مجھے میری حنا سے دور
کیا تو) روحان کا اب ضبط جواب دے گیا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی
مٹھیاں بھینچے اصرار کے منہ پہ پھنکارا تھا جو بار بار اس کے راستے
میں آکر اسے حنادے سے ملنے سے روک رہا تھا۔

میں تیلاتون پی داؤں دا اور تم نے میلی دیدہ تو آنت اتھاتے بی دیتا
تو (میرا تیرا خون پی جاؤں گا اگر تم نے میری دیدہ کو آنکھ اٹھا
کے بھی دیکھا تو) اصرار اس سے ڈبل آواز میں گرجا تھا۔ اس کی شہد
رنگ آنکھیں غصے سے سرخ ہوئی اور چھوٹے سے ماتھے پہ ننھے بل
پڑے تھے۔۔

میں تڑے چھو لوں دانئی (میں تجھے چھوڑوں گا نہیں) روحان اپنی
آستین چڑھا کے اصرار کی طرف بڑھا تھا۔ حنادے اور داین
پریشان سی ہوتی ان کی لفظوں کی جنگ سن رہی تھی۔
دونوں بچوں کی دھاڑ سن کر باتوں میں مشغول اچانک داعیر خان ان
کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

ایک منٹ ایک منٹ!! کوئی کسی کا خون نہ بہائے اور نہ کوئی پیئے،
دونوں اپنے گھر بھاگوں ٹڈوں اور میری بیٹیاں مجھے دو۔۔۔ داعیر
خان فوراً اپنی دونوں بیٹیوں کو اٹھاتا معاملہ رفع دفع کرنے کی غرض
ان دونوں کو مصنوعی غصے سے ڈپٹ گیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا جب
تک اس کی بیٹیاں ان کے نیچ کھڑی رہیں گی، وہ دونوں ایسے ہی
پاگلوں کی طرح جھگڑتے رہیں گئے۔

احرار اور روحان کی لڑائی ہمیشہ شدت اختیار کر جاتی تھی اور پھر
ان دونوں کو لڑتا دیکھ کر اس کی اپنی بیٹیاں رونے لگ جاتی
تھی۔۔۔

داعیر خان کے ڈپٹنے پر احرار ایک کمینگی سی مسکراہٹ چہرے پہ
لئے دمیر کی طرف بڑھ گیا جبکہ روحان خونخوار نظروں سے اس کو
گھورتا اپنے باپ کی طرف بڑھ گیا۔

لڑکیوں کے چکروں میں پڑنے کا بڑا شوق ہے؟ روزے کب رکھنا
شروع کرنے ہیں۔۔۔ داعیر خان طنزاً روحان سے مخاطب ہوا تھا

-

تاچو! لوجے تو میں لتھ لوں، لیتن مزے چتل بوت آتے ایں (چاچو!
روزے تو میں رکھ لوں، لیکن مجھے چکر بہت آتے ہیں) روحان
بپجاری سے شکل بنائے کیوٹ انداز میں بولا تھا۔ اس کی معصوم
بات سنتے ہی سب کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

ہاں! لتریوں شے چتل تلاتے اوے اشے چتل نئی آتے ایں، لوجے
لتھتے اوے اشے چتل اتے ایں (ہاں! لڑکیوں سے چکر چلاتے
ہوئے اسے چکر نہیں آتے ہیں، روزے رکھتے ہوئے اسے چکر
آتے ہیں) اصرار اس کی نقل اتارتے ہوئے معصوم انداز میں
بولا۔ اصرار کی اتنے کیوٹ انداز میں کہی بڑوں والی بات یہ سب کی
ہنسی کی گونج ایک دفعہ پھر سے لاؤنج کی فضا پھیلی تھی۔

داین اپنے باپ کی گود سے زبردستی نکلتی اصرار اور اپنے تایا جان
کے ساتھ بیٹھی تھی۔ دمیر خان نرمی سے اسے اٹھا کے اپنی گود میں
بیٹھاتا اس کے ماتھے پہ لب رکھ گیا تھا جبکہ حنادے بھی چپکے سے
داعیر خان کی گرفت سے نکلتی روحان اور رائم خان کے ساتھ
جا بیٹھی تھی

روحان حنادے کا ہاتھ پکڑ کر ایک کمینگی سی مسکراہٹ اصرار کی
طرف اچھالتا اسے اندر تک سلا گیا تھا۔ اس کی اتنی جرات پر اصرار

ضبط سے اپنی مٹھیاں بھیج گیا جبکہ داعیر خان نے افسوس سے اپنی بیٹیوں کو دیکھا تھا جو اپنے باپ کے حصار سے نکل گئی تھیں۔
کافی دیر تک گپ شپ لگانے کے بعد رائم خان اور انزہ اپنے بیٹے کو گھر لے کے چلے گئے تھے۔
انہوں نے افطاری نہیں کی تھی ان کی افطاری آج کسی دوست کے ہاں تھی۔

افطاری کرنے کے بعد دمیر خان سوئے ہوئے اصرار کو اپنے کمرے میں لئے داخل ہوا تھا اور سامنے بیڈ پہ زربخت کو اوندھے منہ لیٹے دیکھ کے وہ اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبائے احتیاط سے اس کو بیڈ پہ لٹانے کے بعد ایک جست میں زربخت کو اٹھا کے اپنی گود میں لئے ٹیریس کی طرف بڑھ گیا۔

زربخت افطاری کیلئے نیچے نہیں گئی تھی۔ بس اس نے پانی سے ہی
روزہ کھول لیا تھا۔ دمیر خان جانتا تھا، وہ ناراض ہے لیکن وہ
اس کے ساتھ زبردستی کر کے نیچے لے جا کر اس کی روئی ہوئی
آنکھیں دیکھا کر سب کو پریشان نہیں کر سکتا تھا۔
چھوڑیں مجھے۔۔۔ زربخت اس کے حصار سے نکلتی بھیگی ہوئی
آوازیں غرائی۔

نہیں چھوڑوں گا۔۔۔ وہ زبردستی اس کو اپنی گود میں لئے ٹیریس پہ
پڑی چئیر پہ بیٹھتا اس کا چہرہ اپنے سینے سے نکال گیا اور نیلی آنکھوں
میں سرخی دیکھ کر دمیر خان کو تکلیف ہوئی تھی۔
آئی ایم سوری!۔۔۔ دمیر خان نرمی سے اس کی دونوں آنکھوں پہ
لب رکھتا اپنے کئے کی معافی مانگنے لگا۔

مجھے آپ کی معافی نہیں چاہیے۔ میں تو ہوں ہی لاپرواہ، اصرار تو
صرف آپ کا بیٹا ہے۔۔۔ وہ صرف آپ کو پیارا ہے۔ میرا تو وہ بیٹا

ہی نہیں ہے۔۔۔ مجھے تو اس کی تکلیف بھی نہیں ہوتی۔۔۔ زربخت
اس کی گود سے اترنے کی کوشش کرتی ہزیانی انداز میں بولی، زیادہ دیر
رونے کی وجہ سے اس کا پورا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھی۔
آئی ایم سوری! اصرار کو اس وقت تکلیف میں روتا دیکھ کر میں
تمہارے ساتھ کچھ زیادہ ہارش ہو گیا تھا۔ پہلی اور آخری بار معاف
کر دو۔۔۔ آئندہ تمہیں ڈانٹنا تو دور لاؤنچی آواز میں بات بھی نہیں
کروں گا۔۔۔ پکا وعدہ! دمیر خان نرمی سے اس کے کپکپاتے لب
چومتا پھر سے اپنے کئے کی معافی مانگنے لگا۔

میں نہیں کر رہی آپ کو معاف! آپ نے مجھے اتنی بری طرح سے
ڈانٹا تھا۔۔۔ زربخت روتے ہوئے اس کے سینے پہ دانت گاڑھ
گئی، وہ اس کو لے کر بہت حساس تھی۔

آئی ایم ریٹی ویری سوری۔۔۔ دمیر خان اب پیار سے اس کی
ٹھوڑی پہ لب رکھتا ملتجی ہوا۔

نہیں کروں گی معاف۔۔۔ زربخت اب ناک سکوڑتے ہوئے
معصومیت سے گویا ہوئی۔

میں جانتا ہوں! میری بخت مجھ سے زیادہ دیر تک ناراض نہیں رہ
سکتی۔۔۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں تبدیلی دیکھ کے وہ
محبت سے بولتا اس کے گال پہ اپنی بیئر ڈرگڑنے لگا۔

نہیں! میں ناراض ہوں۔۔۔۔ وہ جان بوجھ کے نخرے دیکھاتی اپنا
چہرہ اس سے دور ہٹانے کی کوشش کرنے لگی۔

نہیں! کوئی ناراضگی والا سین نہیں ہو رہا۔۔۔ وہ اس کو مزید خود میں
بھینچتا محبت سے بولا۔

بالاخر بیس منٹ تک یونہی چھوٹی چھوٹی کوششوں کے بعد زربخت
نے اس کے ساتھ صلح کر لی تھی۔ وہ کون سا ہر روز اس کو ڈانٹتا
تھا جو وہ منہ ہی نہ سیدھا کرتی۔۔۔

مہندی لگانی ہے؟ آج چاند رات ہے۔۔۔ دمیر خان نرمی سے اس کی ٹھوڑی چومتا استفسار کر گیا۔

ہمم! لگوانی ہے۔۔۔۔۔ زربخت نے معصومیت سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

اس کا جواب سنتے ہی دمیر خان اپنی جیب میں ہاتھ ڈالے مہندی کی کون نکال کر زربخت کا ہاتھ پکڑا اس پہ مہندی سے گول گول چھوٹے چھوٹے دائرے بنانے لگا تھا۔

وہ جانتا تھا اس کی بخت اس ناراض ضرور ہے مگر اس نے جو خواہش دمیر خان سے اس نے اسکے ہاتھوں سے مہندی لگوانے کی تھی وہ دمیر خان کو ہر حال میں پوری کرنی تھی اور اس لئے تو وہ مہندی بھی لایا تھا اور فون سے مہندی لگانا بھی سیکھی تھی۔

دمیر! آپ کو آتی ہے مہندی لگانی؟۔۔۔ زر بخت اس کے ہاتھ
مہارت اور صفائی سے بنتے گول دائرے دیکھ کر حیرانگی سے گویا
ہوئی۔

مجھے نہیں آتی تھی لیکن تمہارے لئے فون سے دیکھ کے سیکھی
ہے۔۔۔ دمیر خان اس کے ہاتھ پہ گول دائرے مکمل کرتا اس کے
چہرے کی طرف جھک کر زر بخت کی چھوٹی سی ناک لبوں اپنے
لبوں میں دبا گیا تھا۔۔۔

زر بخت اس کی محبت بھری نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے شرم
سے نظروں کا زاویہ بدل گئی تھی
جب اچانک اس کی نظر اوپر آسمان پہ پڑی تھی۔
دمیر! وہ دیکھیں عید کا چاند! زر بخت چاند کو دیکھتے ہی چہک کے بولی
تھی۔

دیکھ ہی تو رہا ہوں اپنے چاند کو!۔۔۔ دمیر خان مخمور لہجے میں بولتا
زر بخت کے ہاتھ اپنے لبوں سے لگا گیا۔

چاند رات مبارک ہو میری بخت! دمیر خان نرمی سے اس کے
لبوں پہ جھکتا پھر سے اس کو اپنی گود میں اٹھائے نیچے کچن کی جانب
لے کے بڑھا تھا تاکہ وہ کچھ کھالے کیونکہ افطاری میں اس نے کچھ
بھی نہیں کھایا تھا۔ وہ سیرٹھیاں اترنے تک زربخت کے لب نرمی
سے چومتا گیا تھا اور وہ اس کے لمس پہ سکون سے آنکھیں موندے
اس کو من مانیاں کرنے دے رہی تھی کیونکہ اس کے مزاحمت
کرنے والے ہاتھ پہ مہندی لگی تھی۔

بابا زان! مزے بی اش آتھ پہ لدائیں (بابا جان! مجھے بھی اس ہاتھ پہ
لگائیں) حنادے کے دونوں ہاتھوں پہ مہندی لگی دیکھ کر داین اپنا
دوسرا ہاتھ آگے بڑھا کر بولی تھی۔

او کے بابا کی جان لگاتا ہوں۔۔۔ وہ حنادے کے ہاتھ پہ مہندی لگاتا
مصروف انداز میں بولا۔

وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے اپنی بیٹیوں کو مہندی لگاتے ہوئے ان کے
لاڈ اٹھا رہا تھا حالانکہ داعیر ان کے ہاتھوں پہ بس الٹی سیدھی
لکیریں ہی مار رہا تھا۔ اس کو مہندی صحیح سے پکڑنی بھی نہیں آرہی
تھی تو پھر وہ صحیح سے لگاتے کیسے؟ لیکن حنادے اور دانیل کو اپنے
باپ کے ہاتھوں سے مہندی سے الٹی سیدھی لکیریں بنوا کے ہی
انتہا کی خوشی ہو رہی تھی۔

مہرو ان تینوں سے فاصلے پہ بیٹھی بظاہر تاسف سے دیکھ رہی تھی
لیکن اندر سے وہ ان تینوں کی نظر بھی اتار رہی تھی۔۔۔ ان تینوں
کے چہرے خوشی سے کھکھلا رہے تھے۔

مہرو کو انزس نے مہندی لگائی تھی۔ اسے مہندی نہیں لگوانی تھی،
بس داعیر کے سینے سے لگ کے سے چاند رات کی مبارک باد دینی

تھی، لیکن ایک وہ تھا جو بیٹیوں میں ایسے مگن تھا کہ اس کی آنکھوں
کی خواہش بھی نہیں پڑھ پا رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد داعیر خان اپنی دونوں بیٹیوں کو خود اپنے ہاتھوں
سے مہندی لگانے کے بعد سلا چکا تھا۔ وہ ان دونوں کے مہندی
والے ہاتھ ان کے کپڑوں سے دور کرتا، بیڈ کی دوسری سائیڈ خاموش
بیٹھی مہرو کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کرنے لبا۔
داعیر خان کا اشارہ دیکھتے ہی مہرو فوراً اٹھ کر اس کے سینے سے آکر
لگی تھی۔

چاند رات مبارک ہو میری مہر!۔۔۔ داعیر خان اس کو اپنے سینے
میں بھینچے اس کے ماتھے پہ لب رکھ گیا تھا۔
خیر مبارک! آپ کو بھی مبارک ہو۔۔ مہرو مزید اس کے گرد مزید
اپنے بازوؤں کا گھیر اتنگ کرتی اس کے سینے میں گھسی تھی۔

داعیر خان ایک نظر اپنی سوئی ہوئی بیٹیوں پہ بھی رکھے ہوئے تھا
لیکن اس کے سینے سے لپٹی مہر و اس کے دل کی توجہ کامرگز بنی ہوئی
تھی۔ داعیر خان کبھی جھک کر اپنی بیٹیوں کو چومتا تو کبھی اپنے
لبوں کا لمس اپنی نور چشم کے ہونٹوں اور گالوں پہ نرمی سے چھوڑتا،
آج کی اس حسین رات سے یہی پہ تھمنے کی التجا کر رہا تھا۔ وہ ایک
داعیر خان اپنے ارد گرد تین وجود، اپنے سینے اور بازوؤں میں سمیٹے
، اپنی پوری خوشیوں سے بھری کائنات کو اپنے حصار میں قید کئے
بیٹھا تھا جس پہ اللہ تعالیٰ نے محبتیں اور اپنی نعمتیں تمام کی تھی۔ کیا
اس سے بھی زیادہ خوش قسمت انسان کوئی اور ہو سکتا تھا جتنا
داعیر خان آفریدی تھا؟

اہہ!۔۔۔ میرا کپڑے تو خراب نہ کریں آپ!۔۔۔ انزس
جھنجھلاتے ہوئے اپنے سینے سے رائم خان کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش
کرتی خفگی سے بولی۔

رائم خان ابھی عید کی نماز پڑھ کے آیا تھا اور جب سے آیا تھا انزس
سے اپنی میٹھی عیدی بٹور رہا تھا۔۔۔ کبھی اس کے میٹھے لبوں کو چوم
کر تو کبھی اس کے وجود پہ اپنے ہاتھوں کا حق جتا کر۔۔۔

آج تو عید ہے! آج تو مجھے خود سے دور کر کے اپنے لمس سے محروم
رکھنے کی کنجوسی نہ کرو۔۔۔ رائم خان بہکے ہوئے انداز میں بولتا پھر
سے انزس کو لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے چوم گیا تھا۔

وہ اپنے سامنے سچی سنوری انزس کو دیکھ کر ہر لمحے بے خود ہو رہا
تھا۔

خان! کیا کر رہیں؟ دروازہ لاک نہیں ہے روحان آجائے گا۔۔۔
انزش اپنا چہرہ اس سے دور کرتی اس کے لبوں کے آگے ہاتھ رکھ کر
عقل دلانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔۔۔

وہ نہیں آئے گا۔۔۔ بس ایک اور بار چومنے دو۔۔۔ رائم خان
مخمور لہجے میں بولتا ملتجی ہوا تھا۔ انزش اس کی التجاسن کر اپنا چہرہ
بے ساختہ آگے کر گئی تھی۔

رائم خان فتح مندی سے مسکرا کر ابھی انزش کے لبوں پہ جھکتا
جب ہمیشہ کی طرح روحان طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوا تھا

-

وہ اس وقت سیاہ شلوار قمیض میں ہم رنگ ویسکوٹ پہنے اپنی سرخ
وسفید رنگت کے ساتھ بے حد پیارا لگ رہا تھا۔
روحان کی اچانک آمد پر انزش اور رائم خان ہڑبڑاتے ہوئے ایک
دوسرے سے فاصلے پہ ہوئے تھے۔

آگئی میری سوتن!۔۔۔ رائم خان لب بھینچے بدمزہ ہوتا روحان کو
گھور گیا۔

مولے! ام نے حنا دھر تب تلنا مزے اش تو عیت بارت بونا)
مورے! ہم نے حنا گھر کب چلنا، مجھے اس کو عید مبارک بولنا)
روحان اپنے ماں باپ کی طرف بڑھتا بے چینی سے سوال کرنے
لگا۔

شام کو جائیں گے ہم۔۔۔ ابھی ہم اپنے گھر میں عید منائیں گے۔
ادھر آؤ میرا بچہ اپنی مورے سے تو ملا ہی نہیں اور نہ عید مبارک
بولا۔۔۔ انز ش اپنے بازو پھیلاتی روحان کو اپنی طرف آنے کا اشارہ
کر گئی۔ روحان بھاگ کے اپنی ماں کی بانہوں میں سمٹا تھا۔
عیت بارت مولے! (عید مبارک مورے) روحان اپنی ماں کے
چہرہ پہ ننھی سی کس کرتا چہک کے بولا تھا۔

خیر مبارک! میرا بچہ آپ کو بھی عید کی خوشیاں مبارک ہوں۔۔۔
انزس مسکرا کر اس کی آنکھوں میں آتے بال چھپ کر کے اس کے
ماتھے پہ لب رکھ گئی تھی۔

عید مبارک! خان کے دل کا ٹکڑا۔۔۔ رائم خان احتیاط سے
روحان کو انزس سے لیکر اپنی گود میں اٹھاتا اس کا نرم گال محبت
سے چوم گیا تھا۔

اپ تو بی عیت بارت بابا زان! (آپ کو بھی عید مبارک بابا جان)
روحان میٹھی آوازیں بولتا اپنے گلابی ہونٹ رائم خان کی بیڑی پہ رکھ
کے بولتا اس کو حیران کر گیا۔

پھر سے بولوں بابا کی جان۔۔۔ رائم خان خوشگوار حیرت سے بولتا
روحان کے منہ سے پھر سے اپنے لئے بابا لفظ سننے کی فرمائش کر
گیا۔ وہ جب سے پیدا ہوا تھا، آج پہلے دفعہ اس کو بابا بول کے اس کی
تڑپ ختم کی تھی ورنہ وہ ہمیشہ اسے تنگ کرتا رہتا تھا۔۔۔

بابا زان! (بابا جان) روحان پھر سے بولتا اپنے چھوٹے چھوٹے بازو
اس کی گردن کے گرد حائل کر گیا۔

بابا جان صدقے اپنے بچے کے۔۔۔ رائم خان اس کو اپنے گلے
سے ہٹاتا اس کے چہرے پہ جابجا لب رکھتا نم آوازیں بولا تھا۔
روحان کے منہ سے پہلی بار اپنے لئے بابا سن کے رائم خان کی
کر سٹل گرے آنکھیں خوشی سے نم ہوئی تھی۔

انز ش خاموشی سے مسکرا کر دونوں باپ بیٹے کے پیار کو دیکھ کر
رہی تھی۔ یہ کل رات کو ہی انز ش نے روحان کو سمجھایا تھا کہ وہ
اسے کل بابا بول کے سر پر انز کرے گا۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ روحان کو منع کرتی تھی کہ وہ رائم خان کو بابا نہ
بولے بلکہ انز ش کو روحان کے منہ سے رائم کیلئے "خان" لفظ سننا
زیادہ اچھا لگتا تھا۔ اس لئے وہ اس کی درستگی نہیں کرتی تھی لیکن
کل رائم خان کے دل کی بات جان کر روحان کو پیار سے سمجھایا تھا

کہ وہ آئندہ اپنے بابا کو خان کی بجائے بابا جان بولا کرے، ماں کی ہدایت سن کر فوراً روحان نے یہ ہدایت اپنے دماغ میں محفوظ کر لی تھی۔۔

رائم خان ایک تشکر اور محبت بھری نگاہ انزش پہ ڈالتا اس کو بھی آگے بڑھ کر اپنے حصار میں لے گیا۔

تایا زان! اپ میلاپٹہ تھیت تردیں دے (تایا جان آپ میرا دوپٹہ ٹھیک کر دیں گے)؟۔۔۔ حنادے اپنے چھوٹے سے دوپٹے کے ساتھ الجھی دمیر خان سے مخاطب ہوئی تھی۔

ہاں کیوں نہیں میرا بچہ! ادھر میرے پاس آؤ۔۔۔ دمیر خان نرمی سے حنادے کو بازو سے اٹھا کے اپنی گود میں بیٹھاتا اس کا دوپٹہ درست کرتا حنادے کا گلابی پھولا گال چوم گیا تھا۔

تایا زان مزے بی تھائیں! (تایا جان! مجھے بھی اٹھائیں) حنادے کو
دمیر خان کی گود میں بیٹھا دیکھ کر دانین نے بھی معصومیت سے
فرمائش کی تھی۔۔ ایسے کیسے ہو سکتا تھا جو کام حنادے کرے اور
وہ دانین نہ کرے؟

ہاہا! تایا کی جان۔۔ آپ بھی آجاؤ۔۔ دمیر خان محبت سے لبریز
لہجے میں بولتا دانین کو بھی اٹھا کے اپنی گود میں بیٹھا گیا جبکہ اصرار
اپنے دادا جان کی گود میں بیٹھا اپنی عید کے پیسے گننے میں مصروف
تھا۔

زربخت، مہر اور انیسہ خان کچن میں ملازمہ کے ساتھ آج شام کی
دعوت بنانے میں مصروف تھی جبکہ داعیر خان عید کی نماز پڑھ کے
آنے کے بعد سو گیا تھا اور ابھی تک سو رہا تھا۔

روحان تے تنی عیت ملی؟ (روحان تمہیں کتنی عید ملی) حنادے
نے اپنے پاس کھڑے روحان سے سوال کیا تھا۔
مزے تو دھیل شاری ملی اے (مجھے تو ڈھیر ساری ملی ہے) روحان
اپنے دونوں بازو پھیلائے خوشگوار سے بولا تھا۔
مزے زادہ تو نئی اے (مجھ سے زیادہ نہیں ہے) داعیر خان کی گود
میں بیٹھا اصرار حنادے کے قریب روحان کو دیکھ کر کلس کے بولا
تھا۔۔

تم تپ ترو! (تم چپ کرو) روحان ایک کڑی نظر اصرار پہ ڈالتا
رعب دار لہجہ میں بولا تھا۔
میلے دھر میں مزے آنتھیں دیتھاتا اے (میرے گھر میں مجھے آنکھیں
دیکھاتا ہے)۔۔۔ اصرار مٹھیاں بھینچے داعیر خان کی گود میں غصے سے
اچھلا تھا۔

ہاہاہا! دے میں دبا دے میں تار!

شارے بتے پانی پھینتو دل لہا اے اہلال!

(ڈبے میں ڈبا، ڈبے میں کار!)

سارے بچے پانی پھینکو، جل رہا ہے احرار (روحان ہنستے ہوئے اپنی
توتلی زبان میں بولتا سب کو حیرانگی کے ساتھ قہقہہ لگانے پر مجبور کر
گیا تھا۔

روحان کو یہ ساری باتیں شانزے نے پرسوں ہی سیکھائی تھی جب
اس نے احرار کی شکایت لگاتے ہوئے اپنی دکھ بھری داستان اسے
سنائی تھی تو اس نے احرار کو جلانے کیلئے اسے کچھ دم دار اور
مزاحیہ جواب سیکھائے تھے۔

احرار روحان کی بات سنتا کانوں تک غصے میں سرخ ہوا تھا۔ اس کو
غصے سے پاگل ہوتے دیکھ کر داعیر خان اس کان کے پاس جھک کر
کچھ بڑبڑانے لگا۔ داعیر خان کی بات سنتے ہی احرار کے چہرے پہ
اب غصے کی بجائے کمینگی سی مسکراہٹ دوڑی تھی۔

دبے میں دبا، دبے میں پان!
حنا میلی تزن اول لالا اش تے لوحان!

(ڈبے میں ڈبا ڈبے میں پان!
حنا میری کزن اور لالا اس کے روحان) اصرار ایک کمینگی سے مسکرا
کر جواب دیتا روحان کو کپڑوں تک جلا گیا تھا۔
اب کی بار اصرار کا تگڑا جواب سن کر سب کا بلند قہقہہ لاؤنج کی
زینت بنا تھا۔

جبکہ دمیر اور زربخت نے حیرانگی سے اپنے بیٹے کو دکھنے کے بعد
روحان کی اتری شکل دیکھ کر پھر سے ہنس دیئے۔

بابا زان! میں حناتا لالائی اوں (بابا جان! میں حنا کا لالا نہیں ہوں
(۔۔۔ روحان اپنے باپ کی طرف بڑھتا رنجیدگی سے دہائی دے گیا
تھا۔ وہ سب کچھ بن سکتا تھا لیکن حنادے کا لالا کبھی نہیں۔

سب بڑے بچوں کی شرارتوں اور نوک جھوک سے محفوظ ہوتے
ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

عامر بزدار اور رائم خان کے والدین روحان کی سائیڈ لے رہے تھے
جبکہ اسد اللہ خان اور انیسہ بیگم اپنے پوتے کی سائیڈ لیتے ہوئے اس
محبت سے بھری رشتوں کی محفل کو اپنے قہقہوں سے زعفران بنا
ہوئے تھے۔۔۔

سب لان میں خوش گپیوں کے ساتھ کھانا کھانے میں مصروف تھے۔
بچے لان میں کھیل رہے تھے۔۔ ہر طرف خوشیوں کا سماں تھا۔
دمیر خان ایک نظر اپنے قریبی میٹھے سبھی لوگوں پہ ڈالتا سرشاری میں
مسکرایا تھا۔

انیسہ، اسد اللہ خان، عامر بزدار اور رائم خان کے والدین کی خوشی
کا ٹھکانہ ہی الگ تھا کیونکہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی اولاد کو
پھلتے پھولتے اور خوش دیکھ رہے تھے۔

دمیر خان نے ایک محبت بھری نگاہ زربخت پہ ڈالتے ہوئے زندگی
بھر ساتھ نبھانے کا عہد کیا تھا۔

داعیر خان بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی نور چشم کے صدقے
واری جا رہا تھا جبکہ رائم خان ٹیبل کے نیچے اپنی قلبِ راحت کا
ہاتھ پکڑے اگلے جہاں تک بھی نہ چھوڑنے کا ارادہ باندھے بیٹھا
تھا۔۔

اہلال! (احرار) روحان گرج دار آوازیں دھاڑا تھا۔ اس کی دھاڑ پہ
سب نے بے ساختہ چھپے پڑ کے دیکھا تھا۔ اور ایک بار پھر سے
احرار کو حنادے اور دانیں کو روحان کی پہنچ سے دور لے جانے کی
کوشش کرتا چھوٹا سا احرار اپنی کیوٹ سی حرکت اور چہرے کے
غصیلے تاثرات سے سب کو ہنسنے پہ مجبور کر گیا تھا۔۔

یہ رشتوں کی چاشنی میں ڈوبے ہوئے قہقہے تھے نہ ان قہقہوں کی آواز
مدہم ہونی تھی اور نہ ان کی مٹھاس کم ہونی تھی۔۔

"پوری کائنات کی خوشیوں کو لپیٹ کے رشتوں کی کتاب میں ڈھالا

ہے!
کائنات کتاب میں سمٹ آئی، مکمل ہوئی رشتوں کی کہانی!
کیا اب اجازت ہے، میں توڑ دوں اپنی قلم پرانی؟"

ختم شد!

(یہ خوبصورت داستان بالا خراپے اختتام کو پہنچ چکی ہے، سب نے
اس کو پڑھنے کے بعد اپنے ریوز انباکس یا یوٹیوب چینل کے
کو منٹ سیکشن میں ضرور شتیر کرنے ہیں۔۔ عید مبارک۔۔

خوش رہیں (❤️💋)